آخری معرکہ
نسیم حجازی

آخری معرکہ

نسیم حجازی

فہرست

نئے دور کے مشعل بردار

وہ جاہل تھے اور اپنی جہالت پر فخر کرتے تھے۔ ان کے ماضی کی تاریخ نہ ختم ہونے والی قبائلی جنگوں تک محدود تھی اور ان کے سامنے ان جنگوں کو جاری رکھنے کے سوا کوئی مستقبل نہ تھا۔ جو ظلم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے ظلم سہنے پر مجبور کر دیے جاتے تھے۔ لیکن جب اسلام آیا تو یہی لوگ ایک نئے دور کے مشعل بردار بن گئے۔ کار سازِ فطرت نے اپنی رحمت کے نزول کے لیے ایک بے آب و گیاہ صحرا کو منتخب کیا۔ عرب کے ظلم کدے سے نور کا ایک سیلاب نمودار ہوا اور مختلف قبائل اور اقوام کو اپنے آغوش میں لیتا ہوا اطرافِ عالم پر چھا گیا۔

اسلام تپتے ہوئے صحرا میں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا اور خلقِ خدا اس کی پیاسی تھی۔ دنیا جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی اور اسلام ایک نئی صبح کا آفتاب تھا۔ انسانیت ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہی تھی اور اسلام اس کے لیے عدل و مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا۔

بدر و حنین کے معرکوں میں اسلام کی ابتدائی فتوحات دراصل صدیوں کی روندی، پسی اور سسکتی ہوئی انسانیت کی فتوحات تھیں۔ مؤرّخ جنہوں نے روم اور ایران کے شہنشاہوں کا جاہ و جلال دیکھا تھا، اب ان بوریا نشینوں کو اقوام و ملل کی قسمت کا فیصلہ کرتے دیکھ رہے تھے جو اپنی پھٹی ہوئی قباؤں کو اپنے ہاتھ سے پیوند لگایا کرتے تھے۔

وقت کے فرعون، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواروں کی طرح حائل تھے۔ جب یہ دیواریں ٹوٹ گئیں تو ہمسایہ ممالک کے باشندوں نے دیکھا کہ عرب کے صحرا نشین ان کے دشمن نہیں بلکہ دوست اور محافظ بن کر آئے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اپنی نسلی اور وطنی عصبیتوں کے باعث کبھی اسلام کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے،

اب کفر و اسلام کی نگاہوں میں عربوں کے دوش بدوش لڑ رہے تھے۔

خلافت راشدہ اسلامی نظامِ حکومت کا ایک مثالی دور تھا لیکن اس کے بعد خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو اسلامی سلطنت کا تدریجی زوال شروع ہو گیا۔ حکومت کے ایوانوں میں اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے حاوی نہ رہ سکا اور بعض دور تو ایسے بھی تھے جب برسرِ اقتدار طبقہ کھلے بندوں احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتا رہا۔

تاہم اس انحطاط کے دور میں بھی ہمیں کبھی کبھی اسلام کے ابتدائی دور کی مثالی ریاست کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

قرن اوّل کے مسلمانوں نے انسانی سیرت و کردار کا جو نمونہ پیش کیا تھا، اس کا تصور مختلف ادوار میں ملّتِ بیضا کے قافلوں اور قافلہ سالاروں کو ان کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں دکھاتا رہا جن کا تصوّر اغیار کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس باغ کی خزاں کا یہ عالم تھا اس کی بہار کیا رہی ہو گی۔

المسلمین کے دلوں میں، مختلف زمانوں میں اس مثالی دور کی طرف رجوع کرنے کی تڑپ پیدا ہوتی رہی۔ اگر انہیں کوئی اچھا حکمران یار ہنما مل گیا تو انہوں نے مشرق و مغرب کی رزمگاہوں میں ایک بار پھر گزرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ کر دی۔ کبھی ان کی اذانیں فرغانہ کی وادیوں میں گونجتی تھیں اور کبھی ان کے اقبال کے پرچم اندلس کے میناروں میں لہراتے تھے۔

۲

اموی حکمرانوں کے زوال کے بعد زمامِ حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں آئی تو ملوکیت کی خرابیوں کے ساتھ عجمی تصورات کی برائیاں بھی شامل ہو گئیں اور قبائلی اور قومی عصبیت نئی شدّت کے ساتھ جاگ اٹھی۔ دین کا وہ رشتہ جس نے اطرافِ عالم کے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر رکھا تھا کمزور پڑ گیا اور عباسی خلفا دور افتادہ ممالک کو مرکز کے ساتھ وابستہ نہ رکھ سکے۔

۱۳۸ھ میں عبد الرحمٰن الداخل نے ہسپانیہ میں اموی خاندان کی خود مختار

سلطنت قائم کر لی اور اس سے چند سال بعد علوی خاندان کے ایک فرد ادریس نے مراکش میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ قریباً اسی زمانے میں طیونس بھی عباسی سلطنت سے کٹ گیا۔ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں محمد بن زیاد نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ اسی صدی کے وسط میں مصر کے گورنر احمد ابن طولون نے عباسی اقتدار کے خلاف بغاوت کی اور مصر بھی علیحدہ ہو گیا۔ ۳۵۸ھ میں مصر پر فاطمیوں کی حکومت قائم ہو گئی اور انہوں نے چند سال کے عرصہ میں شام پر بھی تسلط جما لیا۔

انحطاط کے اس دور میں فارس، خراسان اور شمال کے ممالک پر بھی عباسی خلفا کا اقتدار برائے نام تھا۔ ان ممالک کی گورنریاں چند خاندانوں کی میراث بن چکی تھیں۔ بنی عباس کے عروج کے زمانے میں اقتدار کی مسندوں پر عربوں کی بجائے ایرانی امراء قابض تھے۔ لیکن زوال کے دور میں ایرانیوں کی جبکہ ترک امراء نے لے لی۔ چوتھی صدی میں ہر ملک کا گورنر ایک خود مختار بادشاہ تھا اور حکومت کے شوق میں نئے نئے قسمت آزما میدان میں آ رہے تھے۔ عباسی خلفاء بے بس تماشائیوں کی حیثیت

میں حکومت کے پرانے اور نئے دعویداروں کی زور آزمائی دیکھا کرتے تھے جو غالب آجاتا وہ اس کی برائے نام سرپرستی قبول فرمالیتے تھے اور اسے ایک آدھ خطاب سے نواز دیتے تھے۔

سامانی خاندانوں جس کے عروج کی ابتدا خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں ہوئی تھی۔ تیسری صدی کے وسط تک ایک ایسی عظیم الشان سلطنت پر قابض ہو چکا تھا جو خراسان سے لے کر کاشغر، خوارزم اور طبرستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ عباسی خلفاء جن کے اسلاف نے سامانیوں کو خراسان کی امارت عطا کی تھی اب اس خاندان مربّی اور سرپرست نہ تھے بلکہ مجبور اور بے بس دُعاگو بن کر رہ گئے تھے۔ چوتھی صدی کے وسط آخر میں اس سلطنت کا زوال شروع ہوا اور اس کے آخر تک سامانی تاجدار قصۂ ماضی بن کر رہ گئے۔ پھر یہ سلطنت اقتدار کے نئے دعویداروں کی رزمگاہ بن گئی۔ لیکن غزنی کی وادیوں سے وہ عظیم الشان شخصیت نمودار ہوئی جس کی ہمہ گیر قوت کے سامنے ان قسمت آزماؤں کے حوصلے ٹھنڈے پڑ گئے۔ جن فضاؤں میں کرگس پرواز کر رہے تھے وہاں ایک عقاب نمودار ہوا۔

جن شکار گاہوں میں بھیڑیے اور گیدڑ چیخیں مارتے تھے وہاں اب ایک شیر کی گرج سنائی دینے لگی۔

محمود غزنوی کا ظہور سمندر کی اس اٹھتی ہوتی لہر کی طرح تھا جو اپنی راہ کی ہر موج کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ وہ ایک ایسا فاتح تھا جس کی تلوار کی جھنکار کبھی ترکستان اور کبھی ہندوستان کے میدانوں میں سنائی دیتی تھی۔ جس کے گھوڑے کبھی جیحوں اور کبھی گنگا کا پانی پیتے تھے۔ وہ شاہراہِ حیات کے ان مسافروں میں سے تھا جو کسی منزل پر قیام کرنے کی بجائے ہر منزل سے آگے گزر جاتے ہیں اور جن کا ذوقِ سفر کسی سرحد کو تسلیم نہیں کرتا۔ پہاڑ، دریا اور صحرا اس کی راہ کے سنگِ میل تھے۔ غزنی جسے الپتگین کے زمانے میں معمولی شہرت حاصل تھی۔ محمود کی فتوحات کے باعث وسط ایشیا کی اس عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام بن چکا تھا جو خراسان، کرمان، سیستان، مکران، طبرستان، آذربائیجان، خوارزم اور فرغانہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ شمالی ممالک کی فتوحات نے محمود کو تاریخ کے عظیم ترین فاتحین کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا لیکن ہماری داستان کا

تعلق محمود غزنوی کی ان فتوحات کے ساتھ ہے جو ہندوستان میں ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

بظاہر اس کے سامنے اطرافِ عالم میں اپنی فتح و نصرت کے پرچم لہرانے کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا لیکن ہندوستان میں قدرت اسے اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع مقصد کی تکمیل کی راہیں ہموار کرنے کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ قدرت جو خزاں رسیدہ چمن کے خشک پتے جھاڑ کر نئی بہار کے شگوفوں کی جگہ پیدا کرنے کے لیے شمال کی خنک اور تند و تیز ہواؤں کو حرکت میں لاتی ہے اور جھلسے ہوئے صحراؤں کی پیاس بجھانے کے لئے دور افتادہ پہاڑی ندیوں میں چٹانوں کے سینے چیر کر اپنی گزر گاہیں بنانے کی قوّت پیدا کر دیتی ہے۔ اسے ایک کارِ عظیم کے لیے منتخب کر چکی تھی۔

ہندوستان پر صدیوں سے اس فلسفۂ حیات کی حکومت تھی جن کا اوّلین مقصد انسانوں میں اونچ نیچ، چھوت اور اچھوت کی تفریق پیدا کرنا اور اسے قائم رکھنا تھا۔ جب وسط ایشیا کے آرین فاتحین اس ملک میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی بستیاں بسانے کے لیے زرخیز زمینوں اور سرسبز

چراگاہوں کو منتخب کیا اور اس ملک کے قدیم باشندوں کے لیے صرف وہ جنگلات، پہاڑ اور بنجر علاقے رہ گئے جنہیں آرین حکمران اپنے تصرف میں نہیں لاسکتے تھے۔ پھر اپنی مفتوح اقوام پر دائمی تسلط قائم رکھنے اور ان کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات ختم کرنے کے لیے انہوں نے مذہب کے نام سے ایک ایسے سماجی نظام کو جنم دیا جس نے مغلوب افراد کو ہمیشہ کے لیے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اس سماجی نظام کے نگہبان ہندو مذہب کے وہ مقدس دیوتا تھے جن کی نگاہ میں ایک برہمن ہر لحاظ سے قابلِ تعظیم تھا اور ایک شودر ہر لحاظ سے قابلِ نفرت۔ اونچی ذات کے ہندو کے بدترین اعمال بھی اس سے اس کی پیدائشی برتری نہیں چھین سکتے تھے اور نیچ ذات شودر کے بہترین اوصاف بھی اس کے مقدر کی سیاہی نہیں دھوسکتے تھے۔

ہندو سماج کے قانون کی نگاہ میں اونچی ذات کے فرد کا کوئی گناہ اگر ناقابلِ معافی تھا تو یہ کہ وہ نیچ ذات کے کسی فرد کو انسان سمجھنے لگے اور نفرت حقارت کی اس دیوار کو پھاندنے پر آمادہ ہو جائے جو چھوت اور اچھوت کے درمیان کھڑی کی گئی تھی۔ منوجی کے چیلوں نے مسلک کو مذہب

قرار دیا تھا اس کا نصب العین انسانوں کے درمیان مساوات قائم کرنا نہ تھا بلکہ مساوات کے تصوّر کی جڑیں کاٹنا تھا۔ اس کا مقصد کسی ضابطۂ اخلاق کی اشاعت نہ تھا۔ بلکہ اونچی ذات کے انسانوں کے مفاد کی ترجمانی تھا۔ شودروں کو ہندو سماج کا قابلِ نفرت حصّہ بنا کر اس ملک کے زرخیز علاقوں سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ کسی بستی کو شودروں سے خالی کرانے کے لیے انہیں ہر وقت تلوار اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ شودر کے اعصاب پر ان کی تلواروں سے زیادہ ان کے دیوتاؤں کی مورتیوں کا خوف سوار ہو چکا تھا۔ یہ مورتیاں جس مقام پر نصب کر دی جاتی تھیں وہاں شودر کا رہنا ناممکن بنا دیا جاتا تھا۔ جس کنویں سے ان مورتیوں کے پجاری پانی پیتے تھے وہ مقدس بن جاتا تھا اور ایک شودر کا ان کے قریب پھٹکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ جن مندروں میں ان مورتیوں کے لیے بھجن گائے جاتے تھے ان کے آس پاس کے راستے شودروں کے لیے بند ہو جاتے تھے۔ پجاری اپنے دیوتاؤں سے سنسکرت کی مقدس زبان میں ہمکلام ہوتے تھے۔ اگر اس مقدس زبان کا ایک لفظ بھی شودر تک پہنچ جاتا تھا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا

تھا۔ اونچی ذات کے ہندو کا دھرم اچھوت کو چھونے اور اس کے ساتھ بات کرنے سے بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ ان حالات میں شودر کسی کام کے بغیر ہی اپنی جھونپڑیاں ہندو سماج کے خوشنما ایوانوں کی بھینٹ کر دیتے تھے۔

صدیوں ظلم و استبداد کی اس چکی میں پسنے کے بعد جس کی نظیر تاریخِ انسانی میں نہیں ملتی، ایک شودر صرف ایک برہمن کی نگاہ میں ہی رذیل نہ تھا بلکہ خود اپنی نگاہوں میں بھی رذیل ہو چکا تھا۔ وہ سماج کا دشمن ہونے کی بجائے سماج کا ایک قابلِ نفرت حصّہ بن جانے پر قانع ہو چکا تھا۔ جابر و ظالم برہمن سے اس کی نفرت خوف اور خوف نیاز مندی کے جذبات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ دور دور سے ان ایوانوں کو سلام کرتا تھا جو اس کے اسلاف کی جھونپڑیوں پر تعمیر ہوئے تھے اور ان مندروں کی تقدیس اور عظمت کا اعتراف کرتا تھا جن کی مورتیوں کے سامنے برہمن اپنے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے اچھوتوں کا بلیدان دیا کرتے تھے۔ وہ مقصد جس کے لیے آریا قوم کے فاتحین نے منوجی کا فلسفۂ حیات قبول کیا تھا پورا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے مغلوب اقوام کے لیے دوبارہ اپنے پاؤں

پر کھڑا ہونے یا اپنے کھوئے ہوئے حقوق کے لیے لڑنے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔

لیکن انسانوں کی تقسیم صرف یہیں تک محدود نہ رہی بلکہ خود اونچی ذات کے ہندو بھی ادنیٰ اور اعلیٰ ذاتوں میں تقسیم ہو گئے۔ برہمن سب سے اعلیٰ تھے۔ اس لیے سب پر ان کی تعظیم فرض تھی۔ وہ مذہب کے اجارہ دار تھے اور مذہب میں دیوتاؤں کی پوجا کے ساتھ برہمنوں کی اطاعت بھی فرض تھی۔ کھشتری ہندو سماج کا سپاہی تھا اور برہمن نے اپنی سہولت کے لیے سیاسی اختیارات اسے سونپ رکھے تھے۔ کھشتری اپنی تلوار کی طاقت سے حکومت حاصل کرتا تھا اور برہمن اس کے مشیر کی حیثیت سے حکومت کا کاروبار اپنی مرضی کے مطابق چلاتا تھا۔ حکومت کا اوّلین مقصد ان حد بندیوں کو قائم رکھنا تھا جو برہمن اور اس کے ہر کھشتری کی برتری منوانے کے لیے ضروری تھیں۔

ملک کے محنت کش لوگ ویش کہلاتے تھے۔ انہیں برہمن اور کھشتری کے مقابلے میں کم تر سمجھا جاتا تھا۔ ان کے خون اور پسینے کی کمائی سے

کھشتری حکمرانوں کے محل اور برہمن پیشواؤں کے مندر تعمیر ہوتے تھے۔ تاہم برہمن جو نذرانہ وصول کرتا تھا وہ حکمران کے خراج سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ حکمران صرف ویش کی آمدنی کا ایک حصّہ لے سکتا تھا لیکن برہمن کے مندر کا خزانہ پُر کرنے کے لیے ویش کی طرح کھشتری حکمران بھی اپنی آمدنی کا ایک حصّہ مندروں پر وقف کرنے پر مجبور تھے۔

برہمن اور کھشتری کی دوہری حکومت میں ملک کا محنت کش طبقہ بری طرح پس رہا تھا کہ کسی کو سسکنے، کراہنے یا شکایت کرنے کی اجازت نہ تھی۔

بدھ مت اس سماجی نظام کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ یہ ایک سیلاب تھا جس کی لہریں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئیں اور کچھ مدّت کے لیے اس نے ان بلند چٹّانوں کو بھی اپنے آغوش میں لے لیا جن پر برہمن کے اقتدار کے محل کھڑے تھے۔ لیکن اس کی طغیانی کا زور کم ہوتے ہی یہ چٹانیں پھر نمودار ہونے لگیں اور ہندوستان کی

سرزمین ایک بار پھر منو جی کے چیلوں کی شکار گاہ بن گئی۔ بدھ مت نے انسان کو اچھے اور بُرے اعمال کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور یہ برہمن کی نسلی برتری کے خلاف ایک اعلانِ جنگ تھا۔ چنانچہ اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے بعد بدھ کے چیلوں کے خلاف برہمن کے ہاتھ میں انتقام کا خنجر اس خنجر سے کہیں زیادہ تیز تھا جو اس نے کسی زمانے میں شودر کے خلاف اٹھایا۔ دیو مالاؤں کی سرزمین میں دیوتاؤں کے مقدس بیٹوں کو عام انسانوں کی طرح اعمال کی کسوٹی پر پرکھنے والے مذہب کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ بدھ مذہب کی مسخ شدہ صورت کو صرف اس حد تک ہندو مذہب میں جذب ہونے کی اجازت دی گئی جس حد تک کہ وہ اونچی ذات کے اقتدار کے لیے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلی صدی ہجری کے آخر میں لس بیلا سے لے کر ملتان تک محمد بن قاسم کی فتوحات نے اس ملک میں ایک نئی روشنی کے دروازے کھول دیے۔ یہ دور اگرچہ اسلام کا مثالی دور نہ تھا لیکن ابتدائی دور کی بہت سی خصوصیات

ابھی تک باقی تھیں۔ وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھ کر ان کا راستہ روکنے کے لیے تلوار اٹھائی تھی، ان کی اکثریت اسلام کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ دیکھ کر اسلام کے علمبر داروں کی جماعت میں شامل ہو گئی۔ مسلمانوں کے سترہ سالہ سپہ سالار کی فتوحات نے ہندوستان کے طول و عرض میں ان ایوانوں پر لرزہ طاری کر دیا جن کی بنیادیں چھوت اور اچھوت کی تفریق پر رکھی گئی تھیں لیکن محمد بن قاسم کی بے وقت موت کے باعث یہ گھٹا جو ہندوستان کے لیے نئی بہاروں کا پیغام لے کر آئی تھی، ملتان سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اموی خاندان کے عہد حکومت تک کے مرکز کے ساتھ سندھ کا تھوڑا بہت تعلق قائم رہا لیکن عباسیوں کے زمانے میں یہ رشتہ عملی طور پر منقطع ہو چکا تھا۔ عباسی سلطنت کے اختیارات کی حدود سے باہر ہونے کے باعث سندھ عالمِ اسلام کے تخریبی عناصر کے ایک جائے پناہ بن گیا۔ ہر وہ خطرناک تحریک جس کے لیے اسلامی دنیا میں بڑھنے اور پھولنے کے امکانات ختم ہو جاتے تھے، سندھ میں پناہ لیتی تھی۔ فتنہ پروروں اور

انتشار پسندوں کے وہ گروہ جنہیں عباسی حکومت کُچلنے کی کوشش کرتی تھی، چاروں طرف سے فرار ہو کر سندھ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیتے تھے۔ سندھ میں اسلام کے نظریات کو عجمی اور ہندی تصورات کی آمیزش نے پہلے ہی کافی حد تک مسخ کر رکھا تھا۔ اب نئی بدعتوں نے اس کی رہی سہی صورت بھی بگاڑ کر رکھ دی۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں غزنی کے افق سے جو طوفان نمودار ہو رہا تھا، وہ قدرت کی طرف سے ہندوستان کے برصغیر میں بسنے والے ان گنت انسانوں کی دلوں کی پکار کا جواب تھا۔

۳

ویہند کی سلطنت کے ہندو حکمران کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ کی ابتدا سلطان محمود غزنوی کے باپ سبکتگین کے عہد میں ہوئی تھی۔ راجہ جے پال کے عہد حکومت میں اس سلطنت کی حدود لمغان سے دریائے چناب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جے پال کو اپنی فوجی قوّت کی برتری پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے شمال کی سرحد پر سبکتگین کے حملے سے غضب ناک ہو کر غزنی کی سلطنت کو ہمیشہ کے لیے نابود کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور ایک

بہت بڑی فوج کے ساتھ غزنی پر چڑھائی کر دی۔ سبکتگین نے لمغان اور غزنی کے درمیان حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ ہندو بہادری کے ساتھ لڑے لیکن مسلمانوں کے پے در پے حملوں اور اس کے ساتھ برفباری کے طوفانوں نے ان کے حوصلے توڑ دیے۔ جے پال نے اپنی سرحد کی چند بستیاں اور قلعے سبکتگین کے حوالے کرنے اور خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی لیکن واپسی پر اپنی سلطنت کی حدود میں داخل ہوتے ہی اپنے عہد سے پھر گیا اور اس نے سبکتگین کے ان افسروں کو قید کر لیا جو خراج وصول کرنے کے لیے اس کے ہمراہ آئے تھے۔ سبکتگین نے اس عہد شکنی کی سزا کے طور پر فوج کشی کی اور سرحد کے چند علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

جے پال نے شمالی ہند کے کئی راجاؤں کو اپنی مدد کے لیے بلایا اور ایک لاکھ فوج کے ساتھ دوبارہ غزنی پر چڑھائی کر دی لیکن سبکتگین نے قلیل فوج کے باوجود پشاور اور لمغان کے درمیان جے پال اور اس کے حلیفوں کے لشکرِ جرار کو تتّر بتّر کر دیا۔

محمود اپنے باپ کے ساتھ ان جنگوں میں شریک ہوا تھا اور وہ یہ اندازہ کر

چکا تھا کہ غزنی اور ہندوستان کے درمیان فیصلہ کُن معرکے ابھی باقی ہیں۔ وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ ہر نئے معرکے میں جے پال کی فوج تعداد میں پہلے سے زیادہ ہوتی تھی اور اگر اس کے حکمران اسی طرح جے پال کی حمایت پر میدان میں آتے رہے تو کسی دن غزنی کی سلطنت کو اس برصغیر کی ان گنت افواج کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس لیے جب تک ہندوستان میں یہ لا محدود قوّت موجود ہے۔ کوئی دریا یا کوئی پہاڑ غزنی کے لیے خطِ دفاع نہیں بن سکتا۔ چنانچہ محمود اپنی مدافعت کے لیے بھی ان خطرناک عناصر کو منتشر اور مغلوب رکھنا ضروری سمجھتا تھا جن کا اتحاد کسی وقت بھی نہ صرف غزنی بلکہ شمال اور مغرب کے کئی ممالک کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔

ہندوستان میں ویہند کی ہم پلّہ کئی اور سلطنتیں تھیں اور محمود نے ویہند کی طاقت سے متاثر ہو کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ ان سلطنتوں کی طاقت کو کھوکھلا رکھنے کے لیے ہر سال کم از کم ایک بار کسی نہ کسی سلطنت کے ساتھ ضرور ٹکّر لیتا رہے گا۔

سبکتگین کی وفات کے بعد غزنی کی مسندِ حکومت پر رونق افروز ہوتے ہی محمود نے ہندوستان پر حملے شروع کر دیے۔ ۳۹۰ھ میں محمود نے لمغان کے آس پاس جے پال کی سلطنت کے چند علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اگلے سال اس نے پھر چڑھائی کی۔ جے پال محمود کے پندرہ ہزار سواروں کے مقابلے کے لیے تیس ہزار پیادہ فرج، بارہ ہزار سواروں اور تین سو ہاتھیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ پشاور کے قریب ۸ محرم ۳۹۳ھ کے دن فریقین کے درمیان ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دوپہر کے قریب غزنی کے ترکمان نیزہ بازوں کے تند و تیز حملوں کے باعث جے پال کی افواج میں سراسیمگی پھیل گئی اور ہندو لشکر میدان میں پانچ ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جے پال اپنے پندرہ بیٹیوں اور پوتوں سمیت گرفتار ہوا اور اڑھائی لاکھ دینار اور پچاس ہاتھی بطور فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کی لیکن وہ ہند واپس پہنچنے کے بعد اس نے پے در پے شکستوں کی ذلّت سے تنگ آ کر خودکُشی کر لی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا آنند پال تخت نشین ہوا اور اس نے کچھ عرصہ سلطان محمود کے ساتھ مخلصانہ تعلقات قائم رکھے۔

محمود غزنوی کی ان کامیابیوں کے بعد ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ان فتوحات کے ساتھ ساتھ اس دین کی تبلیغ و اشاعت کے دروازے کھل رہے تھے جو ہر لحاظ سے ہندو مت کی ضد تھا۔ نسلی اور قبائلی عصبیتوں کی جڑیں کاٹ کر تمام انسانوں میں اخوّت اور مساوات کے رشتے جوڑنے والا دین ہندو سماج کے ان مقدس بیٹوں کی نگاہ میں ایک عظیم خطرہ تھا جو ذات پات کی تمیز میں اپنا مفاد دیکھتے تھے۔ برہمن بیدار ہو چکا تھا اور وہ اس خطرے کے مقابلے کے لیے ہندوستان کے طول و عرض میں راجپوت حکمرانوں کو جمع اور منظم کر رہا تھا۔ ہندوؤں کی طاقت کے اصلی مراکز وہ سلطنتیں تھیں جو ستلج، گنگا اور نربدا کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ راج پال کی شکستوں نے ان سلطنتوں میں جو ہلچل پیدا کر دی تھی وہ محمود غزنوی کی عقابی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھی۔ ان سلطنتوں کے ساتھ قوّت آزمائی کا فیصد کرنے کے بعد اس کے سامنے اوّلین مسئلہ اپنے راستے میں بٹھنڈہ کی سلطنت کو مسخّر کرنا تھا۔

۳۹۵ھ میں محمود نے ملتان کے قریب دریائے سندھ عبور کر کے بٹھنڈہ کا رُخ کیا۔ بٹھنڈہ کے راجہ باجی رائے کو اپنی قوّت پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے قلعہ بند ہو کر لڑنے کی بجائے شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا۔ تین دن تک اس جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، باجی رائے کو قرب و جوار سے کمک پہنچ رہی تھی اور ہندوؤں کی طرف سے بہادری کا ایسا مظاہرہ محمود نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چوتھے دن باجی رائے کی فوج کے حملے مسلمانوں کو ہر محاذ سے پیچھے ہٹا رہے تھے لیکن محمود نے انہیں غیرت دلائی اور خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر دشمن کی اگلی صفوں پر ٹوٹ پڑا۔ جانبازوں کے گروہ آن کی آن میں اپنے امیر کے دائیں بائیں جمع ہو گئے اور اس کے ساتھ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے قلب تک جا پہنچے۔ محمود کی ایسی شجاعت نے تمام فوج میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ میمنہ اور میسرہ کے نیزہ باز دشمن کے دائیں بائیں بازو پر ٹوٹ پڑے اور دشمن جو اپنی فتح کے متعلق پُر امید ہو چکا تھا، اب تیزی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ غروبِ آفتاب سے قبل باجی رائے میدان چھوڑ کر قلعے میں پناہ لے چکا تھا۔

بٹھنڈہ کے قلعے کی خندق اس قدر بڑی اور گہری تھی کہ کسی حملہ آور کے لیے براہِ راست فصیل پر یلغار کرنا ممکن نہ تھا۔ محمود نے خندق کے ایک حصّے کو درختوں اور پتھروں سے بھر دینے کا حکم دیا۔ باجی رائے کو یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو خندق پھاندنے اور فصیل پر یلغار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ چنانچہ اسی نے مایوسی کی حالت میں ایک رات قلعہ سے بھاگ کر جنگل میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن محمود کے چند دستوں نے جنگل میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ باجی رائے نے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اپنے سینے میں خنجر گھونپ کر خودکُشی کر لی۔ بٹھنڈہ کے قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد محمود نے اس سلطنت کے دور افتادہ مقامات کو فتح کیا۔

اس معرکے سے فارغ ہو کر محمود نے ملتان کے راستے غزنی کا رُخ کیا۔ ملتان کا قرمطی حکمران ابوالفتح داؤد ہندوستان میں محمود غزنوی کی فتوحات کو اپنے لیے کم خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔ دریائے سندھ میں قبل از وقت بارشوں کے باعث شدید طغیانی آ گئی تھی اور اسے عبور کرتے ہوئے غزنوی لشکر کے بہت سے سپاہی لہروں کا شکار ہو گئے۔ اس کے علاوہ ملتان

کے قرمطی حکمران اور ابو الفتح داؤد کی غیر مصلحانہ روش نے محمود کی مشکلات میں اور اضافہ کر دیا۔ ۳۹۶ھ میں محمود نے قرامطہ[1] کے استیصال

---

[1]عباسیوں کے انحطاط کے زمانے میں عالمِ اسلام میں جن فتنوں نے سر اٹھایا ان میں قرامطہ سب سے خطرناک تھے۔ اعتقادات کے لحاظ سے قرامطہ کا اسلام کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ صرف حکومت ہی کے دشمن نہ تھے بلکہ ایک عام مسلمانوں کو بھی گردن زدنی سمجھتے تھے۔ تیسری صدی ہجری کے وسط میں انہوں نے عراق اور شام میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ۲۸۷ھ میں خلیفہ مکتفی نے ان کی سرکوبی کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن قرمطیوں نے اس فوج کو بصرہ کے قریب عبرتناک شکست دی اور سپہ سالار کے سوا کسی کو بھی بچ نکلنے کا موقعہ نہ دیا۔ اس کے بعد وہ پھر شام کی طرف متوجہ ہوئے اور دمشق سے لے کر انطاقیہ تک ہزاروں انسانوں کو قتل کرنے کے بعد ان کے رہنما ذکروی کے ایک بیٹے نے شام پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

خلیفہ نے اپنے مصری جرنیل محمد کی قیادت میں فوج روانہ کی اور اس نے قرمطیوں کو شکست دی۔ ذکروی کا بیٹا مارا گیا لیکن قرمطبوں کے حوصلے نہ ٹوٹے۔ ایک سال کے بعد ذکروی پھر گمنامی کے پردوں سے نمودار ہوا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ اس کی اعانت کے لیے مہدی کو ظہور ہونے والا ہے اور خدا نے اسے کوفہ اور اس کے بعد شام میں فتوحات حاصل کرنے اور اپنے نائب کی حیثیت سے حکومت کرنے کی بشارت دی ہے۔ اس اعلان نے قرمطیوں کے حوصلے پھر تازہ کر دیے اور انہوں نے ایک بہت بڑی تعداد میں عراق پر چڑھائی کر دی۔ کوفہ

سے کچھ دور خلیفہ کی فوج کو پسپا کرنے کے بعد انہوں نے کوفہ اور بصرہ کے درمیان پڑاؤ ڈال دیے اور مکّہ سے حاجیوں کے جو قافلے واپس آرہے تھے، ان کے متوقع راستوں پہ پہرے بٹھا دیے۔ ایک قافلہ کسی بستی کے لوگوں کے انتباہ پر بچ کر نکل گیا۔ اس پر قرمطیوں نے اس بستی کو جلا کر راکھ کر دیا۔ دو قافلے ان کے نرغے میں آگئے اور انہوں نے بیس ہزار انسانوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ بربریت اور وحشت کے اس طوفان نے بغداد پر لرزہ طاری کر دیا۔ خلیفہ نے ایک آزمودہ کار ترک جرنیل کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج روانہ کی۔ دو دن کی لڑائی کے بعد قرامطہ کو شکست ہوئی۔ ذکروی مارا گیا اور یہ فتنہ کچھ دیر کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا۔ لیکن چوتھی صدی کے آغاز میں قرمطی پھر نمودار ہوئے اور ۳۱۱ھ میں انہوں نے اچانک بصرہ پر قبضہ کر کے چند روز تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ بغداد سے حکومت کی افواج کی آمد کی اطلاع پا کر انہوں نے شہر خالی کیا لیکن ہزاروں عورتوں کو لونڈیوں کی حیثیت میں اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے قافلوں پر حملے شروع کر دیے۔ حاجیوں کے ایک قافلے کے سات ہزار آدمی انہوں نے کوفہ کے قریب موت کے گھاٹ اتار دیے اور اچانک کوفہ پر قبضہ کر لیا۔ اور یہاں بھی بصرہ کی تاریخ دہرائی گئی۔

قرامطہ کے نزدیک مسلمان عورتوں اور بچوں کو بھی بدترین عذاب دے کر قتل کرنا ایک کارِ ثواب تھا۔ عراق میں ان کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ دوسرے شہروں کی طرح بغداد کے لوگ بھی اپنے گھروں سے بھاگ کر دریا کے پار پناہ لے رہے تھے۔ چار سال ان وحشیوں نے قتل و غارت جاری رکھی۔ بالآخر بغداد کی فوج نے انہیں شکست دی اور وہ عرب میں پناہ لینے پر مجبور

کے لیے ملتان پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا لیکن آنند پال جس کے ساتھ اس کے تعلقات مصالحانہ نہ تھے، ملتان کے قرمطی حکمران ابوالفتح داؤد کا طرفدار بن گیا اور اس نے محمود کو پشاور کے قریب دریا عبور کرکے اپنی حدود سے گزرنے کی اجازت نہ دی اور اس کا راستہ روکنے کے لیے پیش قدمی کی۔ محمود نے اسے عبرتناک شکست دی اور دریائے چناب تک اس

ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی ان کی بربریت میں کوئی فرق نہ آیا۔ انہوں نے مکّہ معظمہ میں بھی کوفہ اور بصرہ کے مظالم کی یاد تازہ کر دی۔ ان کی درندگی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے خانہ کعبہ میں پناہ لینے والوں کو قتل کرنے سے دریغ نہ کیا۔ شہیدوں کی لاشیں چاہِ زمزم میں پھینکی گئیں۔ قرامطہ خانۂ کعبہ سے حجرِ اسود اٹھا کر لے گئے اور یہ بیس سال تک ان کے پاس رہا۔

ان واقعات کے بعد تمام اسلامی ممالک میں قرمطیوں کے خلاف غصّہ اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور ان کی سرگرمیاں ایک مدّت کے لیے ٹھنڈی پڑ گئیں۔ عراق، شام اور دوسرے ممالک سے جو قرمطی حکومت اور عوام کے انتقام سے خوفزدہ ہو کر بھاگے ان کی جائے پناہ سندھ تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں ملتان پر قرمطیوں کی حکومت تھی۔ عالمِ اسلام کی ہزاروں بستیاں جلانے اور ان گنت انسانوں کو انتہائی بیدردی سے قتل کرنے کے بعد شاید یہی ایک بدنصیب خطّہ تھا جہاں ان جنونیوں کو اپنی سلطنت قائم کرنے کا موقع ملا تھا۔

کا تعاقب کیا۔ آنند پال نے اپنی رہی سہی فوج کے ہمراہ کشمیر کی پہاڑیوں میں جا کر پناہ لی۔ محمود غزنوی نے اس کا تعاقب کرنے کی بجائے ملتان کا رُخ کیا لیکن ابھی اس نے ملتان کے چند سرحدی علاقے فتح کیے تھے کہ اسے خراسان میں الک خان کے حملوں کی مدافعت کے لیے اچانک واپس جانا پڑا۔ محمود نے ملتان میں مکمل فتح پانچ سال کے بعد حاصل کی۔

۴

یہ وہ زمانہ تھا جب وسط ایشیا کے ممالک میں محمود کا تسلط ابھی پوری طرح قائم نہیں ہوا تھا اور اسے قریباً ہر سال کسی نہ کسی قسمت آزما کی سرکوبی کے لیے ایک نئے محاذ پر جانا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ ہندوستان کی تسخیر کا کام جاری نہ رکھ سکا۔ ہر سال شمال کے ممالک اور ہندوستان کی فتوحات اس کی سلطنت کی حدود میں اضافہ کر رہی تھیں لیکن اس نسبت سے اس کی مشکلات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ان دو محاذوں کے درمیان کی پہاڑیوں، میدانوں اور صحراؤں کی وسعتیں حائل تھیں اور محمود کی فوجی قوّت کا بیشتر حصّہ ان وسعتوں میں بکھرا ہوا تھا۔ وہ

دریا سندھ عبور کرتا تو جیحوں کے کنارے کوئی فتنہ جاگ اٹھتا۔ وہ پنجاب کے میدانوں میں پڑاؤ ڈال کر گنگا اور جمنا کا رخ کرنے کا ارادہ کرتا تو مکران سے لے کر خوارزم تک کسی نہ کسی ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے کہ اسے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس جانا پڑتا۔ تاریخ کا کوئی زمانہ اولوالعزم فاتحین کے تذکروں سے خالی نہیں لیکن ایسے شہسوار بہت کم ہوں گے جنہوں نے اپنی زندگی کے بیشتر دن گھوڑے کی پیٹھ پر زمین کی وسعتیں ناپنے میں گزارے ہوں۔ اسے مرمریں ایوانوں کی بجائے جنگ کے میدان پسند تھے۔ اسے پھولوں کی سیج پر سونے کی بجائے چٹانوں کا روندنا مرغوب تھا۔ غزنی کے عقاب کا ذوقِ پرواز ہر نشیمن سے دور رہنا پسند کرتا تھا۔ قدرت نے ایک انسان کے وجود میں ان عناصر کو جمع کر دیا تھا۔ جو ہمیشہ متحرک رہنا پسند کرتے ہیں۔

۵

ملتان سے واپسی کے بعد خراسان میں محمود غزنوی کی مصروفیات کے باعث آنند پال کو اپنی فوجی قوّت از سرِ نو منظم کرنے کا موقع مل گیا۔ اس

نے مسلمانوں کے حملوں کو ایک اجتماعی خطرہ ثابت کر کے پڑوس کے راجاؤں سے مدد کی درخواست کی۔ اس دفعہ شمالی ہندستان کے حکمرانوں نے محمود کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے میں پہلے کی نسبت زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ ایک بہت بڑی فوج آنند پال کے بیٹے برہمن پال کی قیادت میں پشاور کی طرف کوچ کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

سلطان محمود نے ان حالات سے باخبر ہوتے ہی ۳۹۹ھ میں غزنی سے کوچ کیا اور یلغار کرتا ہوا ویہند کے قریب جا پہنچا۔ ایک شدید معرکے کے بعد ہندو فوج میدان چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔ سلطان محمود نے کانگڑہ تک آنند پال کے حلیفوں کی افواج کا تعاقب کیا اور کانگڑہ کے پاس نگر کوٹ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ تین دن کی سخت مدافعت کے بعد اہلِ قلعہ نے ہمّت ہار دی اور سلطان کی فوج قلعہ پر قابض ہوگئی۔ اس قلعے کے اندر دہ مشہور مندر تھا جس کے پجاری نہ صرف ہندو عوام بلکہ شمالی ہند کے راجاؤں سے بھی خارج وصول کرتے تھے۔ مندر کے دروازے کھولے گئے تو وہاں سونے اور چاندی کے انبار لگے تھے۔ برہمنوں کا یہ عشرت کدہ ان گنت

انسانوں کی صدیوں کی محنت کا پھل تھا۔ یہ ان لوگوں کی کمائی تھی جو سماج کے دیوتا کا بوجھ اٹھانے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اس مندر سے سات کروڑ درہم کی مالیت کے سکے اور قریباً سات ہزار من چاندی اور سونا بر آمد ہوا۔ نگر کوٹ کے مندر کی دولت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف قیمتی جواہرات کا وزن بیس من کے قریب تھا۔

سلطان محمود کی واپسی کے بعد آنند پال نے نندنہ کو اپنی راجدھانی بنا کر کوہستانِ نمک کے آس پاس کے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا لیکن وہ جلد ہی مر گیا اور اس کی جبکہ ترلوچن پال تخت نشین ہوا۔ سلطان محمود نے اس خاندان کا رہا سہا اقتدار ختم کرنے کے لیے نندنہ پر حملہ کیا۔ ترلوچن پال نے سلطان کی پیش قدمی کی اطلاع پا کر قلعے کی حفاظت اپنے بیٹے بھیم پال کو سونپ دی اور خود کشمیر کے راجہ کو اپنی اعانت پر آمادہ کرنے کے لیے وہاں کا رُخ کیا۔

بھیم پال نے پہاڑیوں کے درمیان سے نندنہ کے قلعے کی طرف جانے والی تنگ گزر گاہ کو بند کرنے کے لیے ہاتھیوں کی صفیں کھڑی کر دیں اور

سلطان کی فوج کئی دن پے در پے حملوں کے باوجود قلعہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس عرصہ میں کشمیر کے علاوہ جنوبی ہند کی کئی ریاستوں سے بھیم پال کو برابر کمک پہنچتی رہی۔ بالآخر بھیم پال اپنی کمین گاہ سے نکلا اور اس نے کھلے میدان میں سلطان محمود کی افواج پر حملہ کر دیا۔ اس کی فوج کے آگے ہاتھیوں کی قطاریں تھیں لیکن محمود کی صفِ اوّل میں ترکمان دستے تھے جن کے تیروں کی بارش نے ہاتھیوں کے منہ پھیر دیے۔ اس کے ساتھ ہی میمنہ اور میسرہ کے سوا دونوں پہلوؤں سے دشمن کی صفیں درہم برہم کرتے ہوئے عقب تک جا پہنچے۔ بھیم پال ان گنت لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگا۔ اس کے بعد محمود نے نندنہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ میدانِ جنگ میں بھیم پال کی شکست کے باعث قلعے کے محافظوں کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے چنانچہ انہوں نے بلا شرط ہتھیار ڈال دیے۔

نندنہ کی فتح کے بعد سلطان محمود ترلوچن پال کی طرف متوجہ ہوا جس کی اعانت کے لیے کشمیر کی مزید افواج جہلم کے شمال کی وادیوں میں جمع ہو

رہی تھیں۔ کشمیر کے لشکر کا سپہ سالار محمود کے ایک گشتی دستے کو شکست دینے کے بعد اپنی قوّت کے متعلّق سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو چکا تھا لیکن جنگ کے پہلے معرکے ہی میں وہ بدحواس ہو گیا۔ اس نے اپنے لشکر کو دوبارہ منظّم کر کے حملہ آوروں کے سامنے کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی شکست کو فتح میں نہ بدل سکا۔

ان شکستوں کے بعد ترلوچن پال کے آخری مستقر مشرقی پنجاب میں شوالک کی پہاڑیاں تھیں۔ ویہند کی سلطنت کا عملی طور پر خاتمہ ہو چکا تھا۔

نندنہ کا قیدی

نندنہ کے قلعے میں ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے رنبیر کے لیے زندگی اب صبح و شام کے ایک بے کیف تسلسل کے سوا کچھ نہ تھی۔ قید کے ابتدائی ایّام اس کے لیے بے حد تلخ اور صبر آزما تھے۔ وہ ہر وقت فرار ہونے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔ کبھی وہ تصوّر میں جنوبی ہند کے راجاؤں کے بے شمار لشکر کو قلعے پر حملہ کرتے دیکھتا، کبھی خواب کی حالت میں اس کے لیے قلعے کے دروازے کھل جاتے اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سینکڑوں میل دور دریائے گنگا کے کنارے اپنے گاؤں میں پہنچ جاتا اور پھر کبھی یہ دیکھتا کہ وہ اپنے گھر میں ہے اور زمانہ وہی ہے جو چار سال پہلے

تھا۔ اس کے دوست اس کے گرد جمع ہیں۔ وہ ان کے ساتھ تیر اندازی یا تیغ زنی کی مشق کر رہا ہے اور اس کا باپ محل ایک کونے میں کھڑا ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے کمالات کی داد دے رہا ہے۔ شکنتلا اس کی ننھی بہن اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ باغ میں جھولا جھول رہی ہے لیکن حال کے تلخ حقائق ہر بار اس کے حسین خیالوں اور رنگین سپنوں کی دنیا درہم برہم کر دیتے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا رنبیر کا کرب و اضطراب، مایوسی اور بے حسی میں تبدیل ہوتا گیا۔ ایک لامتناہی قید کا بھیانک تصوّر ماضی کی ہر یاد اور مستقبل کی امید پر حاوی ہو چکا تھا۔ رنبیر فوج کے ایک راجپوت سردار موہن چند کا بیٹا تھا۔ قنوج کے حکمران راجیہ پال کے دربار میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اپنی جوانی کے ایّام میں موہن چند نے راجیہ پال کی فوج کے ایک افسر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ جب شمالی سرحد کے ایک با اثر جاگیر دار جے کرشن نے پڑوس کے چند راجاؤں کی شہ پر قنوج کے حکمران کے خلاف بغاوت کی تو اس نے جے

کرشن کی سرکوبی کے لیے موہن چند کو روانہ کیا۔ موہن چند کا حملہ اس قدر اچانک تھا کہ جے کرشن کو اپنے حلیفوں کی طرف سے کوئی مدد نہ پہنچ سکی اور اس نے معمولی جھڑپ کے بعد راہِ فرار اختیار کی اور مہابن کے راجہ کے پاس پناہ گزین ہوا۔ راجیہ پال نے اس کی جاگیر ضبط کرکے اپنے چند سرداروں میں تقسیم کردی۔ اس جاگیر کا ایک بڑا حصّہ اور جے کرشن کا محل موہن چند کو ملے۔ اس عالیشان محل میں موہن چند کی خوشی کے دن بہت مختصر تھے قریباً تین سال کے بعد اس کی بیوی ایک چار سالہ لڑکے رنبیر اور چھ ماہ کی لڑکی شکنتلا کو چھوڑ کر چل بسی۔

یہ دو بچے موہن چند کی تمام آرزوؤں اور تمنّاؤں کا مرکز تھے۔ وہ رنبیر کو راجہ کے بعد قنوج کی سب سے بڑی شخصیت دیکھنے کا متمنّی تھا۔ اور شکنتلا کو کسی سلطنت کی رانی دیکھنا چاہتا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں رنبیر ایک خوبصورت جوان تھا۔ ایک سپاہی کے خصائل اپنے باپ سے ورثہ میں ملے تھے۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہت کم نوجوان ایسے تھے جو اس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتے تھے۔ راجہ

کے کانوں تک فنونِ سپہ گری میں رنبیر کے کمالات کی خبریں پہنچیں تو اس نے اسے بلا کر محل کے محافظ دستے کا افسرِ اعلیٰ بنا دیا۔

اپنے بچوں کے متعلق موہن چند کے سپنوں کی تعبیر کے دن قریب آ رہے تھے لیکن پنجاب میں محمود غزنوی کی فتوحات کے باعث جو اضطراب ہندوستان کے راجاؤں، سرداروں اور پنڈتوں کے دِلوں میں پیدا ہو رہا تھا، وہ آئے دن بڑھ رہا تھا۔ دھرم کی رکھشا کے لیے قنوج کے جن با اثر لوگوں نے ترلوچن پال کی حمایت کے لیے آواز اٹھائی ان کے ساتھ موہن چند بھی شامل تھا۔ قنوج کا حکمران اپنی ہمسایہ ریاستوں کی دیکھا دیکھی ترلوچن پال کی مدد کے لیے ایک ہزار سپاہی بھیجنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب ان سپاہیوں کی قیادت کا مسئلہ پیش آیا تو راجہ کی نگاہ رنبیر پر پڑی۔ موہن چند خود اس مہم میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن جوڑوں کے درد کے باعث اسے رکنا پڑا۔

قنوج سے روانہ ہوتے وقت رنبیر کی عمر کوئی بیس سال تھی اور اس کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ جب راجہ کے دربار کے نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر

یہ مژدہ سنایا کہ تم نندنہ سے فتح کے پھریرے اُڑاتے ہوئے واپس آؤ گے تو رنبیر نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم نندنہ نہیں غزنی جا رہے ہیں۔“ اس پر جب ایک بوڑھے سپاہی کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ غزنی بہت دور ہے تو رنبیر کے باپ کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا اور اس نے چلّا کر کہا ”غزنی دور نہیں تم ہی بے غیرت ہو گئے ہو۔“

قنوج کی سرحد عبور کرنے سے پہلے رنبیر اپنی بستی سے گزرا۔ جب وہ اپنے محل کے قریب پہنچا تو شکنتلا بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔ اس نے جلدی سے رنبیر کی کمر کے ساتھ لٹکا ہوا خنجر نکالا اور اس کی نوک سے اپنے ہاتھ کی انگلی چیر کر اس کی پیشانی پر خون کا تلک لگا دیا اور اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”بھیا! دیوتا تمہاری رکھشا کریں۔ جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔“ رنبیر نے کہا ”میں بہت جلد آ جاؤں گا لیکن میری ننھی بہن نے یہ بتایا ہی نہیں کہ میں آتی دفعہ اس کے لیے کیا لاؤں۔“

”کچھ نہیں۔ ایک بہن کو اپنے بھائی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔“ ان الفاظ کے ساتھ شکنتلا کی کٹورے جیسی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو ٹپک

پڑے۔ رنبیر نے ایک ثانیہ توقف کے بعد کچھ کہے بغیر گھوڑے کی باگ موڑ لی۔

۲

نندنہ کی جنگ میں بھیم پال کی مدد کے لیے قنوج کے علاوہ جنوبی ہند کی کئی اور ریاستوں نے بھی امدادی دستے بھیجے تھے۔ اپنی اپنی ریاست کے سپاہیوں کے جوہر دیکھنے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے برہمنوں کی ٹولیاں بھی ان کے ساتھ آئی تھیں اور ان میں سے کئی برہمن میدانِ کارزار میں ہندو دھرم کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کا جوش و خروش زندہ رکھنے کے لئے اپنے ساتھ مورتیاں بھی لے آئے تھے۔ چنانچہ نندنہ کے قلعے میں جو چیز سب سے زیادہ ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھیں، وہ ان دیوتاؤں کی مورتیاں تھیں جن کی کرامات کے افسانے بیان کر کے برہمنوں نے سماج کے بیٹوں کو یقین دلایا تھا کہ ان کی موجودگی میں مسلمان سپاہی نندنہ کے قلعہ میں پاؤں رکھتے ہی بھسم ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب قلعہ سے باہر ایک کھلے میدان میں بھیم پال اور محمود غزنوی

کی قیادت میں لڑنے والی افواج مردانگی کے جوہر دکھارہی تھیں تو برہمن قلعہ کی چار دیواری کے اندر ناقوس اور گھنٹیاں بجا کر اپنے دیوتاؤں کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ مدافعانہ قوّت جو ان سونے چاندی اور پتھر کی مورتیوں میں پوشیدہ تھی بروئے کار نہ آئی۔

میدان میں شکست کھانے کے بعد بھیم پال کے فوج کے بعض دستوں نے قلعے میں پناہ لینے کی کوشش کی اور باقی فوج اِدھر اُدھر منتشر ہو گئیں۔ بعض راجاؤں اور سرداروں نے اپنی اپنی فوج کو از سرِ نو منظّم کر کے جوابی حملہ کیا لیکن بھیم پال کے فرار ہو جانے سے ہندوستانی سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے اور وہ کسی جگہ جم کر لڑائی نہ کر سکے۔ غزنی کے شہسواروں کے طوفانی حملوں نے انہیں پھر ایک بار میدان سے دھکیل کر آس پاس کی پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ سلطان نے اپنے لشکر کا ایک حصّہ ان لوگوں کے تعاقب کے لیے چھوڑ دیا اور باقی فوج کے ساتھ آگے بڑھ کر نندنہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

دوپہر کے قریب ایک طرف سلطان کی فوج کے سوار اور پیادہ دستے قلعے کی ارد گرد پہاڑیوں اور وادیوں میں میلوں تک بکھرے ہوئے دشمن کا تعاقب کر رہے تھے اور دوسری طرف قلعے کی مکمل ناکہ بندی ہو چکی تھی۔

رنبیر زخمی ہونے کے باوجود آخری وقت تک میدان میں ڈٹا رہا۔ جب میدان خالی ہونے لگا تو اس نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ ایک ٹیلے پر پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن تھوڑی دیر میں دوسروں کی دیکھا دیکھی قنوج کے سپاہی بھی بھاگ نکلے۔ رنبیر کے ساتھ صرف پندرہ جاں نثار رہ گئے۔ فاتح لشکر نے جو بھاگتے ہوئے دشمن کی بڑی بڑی ٹولیوں کا دور دور تک پیچھا کر رہا تھا، ان مٹھی بھر سرفروشوں کو اہمیّت نہ دی۔ ترک اور افغان سواروں کے کئی دستے آئے اور اس ٹیلے سے کترا کر آگے نکل گئے۔ بالآخر سلطان کی فوج کے ایک دستے نے ٹیلے کا محاصرہ کر لیا۔ رنبیر کے ساتھی اپنی کمانیں سیدھی کر کے پتھروں کی آڑ میں بیٹھ گئے لیکن ٹیلے کا محاصرہ کرنے والے سپاہی چوٹی پر یلغار کرنے کی بجائے اطمینان سے چاروں

طرف کھڑے تھے۔

رنبیر نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "بھائیو! ہمارے لیے یہاں سے بچ نکلنا آسان نہیں لیکن سورج غروب ہونے والا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر اور مقابلہ کر سکیں تو ممکن ہے رات کی تاریکی میں سے بعض کو جان بچا کر بھاگنے کا موقع مل جائے۔ اس ٹیلے کی چوٹی سے حملہ کرنے والے دشمن پر ہمارا کوئی تیر رائیگاں نہیں جائے گا اور دشمن اتنا بے وقوف نہیں کہ اپنی فتح کے بعد صرف چند آدمیوں کو قتل یا گرفتار کرنے کے شوق میں اپنے کئی سپاہیوں کی جانیں خطرے میں ڈالنے پر آمادہ ہو جائے۔ اور اگر وہ ایسا کرنے کے لیے تیار بھی ہو تو ایک راجپوت کے لیے دھرم کے دشمنوں کی قید میں چلے جانے کی بجائے موت کہیں بہتر ہے۔ میں اپنے ان ساتھیوں کو بزدلی کا طعنہ نہیں دیتا جو ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ لیکن وہ بیوقوف ضرور تھے۔ دشمن نے ہماری شکست کے آثار دیکھتے ہی اپنے محفوظ دستوں کے تازہ دم سواروں کو چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ اس وقت تک ان میں سے اکثر اگر قتل نہیں ہو چکے تو قید ضرور ہو

گئے ہوں گے۔ دُشمن ان کے فرار ہونے سے بہت پہلے قلعے کے دروازوں تک پہنچ چکا تھا۔ کاش وہ سورج غروب ہونے تک ہمارا ساتھ دیتے۔"

تھوڑی دیر بعد محاصرہ کرنے والے گھوڑوں سے اُتر کر پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ رنبیر کے ساتھیوں نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا اور اس نے مغموم لہجے میں کہا "معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کو ہمارا بچ نکلنا منظور نہیں۔ لیکن وہ ہمیں بہادری کی موت سے محروم نہیں کر سکتے۔ اپنے مورچوں میں ڈٹے رہو اور اس وقت تک انتظار کرو جب تک کہ وہ ہمارے تیروں کی زد میں نہ آجائیں؟"

کسی نے ٹیلے کی چوٹی سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ایک پتھر کی اوٹ سے سر نکالا اور ہندی زبان میں بلند آواز میں کہا "تم اگر جانیں بچانا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال کر نیچے آجاؤ۔"

اس کے جواب میں رنبیر کی کمان سے ایک سنسناتا ہوا تیز نکلا لیکن بولنے والے نے اچانک اپنا سر پتھر کے پیچھے چھپا لیا۔ محاصرہ کرنے والوں نے

چاروں طرف سے تیروں کی بارش شروع کر دی۔ اتنے میں رنبیر اور اس کے ساتھیوں کو ہتھیار ڈال دینے کی ترغیب دینے والا اجنبی تیزی کے ساتھ پتھروں کی آڑ لیتا ہوا پندرہ بیس گز اور اوپر آ گیا اور بلند آواز میں بولا۔ ”تم میری توقع سے زیادہ بیوقوف ثابت ہوئے ہو لیکن میں تمہیں ایک بار پھر سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔“ اس مرتبہ اس نے اپنا سر پتھر کی آوٹ سے نکالنے کی کوشش نہ کی۔ ہندی زبان میں اس کا لب و لہجہ یہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ یا تو اس ملک کا باشندہ ہے اور یا اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ اس ملک میں گزارا ہے۔ رنبیر اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے کہا۔ ”میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ ہم سورج غروب ہونے سے پہلے اس ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ جائیں گے۔ اگر تم خودکُشی پر آمادہ نہیں ہو چکے تو ہتھیار ڈال دو، میں تمہاری جان بچانے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ ممکن ہے کسی دن تم اپنے گھر بھی جا سکو۔“

رنبیر اور اس کے ساتھیوں کے لیے بظاہر یہ الفاظ سراب تھے لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس سراب کی دلکشی ان کے تصورات پر چھا گئی۔ کسی دن

آزاد ہو کر اپنے گھروں کو دوبارہ دیکھنے کی موہوم امید نے مایوسی کی تاریکیوں میں وہ چراغ روشن کر دیے جن کی روشنی میں انہیں موت کا چہرہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بھیانک نظر آنے لگا۔ اس کو ان کی بازگشت انہیں سینکڑوں کوس کے فاصلے پر سنائی سے رہی تھی۔ ان کے والدین، ان کے بال بچے، ان کے دوست اور عزیز سب یہ کہتے ہوئے سنائی دے رہے تھے "ممکن ہے کہ تم کسی دن ہمیں دیکھ سکو۔"

بولنے والا دیر تک خاموش رہا۔ اچانک رنبیر کا ایک ساتھی ہتھیار پھینک کر اٹھا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے ٹیلے سے اترنے لگا۔ ایک ثانیہ توقّف کے بعد تین اور اس کے پیچھے چل دیے۔ باقی رنبیر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔ تم میں سے جو چاہے جا سکتا ہے۔ میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں۔"

چار آدمی اور اٹھ کر چل دیے۔ ان میں سے ایک قدم چلنے کے بعد مڑ کر رنبیر کی طرف دیکھا اور کہا، "ممکن ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولتا ہو۔ وہ ہماری زبان بولتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ان راجپوتوں میں سے ہو جو دشمن کے

ساتھ مل چکے ہیں اور اس کا مقصد ہماری جانیں بچانا ہو۔“

رنبیر کرب انگیز لہجے میں چلّایا۔ ”بھگوان کے لیے جاؤ، مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔“ اور وہ بھاگ کر دوسروں کے ساتھ جا ملا۔ ٹیلے پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر پتھر کی اوٹ سے آواز آئی۔ ”سورج غروب ہونے والا ہے۔ میں تمہیں تھوڑی دیر اور سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ بہادری اور حماقت میں بہت فرق ہے۔“

تھوڑی دیر اور جب رنبیر کے باقی ساتھیوں میں سے کسی نے جنبش نہ کی تو خطاب کرنے والے نے کہا۔ ”میں تنہا اوپر آتا ہوں اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم میرا راستہ نہیں روک سکو گے۔“

ایک دراز قامت انسان پتھر کی آڑ سے نکل کر اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا ٹیلے کی چوٹی کی طرف بڑھنے لگا۔ رنبیر نے اس کی طرف کمان سیدھی کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہ دھوکا ہے۔ وہ تنہا اوپر نہیں آئے گا۔ تم چاروں طرف خیال رکھو۔“ لیکن انہیں کسی طرف سے حملے کے آثار دکھائی نہ دیے۔ محاصرہ کرنے والوں میں سے بعض پتھروں کی

آڑ سے نکل کر اپنی جگہ اطمینان سے کھڑے چوٹی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رنبیر کے ساتھی بھی جو ہتھیار پھینک کر نیچے اترے تھے، اُن کے قریب جا کر اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بلند قامت آدمی کوئی پندرہ قدم آگے بڑھا تھا کہ رنبیر اپنے مورچے سے نکلا اور اس کی طرف کمان سیدھی کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے جواب میں نیچے سے کئی آدمیوں نے رنبیر کی طرف اپنی کمانوں کا رُخ پھیر دیا لیکن بلند قامت آدمی نے جلدی سے ان کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں تیر چلانے سے منع کر دیا۔ پھر وہ رنبیر کی طرف متوجہ ہوا اور چوٹی کی طرف اس کے پاؤں اسی وقار اور تمکنت کے ساتھ اٹھنے لگے۔ اس کے قد و قامت کی طرح اس کا چہرہ بھی جاذبِ نگاہ تھا۔ تیکھے نقوش، سیاہ اور چمک دار آنکھیں، کشادہ پیشانی، جرأت، اولوالعزمی اور عالیٰ ظرفی کی شہادت دے رہے تھے۔ اس کا انداز فاتحانہ تھا لیکن اس کی مسکراہٹ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے مفتوح کو قتل کرنے کے لیے نہیں بلکہ سینے سے لگانے جا رہا ہے۔ رنبیر کے ساتھی مبہوت ہو کر اس کی

طرف دیکھ رہے تھے۔ رنبیر نے تیر کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہمّت جواب دے گئی۔ اس نے دو تین قدم پیچھے ہٹ کر دوبارہ تیر کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ساتھی بھاگ کر اس کے آگے کھڑا ہو گیا اور چلّایا۔ ’’نہیں، رنبیر نہیں۔‘‘

اجنبی نے کہا۔ ’’تمہاری شکل و صورت کے نوجوان کو زندگی سے اس قدر بے زار نہیں ہونا چاہیے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک تمہارے کانوں میں کسی کی آواز نہ پہنچی ہو اور تمہارے دل میں کسی سے دوبارہ ملنے کی امید پر زندہ رہنے کی خواہش پیدا نہ ہوئی ہو؟‘‘

رنبیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ہاتھ سے کمان گر چکی تھی۔ وہ سینکڑوں میل دور سے کسی کے یہ الفاظ سن رہا تھا۔ ’’بھیّا! دیوتا تمہاری رکھشا کریں۔ جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔ ایک بہن کو اپنے بھائی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔‘‘

’’تم زخمی ہو۔‘‘ دراز قامت آدمی نے رنبیر کی خون سے بھیگی ہوئی آستین دیکھ کر کہا۔ رنبیر کی خاموشی پر اس نے آگے بڑھ کر رنبیر کا ہاتھ پکڑ لیا اور

اطمینان سے اس کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد اس پر اپنا رومال باندھتے ہوئے کہا۔ "جوانی میں ایسے زخم بہت جلد مندمل ہو جاتے ہیں لیکن تمہیں تھوڑی بہت احتیاط ضرور کرنی چاہیے۔" اتنی دیر میں چند اور سپاہی اوپر پہنچ گئے اور انہوں نے اپنے سالار کے اشارے پر رنبیر کے دو اور ساتھیوں کے زخموں پر پٹیاں باندھ دیں۔

ان کا یہ سلوک رنبیر اور اس کے ساتھیوں کی توقع کے برعکس تھا۔ ان کی پریشان نگاہیں اپنے دشمنوں کے چہروں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھیں کہ اب کیا ہو گا؟ ٹیلے کے ارد گرد کوسوں دور تک گرد و غبار کے بادل یہ ظاہر کر رہے تھے کہ ابھی شکست خوردہ لشکر کی منتشر ٹولیوں کا تعاقب جاری ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ سات آدمی قیدیوں کی حیثیت سے نیچے اترے اور اپنے ان رفیقوں کے ساتھ جا ملے جنہوں نے ہتھیار ڈالنے میں سبقت کی تھی۔

سالار نے اپنے چند ساتھیوں کو حکم دیا کہ قیدیوں کو حفاظت سے پڑاؤ میں لے جائیں اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر باقی سپاہیوں کے ہمراہ ایک

طرف چل دیا۔

"یہ کون تھا؟" رنبیر بار بار اپنے دل سے اس سوال کا جواب پوچھ رہا تھا۔

پڑاؤ کی طرف جاتے ہوئے قیدی اپنے پہریداروں میں سے بعض کو ہندی میں باتیں کرتے ہوئے سن رہے تھے۔ ایک سپاہی نے کہا۔ "اس شکست کے بعد ہندوستان کے تمام راجاؤں کو یقین ہو جانا چاہیے کہ اب وہ ہند کے حکمرانوں کو مدد دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب ترلوچن پال اور اس کے بیٹے کے لیے پنجاب میں کوئی جگہ نہیں رہی۔"

دوسرا بولا "لیکن مجھے یقین ہے کہ برہمن اس ملک کے باشندوں کو آخری وقت تک لڑائیں گے۔ ترلوچن پال اگر ختم بھی ہو جائے تو کئی اور راجے میدان میں آجائیں گے۔"

تیسرے نے کہا "لیکن مجھے یقین ہے کہ اس جنگ میں کسی برہمن کو خراش تک نہیں آئی ہو گی۔ انہوں نے قلعے کے اندر کئی مورتیاں جمع کی تھیں اور کی دنوں سے انہیں جگانے کے لیے گھنٹیاں اور ناقوس بجا رہے

تھے لیکن تم دیکھو گے کہ نگر کوٹ کی طرح اس قلعہ کو چھوڑ کر بھاگتے ہوئے بھی وہ ان مورتیوں کا خیال تک نہیں کریں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اب تک قلعہ چھوڑ کر بھاگ نہیں گئے ہوں گے؟" سپاہی یہ کہہ کر رنبیر کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کا وطن کہاں ہے؟"

رنبیر کی خاموشی پر اس کے ایک عمر رسیدہ ساتھی نے جواب دیا "ہمارا وطن قنوج ہے۔"

سپاہی بولا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں قنوج بھی جانا پڑے گا۔"

ایک ترک نے جو باقی سپاہیوں کا افسر معلوم ہوتا تھا ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ "تمہیں قیدیوں سے مذاق کرنے کی اجازت نہیں۔"

سپاہی نے جواب دیا۔ "یہ مذاق نہیں، میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ جنگیں جو ہمارے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی ہیں، گنگا اور جمنا کی وادیوں میں لڑی جائیں گی۔ وہاں

کے لوگ ہماری نسبت زیادہ مظلوم ہیں۔ اگر سلطان محمود قدرت کی طرف سے مظلوم لوگوں کی پکار کا جواب ہے تو وہ وہاں ضرور جائے گا۔"

اگر ایسی باتیں کوئی ترکی، ایرانی یا افغانی کرتا تو رنبیر شاید اس قدر متاثر نہ ہوتا لیکن ایک ہندوستانی کے منہ سے یہ الفاظ رنبیر کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ تاہم انتہائی بے بسی کے احساس نے اسے زبان ہلانے کی اجازت نہ دی۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا "بھگوان کرے کہ ایسے نادان دوستوں کے مشورے محمود کے دل میں گنگا اور جمنا کی وادیوں کی فتوحات کا شوق پیدا کر دیں اور دیوتاؤں کی مقدس دھرتی پر پاؤں رکھتے ہی وہ یہ محسوس کرے کہ بھیڑوں کے شکار کا شوق اسے شیروں کے کچھار میں لے آیا ہے۔" تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے گرد و پیش کو فراموش کر کے اس دن کا تصوّر کر رہا تھا جب گنگا جمنا کے کنارے وسطی ہندوستان کے راجپوت حکمرانوں کی ان گنت افواج محمود کے مقابلے میں کھڑی ہوں گی اور ان کی اگلی صفوں میں صرف ہاتھیوں کی تعداد اس قدر ہو گی کہ دشمن دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلے گا اور یہ لوگ جو آج دشمن کی فتوحات سے

مرعوب ہو کر اس کے ساتھ مل گئے ہیں اور اپنے دیوتاؤں کا مذاق اڑانے سے بھی دریغ نہیں کرتے، محمود کی شکست یقینی سمجھ کر جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہمارے ساتھ آملیں گے۔

ہندی سپاہی کے خلاف رنبیر کا غم و غصّہ نفرت اور حقارت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نندنہ کا قلعہ فتح ہونے کے بعد تمام قیدی پڑاؤ سے وہاں منتقل کر دیے گئے۔ اور محمود کی فوج نے کشمیر کا رُخ کیا۔ رنبیر کو قید ہونے کے بعد چند دن تک محمود کی فوج کے اس افسر کے متعلق جستجو رہی جو اپنی شکل و شباہت اور جرأت و ہمّت کے باعث اس کے دل پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گیا تھا لیکن وہ اسے دوبارہ نظر نہ آیا۔

۳

رنبیر نے ایک قیدی کی حیثیت سے چار سال نندنہ کے قلعے میں گزار دیے اور اس عرصے میں وہ ہندوستان کے مختلف حصّوں اور ہندوستان سے دور شمال کے ممالک میں محمود کی فتوحات کی خبریں سنتا رہا۔

قلعہ میں قیدیوں کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی۔ بہت سے ایسے تھے جو مسلمان علما کی تبلیغ کے باعث اسلام قبول کر کے آزادی حاصل کر چکے تھے۔ بعض ایسے تھے جنہیں فدیہ دے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جو عمر رسیدہ مفلس یا نادار تھے انہیں کسی معاوضہ یا شرط کے بغیر رہا کر دیا گیا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد آزاد ہونے والے قیدیوں کی اکثریت یہ سمجھ کر کہ ہندوستان میں صرف اسلام کی فتح ان کے مستقبل کی ضامن ہو سکتی ہے، محمود کی فوج میں شامل ہو چکی تھی۔

چوتھے سال نندنہ کے قلعے میں صرف ڈیڑھ سو ایسے قیدی باقی رہ گئے تھے جو ابھی تک اپنے مذہب پر قائم تھے اور جنہیں صاحبِ حیثیت ہونے کے باوجود فدیہ ادا کرنے کی شرط پر آزادی حاصل کرنا منظور نہ تھا۔

رنبیر کی طرح یہ لوگ اس دن کے منتظر تھے جب ہندوستان کے جنوبی اور مشرق سے بیسیوں راجاؤں کی ان گنت افواج مسلمانوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھیں گی اور وہ قلعے کے دروازے کھول کر ”دھرم کی جے“ کے

نعرے لگاتے ہوئے ان کے ساتھ جا ملیں گے اور پھر غزنی ہی نہیں بلکہ وسط ایشیا تک ان لوگوں کا تعاقب کیا جائے گا۔"

یہ قلعہ ان قید خانے کی بجائے غزنی کے لشکر کے لیے اگلی چوکی کا کام دے رہا تھا۔ فالتو گھوڑے اور ہاتھی یہاں رکھے جاتے تھے۔ جن زخمیوں کو زیادہ دیر آرام کی ضرورت ہوتی، وہ بھی اس قلعے میں بھیج دیے جاتے تھے۔ اگر کوئی ایسا راجہ یا با اثر سردار میدانِ جنگ میں قید ہو جاتا جسے کسی زیادہ محفوظ مقام پر رکھنے کی ضرورت محسوس کی جاتی تو اُسے اس قلعے میں بھیج دیا جاتا۔

محمود کی تازہ فتوحات کے متعلق رنبیر کے کانوں تک جو خبریں غیر ملکی یا ہندوستان کے نو مسلم سپاہیوں کی وساطت سے پہنچتی تھیں وہ ان پر اعتماد کرنے کا عادی نہ تھا لیکن جب کوئی نیا قیدی ان اطلاعات کی تصدیق کرتا تو وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتا۔

قید سے چند ماہ بعد جب اس قلعے میں قیدیوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی، رنبیر نے خبر سنی کہ محمود نے ڈیرہ گوپی پور کے راجہ کو شکست دینے

کے بعد تھانیسر کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ وہ اس خبر پر سراسیمہ ہونے کی بجائے خوش تھا۔ قیدیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے تھانیسر کے مندر میں چکر سوامی کے بُت کی کرامات کے ان گنت افسانے نہیں سُنے تھے۔ وہ آپس میں یہ کہا کرتے کہ محمود کو اس کی موت نے تھانیسر کی طرف بلایا ہے۔ مسلمانوں کی فوج چکر سوامی کے مندر کے قریب پہنچے ہی تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ خبر سنتے ہی بہت سے قیدی اس عالمِ دین کے گرد جمع ہو گئے جو انہیں ہر روز اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ ایک قیدی نے کہا۔ ”آپ کہتے تھے کہ ہمارے دیوتا مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، لیکن آپ کے بادشاہ نے اب تک صرف ہمارے چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی مورتیاں توڑی ہیں۔ اب وہ ایسی جگہ جا رہا ہے جہاں سے ہمارے دھرم کا کوئی دشمن زندہ بچ کر واپس نہیں آسکتا اور اگر آپ کے خدا نے اسے چکر سوامی کے غصّے سے بچا لیا تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔“

اسلام کے مبلغ نے مسکرا کر جواب دیا ”تم چکر سوامی کے بت کو خدا کا شریک بناتے ہو لیکن چند دن تک تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ

صرف پتھر کا ٹکڑا ہے۔"

چند دنوں کے بعد تھانیسر کے راجہ کا ایک رشتہ دار جنگی قیدی کی حیثیت سے اس قلعہ میں لایا گیا اور اس نے یہ بتایا کہ مسلمان چکر سوامی کے بت کو مندر سے اٹھا کر لے گئے ہیں تاکہ غزنی کے چوراہوں پر اس کی نمائش کی جائے، تو بہت سے قیدیوں نے کلمۂ توحید پڑھ لیا۔ لیکن رنبیر ان لوگوں میں سے تھا جو دیوتاؤں کی کرامت پر شبہ کرنے کی بجائے ان کے پجاریوں کو بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیتے تھے۔

پھر وہ دن آئے جب محمود غزنوی کی افواج گنگا اور جمنا کی وادیوں میں گھوڑے دوڑا رہی تھیں اور رنبیر آئے دن اُن کی کامیابیوں کی تازہ خبریں سنتا اور اس کا یہ یقین متزلزل ہو رہا تھا کہ دیوتاؤں کی اس مقدس زمین کے پہریداروں کی ہمّت و غیرت محمود غزنوی کی فتوحات کے سیلاب کا رُخ پھیر دے۔ اُسے توقع تھی کہ سرسوا کا راجہ آخری دم تک لڑے گا لیکن وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اسے بارن [۲] کے راجہ ہروت سے امید

---

[۲] موجودہ بلند شہر

تھی کہ وہ دیوتاؤں کا نام بلند کرے گا لیکن اس نے اپنے ایک لاکھ رفقا کے ساتھ کلمۂ توحید پڑھ لیا۔

پھر جب مہابن کا حکمران کل چند محمود غزنوی کے مقابلہ پر آیا تو رنبیر نے اپنی توقعات اس کے ساتھ وابستہ کر لیں۔ لیکن چند دن کے بعد یہ خبر آئی کہ کل چند نے چاروں طرف سے محصور ہونے کے بعد خود کشی کر لی ہے۔

مہابن کی فتح کے بعد محمود غزنوی متھرا کی طرف بڑھا۔ چند دن کے بعد رنبیر نے سنا کہ متھرا نے اپنے سوئے ہوئے دیوتاؤں کو جگانے کی ناکام کوشش کے اور ہتھیار ڈال دیے ہیں اور مختلف مندروں سے پانچ سو سونے کی اور دو سو چاندی کی مورتیاں جو صدیوں سے اپنی تقدیس کا خراج وصول کر رہی تھیں ان لوگوں کے قبضے میں آ گئی ہیں، جو صرف ان کے وزن سے ان کی قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اور پھر اس خطّۂ زمین کی باری آئی جس کا ہر ذرّہ رنبیر کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ چار سال قبل وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ جو قنوج جائے گا وہ واپس نہیں آ سکتا۔ قنوج کے راجپوت پنجاب کے راجپوتوں سے

مختلف ہیں۔ وہ دشمن کا راستہ روکنے کے لیے اپنی لاشوں کی دیواریں کھڑی کر دیں گے۔ وہ اپنے دیوتاؤں کو چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے بلکہ ان کے قدموں میں اپنی جانیں دے دیں گے۔ لیکن اب اس کے احساسات مختلف تھے۔ گزشتہ چار سال کے واقعات کے پیشِ نظر وہ انتہائی اضطراب اور بے چینی کے بغیر قنوج کے متعلق نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ صبح و شام دُعا مانگا کرتا تھا "میرے وطن کے مقدس دیوتاؤ! میری قوم کی رکھشا کرو۔" اور جب اس نے سنا کہ قنوج فتح ہو چکا ہے اور راجہ میدان چھوڑ کر باری کی طرف بھاگ گیا ہے تو دنیا اس کی نگاہوں میں تاریک ہو گئی۔ شام کے وقت جب قلعے کے پہرے دار قنوج کی فتح کی خبر سُن کر مسرّت کے نعرے بلند کر رہے تھے وہ ایک کونے میں بیٹھا اس کمسن بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا جس کے تمام کھلونے ٹوٹ چکے ہوں۔

اس کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے آسی کے راجہ چندر پال اور سرداکے راجہ چندر رائے کی شکستوں کی خبریں سنیں لیکن اب اسے ان خبروں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ قنوج کی شکست کے بعد کسی کی ہار جیت اس کے

لیے بے معنی تھی۔ اب اس کی تمام دلچسپیاں اپنے بوڑھے باپ اور کمسن بہن کی یاد تک محدود ہو کر رہ گئیں تھیں۔ "وہ کہاں ہیں؟ وہ کس حال میں ہیں؟ قنوج کی فتح کے بعد ان پر کیا گزری ہو گئی؟" وہ صرف ان سوالات کے جواب جاننا چاہتا تھا۔

۴

قرب وجوار کے بعض ہندو اور نو مسلم قیدیوں کے حالات دریافت کرنے قلعے میں آیا کرتے تھے۔ قیدیوں کو ان لوگوں کی وساطت سے اپنے عزیز واقارب کو پیغام بھیجنے کی اجازت بھی تھی۔ قیدیوں کے رشتے دار ان کے متعلق اطلاع پا کر آتے اور ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں آزاد کرا لیتے۔ چھ ماہ قبل رنبیر کے پانچ ساتھیوں کے رشتہ دار فدیہ ادا کر کے انہیں رہا کرا چکے تھے۔ تین مسلمان ہو جانے کے باعث رہا ہو چکے تھے اور چار کو اس لئے چھوڑ دیا گیا تھا کہ ان کا فدیہ ادا کرنے والا کوئی نہ تھا۔

رنبیر کے لیے فدیہ ادا کرنا معمولی بات تھی لیکن وہ ایک شکست خوردہ سپاہی کی حیثیت سے گھر لوٹنا ایک راجپوت کی غیرت کے منافی سمجھتا تھا۔

اس نے اس امید پر قید کو ترجیح دی کسی دن اس کے وطن کے سپاہی دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں گے۔ اپنے باپ کے نام اس نے اپنے رہا ہونے والے ساتھی کو صرف یہ پیغام دیا تھا کہ میرا فدیہ ادا کرنے کی بجائے یہ بہتر ہو گا کہ آپ اپنی دولت سے قنوج کی فوج میں چند سپاہیوں کا اضافہ کر دیں۔

لیکن اپنے راجہ کے فرار ہونے کی خبر سن کر اس کی دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے تصورات کے پہاڑ تنکوں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھے۔ اس کا پیغام سن کر اس کا باپ یقیناً خوش ہوا ہو گا اور اس نے اسی وقت راجہ کے پاس جا کر کہا ہو گا "مہاراج! اپنے بیٹے کی خواہش پر آپ کی فوج کے لیے اتنے ہاتھی، اتنے گھوڑے اور اتنی تلواریں پیش کرتا ہوں۔ میرا بیٹا فدیہ دے کر یہاں آنے کی بجائے نندنہ کے قلعے کے دروازے پر آپ کا استقبال کرنا چاہتا ہے۔" لیکن اب شاید میری طرح اس کی دنیا بھی بدل چکی ہو گی۔ وہ اپنے دل میں بار بار یہی کہتا ہو گا۔ "مجھے قنوج یا اس کے حکمران سے کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے اس بات سے کوئی

سروکار نہیں کہ دیوتاؤں کی مورتیوں کا مقام قنوج کے مندر رہیں یا غزنی کے بازاروں کے چوراہے۔ مجھے صرف اپنا بیٹا چاہیے۔"

کبھی کبھی دیوتاؤں کی طاقت و عظمت کے متعلّق رنبیر کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگتے لیکن اس کا ضمیر فوراً پکار اُٹھتا۔ "نہیں رنبیر، تمہیں دیوتاؤں کے متعلّق ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہیں۔ وہ صرف اپنے پجاریوں کا امتحان لے رہے ہیں۔ وہ ضرور بیدار ہوں گے اور دھرم کی رکھشا کریں گے۔ محمود نے صرف ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں کو شکست نہیں دی بلکہ ان دیوتاؤں کو للکارا ہے جو زمین پر بھگوان کی مرضی پوری کرتے ہیں اور بھگوان کی مرضی یہ نہیں ہو سکتی کہ اس کے دیوتاؤں کی مورتیوں کی تضحیک کرنے والے اس پوتر دھرتی پر دیر تک من مانی کرتے رہیں۔ اس زمین سے کسی دن یقیناً وہ عظیم الشان قوّت نمودار ہو گی جو ان دیوتاؤں کی مورتیوں کے ساتھ کھیلنے والے گستاخ ہاتھوں سے تلوار چھین لے گی اور تمہیں اس دن کا انتظار کرنا چاہیے۔" اس قسم کے خیالات سے رنبیر کے دل کو قدرے تسکین ہو جاتی اور وہ انتہائی عجز و

انکسار سے دعا کرتا۔ ”میرے بھگوان اور میرے بھگوان کے دیوتاؤ! مجھے ہمّت دو کہ میں انتہائی مصیبت میں بھی اپنے دھرم پر قائم رہ سکوں۔ میرے ڈگمگاتے ہوئے یقین کو سہارا دو۔“

لیکن ایسی دعاؤں کے بعد اس کے دل کی تسکین کے لمحات بہت مختصر ہوتے۔ گنگا اور جمنا کے میدانوں میں محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد رنبیر کی حالت اس شخص کی سی تھی جو طوفان میں کھڑا ہو کر چراغ روشن کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ قیدی جنہوں نے چار سال تک انتہائی صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا تھا، ان فتوحات کے بعد دیوتاؤں سے بد دل ہو چکے تھے۔ چوبیس قیدیوں نے متھرا کی تسخیر کی خبر سنتے ہی کلمۂ توحید پڑھ لیا تھا۔ باقی قیدیوں میں سے بھی اکثر ایسے تھے جو اسلام کی تبلیغ پہلے کی نسبت زیادہ توجّہ سے سُنا کرتے تھے۔

حال کی بے بسی اور مستقبل کے متعلق بڑھتی ہوئی مایوسی آہستہ آہستہ رنبیر کی صحت پر اثر انداز ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے موسمی بخار نے آلیا اور وہ کئی دن تک بستر پر پڑا رہا۔

۵

ایک دن رنبیر بخار میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور قلعے کا طبیب جس کی دوائی پینے سے اس نے انکار کر دیا تھا، اس کے بستر کے گرد جمع ہونے والے قیدیوں سے کہہ رہا تھا۔ ”تم اس نوجوان کو سمجھاؤ۔ کل سے اس نے میری کوئی دوا نہیں پی۔ پہریداروں نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے کھانے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ آج قید خانے کے ناظم شاید خود اسے دیکھنے آئیں۔ تم سب میرے گواہ ہو کہ میں اپنی طرف سے اس کی جان بچانے کے لیے تمام جتن کر چکا ہوں۔“

ایک قیدی نے آگے بڑھ کر طبیب کے ہاتھ سے دوا کی پیالی پکڑتے ہو کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں ہم انہیں سمجھا لیں گے۔“ پھر وہ رنبیر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”لیجئے مہاراج! آپ کا اس میں فائدہ ہے۔“

رنبیر چلّایا۔ ”بھگوان کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔“

دوسرے قیدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "رنبیر! ہم آپ کے دشمن نہیں۔ بیماری کی حالت میں انسان اپنا نفع نقصان نہیں سوچ سکتا۔ اٹھیے! دوا پینے سے انکار نہ کیجیے۔"

رنبیر نے غضب ناک ہو کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور پہلے کی نسبت زیادہ بلند آواز میں چلّا کر کہا۔ "مجھے یہاں کسی کی دوستی کی ضرورت نہیں۔ مجھے مرنے دو۔ بھگوان کے لیے مجھے مرنے دو۔ موت میرے لیے اس زندگی سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہو سکتی۔"

اچانک کمرے کے دروازے کی طرف سے کسی کی آواز سنائی دی۔ "یہ الفاظ ایک سپاہی کے نہیں ہو سکتے۔" وہ لوگ جن کی نگاہیں رنبیر پر مرکوز تھیں اچانک مُڑ کر ایک بلند قامت اور بارعب آدمی کی طرف دیکھنے لگے جو دروازے کے پاس قلعے کے ناظم کے ساتھ کھڑا تھا۔ قیدی ایک طرف ہٹ گئے۔ اجنبی نے رنبیر کے بستر کے قریب آ کر کہا۔ "سپاہی مسکراتے ہوئے موت کے آغوش میں چلے چلے جاتے ہیں لیکن مایوس ہو کر اس کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے۔"

رنبیر نے اجنبی کی طرف دیکھا اور اضطراری حالت میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں نفرت اور حقارت کے ابلتے ہوئے جذبات تحیّر میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔

یہ وہی تھا جس نے اسے چند سال قبل موت کے منہ سے چھین کر اس قلعے میں بھیجا تھا۔ یہ وہی تھا جس سے ایک ٹیلے پر مختصر سی ملاقات اس کے ذہن میں ایک دائمی جستجو چھوڑ گئی تھی۔

”یہ دوا نہیں پیتا۔“ طبیب نے پہلے اس اجنبی اور پھر قلعے کے ناظم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت کوشش کر چکا ہوں۔“

”لاؤ مجھے دو۔“ یا یہ کہتے ہوئے اجنبی نے دوا کی پیالی قیدی کے ہاتھ سے پکڑ لی اور رنبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں ایک بار تم سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔ یہ لو۔“

رنبیر اس کے الفاظ سے زیادہ اس کی نگاہوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے دوا کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

"دیکھو جب تک تم دوا نہ پیو گے میں یہیں کھڑا رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اجنبی نے دوا کی پیالی رنبیر کے منہ سے لگا دی۔ رنبیر نے اس کے ہاتھ سے پیالی پکڑ لی۔ اس کے جی میں آیا کہ اسے دیوار سے دے مارے لیکن اس کی ہمّت جواب دے گئی۔ ایک ثانیہ توقّف کے بعد اس نے اچانک دوا کے چند گھونٹ اپنے حلق سے اتار لیے۔

اجنبی نے مسکراتے ہوئے طبیب کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کی دوا بہت کڑوی تھی۔ میں خود بھی کڑوی دوا پینے سے بہت گھبراتا ہوں۔"

قلعہ کے ناظم نے کہا "چلیے آپ کو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔" اجنبی ناظم کے ساتھ کمرے سے باہر گیا تو طبیب نے رنبیر سے کہا۔ "میں شام کو پھر آؤں گا۔ آپ تھوڑی دیر بعد دودھ پی لیں تو بہتر ہو گا۔"

"ٹھہریئے!" رنبیر نے کہا۔ "میں آپ سے کچھ پر پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھیئے!"

”یہ کون تھا؟“

یہ سلطانِ معظّم کی فوج کے ایک بڑے افسر ہیں۔ قلعہ کے ناظم کچھ عرصہ کے لئے رخصت پر جا رہے ہیں اور یہ ان کی جگہ کام کریں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ قیدیوں کے لیے خاص اختیارات لے کر آئے ہیں۔“

”لیکن ان کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی ملک کے باشندے ہیں۔“

”ہاں یہ نو مسلم ہیں۔ میں نے یہ سنا ہے کہ یہ آپ کے ملک کے کسی راجہ کے قریبی رشتہ دار ہیں۔“

٦

پندرہ دن بعد رنبیر اُٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ اس عرصہ میں نیا ناظم کئی بار اسے دیکھنے کے لیے آ چکا تھا۔ قیدیوں کو قلعے کے ایک مخصوص رقبہ کے سوا جہاں اسلحہ خانہ اور چند فوجی افسروں کے رہائشی کمرے تھے، گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ ایک دن رنبیر علی الصبح اپنے

کمرے سے نکل کو صحن میں ٹہل رہا تھا کہ اسے قلعے کا نیا ناظم جو باہر سے قلعہ سے باہر چند میل پر گشت کرنے کا عادی تھا، چار سواروں کے ہمراہ اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ رنبیر کے قریب پہنچ کر ناظم نے اپنا گھوڑا روکا اور کہا۔ ”صبح کی سیر سے آپ کی صحت پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔“ رنبیر نے قدرے روکھے پن سے جواب دیا۔ ”مجھے اپنی صحت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کمرے میں میرا دم گھٹتا تھا، اس لیے باہر نکل آیا۔“

”تو میرے خیال میں آپ کے لیے باہر کی فضا زیادہ خوشگوار ہو گی۔“ یہ کہہ کر ناظم ایک سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم اپنا گھوڑا انہیں دے دو، یہ ہمارے ساتھ جائیں گے۔“

سپاہی نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے گھوڑے کی لگام رنبیر کے ہاتھ میں دینے کی کوشش کی لیکن اس کے ناظم کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آپ کا شکریہ لیکن اس وقت سواری کو جی نہیں چاہتا۔“

”آپ کی مرضی۔ لیکن اگر آپ کے دل میں کبھی اس کی خواہش پیدا ہو تو مجھے ضرور بتائیں۔“ ناظم نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس

کے ساتھی اس ک پیچھے ہو لیے۔

اگلے دن ایک پہرے دار نے رنبیر کو اطلاع دی کہ ناظم قلعہ آپ کو بلاتے ہیں۔ رنبیر اُٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔

ناظم اپنے دفتر کے سامنے ایک باغیچے میں ٹہل رہا تھا۔ رنبیر اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ناظم نے ایک درخت کے نیچے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں بیٹھ جایئے۔ میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج کمرے میں بہت حبس ہے۔“

رنبیر قدرے تذبذب کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناظم نے دوسری کرسی پر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے کہا۔ ”آپ نندنہ کی جنگ میں قنوج کے دستوں کے سردار کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے؟“

”ہاں!“ ”اور آپ کے بہت سے ساتھی رہا ہو کر جا چکے ہیں؟“

”ہاں!“

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ رہا ہونے کے لیے آپ کے نزدیک کون سی شرط

ناقابلِ قبول تھی؟"

رنبیر نے جواب دیا۔ "میں نے اپنے دشمنوں کی شرائط پر غور کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

ناظم مسکرایا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ نے یہاں چار سال اس امید پر گزار دیے ہیں کہ کسی دن ہندوستان کے راجپوت اپنی قوّت کے بل بوتے پر آپ کو یہاں سے چھڑا کر لے جائیں گے۔"

رنبیر نے کہا۔ "اور آپ مجھے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اب مجھے قطعی مایوس ہو کر آپ سے آزادی کی بھیک مانگنی چاہیے۔"

ناظم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں آپ کو اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی جنگ کی طرح آپ کی قید بھی بے مقصد ہے اور جس جرأت پر آپ کو ناز ہے میں اسے ہٹ دھرمی سمجھتا ہوں۔ آپ تصورات کے قلعوں میں بیٹھ کر اس قوّت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں جسے

قدرت نے ایک عظیم مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔"

رنبیر نے کہا۔ "اگر مندروں پر حملہ کر کے دیوتاؤں کی مورتیاں توڑنا آپ کے نزدیک ایک عظیم مقصد ہے تو آپ یقیناً اپنی کارگزاری پر فخر کر سکتے ہیں۔"

ناظم نے جواب دیا۔ "جن بتوں کو انسانوں کے ہاتھوں نے تراشا ہے وہ انسانوں کے ہاتھوں ہی سے ٹوٹیں گے۔ کاش! آپ کو یہ علم ہوتا کہ برہمن کے ہاتھ میں ایک تراشا ہوا پتھر انسانیت کا کس قدر خطرناک دشمن بن جاتا ہے۔ آپ راجپوت ہیں اور ان بتوں سے آپ کی محبت کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ انہوں نے آپ کو ان گنت انسانوں پر برتری عطا کی ہے۔ آپ نے ان کے بل بوتے پر صدیوں سے ان گنت انسانوں کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم رکھا ہے۔ یہ بت ایک انسان کو برہمن اور کھشتری کی تقدیس عطا کرتے ہیں اور دوسرے انسان کو اچھوت اور شودر ہونے کی ذلّت پر قانع رہنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ اس ملک میں ان بتوں کی شکست انسانیت کی فتح ہے۔ کاش ان بتوں کے

مندروں کی حفاظت کے لیے تلوار بلند کرنے سے پہلے آپ نے کسی اچھوت سے یہ پوچھا ہوتا کہ تمہاری سوکھی ہوئی ہڈیوں پر راجوں کے محلات کا بوجھ زیادہ ہے یا ان مندروں کا؟ یا ایک ویش ہی سے یہ پوچھ لیا ہوتا کہ تمہاری کمائی میں سب سے بڑے حصّہ دار کون ہے؟ تلوار کی نوک سے لگان وصول کرنے والے کھشتری یا اپنے بتوں کے لیے خراج وصول کرنے والا برہمن۔"

رنبیر نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اگر میں غلطی پر نہیں تو کسی وقت آپ بھی راجپوت تھے۔ اگر دشمن کے مقابلے میں آپ کی ہمّت جواب نہ دے جاتی تو شاید دیوتاؤں کے متعلق آپ کے خیالات میں یہ تبدیلی نہ آتی۔"

"ہاں! میں راجپوت تھا لیکن حالات نے میری گردن کو انسانیت کی تعظیم کے لئے جھکا دیا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد اچھوتوں کے طرفدار بن گئے ہیں۔"

”نہیں، میں انسانوں کے شکاریوں کے گروہ سے نکل کر انسانیت کے علمبر داروں کی صف میں شامل ہو گیا ہوں۔“

”تو آپ محمود غزنوی اور اس کے سپاہیوں کو انسانیت کا علمبر دار سمجھتے ہیں؟““ہاں! مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کی فتوحات کے بعد اس دین کی تبلیغ و اشاعت کی راہیں ہموار ہو جائیں گی جس کا مقصد انسانوں میں اونچ نیچ کی تفریق مٹانا ہے۔ جو ظالم کے ہاتھ سے تلوار چھینتا اور مظلوم کو سہارا دے کر اٹھاتا ہے۔ ایسے دین کا مخالفت ان لوگوں سے زیادہ نہیں ہو سکتا جنہوں نے اپنے تمدّن کی بنیاد چھوت اور اچھوت کی تفریق پر رکھی ہے اور جو اپنے قلعوں اور مندروں میں بیٹھ کر انسانوں پر خدائی کرتے ہیں۔ ان مندروں اور قلعوں کا طلسم توڑے بغیر ایسے دین کی تبلیغ کا راستہ صاف نہیں کیا جا سکتا جو برہمن اور شودر کو ایک ہی سطح پر کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت میری باتیں آپ کے کانوں کو خوشگوار محسوس نہیں ہوں گی لیکن جس دن آپ ایک اونچی ذات کے فرد کی بجائے ایک عام انسان کی حیثیت سے سوچیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ محمود کی

آمد اَن گنت انسانوں کی پکار کا جواب ہے۔“

رنبیر نے کہا۔”ایک انسان کی حیثیت میں میں صرف یہ سوچ سکتا ہوں کی میں ان لوگوں کی قید میں ہوں جو آپ کی نگاہ میں انسانیت کا بہترین نمونہ ہیں۔“

”میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ محمود غزنوی کا ہر سپاہی انسانیت کا بہترین نمونہ ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں ضابطۂ اخلاق کی صداقت پر یہ لوگ مجموعی حیثیت میں ایمان رکھتے ہیں، اس پر دیانتداری سے عمل کرنے والا ہر شخص انسانیت کا بہترین نمونہ بنا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک قیدی کی حیثیت سے آپ کے دل میں اس قلعے کے کسی پہریدار کی بدسلوکی کے خلاف شکایت پیدا ہوئی ہو لیکن آپ کو بھی سوچنا چاہیے کہ اس ملک کے کروڑوں انسان صدیوں پیشتر ہندو سماج کی تلوار سے مغلوب ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے شودر بن چکے ہیں اور برہمن آج بھی ان دیوتاؤں پر ایمان رکھتا ہے تو شودروں کا بلیدان لے کر خوش ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک بہترین ذہنیت کے مسلمان نے بھی کسی بھی قیدی

سے وہ سلوک نہیں کیا ہو گا جو آپ شودروں کے ساتھ روا رکھے ہیں۔ آپ کے لیے قید کے ایّام یقیناً تلخ ہیں۔ مگر میں آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ بہت جلد آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہزاروں قیدی آزاد ہو چکے ہیں لیکن ان اچھوتوں کی زندگی کی تلخیوں کا تصوّر کیجئے جو ذلّت کی گود میں آنکھیں کھولتے ہیں اور ذلّت کی گود میں مر جاتے ہیں۔ میں آپ سے صرف ایک سوال پوچھتا ہوں، فرض کیجئے اگر جے پال یا آنند پال کی افواج غزنی تک پہنچ جائیں اور مسلمان مغلوب ہو جائے تو آپ لوگ جنگی قیدی تو درکنار عام مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ کیا یہ سلوک اس سلوک سے مختلف ہوتا جو برہمن سماج نے کول، دراوڑ اور بھیل اقوام کے ساتھ کیا ہے؟ کیا جن مورتیوں کے سامنے اچھوتوں کا بلیدان دیا جاتا ہے وہ غزنی میں نصب نہ کی جاتیں؟ کیا غزنی پر جے پال کی چڑھائی کے وقت اس ملک کے برہمنوں نے یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ مسلمان ملیچھ ہیں اور انہیں اچھوتوں کی طرح مغلوب کرنا دھرم کی سیوا ہے؟"

رنبیر نے لاجواب سا ہو کر کہا۔ ''آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

ناظم نے قدرے بے تکلّف سا ہو کر کہا۔ ''تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں کوئی ایسی بات تسلیم کرنے کے لیے نہیں کہوں گا جس کی صداقت کے متعلّق تمہارا اپنا ضمیر گواہی نہ دے۔ تمہارے ساتھ میری پہلی ملاقات بہت مختصر تھی میں اسی رات ان دوستوں سے جاملا تھا جو بھیم پال کی رہی سہی فوج کو کشمیر میں ترلوچن پال کی فوج کے ساتھ شامل ہونے سے روکنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد مجھے اس طرف آنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتا رہا۔ مجھے تمہاری جرأت وہمّت کا اعتراف تھا اور میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں تمہیں یقیناً ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ کر لیتا اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ کسی دن میرا اور تمہارا راستہ ایک ہو گا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شاید مجھے تمہارے ساتھ اطمینان سے باتیں کرنے کے مواقع بہت کم ملیں۔ کل ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ کالنجر کا راجہ ترلوچن پال کو اس کی کھوئی ہوئی سلطنت واپس دلانے کا وعدہ کر کے

گوالیار اور دوسری ہمسایہ سلطنتوں کی مدد سے ہمارے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے میں مصروف ہے۔ مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ یہ حکمران قنوج کے راجہ کو ان کی گذشتہ پیش قدمی کے وقت بھاگ نکلنے پر بُزدلی کا طعنہ دے کر بدنام کر رہے ہیں اور اس کے اُمرا کو اس کے خلاف مشتعل کر رہے ہیں۔ ان حالات میں سلطان شاید پیش قدمی کرنے میں تاخیر نہ کرے اور مجھے بھی اچانک یہاں سے جانا پڑے لیکن میں جانے سے پہلے تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر میں تمہارے متعلق اس بات کی ضمانت دے سکوں کہ آزاد ہونے کے بعد سلطان کے خلاف کسی جنگ میں حصّہ نہیں لوگے تو مجھے یقین ہے کہ تمہاری رہائی کے بارے میں میری یہ درخواست مان لی جائے گی۔“

”میرے وعدے پر آپ کو یقین آجائے گا؟“

”ہاں!“

”اور اگر میں ایسا وعدہ نہ کروں تو؟“

”اس صورت میں تمہیں کالنجر کے راجہ اور اس کے حامیوں کے خلاف ہماری مہم کے اختتام تک یہیں رہنا پڑے گا۔ اس مہم کے خاتمے پر گنگا اور جمنا کے میدانوں میں کوئی حکمران ہمارے خلاف سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے گا اور مجھے امید ہے کہ پھر تمام جنگی قیدیوں کو بے ضرر سمجھ کر رہا کر دیا جائے گا۔ تمہارے متعلق میں اپنی روانگی سے پہلے ہی یہ حکم تحریر کر جاؤں گا کہ تمہیں اس مہم کی کامیابی کے فوراً بعد رہا کر دیا جائے لیکن جب تک میں یہاں ہوں میری یہ خواہش ہے کہ تم مجھ سے ملتے رہو۔ ممکن ہے کہ جس صداقت نے مجھے قائل کیا ہے وہ تمہارے اندر بھی ایک انقلاب پیدا کر دے اور تم ایک شکست خوردہ سپاہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کے مشعل بردار بن کر اپنے وطن واپس جاؤ۔ تم جس وقت چاہو میرے پاس آ سکتے ہو۔ میری قیام گاہ کے دروازے ہر وقت تمہارے لیے کھلے ہیں۔“

رنبیر نندنہ کی جنگ میں شریک ہونے سے پہلے کئی برہمنوں سے یہ سن چکا تھا کہ محمود کی فوج کے ساتھ ایسے جادوگر بھی ہیں جن کی باتیں مفتوحہ

علاقوں کے ہندوؤں کو ان کے مذہب سے بد ظن کر دیتی ہیں۔ چنانچہ قید ہونے کے بعد وہ اپنے دل میں یہ عہد کر چکا تھا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرنے والوں کی باتوں سے متاثر نہیں ہو گا چنانچہ جب بھی اسلام کا کوئی مبلغ قیدیوں کے پاس آتا وہ اس کے وعظ پر توجہ دینے کی بجائے دل ہی دل میں دیوتاؤں کے بھجن گانے لگتا۔ لیکن آج ناظم کی گفتگو کے دوران میں ان دیوتاؤں کا تصوّر بھی اسے کوئی سہارا نہ دے سکا۔ ملاقات کے بعد جب وہ اپنے کمرے کا رُخ کر رہا تھا تو ناظم کی گفتگو کے کئی فقرے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور وہ اپنے ڈگمگاتے ہوئے یقین کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

باقی تمام دن وہ ایک ذہنی کرب میں مبتلا رہا اور رات کا بیشتر حصّہ بھی وہ اپنے بستر پر لیٹ کر سوچتا رہا۔ ناظم کے یہ الفاظ کہ تمہاری جنگ کی طرح تمہاری قید بھی بے مقصد ہے، ایک نشتر کی طرح اس کے دل میں اتر چکے تھے اور وہ یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس نے غیر معمولی عزم و ثبات کا مظاہرہ نہ کیا تو ایسی چند اور ملاقاتوں کے بعد اس کے یقین کے قلعے مسمار

ہو جائیں گے۔ دیر تک بے چینی اور بے قراری سے کروٹیں بدلنے کے بعد اس کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ میں دوبارہ اس کے پاس نہیں جاؤں گا اور اگر اس نے مجھے بُلانے کی کوشش کی تو میں صاف طور پر کہہ دوں گا کہ تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے اسلاف کا دھرم چھوٹنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اگلے روز رنبیر کے خیالات کچھ اور تھے۔ اس نے کچھ دیر قیدیوں کے ساتھ دل بہلانے کی کوشش کی لیکن اسے سکون نہ حاصل ہو سکا۔ اس کا ضمیر بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ بزدلی ہے۔ تمہیں اس پر یہ ثابت کرنا چاہیے کہ تمہارا دل ایک چٹان کی طرح مضبوط ہے اور کسی کے الفاظ کا جادو تمہارے عقیدے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اگر آج وہ بلائے تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔ وہ بہر حال ایک راجپوت ہے۔ اس کا چہرہ اس کی عالیٰ ظرفی کی شہادت دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ تم کوئی ایسی بات کہہ سکو جس سے اس کی غیرت جوش میں آجائے اور توہین آمیز شرائط کے بغیر رہا کر دیے جاؤ۔

جب دوپہر تک اسے کوئی بلانے کے لیے نہ آیا تو وہ مزید انتظار کیے بغیر ناظم کی قیام گاہ کی طرف چل دیا۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک اور آواز اٹھ رہی تھی "رنبیر! تم اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ تم اپنی جرأت کا ثبوت دینے کے لئے نہیں بلکہ اپنی بے بسی کا مظاہرہ کرنے جا رہے ہو۔ تم اُسے ایک جادوگر نہیں بلکہ اپنا مونس و غم خوار سمجھتے ہو۔"

جب وہ ناظم کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ کاتب سے کوئی مراسلہ لکھوا رہا تھا۔ رنبیر کی طرف دیکھتے ہی اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو۔ میں ابھی فارغ ہوتا ہوں۔"

چند فقرے لکھوانے کے بعد اس نے کاتب کو رخصت کیا اور رنبیر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ ورنہ میں تھوڑی دیر بعد خود تمہیں بلانے والا تھا۔"

رنبیر اس کے سامنے بیٹھ کر دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ میں نے تھوڑی دیر اور انتظار کیوں نہ کیا۔

ناظم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”کل تمہارے جانے کے بعد میرے دل میں خیال آیا تھا کہ چند واقعات سے اگر میرے خیالات میں انقلاب نہ آ گیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ میں بھی تمہاری طرح اپنے راجہ یا اپنے دیوتاؤں کا بول بالا کرنے کے لیے نندنہ کی جنگ میں شریک ہوتا اور پھر اسی قلعے میں ایک قیدی کی حیثیت میں تم سے متعارف ہوتا۔ اس صورت میں ہم دونوں ایک دوسرے سے جو باتیں کرتے وہ یقیناً ان باتوں سے مختلف ہوتیں جو کل میرے اور تمہارے درمیان ہوئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے یقیناً یہ پوچھتے کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ تمہاری کتنی بہنیں ہیں؟ کتنے بھائی ہیں؟ تمہارے والدین کس حال میں ہیں؟ اور تمہیں کس کی یاد سب سے زیادہ ستاتی ہے؟ اور آج میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم آؤ تو میں تم سے اس قسم کے سوالات پوچھوں گا۔ اس قلعے کے ناظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے اور اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ ایک انسان کی حیثیت سے میں بھی قید کی وہ صبر آزما تنہائی اور بے بسی دیکھ چکا ہوں جب کسی کی سُننے اور اپنی سُنانے کی خواہش دیواروں سے ٹکرا کر سرد ہو جایا کرتی ہے تو شاید تم مجھے اپنا راز دار بنانے میں ہچکچاہٹ محسوس

نہیں کروگے۔"

رنبیر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ایک انسان کی حیثیت میں مجھے آپ کے سوالات کا جواب دینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ میری داستان بہت مختصر ہے۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔ ماں مر چکی ہے۔ باپ او ایک بہن کے سوا مجھے اور کسی کی یاد نہیں ستاتی لیکن آپ کو غلط فہمی نہ ہو، میں آپ کے پاس فریاد لے کر نہیں آیا۔ یہ صرف آپ کے سوالات کا جواب تھا۔" رنبیر کی آواز بیٹھ چکی تھی اور وہ اپنی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا اور وہ ناظم کو اپنے گھر اور اپنے گاؤں کے حالات بتانے میں تسکین محسوس کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس قدر بے تکلف ہو رہا تھا تاہم یہ قہقہے آنسوؤں کی نمی کے بغیر نہ تھے۔ بالآخر رنبیر نے کہا۔ "اب میں آپ سے پوچھتا ہوں وہ کون سا واقعہ ہے جس کے باعث آپ کے خیالات میں انقلاب آچکا ہے؟ کون سی جنگ میں قید ہوئے تھے؟"

ناظم نے کہا۔ "میری داستان آپ کی سرگزشت سے مختلف بھی ہے اور

طویل بھی۔ اگر آپ بہت جلد سو جانے کے عادی نہیں تو رات کو کھانا
کھاتے ہی میرے پاس آجائیں۔ ہم دیر تک باتیں کریں گے۔“

آشا

رات کے وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ رنبیر نے کھانا کھاتے ہی ناظم کی قیام گاہ کا رُخ کیا۔ ناظم کے ملازم نے اُسے یہ ہے کہہ ایک کمرے میں بٹھا دیا کہ وہ نماز سے فارغ ہو کر ابھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ناظم کمرے میں داخل ہوا اور اس نے رنبیر کے سامنے بیٹھے ہوئے اپنی سرگزشت شروع کی۔

”عبدالواحد میرا اسلامی نام ہے۔ مسلمان ہونے سے پہلے میرا نام واسدیو تھا۔ کانگڑہ میری جنم بھومی ہے اور میں ایسے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں جو

میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے اس دنیا سے رُخصت ہو چکے تھے۔ میرا باپ نگر کوٹ کی فوج کا سیناپتی رہ چکا تھا اور نگر کوٹ سے چند کوس کے فاصلے پر ایک سرسبز وادی کی چند بستیاں ہماری جاگیر تھیں۔ میرے باپ کی موت کے بعد میرے چچا نے میری پرورش کی ذمہ داری لی۔ میرے چچا کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ میں بھی اپنے باپ کی طرح عزّت اور شہرت حاصل کروں۔ نگر کوٹ کے راجہ کی طرف سے ہمیں اپنی جاگیر میں ایک سو پچاس سوار اور چار سو پیادہ سپاہی رکھنے کا حکم تھا۔ اس لیے میرے دل میں ایک اچھا سپاہی بننے کی خواہش پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ مجھے مذہبی تعلیم دلانے کے لیے میرے چچا نے ایک پنڈت کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن مجھے کتابوں سے زیادہ سپاہیانہ کھیلوں میں دلچسپی تھی۔ مجھے گھوڑے پر سواری کرنے اور جھیلوں اور دریاؤں میں تیرنے کا شوق تھا۔ ہمارے سماج میں ایک سردار کے بیٹے کا عام لوگوں بالخصوص نیچ ذات لوگوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنا برا سمجھا جاتا ہے لیکن میرے چچا نے میرے استاد کے احتجاج کے باوجود مجھے آس پاس کی بستیوں میں گھومنے کی عام اجازت

دے رکھی تھی۔ ویش ذات کے کسانوں اور چرواہوں کے لڑکے میرے ساتھ بہت بے تکلف تھے۔ ہماری جاگیر میں صرف ایک بستی ایسی تھی جہاں جانے سے چچانے مجھے منع کر رکھا تھا اور یہ اچھوتوں کی بستی تھی۔

جب میری عمر بارہ سال تھی تو نگر کوٹ کا راجہ ہمارے ہاں آیا۔ اس نے ہمارے سپاہیوں کا معائنہ کیا۔ میں نے چند کھیلوں میں حصّہ لیا۔ راجہ میری نیزہ بازی اور تیر اندازی پر بہت خوش ہوا اور اس نے میرے چچا سے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تمہارا بھتیجا اپنے باپ کا نام روشن کرے گا لیکن آپ کو اس کی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔ بہتر ہو گا کہ آپ اسے چند سال کے لیے شہر بھیج دیں۔“ چنانچہ چچانے مجھے نگر کوٹ کی اس پاٹھ شالہ میں بھیج دیا جہاں بڑے بڑے سرداروں کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔

پاٹھ شالہ کے برہمنوں سے میں نے سب سے پہلی بات جو سیکھی وہ نفرت تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ راجپوت ہو، برہمنوں اور کھشتریوں کے سوا ہر ذات کے انسانوں سے نفرت کرنا تمہارا فرض ہے۔ اچھوتوں کے قریب جانے کا خیال میرے دل میں کبھی پہلے بھی نہیں آیا تھا لیکن نگر کوٹ کا ماحول

ایسا تھا کہ چار سال کے بعد جب میں تعلیم سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میں ویش ذات کے ان نوجوانوں کو بھی حقارت سے دیکھنے لگا جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

میرے گھر آنے سے چند ماہ بعد چچا کی صحت خراب رہنے لگی اور انہوں نے جاگیر اور فوج کا انتظام میرے سپرد کر دیا۔ اب میں یہ محسوس کرنے لگا کہ میری زندگی اتنی خوشگوار نہیں جتنی کہ میں سمجھتا تھا۔ میری جاگیر پر کئی حکومتیں تھیں۔ میں راجہ کا جاگیر دار تھا اور راجہ ویہند کے مہاراجہ کا باجگزار تھا۔ جاگیر کی آمدنی سے مجھے ایک طرف فوج کے اخراجات پورے کرنے پڑتے اور دوسری طرف ہر سال راجہ کے خزانے میں ایک بھاری رقم داخل کرنا پڑتی تھی تاکہ وہ ویہند کے مہاراج کا خراج پورا کر سکے۔ لیکن نگر کوٹ میں ایک ایسی حکومت بھی تھی جس کے سامنے عوام جاگیر دار، راجہ اور مہاراج یکساں بے بس تھے۔ یہ نگر کوٹ کے مندر کے پجاریوں کی حکومت تھی۔

ہر سال لگان کی وصولی کے موقع پر نگر کوٹ کے پروہت کے نمائندے

تمام جاگیر داروں کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ جاگیر دار لگان کی وصولی میں کوئی نرمی نہ برتیں تاکہ ان کے بھتے کی رقم زیادہ سے زیادہ ہو۔ ان کے سامنے راجہ یا جاگیر دار کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ جب پروہت کی طرف سے یہ اعلان ہوتا کہ اس سال مندر میں فلاں دیوی کی چاندی اور سونے کی مورتی نصب کی جائے گی تو عوام پر مزید لگان عاید کر دیا جاتا اور یہ لوگ ان کے منہ سے سوکھی روٹی کے نوالے بھی چھین کر لے جاتے۔

مجھے اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ نگر کوٹ کے مندر میں مَیں نے جو انبار دیکھے تھے وہ دیوتاؤں کی برکت سے زیادہ برہمنوں کی سنگدلی کا نمونہ تھے لیکن مجھے تعلیم دی گئی تھی کہ برہمن دھرم کے محافظ ہیں اور راجہ اور پرجا سب ان کی سیوا کے لیے ہیں۔ شمال اور مشرق کے دشوار گزار پہاڑیوں میں ایسی وادیاں تھیں جہاں کے باشندے ابھی تک بدھ مت کے پیرو تھے۔ یہ لوگ ایک مدّت سے نگر کوٹ راجہ اور پروہت کی دوہری غلامی کا طوق اتار کر پھینک چکے تھے اور نگر کوٹ کے برہمنوں کی

نگاہ میں یہ لوگ شودروں سے کہیں زیادہ قابل نفرت تھے۔

نگر کوٹ کی فوج نے متعدد بار ان لوگوں پر حملے کیے تھے لیکن حملوں کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوٹ مار یا قتل و غارت ہوتا تھا۔ لوگ عام طور پر حملے کے اطلاع ملتے ہی برفانی پہاڑوں کی طرف بھاگ جاتے اور نگر کوٹ کی فوج لوٹ مار کر کے واپس آ جاتی۔ لوٹ کا مال زیادہ تر مویشیوں پر مشتمل ہوتا۔ جو لوگ قید ہوتے تھے ان میں سے اکثر وہیں قتل کر دیے جاتے تھے اور نگر کوٹ میں صرف ایسے نو عمر قیدی لائے جاتے تھے جنہیں کالی دیوی کی بھینٹ کے قابل سمجھا جاتا تھا۔

نگر کوٹ کے مظالم نے ان لوگوں کو آہستہ آہستہ جنگجو بنا دیا۔ ایک دفعہ نگر کوٹ کے پانچ ہزار سپاہی شمال مشرق کے پہاڑوں میں لوٹ مار کرنے کے بعد واپس آ رہے تھے کہ انہیں ایک تنگ گھاٹی میں شام ہو گئی۔ فوج کے سردار کا خیال تھا کہ وہ رات کو چند میل کے فاصلے پر ایک کھلی وادی میں آرام کریں گے۔ اس حملے میں نگر کوٹ کی فوج نے پہاڑی لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا اور کسی کو ان کی طرف سے جوابی حملے کی توقع نہ تھی

لیکن سورج غروب ہوتے ہی دشمن نے جو فوج کی گزر گاہ کے ساتھ ساتھ پہاڑ کے دامن میں درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے تاک لگائے بیٹھا تھا، اچانک تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ قریباً دو کوس تک فوج کے سامنے ایسا تنگ اور خطرناک راستہ تھا کہ دشمن کوئی نقصان اٹھائے بغیر صرف پتھر برسا کر ساری فوج کا صفایا کر سکتا تھا۔ لیکن یہ نگر کوٹ کی فوج کی خوش قسمتی تھی کہ جن لوگوں نے جوابی حملہ کیا تھا ان کی تعداد بہت تھوڑی تاہم کھلی وادی تک پہنچتے پہنچتے نگر کوٹ کے دو ہزار سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ دشمن اپنے مال مویشی کے علاوہ قیدیوں کو بھی چھڑا لے گیا۔ اس واقعہ کے بعد کئی سال تک نگر کوٹ کے راجہ یا پروہت کو ان لوگوں پر کوئی منظّم حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

میرے باپ نے سینا پتی کی حیثیت سے نگر کوٹ کے راجہ سے زیادہ پروہت کو خوش کرنے کے لیے اپنی زندگی کے آخری سال ان لوگوں پر حملہ کیا اور انھوں نے کافی علاقہ فتح کر لیا لیکن سردیوں میں اس علاقے پر قبضہ رکھنا دشوار سمجھ کر انھوں نے راجہ اور پروہت کے ایما پر پہاڑی

لوگوں کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ اگر وہ لگان دینے پر آمادہ ہوں تو ان کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی۔ پہاڑی لوگوں نے یہ شرط مان لی اور نگر کوٹ کے راجہ کی افواج واپس آ گئیں۔ چند سال یہ لوگ باقاعدگی سے اپنی آمدنی کا چوتھائی حصّہ دیتے رہے لیکن راجہ کے اہل کاروں اور مندر کے پجاریوں نے حسب عادت پھر لوٹ مار شروع کر دی اور ان لوگوں نے تنگ آ کر لگان ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

میں نے یہ واقعات قدرے تفصیل سے اس لیے بیان کیے ہیں کیونکہ ان کا میری داستان سے گہرا تعلق ہے۔ اپنی علالت کے ایّام میں میرے چچا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میری شادی کر دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے نگر کوٹ کے ایک سردار کی لڑکی سے میری منگنی کر دی۔ اس سردار کا نام جگت نرائن تھا اور وہ راجہ کا قریبی رشتہ دار تھا۔ میرے چچا اس رشتے سے بہت خوش تھے لیکن میری منگنی سے ڈیڑھ مہینے بعد انہیں موت نے آلیا۔

۲

یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب کے شمال مغربی علاقوں میں ہمیں سلطان محمود کی فتوحات پریشان کر رہی تھیں۔ ایک دن راجہ کے حکم سے تمام سردار نگر کوٹ میں جمع ہوئے اور وہاں ویہند کے مہاراجہ کو مدد بھیجنے کے سوال پر غور کیا گیا۔ اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی پیش ہوا کہ پہاڑی لوگ جنہوں نے چند برس سے مالیہ ادا کرنا بند کر دیا ہے، سے کیا سلوک ہونا چاہیے۔ بعض سرداروں کی رائے تھی کہ ہمیں پہلے محمود غزنوی کی فکر کرنی چاہیے۔ مسلمانوں کا خطرہ ٹل جانے کے بعد ان لوگوں کو ہر وقت مغلوب کیا جا سکتا ہے لیکن مندر کے پروہت، راجہ کے سیناپتی اور بعض سرداروں کی رائے یہ تھی کہ ہمیں پہلے ان لوگوں کے ساتھ نپٹ لینا چاہیے۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ ان لوگوں کو چند سال کی خاموشی کے بعد پہاڑی لوگوں پر فوج کشی کا اس وقت خیال کیوں آیا جب کہ ویہند کے مہاراج کو مدد کی اشد ضروری ہے لیکن جب حقیقت کا پتہ چلا تو میری حیرانی جاتی رہی۔ سیناپتی مسلمانوں کی بہادری کے قصّے سن چکا تھا اور وہ

ایک طاقتور دشمن کے سامنے جانے سے گھبراتا تھا کیونکہ ویہند کے تازہ حالات کے باعث اسے آرام سے گھر بیٹھنا مشکل نظر آتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے لیے ایک آسان محاذ منتخب کرنا چاہتا تھا۔

پروہت کو مندر کی بے حساب دولت کی فکر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عام حالات میں محمود شاید اس دور افتادہ پہاڑی علاقے کا رُخ نہ کرے لیکن نگر کوٹ کی فوج اگر ویہند بھیجی گئی تو شکست کی صورت میں یہ بعید از قیاس نہیں کہ محمود نگر کوٹ تک اس فوج کا پیچھا کرے۔ سرداروں کی اکثریت نے بھی گھر سے دور جا کر بڑے خطرے کا سامنا کرنے پر گھر کے قریب ایک معمولی خطرہ مول لینے کو ترجیح دی۔

راجہ نے مجبوراً پروہت اور اس کے حامیوں کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا لیکن اس کی آخری کوشش یہ تھی کہ نگر کوٹ کا قریباً ہر سپاہی اس جنگ میں حصّہ لے تاکہ یہ فوج اس مہم سے فارغ ہو کر جلد ویہند کی مدد کے لیے جاسکے۔ لیکن پروہت نے پھر راجہ کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ اس مہم کے لیے جاگیرداروں کی فوجیں کافی ہیں اور نگر کوٹ کی

باقاعدہ فوج کے سپاہی مندر کی حفاظت کے لئے رہنے چاہیں۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ راجہ کی باقاعدہ فوج کا نصف حصّہ اس مہم میں جاگیرداروں کے سپاہیوں کے ساتھ شریک ہو اور نصف مندر کی حفاظت کے لئے رہے۔

سیناپتی نے آٹھ ہزار سپاہیوں کی فوج کی فوج کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ اس نے خود چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ سیدھا مشرق کا رُخ کیا اور دو ہزار سپاہی سردار جگت نرائن کی رہنمائی میں دے کر اسے حکم دیا کہ وہ شمال کی طرف سے چکر کاٹ کر مشرق کے برفانی پہاڑوں کے دامن میں پہنچ جائے اور وہاں باقی فرج کا انتظار کرے۔ باقی دو ہزار فوج ایک اور سردار کے ماتحت دے کر اسے جنوب کی طرف سے چکر کاٹ کر اُسی مقام تک پہنچنے کی ہدایت کی۔ میدانی علاقے میں بکھرے ہوئے دشمن کو گھیر کر تباہ کرنے کے لیے ایسی چال کامیاب ہو سکتی تھی لیکن پہاڑوں کے ایک لامتناہی سلسلہ میں ایسی چال سے کسی کامیابی کی امید رکھنا حماقت تھی۔

پہاڑی لوگ اس علاقے کے چپّے چپّے سے واقف تھے اور قدرت نے ان

کے لیے جگہ جگہ ناقابلِ تسخیر مورچے بنا رکھے تھے۔ لیکن سماج کا دبدبہ کچھ ایسا تھا کہ ان لوگوں نے کسی جگہ بھی ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا۔ ہماری فوج میں صرف چند سردار اپنے ساتھ گھوڑے لائے تھے لیکن دشوار گزار پہاڑوں میں داخل ہوتے ہی گھوڑوں کو ایک محفوظ وادی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں اور میرے سپاہی سردار جگت نرائن کے ماتحت تھے۔ اس کے دو بیٹے بھی اس مہم میں شریک تھے۔ ہماری کارگزاری دیکھنے کے لے پروہت کا ایک بھائی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ چند دنوں تک ہم نے کسی قابلِ ذکر مزاحمت کا سامنا نہ کیا۔ جو بستیاں ہمارے راستے میں آتی تھیں وہ عام طور خالی ہوتی تھیں لیکن کوئی عورت، بچہ یا بوڑھا نظر آجاتا تو ہمارے سپاہی ان پر تلواروں کی تیزی آزما لیتے لیکن یہ کھیل مجھے اس وقت بھی پسند نہ تھا جب دل دھرم کے ان دشمنوں کے خلاف نفرت اور حقارت سے بھرا ہوا تھا۔ ایک دن ہم نے ایک نہایت پُر فضا وادی میں قیام کیا۔ چند سپاہی کسی اجڑی ہوئی بستی سے دو عورتیں اور تین بچوں کو پکڑ لائے۔ جگت نرائن نے انہیں درختوں سے بندھوا دیا اور فوج کے چیدہ چیدہ آدمیوں کو نشانہ بازی کی دعوت دی۔ میں نے اس کے خلاف احتجاج

کیا تو اس نے مڑ کر کہا۔ ”تم عورت بنتے جارہے ہو واسدیو! دشمنوں کے خلاف ایک راجپوت کا دل پتھر سے زیادہ سخت ہونا چاہیے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”ابھی تک میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ یہ بے بس عورتیں اور بچے ہمارے دشمن ہیں۔“

وہ بولا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ ہم یہاں پتھروں کے خلاف لڑنے آئے ہیں۔ دیکھو میری طرف۔“ اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کمان کا تیر چھوڑ دیا۔ یہ تیر ایک بچے کے سینے میں لگا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور کمانوں سے سنسناتے ہوئے تیر نکلے اور بچوں اور عورتوں کی چیخیں ان گنت قہقہوں میں دب کر رہ گئیں۔ جگت نرائن اس کے بیٹے اور چند سردار فاتحانہ مسکراہٹوں کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا وہ اس واقعے سے کہیں زیادہ المناک تھا۔ میں اس کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔

ایک دن ایک وادی کے گھنے جنگل میں ہم پر دشمن نے حملہ کیا لیکن ہم

نے انہیں بہت جلد پسپا کر دیا۔ اگلے دن ہم ایک ندی کے سامنے کھڑے تھے جو دو بلند پہاڑوں کے درمیان ایک گہری کھڈ بناتی تھی۔ دن بھر کی تلاش کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں لکڑی کا پل بنا کر ندی کو عبور کیا جاسکتا تھا۔ لکڑی کی وہاں کمی نہ تھی۔ چنانچہ اگلے دن ہم پل بنا کر دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ میں نے احتیاطاً جگت نرائن کو مشورہ دیا کہ اس پل کی حفاظت کے لیے چند آدمیوں کا پہرہ بٹھانا ضروری ہے۔ ممکن ہے ہمیں کسی خطرے کے وقت اس کی ضرورت پڑے۔ جگت نرائن نے کچھ دیر بحث کرنے کے بعد بیس تیر انداز پل کی حفاظت کے لیے مقرر کر دیے اور انہیں حکم دیا کہ وہ کل تک اس پل کی حفاظت کریں اور پھر باقی فوج کے ساتھ آملیں۔

جگت نرائن کے اندازے کے مطابق ہماری آخری منزل جہاں پہنچ کر ہمیں باقی فوج کا انتظار کرنا تھا اس مقام سے پچاس کوس دور تھی۔ لیکن پل سے تھوڑی دور آگے ہم چلنے کی بجائے رینگ رہے تھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ بلند پہاڑ تھا اور بائیں ہاتھ ندی تھی۔ براہ راست پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنا

ناممکن اور اس کے دامن میں ندی کے ساتھ ساتھ چلنا بھی بے حد مشکل تھا۔ دوپہر تک ہم نے بمشکل دو کوس فاصلہ طے کیا اور اس کے بعد پہاڑ کی ڈھلوان ایسی تھی کہ چٹانیں کاٹ کاٹ کر راستہ بنانے کی ضرورت تھی۔ میں نے جگت نرائن کو مشورہ دیا کہ ہمیں واپس مڑ کر کوئی اور راستہ تلاش کرنا چاہیے لیکن اس نے جواب دیا۔ "اب ہمارے راستے میں ہر جگہ ایسے پہاڑ آئیں گے؟"

میں کہا کہ "آپ کا یہ فیصلہ ہے تو بہتر ہے کہ ہم واپس مڑ کر ندی کے پار کسی کھلی جگہ پر پڑاؤ ڈال لیں اور فوج کے چند دستے راستہ بنانے کے کام پر لگا دیے جائیں۔ راستہ تیار ہو جانے کے بعد فوج کو کوچ کا حکم دینا بہتر ہو گا۔ ورنہ ان حالات میں اگر دشمن کسی جگہ گھات لگائے بیٹھا ہو تو وہ صرف پتھر برسا کر ہماری فوج کو تباہ کر سکتا ہے۔"

لیکن جگت نرائن ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ہر غلطی کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا "میں نے یہ دشوار گزار راستہ منتخب اس لیے کیا ہے کہ دشمن اس طرف سے بے پرواہو کر کسی اور

راستے پر پہرہ دے رہا ہو گا۔"

میں نے کہا "یہ ممکن ہے کہ دشمن کے کسی آدمی نے ہمیں ندی پر پل بناتے ہوئے دیکھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے یہ خبر دوسروں تک پہنچا دی ہو اور وہ عقب کے آسان راستے سے اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ چکے ہوں۔"

جگت نرائن نے بگڑ کر کہا۔ "میں تمھارے ساتھ بحث نہیں کرتا، اگر تمہاری ہمّت جواب دے چکی ہے تو تم واپس جا سکتے ہو۔ جب ہم کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے تو تمہیں اطلاع بھیج دی جائے گی کہ اب کوئی خطرہ نہیں، اس لیے تشریف لے آؤ۔"

اپنے ہونے والے خُسر کے منہ سے یہ الفاظ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ میں نے بگڑ کر کہا۔ "جب بہادری دکھانے کا وقت آئے گا تو آپ مجھے بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکیں گے۔"

جگر نرائن کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پہاڑ کی بلندی سے

ایک خوفناک آواز سنائی دی اور سپاہی جو ایک لمبی قطار میں سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھا رہے تھے، مبہوت ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میرے خدشات صحیح تھے۔ ہم پر پتھروں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد کسی کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ ہر شخص اپنے پاؤں کے نیچے چپّہ بھر زمین کو غیر محفوظ سمجھ کر دوسرے کو دھکیل کر اس کی جگہ پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو پیچھے تھے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ جو آگے تھے وہ پیچھے سمٹ رہے تھے۔ جو پتھروں کی لپیٹ میں آ گئے، وہ ندی کے آغوش میں پہنچ گئے لیکن بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے محض دہشت کی وجہ سے ندی میں چھلانگیں لگا دیں۔ جگت نرائن ایک درخت سے چمٹ کر پوری قوّت کے ساتھ چلّا رہا رہا تھا لیکن اسے شاید خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بالآخر سپاہیوں کو یہ احساس ہوا کہ اب پیچھے مڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں لیکن اس وقت تک تین چار سو آدمی کھڈ میں گر چکے تھے۔

جس خطرناک راستے پر ہم کانپ کانپ کر پاؤں رکھتے تھے، اب واپسی پر

ہم وہاں بھاگ رہے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ جگہ جگہ پہاڑ کا دامن درختوں اور جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا اور دشمنی بیشتر مقامات پر ہمیں اچھی طرح دیکھے بغیر اندھا دھند پتھر برسا رہا تھا لیکن ہر جگہ سپاہیوں کی افراتفری کا یہ عالم تھا کہ جتنے سپاہی پتھروں سے ہلاک ہو رہے تھے، ان سے کہیں زیادہ ایک دوسرے سے دھکے سے کھڈ میں گر رہے تھے۔ جوں جوں ہم پل کے قریب پہنچ رہے تھے پتھروں کی بارش کم ہوتی جا رہی تھی لیکن پل سے کوئی آدھ کوس کے فاصلے پر ہمارے سر پر جگہ جگہ ننگی چٹانیں تھیں اور چند آدمی ان چٹانوں پر ہمارے منتظر تھے اور پتھروں کے علاوہ تیر بھی برسا رہے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہاں چار پانچ سو گز کے اندر ہمارا نقصان پچھلے تمام راستے سے زیادہ تھا۔ ایک تیر میرے بازو پر لگا لیکن اس وقت میرے لیے ایسے زخموں کا احساس کرنا بھی مشکل تھا۔ اس خطرناک مقام سے آگے پل تک ہمارا راستہ کافی کشادہ تھا اور اوپر کی ڈھلوان بھی نسبتاً کم خطرناک تھی۔ اِکّادُکّا پتھر کہیں کہیں اب بھی گر رہے تھے لیکن اس طوفان کے بعد یہ ہمارے لیے زیادہ پریشانی کا باعث نہ تھے۔ لیکن ابھی تک ہر سپاہی کی یہ خواہش تھی کہ وہ پل عبور کرنے میں

دوسروں سے سبقت لے جائے۔ جگت نرائن کا ایک بیٹا میری آنکھوں کے سامنے پتھر سے گھائل ہو کر گرا تھا اور دوسرے کا کہیں پتا نہ تھا۔

اپنے راستے کے آخری موڑ پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ دشمن کے پچاس ساٹھ آدمی پل پر حملہ کر رہے ہیں اور ندی کے دوسرے کنارے مورچوں میں بیٹھے ہوئے ہمارے تیر انداز جو پل کی حفاظت پر متعین تھے انہیں دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہم نے کسی توقف کے بغیر ان پر حملہ کر دیا۔ یہ لوگ سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹے لیکن میں چند سپاہیوں کے ساتھ ان کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اب پل سے آگے کچھ دور تک پل کی ڈھلوان ناقابلِ گزر تھی اور سامنے سے تیروں کی بارش میں ان لوگوں کے لیے پل عبور کرنا مشکل تھا کیوں کہ پل پر سے بمشکل بیک وقت دو آدمی گزر سکتے تھے۔ دشمن نے یہ سمجھ کر کہ وہ ہمارے نرغے میں آ چکا ہے، جان توڑ مقابلہ کیا لیکن پندرہ بیس آدمیوں کے سوا جن میں سے بعض ہمارا گھیرا توڑ کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور بعض نے مایوسی کی حالت میں ندی میں چھلانگیں لگا دیں ہم نے کسی کو بچ

نکلنے کا موقع نہ دیا۔ تاہم ان تیس یا چالیس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل ہم اپنی نصف فوج ضائع کر چکے تھے۔

جگت نرائن اپنے حواس میں نہ تھا اور پاگلوں کی طرح اپنے بیٹوں کو آواز دے رہا تھا اور فوج انتہائی غیر منظم حالت میں پل عبور کر رہی تھی۔ مجھے پل کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں بھاگ کر پل کے قریب آ کھڑا ہوا۔ میری چیخ پکار سے سپاہیوں کی افراتفری قدرے کم ہو گئی لیکن ابھی دو سو سپاہی اسی طرف تھے کہ ہم پر پہاڑ کے دامن سے تیروں کی بارش ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی دشمن کے سینکڑوں آدمی نعرے لگاتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ اس نازک مرحلے پر پچاس ساٹھ نوجوانوں نے میرا ساتھ دیا اور ہم نے آگے بڑھ کر دشمن کا راستہ روک لیا۔ میری ران اور کندھے پر تلواروں کے دو زخم آئے اور میرے کئی ساتھی مارے گئے لیکن ہم نے دشمن کو پل کے قریب نہ آنے دیا۔ تھوڑی دیر میں باقی فوج پل پر سے گزر گئی اور میرے ساتھ پندرہ یا بیس آدمی رہ گئے۔ ہم لڑتے ہوئے الٹے پاؤں پل کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن دشمنی کے ایک

سخت حملے نے ہمارے پاؤں اکھاڑ دیے اور میرے ساتھیوں نے بیک وقت بھاگ کر پل عبور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ابھی پل پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ پل ٹوٹ گیا۔ میں نے فوراً ندی میں چھلانگ لگا دی۔ اس ندی سے بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ پل سے گزرنے والے بعض آدمی مجھ سے آگے جا چکے تھے اور چند ابھی ان گرتے ہوئے شہتیروں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے جن کے سرے ایک طرف سے ابھی تک مضبوط رسّوں سے پل کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ لیکن پانی کے ایک ریلے نے ان شہتیروں کو بھی اپنے آغوش میں لے لیا۔ ہم دشمن کے پتھروں اور تیروں کی زد میں تھے لیکن یا تو دوسرے کنارے سے ہمارے سپاہیوں کے تیروں کی بارش نے ان لوگوں کو منتشر کر دیا تھا اور یا ان لوگوں کے جنگی آئین ہم سے مختلف تھے اور انہوں نے ہماری موت یقینی سمجھ کر اپنے ہاتھ روک لیے تھے۔

میں ایک بھنور میں پھنس کر چند غوطے کھانے کے بعد اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو چکا تھا۔ قدرت نے میری مدد کی اور میں چند لمحات موت و

حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ایک بہتے ہوئے شہتیر کے ساتھ لپٹ گیا تاہم مجھے یقین تھا کہ میرا یہ سہارا عارضی ثابت ہو گا اور تند و تیز موجیں مجھ کسی چٹان پر پٹخ دیں گی۔ لیکن ندی کا پاٹ بتدریج تنگ اور پانی کی شوریدگی نسبتاً کم ہوتی گئی۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کناروں کی بلندی زیادہ ہوتی گئی۔ اب مجھے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کی خبر نہ تھی۔ یہ منظر اس قدر ہیبت ناک تھا کہ برسوں کے بعد آج بھی اس کے تصوّر سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شہتیر مجھے متعدد بار کبھی ایک اور کبھی دوسرے کنارے کے قریب لے گیا لیکن میں ان سیدھی دیواروں پر چڑھنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دل میں کبھی یہ خیال آتا تھا کہ اچانک کسی مقام پر ندی کا پاٹ کشادہ ہو جائے گا لیکن اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ میں کنارے لگنے کی بجائے پانی کی سطح سے اُبھرے ہوئے مہیب پتھروں کے ساتھ ٹکرا کر پاش ہو جاؤں اور یا پھر ندی اچانک کسی نشیب پر ایک آبشار میں تبدیل ہو جائے اور یہ میری آخری منزل ہو۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ میں کتنی دور آ چکا ہوں۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ زخموں کی تکلیف نے مجھے بے جان سا بنا دیا تھا اور

مجھے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اگر میں تھوڑی دیر اور پانی میں رہا تو کسی اور حادثے کا سامنا کیے بغیر ہی ختم ہو جاؤں۔ ایک جگہ ندی کا پاٹ کچھ کشادہ نظر آیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بلندی سے گرتے ہوئے پانی کا شور سنائی دینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ ندی کے سامنے ایک بلند چٹان آ گئی ہے۔ اس نے پانی کے بہار کا رُخ یک دم بدل دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں مَیں ایک گول دائرے کی شکل کی ایک چھوٹی سی جھیل میں داخل ہو چکا تھا۔ اُسے جھیل کی ایک بہت بڑا کنواں کہوں تو زیادہ صحیح ہو گا۔ ندی کا پانی ایک مہیب گرداب کی شکل میں اس کنوئیں کے اندر چکر لگانے کے بعد اچانک دائیں ہاتھ ایک کھڈ میں گرتا تھا۔ صرف پانی کا شور سن کر ہی میرے لیے اس کھڈ کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ میں گرداب میں پھنس کر بلند کناروں کے ساتھ ساتھ چکر لگاتا ہر ثانیہ آبشار کے قریب جا رہا تھا لیکن ایک جگہ مجھے کنارے کی چٹان سے آگے نکلی ہوئی ایک سل دکھائی دی جو پانی کی سطح سے بالشت بھر اونچی تھی۔ اس سل سے اوپر چند چھوٹے چھوٹے زینے بنے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے چٹان کے اندر ایک شگاف نظر آ رہا تھا۔

۳

قدرت نے موت کے منہ سے چھیننے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ گرداب کا چکر شہتیر کو دھکیلتا ہوا اس سِل کے قریب لے گیا۔ زندہ رہنے کی امید نے میرے نڈھال جسم میں ایک نئی قوّت پیدا کر دی اور میں شہتیر چھوڑ کر سِل پر چڑھ گیا۔"

عبدالواحد نے یہاں تک کہہ کر قدرے توقّف کے بعد رنبیر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میں پھر تفصیلات میں چلا گیا۔ آپ اُکتا تو نہیں گئے؟"

رنبیر نے چونک کر جواب دیا۔ "نہیں نہیں، ایسی داستان میں ساری رات بیٹھ کر سن سکتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں خود موت کے منہ سے بچ کر نکلا ہوں۔"

عبدالواحد نے دوبارہ اپنی سرگذشت شروع کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ دیر سِل پر بیٹھا میں اپنے گرد و پیش سے متعلق سوچتا رہا۔ سِل پر چھوٹے چھوٹے گڑھے جو پانی بھرنے کے مٹکوں کی رگڑ سے بنے ہوئے معلوم

ہوتے تھے اور سِل سے اوپر گھسی ہوئی سیڑھیاں اس جگہ انسانوں کی آمد ورفت کی گواہی دے رہی تھیں۔

مجھے یقین تھا کہ میں اس راستے سے باہر نکلتے ہی کسی بستی کے قریب پہنچ جاؤں گا لیکن اس علاقے کی کسی بستی کا تصوّر میرے لیے کم خطرناک نہ تھا۔ اوپر فضا کا رنگ بتا رہا تھا کہ شام ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ سردی سے سُن اور زخموں سے نڈھال ہونے کے باعث مجھ میں چند قدم چلنے کی ہمّت نہ تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ اندیشہ تھا کہ شام ہو جانے سے پہلے اگر میں نے کوئی جائے پناہ تلاش نہ کی تو میں رات بھر سردی میں ٹھٹھر کر مر جاؤں گا۔ بالآخر میں لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور چٹان میں تراشے ہوئے زینوں پر چڑھنے لگا۔ چند قدم اُٹھانے کے بعد ایک اور بازو کے زخموں کی ناقابلِ برداشت تکلیف کے باعث میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تاہم میں نے ہمّت نہ ہاری اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا اور چڑھتا گیا۔ میں نے ابھی پندرہ بیس قدم اٹھائے تھے کہ مجھے کچھ دور سے ایک آواز سنائی دی۔ میں چند لمحے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ مجھے

محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی دھیمے لے میں گنگناتا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے اپنا خنجر، جو ابھی تک میری کمر سے لٹک رہا تھا، نکال لیا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ آنے والا مجھے اوپر سے دیکھتے ہی شور مچانا شروع کر دے گا اور آن کی آن میں اس کے کئی مددگار جمع ہو جائیں گے۔ اس لیے میں اگر دوبارہ نیچے پہنچ جاؤں تو اس پر آسانی کے ساتھ بے خبری کی حالت میں حملہ کر سکوں گا۔ چنانچہ میں دوبارہ بڑی مشکل سے اسی جگہ پہنچا اور تنگ گزر گاہ سے ایک طرف چٹان کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ہر لمحہ میری تکلیف میں اضافہ کر رہا تھا۔

گنگنانے والے کی آواز قریب آتی گئی۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ یہ کسی مرد کی نہیں بلکہ عورت کی آواز ہے۔ لیکن ان حالات میں میرے لیے ایک بچہ بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔ بالآخر ایک لڑکی مٹکا اٹھائے نمودار ہوئی اور میری طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ کر سِل کے کنارے بیٹھ گئی اور زانو کے بل آگے جھک کر مٹکے میں پانی بھرنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ مٹکا اٹھا کر واپس مُڑتے وقت وہ مجھے ضرور دیکھ لے گی اور میں اسے آسانی کے ساتھ

دھکا دے کر خوفناک گرداب میں پھینک سکوں گا۔ لیکن سماج کے دیوتاؤں کا پجاری ہونے کے باوجود میری ہمّت جواب دے گئی۔ میں سِل کے کنارے سے ہٹ کر زینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے مٹکے کو پانی سے نکال کر سِل پر رکھ دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ معاً اس کی نے میری طرف دیکھا اور ایک ہلکی سی چیخ کے بعد مبہوت سی رہ گئی۔ وہ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی۔

میں نے اپنا خنجر نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈرو نہیں، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن اگر تم نے شور مچایا تو میں تم پر ہاتھ اُٹھانے سے دریغ نہیں کروں گا۔“

لڑکی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم۔۔۔۔ تم کون ہو؟“

میں نے کہا۔ ”تم صرف میرے سوال کا جواب دو۔ تمہارے پیچھے کوئی اور بھی اس طرف آرہا ہے؟“

وہ بولی۔ ”نہیں، لیکن اگر تم نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں ندی میں

چھلانگ لگا دوں گی۔"

مجھ میں اب کھڑا رہنے کی ہمّت نہ تھی۔ میں نے سِل سے اوپر ایک زینے پر بیٹھتے ہوئے لڑکی سے پوچھا۔ "تمہاری بستی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "بہت نزدیک ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ شام تک بستی کے کئی لوگ یہاں سے پانی لینے آئیں گے۔"

"نہیں، بستی خالی ہو چکی ہے۔ لوگ جنگلوں کی طرف بھاگ گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم صرف سچ بول کر اپنی جان بچا سکتی ہو۔ میرا وعدہ ایک راجپوت کا وعدہ ہے۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں سچ بول رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "میں یہ کیسے مان سکتا ہوں کہ بستی کے لوگ تمہاری عمر کی ایک لڑکی کو تنہا چھوڑ کر جا چکے ہیں۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں اپنے دادا کے ساتھ ہوں۔ وہ اندھے ہیں۔ اُسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میرا بھائی بھی ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اگر وہ آجاتا تو شاید ہم بھی دادا کو لے کر کہیں نکل جاتے۔“

لڑکی کے الفاظ سے زیادہ اس کے آنسوؤں نے مجھے لاجواب سا کر دیا۔ تاہم مجھے پوری طرح اطمینان نہ ہوا۔ میں نے کہا۔ ”تم شام تک یہاں رہو گی، اگر کوئی اس طرف آیا تو میں تمہیں ندی میں پھینک دوں گا اور اگر تمہاری باتیں درست ثابت ہوئیں تو میں یہاں سے کچھ دور تک تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“ میرے ان الفاظ نے لڑکی کا خوف نفرت اور حقارت میں بدل دیا۔ وہ بولی۔ ”نہیں تم مجھے قتل کر سکتے ہو لیکن میں تمہیں اپنے دادا کے پاس لے کر نہیں جاؤں گی، میں اُسے ایسی جگہ چھوڑ کر آئی ہوں جہاں سے تم اسے تلاش نہیں کر سکتے۔“

میں نے سوچا اگر میں نے تھوڑی دیر اور کوئی جائے پناہ تلاش نہ کی تو رات ہو جائے گی اور میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ اگر میں تاریکی میں باہر نکلا تو میرے لیے اپنے اردگرد کا جائزہ لینا مشکل ہو گا۔ پھر اگر میں نے کوئی

راستہ تلاش کر بھی لیا تو چلنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ لڑکی میری آخری امید تھی۔ اس کی مدد کے بغیر میرے لیے اگلی صبح کا سورج دیکھنے کا امکان نہ تھا۔ بے بسی کے احساس نے میرے نسلی غرور کے قلعے مسمار کر دیے تھے اور لڑکی کی نگاہیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ میری جسمانی تکلیف کا اندازہ لگا چکی ہے۔ وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم نگر کوٹ کی فوج کے سپاہی ہو۔ میں تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ تمہارے دیوتا تمہارے ہاتھوں پر بے کس انسانوں کا خون دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم میری جان لینے کا فیصلہ کر چکے ہو تو جلدی کرو۔ تمہارے ہاتھ میں خنجر ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ لیکن اگر دیوتاؤں کی پوجا کے باوجود انسانیت تمہیں ایک عورت پر ہاتھ اٹھانے سے روکتی ہے تو میرا راستہ چھوڑ دو۔ یہ علاقہ درندوں سے خالی نہیں۔ سورج غروب ہوتے ہی بستی کے راستے پر کئی شیر اور چیتے پہرہ دینے لگتے ہیں۔“

میں نے اپنا خنجر پھینک دیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور اس کا راستہ چھوڑ کر کہا۔ ”تم جا سکتی ہو۔“

میری یہ حرکت اس کے دل پر اثر کیے بغیر نہ رہی۔ اس نے قدرے تذبذب کے بعد گھڑا اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور زینے پر پاؤں رکھنے کے بعد مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم زخمی ہو۔“ میں نے جواب دینے کی بجائے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بولی ”تم رات یہاں نہیں گزار سکتے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

میں کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے چل دیا۔ چڑھائی بہت سخت تھی اور میں بڑی مشکل سے سنبھل سنبھل کر پاؤں اُٹھا رہا تھا۔ ہر پندرہ بیس قدم کے بعد میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تازہ دم ہونے کے لیے بیٹھ جاتا اور وُہ رُک کر میرا انتظار کرنے لگتی۔ تھوڑی دیر میں تنگ تاریک راستہ طے کرنے کے بعد ہم کھلی جگہ پہنچ گئے۔ میرے بائیں ہاتھ سرسبز پہاڑ تھا۔ دائیں ہاتھ نیچے وہ تاریک کھڈ تھی جس میں آبشار گرتی تھی اور سامنے پہاڑ کے نشیب میں چیڑ کے درمیان چند جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں لیکن اب مجھ میں چلنے کی ہمّت نہ تھی۔ میں سرسبز گھاس پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ لڑکی گھڑا نیچے رکھ کر میرے قریب آ کر کھڑی ہوئی اور مجھے

تسلّی دیتے ہوئے بولی۔ ”ادھر دیکھیے وہ ہماری بستی ہے۔ ذرا ہمّت سے کام لیجئے۔ میں حیران ہوں کہ آپ اس حالت میں وہاں کیا کر رہے تھے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”میں ندی میں بہتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور شاید کسی دیوتا کا انتظار کر رہا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد میں پھر اُٹھ کر چلنے لگا۔ جوں جوں میں بستی کے قریب ہو رہا تھا۔ میرے خدشات دور ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے مجھے سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھی اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ کسی دشمن کا ہاتھ نہیں۔ بستی سے باہر ایک نحیف اور لاغر بوڑھا درد بھری آواز میں ”آشا آشا!“ پکارتا ہوا اِدھر اُدھر جھانک رہا تھا۔ لڑکی نے اسے آواز دی۔ ”بابا! میں آگئی ہوں۔“

بوڑھے نے ہاتھ پھیلا کر بے اختیار آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! بہت دیر لگائی تم نے۔ اگر تھوڑی دیر اور نہ آتیں تو میں شاید بھٹکتا ہوا کسی کھڈ میں جا گرتا۔“ لڑکی نے مجھے چھوڑ کر بوڑھے کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے ایک جھونپڑی کی طرف گئی اور میں پاس ہی سوکھی ہوئی گھاس کے ڈھیر پر لیٹ

گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں کھولیں تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں وہاں سے اُن کی جھونپڑی تک کیسے پہنچا۔ رات کے پچھلے پہر مجھے ہوش آیا تو میں ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا اور میرے زخموں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں آگ سلگ رہی تھی۔ میرے قریب دوسری چارپائی پر کوئی اور سو رہا تھا۔ میں نے شدّت کی پیاس محسوس کرتے ہوئے پانی مانگا۔ آشا جو شاید ساری رات نہیں سوئی تھی، میری آواز سنتے ہی برابر کے کمرے سے نکلی اور مجھے پانی دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ رات کے بھوکے ہیں، میں نے آپ کے لیے دودھ رکھ چھوڑا تھا۔ ابھی گرم کرتی ہوں۔“ وہ دودھ گرم کرنے بیٹھ گئی اور میرا دل شرم اور ندامت کے بوجھ سے پسا جا رہا تھا۔ بوڑھا جو میرے قریب لیٹا ہوا تھا اس نے میرا بستر ٹٹولنے کے بعد میری پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بخار ابھی کم نہیں ہوا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ جوانی کے زخم بہت جلد بھر جاتے ہیں۔“

تیسرے دن میرا بخار قدرے کم ہو گیا اور میں کسی حد تک اطمینان سے اپنے محسنوں کے ساتھ باتیں کر سکتا تھا۔ بوڑھے نے مجھ سے ابھی تک کوئی ایسا سوال نہیں پوچھا تھا جس کا جواب دینا میرے لیے تکلیف دہ ہوتا۔ غالباً آشا اسے میرے میرے متعلق یہ بتا چکی تھی کہ میں ان کے بد ترین دشمنوں کی فوج کا ایک سپاہی ہوں۔ اس نے مجھ سے یہ بھی نہ پوچھا کہ میں کب اور کیسے زخمی ہوا ہوں۔ میں اس کے لیے صرف ایک بے بس انسان تھا۔

اسی دن جب آشا ندی سے پانی لینے گئی تو میں نے اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کرتے ہوئے بوڑھے سے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں، میں کون ہوں؟“

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر حالات مجھے اس حالت میں یہاں نہ لے آتے تو اب تک میری تلوار ان پہاڑیوں میں کئی انسانوں کا خون بہا چکی ہوتی۔“

”مجھے معلوم ہے۔ لیکن میں تمہیں مجرم نہیں سمجھتا۔ تم نے جس سماج کی گود میں آنکھ کھولی ہے وہ صرف تمہیں تلوار سے وار کرنا سکھاتا ہے۔ انسانیت کی پکار سننے کے لیے کان نہیں دے سکتا۔ تم ان دیوتاؤں کے سپاہی ہو جو اپنے پجاریوں کے سینوں سے دل نکال لیتے ہیں اور اس کی جگہ پتھر رکھ دیتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اور آپ اس پتھر کے دل والے انسان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”نہیں بیٹا! پتھر کا دل تو اسی وقت چکنا چور ہو گیا تھا جب تمہارے ہاتھوں نے آشا پر وار کرنے سے انکار کر دیا۔ اب میں تمھارے سینے میں ایک انسان کے دل کی دھڑکنیں سن رہا ہوں۔ لیکن اگر یہ نہ بھی ہوتا تو بھی تمہاری تیمار داری ہمارا فرض تھا۔ تم اس اجڑی ہوئی بستی میں ایک دشمن کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے آئے ہو۔ کاش میری آنکھیں ہوتی اور میں تمہاری خدمت کر سکتا۔“

اس کے بعد میں بوڑھے سے خاصا بے تکلّف ہو چکا تھا۔ اس کی باتوں سے

مجھے معلوم ہوا کہ اس بستی کے کچھ لوگ نگر کوٹ کی افواج کی پیش قدمی روکنے کے لیے جنوب کی طرف جا چکے تھے کہ شمال کی جانب سے نگر کوٹ کی ایک اور فوج کی پیش قدمی کی خبر ملی۔ چنانچہ بستی کے لوگ خوفزدہ ہو کر جنگل کی طرف بھاگ نکلے اور صرف ایسے لوگ یہاں رہ گئے جن کے عزیز جنوب میں محاذ پر گئے ہوئے تھے۔ لیکن جب ان لوگوں کو یہ اطلاع ملی کہ نگر کوٹ کی فوج ندی پر پل تعمیر کر کے آگے بڑھنا چاہتی ہے تو وہ بھی راتوں رات رفوچکر ہو گئے۔ بوڑھے نے آشا کو سمجھایا کہ وہ بھی ان لوگوں کے ہمراہ چلی جائے لیکن اس نے اپنے اندھے بابا کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اب یہ دونوں یہاں پر آشا کے بھائی کا انتظار کر رہے تھے۔

میں بوڑھے کو ندی عبور کرنے کے بعد جو لڑائی ہوئی اس کے حالات سنائے تو اس نے کہا۔ ”مجھے امید نہیں کہ اس جنگ میں ہماری بستی کے کسی آدمی نے حصّہ لیا ہو۔ جن جوانوں میں لڑنے کی ہمّت تھی، وہ پہلے ہی جنوب کی طرف جا چکے ہیں۔ لوگ جنہوں نے اس درجہ بہادری سے تمہاری فوج کا مقابلہ کیا ہے شمال کی اور مشرق کی بستیوں سے آئے ہوں گے۔“

بستی کے لوگ فرار ہوتے وقت اپنے بہت سے مویشی چھوڑ گئے تھے جو اِدھر اُدھر چرنے کے بعد شام کے قریب بستی میں جمع ہو جاتے اور آشا انہیں درندوں سے محفوظ رکھنے کے لیے رات کے وقت چند گھروں میں بند کر دیتی اور علی الصبح چھوڑ دیتی لیکن درندے بعض دفعہ دن کے وقت بھی بستی کے آس پاس دو چار مویشی ہلاک کر دیتے۔ ان حالات میں آشا کا پانی لینے ندی پر جانا خطرے سے خالی نہ تھا لیکن بارش نہ ہونے کے باعث بستی کے قریب ایک چھوٹا سا چشمہ سوکھا پڑا تھا اور وہ جوہڑ جس میں بستی کے لوگ مویشیوں کے لیے پانی جمع رکھتے متعفن ہو گیا تھا اور اس کا پانی انتہائی مجبوری کی حالت میں بھی پینے کے قابل نہ تھا۔

آشا پانی لے کر آئی تو بہت بدحواس ہو رہی تھی۔ ہم نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ جب وہ پانی لے کر واپس آ رہی تھی تو راستے سے تھوڑی دور ایک شیر گائے کو پھاڑ کر اس کا گوشت نوچ رہا تھا۔

میں نے کہا ”ہم اس پانی سے تین چار دن گزاریں گے۔ اس کے بعد میں خود پانی لانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ آشا کو اب وہاں نہیں جانا چاہیے۔“

آشا نے مسکرا کر کہا۔ "درندے انسان پر انتہائی بھوک کی حالت میں حملہ کرتے ہیں اور اب آس پاس اتنے مویشی ہیں کہ کوئی درندہ بھوکا نہیں رہا ہو گا۔"

بوڑھا اُٹھ کر لاٹھی کے سہارے باہر نکلا اور تھوڑی دیر میں اندر آ کر کہنے لگا۔ "آشا کو اب وہاں نہیں جانا پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ کل تک بارش ضرور ہو جائے گی۔"

میں نے لیٹے لیٹے کہا۔ "باہر بادل تو معلوم نہیں۔"

وہ بولا۔ "ہوا بتا رہی ہے کہ بادل ابھی آ جائیں گے۔"

شام کے قریب میں بادلوں کی گرج سن رہا تھا اور آشا کہہ رہی تھی۔ "میرے بابا کی باتیں کبھی جھوٹ نہیں ہوتیں۔"

تھوڑی دیر بعد میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا موسلا دھار بارش کی آواز سُن کر اس لیے خوش ہو رہا تھا کہ آشا کو اب پانی لانے کے لیے ندی پر نہیں جانا پڑے گا۔

ان حالات میں میرے دل میں کسی بد صورت لڑکی کے لیے بھی غایت درجہ کا انس پیدا ہو جانا یقینی تھا اور آشا کی شکل و صورت تو ایسی تھی کہ اگر میں اسے کہیں راہ چلتے بھی دیکھ لیتا تو بھی میری نگاہیں عمر بھر بھٹکتی رہتیں۔ میں اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر یوں محسوس کرتا کہ بستی کی اداس اور مغموم فضائیں مسرّت کے قہقہوں سے لبریز ہو گئی ہیں لیکن یہ مسکراہٹیں تاریک بادلوں سے گزرنے والے چاند کی طرح عارضی ہوتیں، اس کا چہرہ عام طور پر مغموم رہتا اور اس کے غم کی وجہ اس کے بھائی کی غیر حاضری تھی۔ آشا کے انتظار کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر صبح اس کے حصّے کا کھانا رکھ چھوڑتی اور جب شام ہو جاتی تو بھائی کے لیے رکھی ہوئی باسی روٹی خود کھا لیتی اور اپنے حصّے کا کھانا اس کے لیے سنبھال کر رکھ لیتی تھی کہ شاید وہ رات کو کسی وقت آ جائے۔

۴

جوں جوں دن گزر رہے تھے میرا یہ اندیشہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جگت نرائن شکست کا بدلہ لینے کے لیے ضرور کوئی نیا محاذ منتخب کرے گا۔ وہ اس بستی

سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ اگر وہ اس طرف آنکلا تو خالی جھونپڑوں کو آگ لگانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اپنے لڑکوں کی موت نے اسے پاگل بنادیا ہو گا۔ یہ ممکن نہیں کہ میری مداخلت سے وہ آشا اور اس کے اندھے دادا پر اپنا غصّہ نکالنے سے باز رہ سکے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میری طرف سے بغاوت کی صورت میں میرے اپنے سپاہی میرا ساتھ دیں لیکن اس کا انجام کیا ہو گا؟ اگر بغاوت کی دھمکی سے جگت نرائن اور اس کے ساتھ باقی سردار آشا اور اس کے دادا پر ہاتھ اٹھانے سے باز آ بھی گئے تو بالآخر یہ معاملہ پروہت اور راجہ کے سامنے پیش ہو گا۔ یہ قیدیوں کی حالت میں وہاں پیش ہوں گے اور جو لوگ اس جنگ میں مارے گئے ہیں ان کے عزیز ان بے گناہوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سزا کا مطالبہ کریں گے۔ نگر کوٹ میں میرا کوئی دوست نہ ہو گا۔

ساتویں روز میں بستر سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ آشا علی الصبح اپنے مکان سے باہر ایک گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔ میں اپنے بستر سے اٹھ کر باہر نکلا اور اس کے پاس ایک درخت سے ٹیک لگا

کر بیٹھ گیا۔ وہ دودھ دوہ کر اٹھی تو میں نے کہا۔ ”آشا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

اس نے دودھ کا برتن میرے قریب رکھتے ہوئے کہا۔ ”کہیے!“

میں نے کہا۔ ”آشا تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ نگر کوٹ کی فوج جنوب یا شمال سے اس طرف ضرور آئے گی۔“

وہ بولی۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنے اندھے دادا کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں؟“

”نہیں آشا! تمہارے دادا کی مدد کے لیے میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”لیکن آپ چلنے کے قابل نہیں ہوئے اور اگر آپ اس قابل ہوتے بھی تو ہم سُندر کا انتظار کے بغیر کیسے جاسکتے ہیں۔“ سندر اس لڑکی کے بھائی کا نام تھا۔

میں نے جواب دیا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کسی محفوظ جگہ

پہنچا کر پھر اس بستی میں واپس آ جاؤں گا۔ اور جب تمہارا بھائی آئے گا تو اسے تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔"

وہ بولی۔ "لیکن ابھی آپ اچھی طرح چل نہیں سکتے۔ پھر آپ خود یہ کہتے ہیں کہ نگر کوٹ کی فوج برفانی پہاڑوں تک ہمارے لوگوں کا تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ممکن ہے کسی جنگل میں ہم اپنے آدمیوں کو تلاش کر لیں۔ لیکن جب آپ کی فوج اس طرف جائے گی تو لوگ وہاں بھی اس بستی کی طرح ہمیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ بابا میرا ہاتھ پکڑ کر بھی چند قدم سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ ہمارا ساتھ کوئی نہیں دے گا اور ہم اگر آپ کی فوج کے ہاتھوں سے بچ بھی گئے تو تنہا جنگل میں بھٹکتے ہوئے درندوں کا شکار ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس صورت میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ لیکن تمہارا یہاں سے نکالنا ضروری ہے۔ اگر بھگوان کو منظور ہوا تو تمہارا بھائی تم سے آ ملے گا لیکن تم ایک عورت ہو۔ تم نے دیکھا ہے کہ چیتے کس بے دردی کے ساتھ مویشیوں کو ہلاک کرتے ہیں، وہ لوگ جنہیں میں جانتا ہوں

چیتوں سے زیادہ بے رحم ہیں چیتے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد آرام سے بیٹھ جاتے ہیں لیکن ہمارے سماج کے بیٹوں کے دلوں سے انسانوں کے خون کی پیاس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اگر مجھے صرف اس بات کا یقین ہو کہ میں اپنی جان پر کھیل کر تمہیں بچا سکوں گا تو میں تمہیں یہ مشورہ نہ دیتا لیکن تمہارا واسطہ بھیڑیوں سے ہے۔ انسانوں سے نہیں۔ جب تمہارا بھائی آئے گا تو باقی بستی کی طرح اپنا گھر خالی دیکھ کر یہی سمجھے گا کہ تم بستی کے لوگوں کے ساتھ جا چکی ہو۔ میں پھر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ تمہیں ڈھونڈ نہیں لے گا میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہارے ساتھ رہوں۔ اپنی جان بچاؤ آشا! اگر اپنے لیے نہیں تو میرے لیے۔"

آخری الفاظ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہہ دیے۔ آشا نے بغور میری طرف دیکھا اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے میری جان کی قیمت بہت بڑھا دی ہے۔ میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تو ہم کل صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل چلیں۔"

وہ بولی۔ ”اتنی جلدی نہ کیجئے، ابھی آپ نہیں چل سکیں گے۔“

میں نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”میری فکر نہ کرو۔ اگر میری ٹانگ کی تکلیف بڑھ گئی تو ہم ابتدائی منزلیں ذرا آرام سے طے کر لیں گے۔ میں ابھی تمہارے دادا سے بات کرتا ہوں۔“

آشا اُٹھ کر اندر جانے کو تھے کہ آشا اچانک بدحواس سی ہو کر ”بھیا بھیا!“ کہتی ہوئی ایک طرف بھاگنے لگی۔ کوئی تیس چالیس قدم دور ایک نوجوان دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبائے لڑکھڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ بری طرح زخمی ہے۔ میں بھی بھاگ کر آگے بڑھا اور ہم اسے سہارا دے کر مکان کی طرف لے آئے۔ آشا کا دادا باہر نکل کر چلّا رہا تھا۔ ”آشا آشا! کہاں ہے تمہارا بھیا!“ اور سندر نحیف آواز میں آشا سے کہہ رہا تھا۔ ”آشا تم بھاگ جاؤ، مجھے چھوڑ دو۔ اب مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ جلدی کرو آشا تم بھاگ جاؤ۔ وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ ابھی پہنچ جائیں گے۔“ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر وہ ایک زور دار جھٹکے سے اپنے آپ کو ہماری گرفت سے آزاد کرتے ہوئے چلّایا۔ وہ

مشرقی اور جنوب کی طرف سے اس بستی کے گرد گھیر اڈال رہے ہیں۔ تم ندی کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف جنگل میں پہنچ جاؤ۔ وہاں چند ساتھی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب جلدی کرو سوچنے کا وقت نہیں، بابا آشا کو سمجھاؤ۔" ان الفاظ کے ساتھ سندر کے منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی زندگی کا سفر ختم کر چکا تھا۔ پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر نکلی ہوئی انتڑیوں کو ہاتھوں کا سہارا دے کر یہاں تک پہنچنا انسان کی قوّت سے بعید تھا۔ آشا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں بھی مبہوت سا ہو کر اس خوش وضع نوجوان کی لاش دیکھتا رہا لیکن اچانک میں نے ایک جھر جھری لی اور ایک ہاتھ سے آشا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے دادا کا ہاتھ پکڑ کر ندی کی طرف چل دیا۔ آشا اضطراری حالت میں چند قدم اٹھانے کے بعد رُک گئی اور اس نے چلّا کر کہا۔ "نہیں میں اپنے بھائی کی لاش چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" بوڑھا بھی زمین پیٹھ گیا۔ میں نے کہا "بابا یہ آشا کی جان بچانے کا آخری موقع ہے۔ بھگوان کے لیے اپنے پوتے کی آخری خواہش پوری

کرنے سے انکار نہ کرو۔"

بوڑھے نے کہا۔ "اگر تم آشا کی جان بچا سکتے ہو تو اسے لے جاؤ۔ اب میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اب میری ٹانگوں میں میرا بوجھ اٹھانے کی ہمّت نہیں رہی۔ آشا بیٹی جاؤ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔" میں آشا کو پکڑ کر کھینچے لگا اور وہ دھاڑیں مارتی ہوئی میرے ساتھ چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد زندہ رہنے کی خواہش اس کے ہر زخم پر غالب آچکی تھی اور وہ میرے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ مجھے کچھ دیر اپنی جسمانی تکلیف کا احساس نہ ہوا لیکن کوئی آدھ کوس چلنے کے بعد میری ہمّت آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ندی کے کنارے کنارے پہاڑ کے نشیب میں کوئی ایک کوس کا فاصلہ طے کیا اور ہم ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ اب آشا میرا ساتھ دینے کی بجائے میری رہنمائی کر رہی تھی۔ اچانک گھنے درختوں کی اوٹ سے پانچ مسلح نوجوان نمودار ہوئے اور ہمارا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ یہ وہی تھے جن کا آشا کے بھائی نے پتہ دیا تھا۔ ایک نوجوان نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور اپنی کلہاڑی بلند

کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہو؟“

میں نے کہا ”میں آشا کو تمہارے پاس پہنچانے کے لیے آیا ہوں۔ اب باتوں کا وقت نہیں، آشا میرے متعلق یہ بتا سکے گی کہ میں تمہارا دشمن نہیں۔ تم اب اسے کسی محفوظ جگہ لے جاؤ۔“ پھر میں نے آشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آشا! میرے لیے تمہارے ساتھ بھاگنا مشکل ہے۔ میں اس بستی کی طرف واپس جاتا ہوں۔ ممکن ہے میں تمہارے بابا کی جان بچا سکوں۔“

ایک نوجوان نے سُندر کے متعلق پوچھا۔ میں نے جواب دیا ”سندر مر چکا ہے۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شمال کی طرف سے نگر کوٹ کی دوسری فوج نیچے کے کسی مقام سے ندی عبور کرکے اس طرف نہ آ رہی ہو۔ اس لیے دن کے وقت تمہارے لیے ندی کے کنارے چلنے کی بجائے جنگل میں چھپ کر چلنا بہتر ہوگا۔“

آشا جیسے خواب کی حالت میں ہماری باتیں سن رہی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر پتھرائی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی ان آدمیوں کے ساتھ

چل پڑی اور میں ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔

۵

واپسی پر انتہائی کوشش کے باوجود میری رفتار بہت سُست تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے فوج کے چند دستے بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ چند سپاہی مجھے دور سے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے جگت نرائن کے ماتحت لڑنے والی فوج کے حالات پوچھنے لگے۔ میں کوئی جواب دیے بغیر آشا کے گھر کی طرف بڑھا۔ سندر کی لاش کے قریب اس کے دادا کی لاش پڑی تھی۔ لیکن یہ دونوں لاشیں اس حد تک مسخ کر دی گئیں تھیں کہ میرے لیے ان کا پہچاننا مشکل تھا۔ ایک سردار آگے بڑھ کر بے اختیار میرے ساتھ لپٹ گیا اور کہنے لگا۔ ''بھگوان کی کرپا ہے کہ تم زندہ ہو۔ ہم نے تمہارے متعلق بہت بری خبر سنی تھی۔ کہاں سے آرہے ہو تم؟ جگت نرائن نے ہمیں پیغام بھیجا تھا کہ دشمن اس علاقے میں جمع ہو رہا ہے، لیکن اس بستی میں ہمیں ایک لاش اور ایک اندھے کے سوا کچھ نہیں

ملا۔ ہم نے بستی پر حملہ کرنے سے پہلے دشمن کے لیے پہاڑ کی طرف جانے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نیچے جنگل کی طرف بھاگ گئے ہوں گے۔"

میں نے اسے کوئی جواب دینے کی بجائے کہا۔ "اس اندھے کو مارنے میں کیا فائدہ تھا؟"

اس نے کہا۔ "ارے یار وہ کمبخت بڑا ضدّی تھا۔ ہم اس سے بستی کے لوگوں کے متعلّق پوچھنا چاہتے تھے لیکن وہ ہمیں پاگلوں کی طرح گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر مکّا مارا اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ شاید پہلے ہی مرنے کے لیے کسی بہانے کا منتظر تھا لیکن تم نے نہیں بتایا کہ کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصّہ ضبط کیا اور پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ کر اُسے جواب دیا۔ "میں زخمی تھا اور یہاں پاس ہی ایک جگہ چھپا ہوا تھا۔"

وہ بولا۔ "تو آپ کو یہ خبر نہیں کہ سردار جگت نرائن کی فوج یہاں کب

پہنچے گی؟ ہمیں سینا پتی نے یہ ہدایت کی تھی کہ ہم یہاں ان کا انتظار کریں۔ ان کے مطابق انہیں آج ہی یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ سیناپتی خود بھی اس طرف آ رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی فوج کی تباہی نے ہمارے تمام ارادے بدل دیے ہیں اور ہمیں وہ کامیابی جس کی امید تھی نصیب نہیں ہو سکی۔“

میں نے نفرت اور حقارت کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ ”کیا ایک اندھے کو مار دینا آپ کے نزدیک کامیابی نہیں؟“

سردار نے کہا۔ ”اگر آپ کا مطلب ہے کہ بستی کے لوگ ہماری کسی بے تدبیری کے باعث بچ گئے ہیں تو یہ غلط ہے۔ ہمیں صرف جنوب اور مشرق کی طرف سے اس بستی کے گرد گھیرا ڈالنے کی ہدایت کی گئی تھی اور اس طرف ہم نے دشمن کے لیے فرار ہونے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ سردار جگت نرائن نے ہمیں اطلاع بھیجی تھی کہ وہ نیچے کے کسی مقام سے ندی عبور کر کے دشمن کے لیے مغرب کے جنگل میں پناہ لینے کے تمام راستے بند کر دے گا۔ اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک

یہ کہ دشمن نے کسی جگہ پل بنا کر ندی عبور کر لی ہے اور وہ سردار جگت نرائن کی بے خبری سے فائدہ اُٹھا کر شمال کی طرف کہیں دور نکل گیا ہے۔ دوسری یہ کہ انہوں نے اپنی اطلاع کے مطابق ندی عبور کر کے مغرب کے جنگل کی طرف دشمن کے فرار ہونے کا راستہ بند نہیں کیا اور دشمن کو بھاگنے کا موقع مل گیا ہے، تاہم مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جنگل میں ہیں تو ہم انہیں بھیڑوں کی طرح گھیر کر مار سکیں گے۔ ہمارے سیناپتی ان لوگوں کے ساتھ نمٹنا جانتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ ہم نے دشمن کو کئی شکستیں دینے کے بعد اس پہاڑ کے پیچھے کئی کوس وسیع علاقہ صاف کر دیا ہے۔"

سردار یہ سمجھ کر میں جگت نرائن کی شکست کے ذکر سے چڑ گیا ہوں، مجھے اور زیادہ مرعوب کرنے کے لیے اپنی فتوحات کی تفصیلات سنا رہا تھا لیکن میرے خیالات کہیں اور تھے۔ میں صرف آشا کے متعلق سوچ رہا تھا اور انتہائی عاجزی کے ساتھ بھگوان سے دُعا مانگ رہا تھا کہ وہ جگت نرائن کی فوج کے جنگل میں داخل ہونے سے پہلے کہیں دور نکل جائے۔ میں ان

دیوتاؤں کو بھی آشا کی مدد کے لیے بلا رہا تھا جن کی تقدیس کے متعلق میرے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہو چکے تھے لیکن میری دعا قبول نہ ہوئی۔ شام سے کچھ دیر پہلے جگت نرائن اپنی فوج کے ساتھ اس بستی میں پہنچ گیا۔ آشا اس کے قیدیوں کے ساتھی تھی۔ مجھ میں یہ ہمّت نہ تھی کہ میں اس کے سامنے جا سکوں۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس وقت دیوانگی سے کام لیا تو آشا کو بچانے کے رہے سہے امکانات بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے میں نے کسی کو یہ نہ بتایا کہ میں ان کو جانتا ہوں اور جب میں موت کے قریب تھا تو اس نے مجھے پناہ دی تھی۔ اپنے ساتھیوں کے سوالات کے جواب میں مَیں نے میں صرف یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میں نے ندی سے نکلنے کے بعد چند دن پاس ہی ایک غار میں گزارتے ہیں اور آس پاس بھٹکنے والے ان مویشیوں کے دودھ پر گزارہ کرتا رہا ہوں جنہیں پہاڑی لوگ بھاگتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ جگت نرائن مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن جب اُس اس نے کہا کہ میں نے تمہارے آدمیوں سے تمہارے سر کے ہر بال کے بدلے ایک ملیچھ کو موت کے گھاٹ اتارنے کی قسم لی تھی، تو میرا دل بیٹھ گیا۔

٦

رات کے وقت جب جگت نرائن ایک جھونپڑی میں آرام کر رہا تھا میں اس کے پاس پہنچا اور اسے اپنی سرگزشت سنائی لیکن احتیاطاً! آشا یا اس کے دادا کا ذکر چھیڑنے کی بجائے میں نے صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا کہ میں ندی کے کنارے مر رہا تھا کہ ایک لڑکی اس طرف آنکلی اور وہ میری حالت پر رحم کھا کر مجھے اس اُجڑی ہوئی بستی میں لے آئی اور میری تیمارداری کرتی رہی۔

جگت نرائن نے مجھ سے سوال کیا۔ ”وہ لڑکی کہاں ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”وہ فوج کی آمد سے پہلے کہیں روپوش ہو گئی تھی۔ میں آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ اگر وہ کہیں پکڑی جائے یا آپ مجھ پر اس کے احسانات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی جان بچانے کا وعدہ کریں۔“

جگت نرائن نے اپنے تیور بدلتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے تم پر احسان

نہیں کیا، تمہاری جان دیوتاؤں نے بچائی ہے۔ دیوتا اگر چاہیں تو وہ ایک بچھو کو ڈنگ مارنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ دیوتا چاہتے تھے کہ تم دھرم کی سیوا کے لیے زندہ رہو، اس لیے انہوں نے ایک ڈائن کی بیٹی کے دل میں تمہارے لیے تھوڑی دیر کے لیے رحم ڈال دیا لیکن میں تمہیں مایوس نہیں کرتا۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ آگئی تو میں یہ کوشش کروں گا کہ اسے مندر کی سیوا کے لیے بھیج دیا جائے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی جنگل میں ہم نے ایک لڑکی کو پکڑا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور پروہت کے بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ ایسی لڑکیوں کی ہمیں شیوجی کے مندر میں ضرورت ہے۔ تم نے قیدیوں کو دیکھا ہے نا؟"

میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ آشا کے سوا کسی اور کی طرف نہیں لیکن میں نے جواب دیا۔ "میں دیکھ چکا ہوں لیکن وہ ان میں سے نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس نے کہیں ندی میں چھلانگ نہ لگا دی ہو۔"

جگت نرائن نے کہا۔ "تو پھر یہ تمہارا قصور ہو گا۔ تم نے اسے بتا دیا ہو گا کہ ہم لوگ بہت ظالم ہیں اور اپنے قیدیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے

ہیں۔"

میں نے حقارت کے ساتھ جواب دیا۔ "ہاں میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ شیو جی کے مندر میں دیوداسیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔"

جنگ نرائن غصّے سے کانپتے ہوئے چلّایا۔ "خاموش رہو۔ مجھے بار بار اس بات کا احساس نہ دلاؤ کہ میں نے تمہیں ایک سپاہی سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اگر تمہارا دل اس قدر نازک ہے تو تم واپس جا سکتے ہو۔ ویسے اب تم اس قابل نہیں ہو کہ کسی جنگ میں حصّہ لے سکو۔ اپنے بیٹوں کی موت کے بعد میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم ان ملیچھوں کی طرفداری کرو۔"

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر میری جگہ آپ کا بیٹا ہوتا تو پھر بھی آپ مجھے یہی جواب دیتے؟"

جگت نرائن نے حقارت سے جواب دیا۔ "اگر تمہاری جگہ میرا بیٹا ہوتا تو ان لوگوں کی مدد سے زندہ رہنے کی بجائے ندی میں ڈوب جاتا بہتر

جانتا۔“

میں انتہائی مایوسی کی حالت میں جھونپڑی سے باہر نکل رہا تھا کہ جگت نرائن نے مجھے آواز دے کر دوبارہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرا قیاس غلط نہیں تو تم اس لڑکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔“

”کون سی بات؟“ میں نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد جگت نرائن نے میرے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں اور بالا: ”میرے پاس آنے سے پہلے تمہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں ہے اور تم اس کا پتہ دینے سے پہلے میرے خیالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اگر میرا یہ خیال غلط نہیں تو میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کرو۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے لیکن تم سے کہوں گا کہ اگر یہ بات ثابت ہو گئی کہ تم نے ایک ملیچھ لڑکی کو بھاگنے میں مدد دی ہے تو تم نگر

کوٹ کے کسی سپاہی کو اپنا دوست نہیں پاؤ گے۔ تمہارے لیے یہ لوگ سورماؤں کو بھولنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے جو دھرم کے ان دشمنوں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔"

میں اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ لے کر وہاں سے نکلا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر میں صبح سے پہلے آشا کو قید سے چھڑانے کی کوئی تدبیر نہ کر سکا تو کل تک باقی فوج پہنچ جائے گی اور میرے لئے آشا کی مدد کرنے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ ہر لحظہ میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آسمان پر بادل گرج رہے تھے۔ میں اس جھونپڑی کی طرف بڑھا جہاں قیدیوں کو جمع کیا گیا تھا۔ پہریداروں میں چند میرے اپنے آدمی تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ میری خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے لیکن مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ وہ میرے لیے دیوتاؤں کا عتاب مول لینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میں کسی کو اپنا رازدار بنانے سے سے پہلے اس کا دل ٹٹولنا ضروری سمجھتا تھا۔ ایک نوجوان جس کا نام بنسی داس تھا، میری فوج کے ایک دستے کا افسر تھا اور میں اس کے متعلق جانتا تھا کہ حملے

کے آغاز میں جگت نرائن کے حکم پر عورتوں اور بچوں کے قتل پر وہ بہت برگشتہ تھا۔ چنانچہ پہرے داروں میں سے کسی کے ساتھ بات کرنے کی بجائے میں نے اسے تلاش کیا اور اسے ایک طرف لے جا کر اپنی تمام سرگزشت سنا دی۔ بنسی داس نے کسی تذبذب کے بغیر آشا کو قید سے چھڑانے کا وعدہ کیا۔ کچھ دیر بحث کرنے کے بعد ہم ایک تجویز پر متفق ہو گئے۔ بنسی داس مجھے فوج کے پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ بٹھا کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے دستے کے آٹھ ایسے آدمیوں کو میرے پاس لے آیا جن کے متعلق ہمیں یقین تھا کہ وہ کوئی سوال پوچھے بغیر ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ ان آدمیوں کو میں نے بتایا کہ ہمیں فوج میں ایک خطرناک سازش کا علم ہوا ہے اس لیے سردار جگت نرائن کی خواہش ہے کہ چند آدمیوں کو چپکے سے گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے بعد بنسی داس قیدیوں کے پہرے داروں کے پاس گیا۔ پہریداروں کی ٹولی کا افسر جگت نرائن کا اپنا آدمی تھا۔ بنسی داس نے اسے بتایا کہ سردار جگت نرائن مجھے پڑاؤ میں گشت کرتے ہوئے ملے ہیں اور وہ تمہیں بلاتے ہیں۔ پہریداروں کا افسر بنسی داس کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہم کچھ فاصلے پر ان کی

باتیں سن رہے تھے۔ پہریداروں کا افسر کہہ رہا تھا۔ "سردار بہت تھکے ہوئے تھے۔ مجھے انہوں نے شام کے وقت ہی کہہ دیا تھا کہ میں بہت جلد سو جاؤں گا۔ اس طرف اُجاڑ میں وہ کیا کر رہے ہیں۔" اور بنسی داس اُسے سمجھا رہا تھا کہ آگے کئی جھونپڑیاں ہیں اور سردار ایک جھونپڑی سے باہر کھڑا واسدیو کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم ڈرتے کیوں ہو۔

بنسی داس کے آخری الفاظ کارگر ثابت ہوئے اور پہریداروں کے افسر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "ارے یار ڈرتا کون ہے؟"

خوش قسمتی سے تاریکی میں وہ ہم میں سے ہر ایک کو جگت نرائن سمجھ رہا تھا۔ سپاہیوں نے میرے اشارے پر عمل کیا اور اسے آن کی آن میں رسّیوں میں جکڑ دیا گیا۔ ایک سپاہی نے اس کی گردن پر خنجر رکھتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر تم نے شور مچایا تو تمہاری خیر نہیں۔

بندی داس پھر تاریکی میں غائب ہو گیا اور تھوڑی دیر میں دو اور پہریداروں کو لے آیا اور انہیں باندھنے کے بعد ان کی جگہ اپنے دو آدمی

ساتھ لے گیا۔ ہم نے پہریداروں کے منہ پر احتیاطاً کپڑے باندھ دیے تاکہ وہ کسی کے ساتھ بات نہ کریں۔ بنسی داس کی اطلاع کے مطابق باقی پہریداروں میں سے چار ہمارے اپنے تھے اور تین دوسرے سرداروں کی فوج سے تعلّق رکھتے تھے۔

اب ہماری تجویز یہ تھی کہ بنسی داس خود پہرے داروں کے افسر کی جگہ لے گا اور آدھی رات دوسرے دستوں کے تین پہرے داروں کو بھی کسی بہانے وہاں سے رخصت کر دے گا۔ اس کے بعد وہ مجھے اطلاع دے گا۔ بنسی داس کو آخری بار رخصت کرنے سے پہلے میں نے اسے دوسرے سے علیحدہ کر کے سمجھایا کہ وہ آشا سے ملے اور اسے میری طرف سے یہ پیغام دے کہ وہ قیدیوں کو آدھی رات کے قریب بھاگنے کے لیے تیار رکھے۔ بنسی داس کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ مجھے اس بات پر قدرے اطمینان ہوا کہ باقی فوج جو باہر پڑی ہوئی تھی، اب جھونپڑیوں کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گی۔ میں نے ایک سپاہی سے اس کے ہتھیار لیے اور انتہائی بے

قراری کے ساتھ بنسی داس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ آدھی رات سے کچھ دیر پہلے وہ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ میں اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "میں قیدیوں کے بھاگنے کا راستہ صاف کر چکا ہوں لیکن آشا کے متعلق میں ایک افسوس ناک خبر لے کر آیا ہوں۔"

میرا دل بیٹھ گیا اور میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھگوان کے لیے بتاؤ کیا ہوا۔"

اس نے کہا "ابھی پروہت کے بھائی نے دو پجاریوں کو بھیجا تھا اور وہ آشا کو اس کے پاس لے گئے ہیں۔ میں اگر کوئی مزاحمت کرتا تو یہ تمام کھیل بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔"

میں نے بنسی داس کو سمجھایا کہ میں آشا کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا اور تم تھوڑی دیر انتظار کے بعد تمام قیدیوں کو رہا کر دو اور انہیں بھی سمجھا دو کہ ان کا ایک ساتھ چلنے کی بجائے جنگل یا پہاڑ کی طرف منتشر ہو جانا بہتر ہو گا۔ تمہارے لیے بھی بھاگ نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اگر کبھی وقت آیا تو شاید میں تمہیں اس احسان کا بدلہ دے سکوں لیکن اگر میں تمہارے احسان کا بدلہ نہ بھی دے سکا تو تمہیں یہ اطمینان رہے گا کہ تم نے بھگوان کی مرضی پوری کی ہے۔ اس کی نگاہ میں تمہارا درجہ دیوتاؤں سے اونچا ہو گا۔"

بنسی داس نے جواب دیا۔ "میں آخری وقت تک تمہارے ساتھ ہوں۔ آپ تھوڑی دیر پروہت کے بھائی کی قیام گاہ سے باہر میرا انتظار کریں۔ میں قیدیوں کو رہا کرتے ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ آپ وہ جھونپڑی تلاش کر سکیں گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "وہاں میں آنکھیں باندھ کر جا سکتا ہوں، وہ ظالم اسی گھر میں ٹھہرا ہے جہاں مجھے پناہ ملی تھی۔"

۷

تھوڑی دیر بعد آشا کے گھر کی دیوار کے قریب ایک درخت کے نیچے پروہت کے بھائی کے یہ الفاظ سن رہا تھا۔ "تم دیوانی ہو۔ یہ تمہاری خود

قسمتی ہے کہ میں نے تمہیں جنگل میں گرفتار ہوتے وقت دیکھ لیا تھا۔ تم جیسی خوبصورت لڑکی کو زندہ رہنا چاہئے اور میں تمہیں جو زندگی عطا کر سکتا ہوں اس پر نگرکوٹ کی اونچی ذات کی ہزاروں لڑکیاں رشک کریں گی۔ تم اس جنگل سے نکل کر اس مندر کی سیر کرو گی جو راجوں کے محلوں سے زیادہ عالی شان ہے اور جس کے پجاری سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھاتے ہیں۔ میں اس پروہت کا بھائی ہوں جس کے سامنے نگرکورٹ کا راجہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ میں تمہیں شدھ کر کے اپنے گھر میں جگہ دوں گا۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ مجھے تمہارا قیدیوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا۔ دیکھو میں نے یہ سمجھ کر کہ تمہیں بھوک ہو گی اپنا کھانا تمہارے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔ دیکھو مجھے ناراض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کالی دیوی کے سامنے دوسرے قیدیوں کی طرح تمہارا بھی بلیدان دیا جائے۔"

آشا کی آواز سنائی دی۔ "ذلیل کتّے! مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم مجھے مار سکتے ہو، میری عزّت نہیں چھین سکتے۔ مجھے چھوڑ دو، ورنہ میں شور

مچاؤں گی۔"

پروہت کے بھائی نے کہا۔ "تم اگر چلّاؤ بھی تو اس وقت کسی کو اس جھونپڑی کے قریب آنے کی جرأت نہیں ہو گی۔ اس وقت نگر کوٹ کا راجہ بھی یہاں ہو تو وہ تمہاری چیخوں پر توجہ دینے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

آشا چلّا رہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میری قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی اور میں آگے بڑھ کر جھونپڑی کے اندر داخل ہونے کو تھا کہ مجھے گشت کرنے والے سپاہیوں کی ایک ٹولی کی چاپ سنائی دی اور میں پھر درخت کے ساتھ سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ آشا کی چیخ و پکار سن کر سپاہی بھاگ کر آگے بڑھے اور ایک سپاہی دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے "مہاراج! مہاراج!" کہہ کر آوازیں دینے لگا۔ اندر سے پروہت کا بھائی گرجتی ہوئی آواز کے ساتھ چلّایا۔ "گدھا کہیں کا، بھاگ جا یہاں سے، ورنہ میں تمہاری کھال اُتروا دوں گا۔"

سپاہی رفو چکر ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ پروہت کا بھائی آشا سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ لیا تم نے؟ تمہاری چیخیں بے فائدہ ہیں۔ اب اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور غور سے میری باتیں سنو۔“

مجھے معلوم تھا کہ دروازہ کافی مضبوط ہے اور معمولی دھکے کے ساتھ اسے توڑنا ممکن نہیں، لیکن قدرت نے میری مدد کی اور اچانک ایک طرف سپاہیوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ میں نے زور سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! مہاراج! دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔ اپنی جان بچایئے!“

میری تدبیر کارگر ہوئی۔ پروہت کے بھائی نے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور میں نے اس کے سینے پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے شور کیا تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔“

پروہت کا بھائی الٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور میں نے جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی دوسرے ہاتھ سے پروہت کے بھائی کے منہ پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔

پروہت کا بھائی گر پڑا اور آشا سسکیاں لیتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ پروہت کے بھائی کو بے ہوش دیکھ کر میں نے اسے باندھنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور لکڑی کی مشعل کمرے کے ایک کونے میں جل رہی تھی، بجھا کر آشا کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اتنی دیر میں بنسی داس پہنچ چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ”میں نے قیدیوں کو بھگا دیا ہے لیکن پڑاؤ سے باہر نکلنے سے پہلے گشت کرنے والے پہرے داروں کی کسی ٹولی نے انہیں دیکھ کر شور مچا دیا۔ اب بہت سے سپاہی جنگل میں کی طرف ان کا پیچھا کر رہے ہیں اور باقی فوج افراتفری کی حالت میں ادھر اُدھر بھاگ رہی ہے۔ اکثر سپاہی سمجھ رہے ہیں کہ دشمن نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے لیے نیچے جنگل کی بجائے پہاڑ کا راستہ بہتر ہو گا۔“

چنانچہ ہم پہاڑ کی طرف چل دیے، بجلی کی چمک میں ہم کبھی کبھی اپنی منزل کا راستہ دیکھ لیتے تھے۔ سپاہی بدحواسی کی حالت میں شور مچاتے ہوئے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ افراتفری کا یہ عالم تھا کہ اگر ہم تینوں قیدی ہوتے تو بھی ہماری کوئی پرواہ نہ کرتا۔ ہم کسی مشکل کا سامنا

کیے بغیر پڑاؤ سے نکل سکتے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آبشار کا شور سن کر میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم اس مقام کے قریب پہنچ چکے ہیں جہاں آشا کے ساتھ میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ بجلی کی چمک کے ساتھ میں وہ پگڈنڈی بھی دیکھ چکا تھا جو آبشار کے قریب جاتی تھی۔ اور ہم اس پگڈنڈی کو چھوڑ کر سیدھے پہاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ اب ایک غیر معمولی عزم نے مجھے اپنی جسمانی تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیا تھا لیکن اطمینان کا سانس لیتے ہی میری ہمّت جواب دینے لگی۔ دن کے وقت آشا کو جنگل تک پہنچانے کی جدوجہد میں میری ٹانگ کا زخم دوبارہ خراب ہو چکا تھا اور اب میں چڑھائی کے باعث سخت درد محسوس کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ احساس بہت تلخ تھا کہ میں زیادہ دیر تک آشا اور بنسی داس کا ساتھ نہیں دے سکوں گا اور اگر میں ان کے ساتھ چلتا رہا تو صبح تک ہم زیادہ دور نہیں جا سکیں گے۔ سپاہی صبح کی روشنی میں ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے اور صرف میری وجہ سے دو اور جانیں ضائع ہو گی۔ ٹانگ میں ہر لحظہ بڑھتے ہوئے درد نے مجھے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے پہلے بنسی داس سے وعدہ لیا کہ وہ میرا ہر حکم مانے گا اور پھر آشا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”آشا یہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ اس لیے آگے بنسی داس تمہارا ساتھ دے گا۔“

آشا نے جواب دیا۔ ”آپ کے سوا مجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک ساتھ جان دیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”آشا میرا کہا مانو، مجھے اپنے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ میں ایک سردار ہوں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں اپنے سپاہیوں کے بل بوتے پر فوج کے ہر سردار کے ساتھ ٹکر لے سکتا ہوں لیکن اگر تم پکڑی گئیں تو تمہاری حمایت کے لیے میرے سپاہی تلواریں نہیں اٹھائیں گے۔ آشا! میں تم سے ضرور ملوں گا، اگر پکڑی گئیں تو میں تمہارے سامنے اپنے سینے میں خنجر گھونپ لوں گا۔ میرا کہا مانو۔ آشا! مجھے کوئی خطرہ نہیں۔“ یہ ایک فریب تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان واقعات کے بعد کوئی میری حمایت کے لیے انگلی تک نہیں اٹھائے گا لیکن آشا پر میری باتیں اثر کیے بغیر نہ رہیں۔

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کے حکم ماننے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن یاد رکھیے! مجھے آپ کے بغیر زندگی کے ایک لمحے کی بھی ضرورت نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہم بہت جلد ملیں گے۔ آشا جاؤ۔“

وہ بنسی داس کے ساتھ چل پڑی۔ بجلی کی چمک میں مَیں نے چند قدم دور اس کی آخری جھلک دیکھی اور پھر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی اور پچھلی رات کا چاند نمودار ہونے لگا۔ انتہائی بے بسی کے احساس نے مجھے اپنے گرد و پیش سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن تھوڑی دیر ستانے کے بعد نہ معلوم میرے دل میں اس چٹان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی جہاں قدم رکھنے بعد میں اپنی دنیا سے نکل کر آشا کی دنیا میں پہنچ گیا۔ جہاں سے تنگ و تاریک راستہ نیچے ندی کی طرف جاتا تھا۔ میں دوبارہ سانس لینے کے لیے چٹان کے کنارے بیٹھ گیا اور نیچے آبشار کا منظر دیکھنے لگا لیکن اب اس منظر میں میرے لیے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ زندگی کے ساتھ میرا رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ میں پیٹھ کے بل لیٹ کر آسمان کی طرف

دیکھنے لگا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور آسمان پر چاند اور ستارے دیکھ کر میرے دل میں اس وقت یہ خیال آ رہا تھا کہ تھوڑی دیر قبل فضا میں مہیب تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اب قدرت نے تاریک بادلوں کی جگہ چاند ستاروں کی قندیلیں روشن کر دی ہیں۔ لیکن اس ملک پر صدیوں سے مہیب تاریکیاں مسلط ہیں نہ معلوم کب تک ان تاریکیوں میں گھرے ہوئے انسانوں کی نگاہیں روشنی کی تلاش میں بھٹکتی رہیں گی۔ کیا اس سرزمین سے ان دیوتاؤں کا طلسم نہیں ٹوٹے گا جنہوں نے ایک انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے نفرت اور حقارت کا بیج بویا ہے؟

میں اپنے انجام کا تصوّر کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی میں پکڑا جاؤں گا۔ میرے خلاف گواہی دینے کے لیے کئی آدمی موجود ہوں گے۔ پروہت کا بھائی ہوش میں آتے ہیں جو چیخ و پکار شروع کرے گا، وہ نگر کوٹ کے ہر سپاہی کو میرے خون کا پیاسا بنا دے گا۔ میرے اپنے آدمی مجھے پاگل سمجھیں گے لیکن مجھے قتل کرنے کی بجائے وہ زندہ پکڑنے کی کوشش کریں گے اور نگر کوٹ میں کالی دیوی کے سامنے میرا بلیدان دیا

جائے گا۔ میرا خون کالی دیوی کے پاؤں دھو رہا ہو گا اور لوگ ”کالی دیوی کی جے“ کے نعرے لگا رہے ہوں گے۔

میں نے سوچا کہ اگر موت ہی میرے مقدر میں ہے تو میں کالی دیوی کے مندر میں پہنچنے کا انتظار کیوں کروں؟ میں اس کے غلیظ پاؤں میں جان دینے کی بجائے آبشار میں کیوں نہ کود جاؤں؟ میں اس وقت کے لیے کیوں زندہ رہوں جس کا ہر لمحہ میرے لیے موت سے زیادہ بھیانک ہو گا۔ میں اُٹھ کر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے ایک قدم آگے بڑھ کر میں مہیب کھڈ کی گہرائی میں پہنچ سکتا تھا۔ یہ دنیا جس میں چند دن قبل میرے لیے سب کچھ تھا اب بے حقیقت بن چکی تھی لیکن ایک تصوّر ایسا بھی تھا جس نے ابھی تک میرا دامن پکڑ رکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں آشا! آشا!! پکار رہی تھیں۔ میں نے کانپتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور ایک پاؤں سے پتھر کا کنارا ٹٹولنے لگا لیکن اچانک پیچھے سے ایک آواز آئی اور اس نے میرے ہاتھ پاؤں زندگی کی ان زنجیروں میں جکڑ دیے جنہیں میں قریباً توڑ چکا تھا۔ یہ آشا کی آواز تھی۔ وہ میرا نام پکارتی ہوئی آگے بڑھی اور

میرا بازو پکڑ کر پیچھے کھینچنے لگی۔

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس کھڈ میں کود کر دوسرے کنارے پہنچنا چاہتے تھے۔ آپ کو اس کی گہرائی کا علم نہیں۔ اس جگہ تو اگر درخت بھی پھینک دیا جائے تو آبشار کا پانی اسے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔“

”آشا تم واپس کیوں آئی؟“ میں نے اپنی حیرانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”واسدیو! تمہیں یہ کیسے یقین ہو گیا تھا کہ میں تمہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ مجھے جھوٹی تسلّیاں دینے کی ضرورت نہ تھی۔“

میں بولا۔ ”تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے تھا۔ آشا اب بھی وقت ہے کہ تم بھاگ جاؤ، بنسی داس کہاں ہے؟“

آشا نے اطمینان کے ساتھ کہا۔ ”بنسی داس اب دور جا چکا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے اس سے توقع نہ تھی کہ وہ تمہیں پیچھے چھوڑ جائے گا۔“

وہ بولی۔ ”اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ میں خود اس کی نگاہوں سے چھپ کر آگئی ہوں۔“

میں نے درد بھری آواز میں کہا۔ ”لیکن کیوں؟ اس بے وقوف نے تمہیں یہ بتایا ہو گا کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔“

آشا نے جواب دیا۔ ”اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی، وہ رو رہا تھا اور اس کے آنسو مجھے سمجھانے کے لیے کافی تھے۔“

میں نے نڈھال سا ہو کر پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آشا میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن تم نے واپس آ کر میرے لیے موت کا تصوّر بہت ہیبت ناک بنا دیا ہے۔ اگر تھوڑی دیر اور مجھے آواز نہ دیتیں تو میں اس کھڈ میں کود گیا ہوتا۔ اس امید پر نہیں کہ میں بچ کر دوسرے کنارے پہنچ جاؤں گا، بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ میری لاش ان بھیڑیوں کے ہاتھ نہیں آئے گی۔“

آشا نے میرے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔ ”مجھے صرف اس بات کا خدشہ تھا

کہ آپ کہیں بھگوان کی مرضی کے خلاف جانے کی کوشش نہ کریں۔"

میں نے چلّا کر کہا۔ "تمہارے خیال میں میرے بھگوان کی مرضی یہی ہے کہ میں تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے ان لوگوں کی قید میں جاتا ہوا دیکھوں اور پھر کالی دیوی کے سامنے میرا بلیدان دیا جائے؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "آپ کا بھگوان آپ کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ اس دن ندی سے بچ کر نہ نکلتے۔ میرے بابا نے کہا تھا کہ بھگوان آپ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم پگلی ہو آشا۔ اگر انہوں نے مجھے زندہ رکھا تو بھی میرے لیے نگر کوٹ کے قید خانے کی بدترین کوٹھڑی ہو گی۔ تم سے دوبارہ ملنے کی امید پر میں شاید باقی عمر وہاں گزارنا بھی گوارا کر لیتا۔ لیکن تمہارے ساتھ وہ لوگ جو سلوک کریں گے اس کا تصوّر مجھے اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹنے پر آمادہ کرتا رہے گا۔"

آشا نے جواب دیا۔ "وہ میری زندگی میں مجھے ہاتھ نہیں لگا سکیں گے۔

لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ خود کشی نہیں کریں گے۔ میں اگر مر بھی گئی تو کسی اور روپ میں آکر آپ کو تلاش کروں گی۔"

میں نے آشا کو بہت سمجھایا کہ اب بھی تمہارے لیے جان بچانے کا موقع ہے لیکن وہ میری التجائیں سننے کے لیے تیّار نہ تھی۔ مشرق سے صبح کا ستارہ نمودار ہو رہا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں فوج ہماری باقاعدہ تلاش شروع کر دے گی۔ آشا نے اب میرے لیے زندگی کا ساتھ چھوڑنا مشکل بنا دیا تھا۔ میں اس کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا اور میری حالت اس شخص سے مختلف نہ تھی جو آندھیوں میں چراغ جلا رہا ہو۔ کبھی میں سوچ رہا تھا کہ فوج جنگل کی طرف چلی جائے گی اور کوئی اس طرف توجہ نہیں دے گا اور کبھی میں اپنے دل کو اس خیال سے تسلّی دے رہا تھا کہ سینا پتی اس بستی کی طرف آنے کی بجائے کوئی اور محاذ منتخب کرے گا اور فوج کو اپنے پاس بلائے گا۔ میں اس قسم کی موہوم امیدوں کا سہارا لے کر اُٹھا اور آشا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے تنگ راستے سے ندی کی طرف اُترنے لگا۔ آبشار کے قریب وہ سِل جسے میں نے ندی کے پانی کی سطح سے دو

بالشت اوپر دیکھا تھا اب پانی میں ڈوب گئی تھی۔ ہم اوپر کے زینے پر بیٹھ گئے۔ کمزوری، تھکاوٹ اور ٹانگ کے زخم کے باعث میرا برا حال تھا اور آشا میرے سر کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے رہی تھی۔

میں نے کا کہا۔ ”آشا! تمہیں اس بات کی امید ہے کہ وہ اس طرف نہیں آئیں گے؟“

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”مجھے صرف یہ امید ہے کہ آپ زندہ رہیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد صبح کی روشنی اس تاریک گوشے میں بھی پہنچ رہی تھی۔ اچانک مجھے اوپر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور میں نے تلوار سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آشا تم یہیں رہو۔ ممکن ہے وہ میرا اپنا آدمی ہو۔“

میں چند زینے اوپر چڑھا اور ایک موڑ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جونہی ایک سپاہی میرے قریب پہنچا، میں نے تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔ یہ وہی تھا جسے جگت نرائن رات کے وقت قیدیوں کے پہرے داروں کا

افسر مقرر کیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا اور میری تلوار اس کے آر پار ہو گئی۔ اس کا ایک اور سپاہی شور مچاتا ہوا تیزی کے ساتھ نیچے اتر رہا تھا۔ میں لاش کو جلدی سے ایک طرف دھکیل کر اوپر چڑھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ کچھ دیر میں جم کر لڑتا رہا۔ اس کی تندی اور تیزی میری کمزوری پر غالب آنے لگی اور میں اس کے وار روکتا ہوا الٹے پاوں نیچے اترنے لگا۔ اوپر سے کئی آدمیوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ آخری زینے کے قریب پہنچ کر میں نے مدِّ مقابل پر پوری قوّت کے ساتھ حملہ کیا اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اچانک اس کا پاؤں ایک پتھر کے کونے سے پھسلا اور وہ پیٹھ کے بل ِگر پڑا۔ میری تلوار کی آخری ضرب نے اسے موت کی آغوش میں سلا دیا۔ اب میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن آشا وہاں نہ تھی۔ اس کی اوڑھنی زینے پر پڑی تھی اور وہ چند قدم دور ندی کے تیز دھارے میں بہتی ہوئی چلّا رہی تھی۔ ”واسدیو! تمہیں اپنے بھگوان کی قسم میرے پیچھے نہ آنا۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ مجھے ہاتھ نہیں لگا سکیں گے۔“

آشا آن کی آن میں آبشار کے قریب پہنچ گئی اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ اب مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ اب مجھے زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری رہی سہی حسیات انتقام کے ایک نہ ختم ہونے والے جذبے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ میں دیوانہ وار چیختا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ آٹھ دس آدمی ایک قطار میں نیچے اُتر رہے تھے۔ میں نے سب سے آگے آنے والے کو ایک ہی وار میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ باقی مجھے تنگ جگہ میں خطرناک سمجھ کر الٹے پاؤں بھاگ نکلے۔ تھوڑی دیر میں مَیں چٹان کے اوپر کھلی جگہ میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں کوئی پچاس آدمیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا۔ ان آدمیوں میں سردار جگت نرائن بھی تھا۔ وہ چلّا چلّا کر مجھے زندہ گرفتار کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں چاروں طرف اندھا دھند حملے کر رہا تھا اور سپاہی بھیڑوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ بالآخر میں بے ہوش ہو کر گر پڑا اور وہ مجھے فوراً قتل کرنے کی بجائے کوئی عبرتناک سزا دینے کے لیے گرفتار کر کے لے گئے۔

چند دن بعد میں نگر کوٹ کے قید خانے میں تھا۔ ایک ہفتہ قید رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ کالی دیوی کے سامنے میرا بلیدان دیا جائے گا۔ لیکن دو ہفتے اور گزر گئے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ سلطان محمود نے ویہند پر حملہ کر دیا ہے اور نگر کوٹ کی فوج ویہند کے مہاراجہ کی مدد کے لیے چلی گئی ہے۔ اس فوج کے ساتھ پروہت اور راجہ بھی جا چکے ہیں اور ان کی واپسی پر میرے بلیدان کی تاریخ مقرر کی جائے گی۔ ویہند کے راجہ اور اس کے بعد نگر کوٹ میں کالی دیوی کے پجاریوں کی شکست میرے نزدیک آشا کے خوابوں کی تعبیر تھی۔

۸

نگر کوٹ کی فتح کے بعد سلطان محمود نے مجھے قید سے رہا کیا اور میں اُسے اس ملک میں ایک نئی روشنی کا مشعل بردار سمجھ کر اس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ میرے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ سلطان محمود کی فوج میں شامل ہو گئے جن کی نگاہوں سے نگر کوٹ کے مندر کے بتوں کی شکست کے باعث توہمات کا پردہ اُٹھ چکا تھا۔

محمود غزنوی نے میرا نام عبدالواحد رکھا۔ وہ میرا محسن ہے۔ لیکن اگر اس کے احسانات صرف میری ذات تک محدود ہوتے تو میں اس کی جنگوں میں حصّہ لینے کی بجائے اپنی زندگی کسی گوشۂ تنہائی میں بسر کر دیتا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد مجھے اس بات کی پوری آزادی تھی کہ میں جہاں جی چاہے باقی زندگی بسر کر دوں لیکن میں اُسے اس ملک میں ستم رسیدہ انسانیت کا محسن سمجھتا ہوں۔ قدرت نے اسے ایک عظیم الشّان مقصد کی تکمیل کے لیے منتخب کیا ہے اور یہ مقصد مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ میری سرگذشت ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تمہارے احساسات میرے احساسات سے مختلف نہ ہوتے۔"

رنبیر نے گردن اُٹھا کر عبدالواحد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اس نے انتہائی مغموم لہجے میں کہا۔ "اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو زندہ نہ رہتا۔ آپ انسان نہیں ایک چٹان ہیں۔" عبدالواحد نے مسکرا کر کہا۔ "زندگی جب کسی مقصد سے آشنا ہوتی ہے تو ہر انسان

چٹان بن جاتا ہے۔"

رنبیر نے سوال کیا۔ "آزاد ہونے کے بعد آپ دوبارہ اس بستی میں گئے تھے؟"

عبدالواحد نے جواب دیا۔ "میں کئی بار وہاں جا چکا ہوں۔ وہ اُجڑی ہوئی بستی پھر آباد ہو چکی ہے لیکن آشا کا گھر خالی پڑا ہے۔ پہاڑ کے توہم پرست لوگ اس گھر میں پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آشا کی روح ہر رات اس گھر کا طواف کرتی ہے۔ میں ان توہمات کا قائل نہیں اور میں وہیں قیام کرتا ہوں تاہم رات کی تنہائی میں لیٹے لیٹے مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس گھر کی دیواریں سسکیاں لے رہی ہیں اور جب میں اس ندی کی طرف جاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آشا مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ آبشار کے نہ ختم ہونے والے راگ سے مجھے آشا! آشا!! کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔"

رنبیر نے پوچھا۔ "آپ کے ان ساتھیوں کا کیا بنا جنہوں نے قیدیوں کو آزاد کرانے میں آپ کا ساتھ دیا تھا؟" عبدالواحد نے جواب دیا۔ "وہ

سب میرے ساتھ قید تھے اور رہا ہونے کے بعد میری طرح محمود کی فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔ بنسی داس اس بستی میں پہاڑی لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نگر کورٹ کی فتح کے بعد جب وہاں گیا تھا تو اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اب وہ بھی محمود کی فوج میں ہے۔"

رنبیر نے پوچھا۔ "آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ آشا کسی روپ میں آپ سے ملے گی؟"

"نہیں۔" عبدالواحد نے جواب دیا۔ "آشا موت کے بعد میرے لیے ایک مقصد چھوڑ گئی ہے اور میں اس مقصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتے کرتے اکثر یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی روح مجھے دیکھ رہی ہے۔"

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رنبیر نے عبدالواحد سے رخصت لے کر اپنی کوٹھری کا رُخ کیا۔ باقی رات اس نے بستر پر کروٹیں بدلتے گزار دی۔

اگلی شام رنبیر بن بلائے اس کے پاس چلا گیا۔ اس کے بعد ہر روز کم از کم ایک بار عبدالواحد کی قیام گاہ پر دستک دینا اس کی زندگی کا معمول بن گیا اور چند اور ملاقاتوں کے بعد رنبیر محسوس کر رہا تھا کہ اس کے تصوّرات میں ایک بہت بڑا انقلاب آ چکا ہے۔ تاہم پرانے بندھنوں سے آزاد ہو کر ایک نئی دنیا میں پاؤں رکھنے کے لیے اسے ایک زبردست جھٹکے کی ضرورت تھی۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جو دریا کے تیز دھارے میں بہہ نکلنے کے خوف سے کنارے پر اگی ہوئی گھاس کے تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ تنکے ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے اور وہ ہر آن یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی سرکش لہر اس کا آخری سہارا چھین کر اسے ایک ایسی منزل کی طرف لے جائے گی جہاں سے لوٹ کر ساحل کی طرف آنا اس کے بس میں نہ ہو گا۔ دریا کے اس ساحل پر اس کی ہنسی اور مُسکراتی ہوئی دنیا آباد تھی اور ان گنت آرزوئیں اور امنگیں سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھیں۔ اس کا باپ، اس کی بہن اور اس کے بچپن کے ساتھی اُسے یہ پیغام دے رہے تھے۔ ”رنبیر! اس سیلاب میں بہہ نکلنے سے بچنے کی کوشش کرو۔ تم سماج کو جھٹلا سکتے ہو، دیوتاؤں کی عظمت سے

انکار کر سکتے ہو لیکن ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ یہ درست ہے کہ نگر کوٹ کے حالات نے ایک انسان کو سماج کا دشمن بنا دیا ہے لیکن قنوج نگر کوٹ نہیں اور تم عبدالواحد نہیں بن سکتے۔ تمہاری دنیا اس کی دنیا سے مختلف ہے۔ تم تنہا نہیں ہو۔ تم اگر ہمارے پاس نہیں آ سکتے تو ہمیں اپنے ساتھ لے چلو۔" رنبیر کے لیے یہ دن انتہائی اضطراب کے تھے۔ عبدالواحد کے یہ الفاظ ہر وقت اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے کہ تمہاری جنگ کی طرح تمہاری قید بھی بے مقصد ہے۔ کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ وہ عبدالواحد کے سامنے اس بات کا اعتراف کر لے کہ مجھے اب برہمنوں کے سماج یا قنوج کے حکمران کی فتح یا شکست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں صرف ایک بار اپنے پِتا اور بہن کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے آزاد کر دیا جائے تو میں یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شرکت نہیں کروں گا۔ رنبیر کا دل یہ گواہی دیتا تھا کہ عبدالواحد یہ سنتے ہی اس کی رہائی کا حکم صادر کر دے گا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ عبدالواحد اس کے دل کی ہر بات جانتا ہے۔ وہ اس کی درخواست کے بغیر اس کی رہائی

کے لیے ویہند کے گورنر کے پاس سفارش بھیج چکا ہے اور اس احساس نے رنبیر کو ملتجی ہونے کی اجازت نہ دی۔

۹

ایک دن رنبیر اپنی کوٹھری سے باہر ٹہل رہا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر اسے اطلاع دی کہ قلعے کے ناظم آپ کو بُلاتے ہیں۔ رنبیر سپاہی کے ساتھ چل دیا۔ عبدالواحد اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہ رنبیر کو دیکھ کر مُسکرایا اور اپنے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹھیے، میں آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں۔“

ایک ثانیہ کے لیے رنبیر کی رگوں کا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں آ گیا اور اس نے اپنی دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”ویہند کے گورنر کا جواب آ گیا ہے؟“ عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”اس کا جواب ابھی تک نہیں آیا لیکن اطمینان رکھو تم بہت جلد اپنے گھر جا سکو گے۔ اس وقت میں نے تمہیں ایک اور کام کے بلایا ہے۔“

رنبیر اور دل بیٹھ گیا اور وہ پژمردہ سا ہو کر عبدالواحد کی طرف دیکھنے لگا۔ عبدالواحد نے ریشم کے ایک چھوٹے سے رومال میں لپٹا ہوا خط میز سے اٹھایا اور رنبیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے اسے پڑھ لو۔ یہ خط تمہارے گھر سے آیا ہے۔“

رنبیر نے اپنے ہوئے ہاتھوں سے رومال اتار کر کاغذ کی تہیں کھولیں اور خط پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ یہ خط اس کی بہن شکنتلا نے لکھا تھا اور اس کا مضمون یہ تھا:

”میرے پیارے بھیّا!

میں شمبھو ناتھ کو آپ کی تلاش میں بھیج رہی ہوں۔ بھگوان کرے کہ وہ آپ تک پہنچ جائے۔ نندنہ کے قلعے سے رہا ہونے والے قیدیوں کی زبانی آپ کا حال معلوم ہوا۔ اگر آپ پِتا جی کو فدیہ بھیجنے سے منع نہ کرتے تو وہ آپ کا فدیہ لے کر نندنہ پہنچ جاتے لیکن آپ کے پیغام نے انہیں ایک باپ کی محبت کو ایک راجپوت کے رسمی اور ظاہری غرور کی بھینٹ کرنے پر مجبور کر

دیا۔ آپ کا پیغام ملنے پر وہ بظاہر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ وہ ہر ایک سے کہتے تھے کہ مجھے اپنے رنبیر سے یہی توقع تھی لیکن میں جانتی تھی کہ ان کا دل ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کے نیچے پسا جا رہا ہے۔ وہ مجھے تسلّی دینے کے لیے کہا کرتے تھے کہ عنقریب قنوج کی فوج کے ساتھ کئی اور راجوں اور مہاراجوں کے لشکر دشمن پر چڑھائی کریں گے اور جب تمہارا بھائی آزاد ہو کر قنوج کی فوج کے ساتھ واپس آئے گا تو لوگ مہاراجہ سے زیادہ اس کا سواگت کریں گے۔ لیکن یہ ایک خواب تھا اور قنوج کی شکست کے بعد پِتا جی کو اس خواب کی تعبیر کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں رہی۔ ایک راجپوت کا رسمی اور ظاہری غرور اب بھی انہیں زبان کھولنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن میں ان کا چہرہ دیکھ کر ان کے دل کی پکار سن رہی ہوں۔ میں ان سے مشورہ کیے بغیر شمبھو ناتھ کو بھیج رہی ہوں اور جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اس کے حوالے کر دیا ہے۔ اگر یہ آپ کے فدیہ کے لیے کافی ہو تو بھگوان کے لیے قید سے آزاد ہوتے ہی گھر چلے آئیں۔ میرے

اور شمبھوناتھ کے سوا یہ بات کسی اور کو معلوم نہیں ہو گی کہ آپ کو فدیہ دے کر چھڑایا گیا ہے۔ میں نے پِتا جی کو بھی نہیں بتایا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بُرا مانیں گے۔ بلکہ اس لیے کہ آپ کا انتظار انہیں سخت بے چین رکھے گا۔ اب بھی ان کا یہ حال ہے کہ وہ پہروں تنہائی میں اپنے دل سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ رات کے وقت بستر سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بھاگتے ہیں اور نوکروں کو آوازیں دیتے ہیں کہ دروازہ کھولو۔ میں نے رنبیر کی آواز سنی ہے۔

جان سے پیارے بھیّا! اپنے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھ سکتی ہوں کہ میں ہر سانس کے ساتھ آپ کا نام لیا کرتی ہوں۔ آپ کو یاد ہے کہ بچپن میں جب کبھی آپ گھر میں دیر سے آیا کرتے تھے تو میں سونے کی بجائے اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر آپ کا انتظار کیا کرتی تھی۔ آپ کبھی کبھی زینے سے اوپر چڑھنے کی بجائے پچھواڑے کے درخت کو سیڑھی بنا کر کھڑکی کے راستے

میرے کمرے میں آ جایا کرتے تھے۔ میں جان بوجھ کر منہ پھیر لیا کرتی تھی اور آپ پیچھے سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کرتے تھے۔ ”بھلا میں کون ہوں؟“ اور میں جان بوجھ کر اپنی سہیلیوں کا نام لیا کرتی تھی۔ میں اب سونے سے پہلے اکثر اسی جگہ بیٹھ کر آپ کا انتظار کرتی ہوں۔ کاش آپ آ جائیں۔ آپ کبھی کبھی اپنی ننھی شکنتلا کے قہقہوں سے چِڑ جایا کرتے تھے اور اب تو میں ہنسنا بھی بھول گئی ہوں۔ کبھی میں آپ کو گھر آتے دیکھ کر چھپ جایا کرتی تھی اور آپ میری تلاش میں کونہ کونہ چھان مارتے تھے اور اب میں ساڑھے چار برس سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔“

آپ کی ننھی بہن

شکنتلا!

خط ختم کرتے ہی رنبیر کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔ وہ کچھ دیر گردن جھکائے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے عبدالواحد کی

طرف دیکھا اور خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری بہن کا خط ہے۔ آپ اسے پڑھ سکتے ہیں؟“

عبدالواحد نے خط پڑھنے کے بعد دوبارہ رنبیر کے ہاتھ میں دے دیا اور ایک سپاہی کو آواز دے کر اندر بلانے کے لیے کہا۔ ”داروغہ سے کہو، قنوج سے جو آدمی آیا ہے اسے ساتھ لے کر میرے پاس آ جائے۔“ پھر اس نے قلم اُٹھایا اور کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کاغذ کو ایک مراسلے کی صورت میں تہہ کر کے اس کے ارد گرد دھاگہ لپیٹتے ہوئے رنبیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”رنبیر گھبراؤ نہیں۔ تم اپنی بہن کو جلد دیکھ سکو گے۔“

شمبھوناتھ داروغہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک چھریرے بدن کا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ رنبیر اسے دیکھتے ہی اُٹھ کر آگے بڑھا۔ شمبھوناتھ نے جھک کر اس کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن رنبیر نے اسے بازو سے پکڑ کر گلے لگا لیا۔ شدّت احساس کے باعث چند ثانیے دونوں کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ رنبیر کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور

شمبھوناتھ بڑی مشکل سے سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک شمبھوناتھ رنبیر کو ایک طرف ہٹا کر آگے بڑھا اور اس نے اپنی پگڑی جو اس کے قد و قامت کے تناسب سے کافی بڑی معلوم ہوتی تھی، اتار کر عبدالواحد کے پاؤں پر رکھ دی۔

"مہاراج! مہاراج!" اس نے ہاتھ باندھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "نندنہ کے لوگ کہتے ہیں کہ آپ دیوتا ہیں۔"

عبدالواحد نے پگڑی اٹھا کر دوبارہ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "نندنہ کے لوگ غلط کہتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ اطمینان سے بات کرو۔ مجھے صرف ایک انسان سمجھو۔"

شمبھوناتھ نے قدرے تذبذب کے بعد زمین پر بیٹھ گیا۔ عبدالواحد نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں بیٹھو۔"

شمبھوناتھ نے نیاز مندی سے کہا۔ "نہیں مہاراج! ایک نوکر آپ کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

”نہیں تم ہمارے مہمان ہو۔“ یہ کہتے ہوئے عبدالواحد نے اس کا بازو پکڑ لیا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ شمبھوناتھ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا لیکن اس کی نگاہیں رنبیر سے یہ پوچھ رہی تھیں کہ کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی۔ جب عبدالواحد کے اشارے سے رنبیر بھی اس کے قریب بیٹھ گیا تو شمبھوناتھ اضطراری حالت میں دوبارہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”شمبھوناتھ بیٹھ جاؤ۔“ رنبیر نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ شمبھوناتھ بادل نخواستہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کرسی سے اٹھ کر بھاگ نکلنے کے لیے صرف ایک اشارے کا منتظر ہے۔

عبدالواحد نے کہا۔ ”تم رنبیر کے گھر سے آئے ہو؟“

”ہاں مہاراج! اگر جان کی امان ہو تو عرض کروں۔“

عبدالواحد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہاں تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہیں۔“

شمبھوناتھ نے اپنی کمر کے ساتھ بندھا ہوا پٹکا کھولا اور اس میں سے چھوٹی

سی تھیلی نکال کر عبدالواحد کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! میں یہ آپ کی سیوامیں لایاہوں، بھگوان کے لیے رنبیر کو چھوڑ دیجیے۔“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”یہ تھیلی تم اپنے پاس رکھو۔ ہمیں شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔“

”مہاراج! دیکھ تو لیجیے، اس کا وزن زیادہ نہیں لیکن قیمت بہت زیادہ ہے۔ مہاراج! دیکھیے نا۔“ شمبھوناتھ نے یہ کہہ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھیلی کھولی اور چند چھوٹے چھوٹے زیورات کے علاوہ موتیوں کی ایک مالا اور سنہری کنگن جن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے نکال کر عبدالواحد کے سامنے رکھ دیے۔

اپنی بہن کے زیورات دیکھ کر رنبیر کا دل بھر آیا اور اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ عبدالواحد نے شمبھوناتھ سے خالی تھیلی پکڑ لی اور زیورات میز سے اٹھا کر دوبارہ اس میں ڈالنے کے بعد شمبھوناتھ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”یہ زیورات میرے پاس امانت رہیں گے۔ یہاں سے واپس جاتے وقت مجھ سے لے لینا۔ لیکن اگر تم شہر کی بجائے ہمارے پاس

رہنا چاہو تو انہیں اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔"

شمبھوناتھ نے دوبارہ ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ "انہیں ٹھکرایئے نہیں مہاراج، اس زیور سے چار ہاتھی خریدے جاسکتے ہیں۔ کنگن کے ہیرے اور مالا کے موتی سب اصلی ہیں۔ آپ نندنہ کے کسی جوہری کو بلا کر دکھا لیں۔ اگر ان میں کوئی چیز نقلی ثابت ہو تو مجھے پھانسی پر لٹکا دیجئے۔ پھر بھی اگر یہ زیور رنبیر کی آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لیے کافی نہ ہوں تو اسے گھر جانے کا موقع دیجیے۔ آپ جس قدر اور مانگتے ہیں یہ گھر پہنچتے ہی بھیج دیں گے اور میں اتنی دیر آپ کی قید میں رہنے کے لیے تیار ہوں۔"

"میرے خیال میں رنبیر اپنی آزادی کی قیمت ادا کر چکا ہے۔" یہ کہنے کے بعد عبدالواحد نے میز سے مراسلہ اٹھایا اور داروغہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آپ اسی وقت یہ مراسلہ ایک ذمہ دار آدمی کو دے کہ ویہند کے گورنر کی طرف روانہ کر دیں۔ میں نے اس سے قبل بھی ایک ضروری خط بھیجا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ ویہند کے گورنر شاید گشت پر گئے ہوئے ہیں۔ آپ ایلچی کو ہدایت کریں کہ وہ یہ مراسلہ ویہند

کے دفتر کے سپرد کرنے کی بجائے بذاتِ خود گورنر کے پاس پہنچے اور ان سے جواب حاصل کیے بغیر واپس نہ آئے۔"

داروغہ مراسلہ لے کر باہر نکل گیا۔ عبدالواحد نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے رنبیر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آج سے آپ دونوں میرے مہمان ہیں اور جب تک میرے مکتوب کا جواب نہیں آتا، آپ اسی جگہ قیام کریں گے۔ میں نے ویہند کے گورنر کو دوبارہ آپ کی رہائی کے لیے لکھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس خط کا جواب بہت جلد آجائے گا۔ اب آپ دوسرے کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کر سکتے۔"

عبدالواحد نے ایک نوکر کو آواز دی اور وہ اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں رنبیر اور شمبھوناتھ کو بالائی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں لے گیا۔ شمبھوناتھ کی بدحواسی پہلے ہی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس نئی عزّت افزائی نے اسے اور زیادہ بدحواس بنادیا۔ جب نوکر انہیں کمرے میں چھوڑ کر باہر نکلا تو وہ پھر ایک بار ہاتھ باندھ کر رنبیر کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "مہاراج! میرا قصور معاف کیجیے۔ جب اس نے شیر کی طرح آنکھیں

نکال کر میری طرف دیکھا تو میں ڈر گیا تھا۔ ورنہ میں آپ کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہ کرتا۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ وہ مجھ سے بِگڑ کر آپ کے خلاف نہ ہو جائے۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اُسے میرے ساتھ ایسا مذاق کرنے کی کیا سوجھی۔ کاش آپ نے اسے بتا دیا ہوتا کہ میں ایک ویش ہوں اور میرا خاندان چار پشتوں سے آپ کی سیوا کر رہا ہے۔"

رنبیر نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں شمبھوناتھ! اس قلعے میں داخل ہونے کے بعد تمہاری جون بدل گئی ہے۔ آج کے بعد تم دنیا کے ہر انسان کے ساتھ برابری کا دعویٰ کر سکو گے۔ وہ بُت جنہوں نے انسانوں کے درمیان نفرت و حقارت کی دیواریں کھڑی کی تھیں، ٹوٹ رہے ہیں۔"

رنبیر کا آخری فقرہ شمبھوناتھ کے دماغ کی سطح سے بلند تھا۔ وہ صرف یہ سمجھ سکا کہ اسے دنیا میں ہر انسان کے ساتھ برابری کا دعویٰ کرنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "نہیں مہاراج! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں اس کا داس ہوں۔"

عبد الواحد کا نوکر دوبارہ آیا اور اس نے شمبھوناتھ سے پوچھا: ''آپ کا گھوڑا کہاں ہے؟'' ''میرا گھوڑا؟'' شمبھوناتھ نے بدحواس ہو کر کہا۔

''ہاں!'' نوکر نے جواب دیا۔ ''آقا نے کہا ہے کہ اگر آپ اپنا گھوڑا یا کوئی اور سامان سرائے میں چھوڑ آئے ہوں تو یہاں لے آئیں۔''

شمبھوناتھ نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا۔ ''گھوڑا میں نے بیچ دیا ہے۔ لیکن جب نوکر چلا گیا تو اس نے رنبیر کی طرف متوجّہ ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''مہاراج! سچّی بات یہ ہے کہ میں گھوڑے کی بجائے گدھے پر سوار ہو کر آیا تھا۔ اپنا گھوڑا میں نے ان لوگوں کے علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ راستے میں چوروں اور ڈاکوؤں کے خوف سے میں نے ایک بھکاری کا لباس پہن رکھا تھا۔ اگر میں گھوڑے پر ہوتا تو شاید راستے میں کئی جگہ میری تلاشی لی جاتی۔ مجھے گدھے پر دیکھ کر کسی کو اس بات کا شبہ بھی نہیں ہو سکا کہ میرے پاس اتنی دولت ہے، گدھے کے عوض میں نے نندنہ کے قریب ایک بستی سے نئے کپڑے لے لیے تھے۔''

پانچ دن کے بعد علی الصبح عبدالواحد کا نوکر رنبیر اور شمبھو ناتھ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے رنبیر کو کپڑوں کی ایک چھوٹی سی گٹھری اور ایک تلوار پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ سفر کے لیے یہ لباس پہن لیں۔ آقا نے کہا ہے کہ وہ نماز سے فارغ ہو کر آپ کو قلعے کے دروازے پر ملیں گے۔ یہ تلوار بھی انہوں نے آپ کے لیے بھیجی ہے۔ آپ تیار ہو جائیں میں ابھی آکر آپ کو قلعے کے دروازے کی طرف لے جاؤں گا۔“

رنبیر رات کے وقت سونے سے پہلے اپنے میزبان کی زبانی خوش خبری سن چکا تھا کہ ویہند کے گورنر کی طرف سے اس کی رہائی کا حکم آچکا ہے اور وہ صبح ہوتے ہی اپنے گھر کا رُخ کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے شمبھو ناتھ کو رات کے تیسرے پہر ہی یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب صبح ہونے والی ہے۔

رنبیر نے جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ نوکر دوبارہ آیا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر قلعے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے کے سامنے ایک سپاہی دو گھوڑے لیے کھڑا تھا۔

شمبھو ناتھ کے لیے انتظار کا ہر لمحہ پریشان کُن تھا۔ وہ دبی زبان میں کہہ رہا

تھا ”بہت دیر ہو گئی۔ دیکھیے اب تو سورج بھی نکلنے والا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں ان لوگوں کا ارادہ تبدیل نہ ہو جائے۔“ رنبیر اُسے ہر بار یہی کہتا تھا۔
”گھبراؤ نہیں شمبھوناتھ! وہ آتے ہی ہوں گے۔“

عبدالواحد قلعے کے داروغہ اور چند افسروں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ایک کونے سے نمودار ہوا۔ رنبیر کے قریب پہنچ کر عبدالواحد نے اسے زیورات کی تھیلی اور ایک مراسلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کی امانت ہے اور یہ مراسلہ آپ کی رہائی کے متعلق ہے۔ اس میں راستے کی تمام چوکیوں کے افسروں کو یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ آپ کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائیں۔ اس کے علاوہ میری دعائیں ہر وقت آپ کے ساتھ ہوں گی۔ اب آپ دیر نہ کریں، آپ کے گھوڑے تیار ہیں۔“

رنبیر نے تشکّر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے محسن کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں تا عمر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا لیکن میری ایک التجا قبول کیجیے۔ میں اب خوشی کے ساتھ اپنا فدیہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ جتنی رقم کا مطالبہ کریں میں گھر پہنچتے ہی بھیج

دوں گا۔ اس وقت تک یہ زیورات جو میری بہن نے بھیجے ہیں، آپ کے پاس رہیں گے۔"

عبدالواحد نے جواب دیا۔ "میں نے آپ کے لیے اپنے اختیارات سے باہر ہو کر کچھ نہیں کیا۔ ویہند کے حاکم کو میں نے جو کچھ لکھا تھا، اس میں میں نے ان زیورات کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ تاہم انہوں نے آپ کو فدیہ کے بغیر رہا کر دینے کے متعلق میری درخواست مان لی ہے۔"

رنبیر نے کہا۔ "پھر بھی میرے لیے کم از کم ان گھوڑوں کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے۔"

"یہ گھوڑے میری ذاتی ملکیت ہیں۔ انہیں ایک دوست کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیجئے۔" یہ کہتے ہوئے عبدالواحد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد رنبیر اور شمبھوناتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔

روپ وتی

روپ وتی دریا کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی، اسے دور سے کسی کے گانے کی آواز سنائی دی اور اس کے ہاتھ اچانک رُک گئے۔ آواز آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ روپ وتی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اس آواز کی مٹھاس سے اس کے کان آشنا تھے۔ اس سے قبل جب بھی وہ یہ آواز سنتی تھی تو بے تاب سی ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑایا کرتی تھی لیکن آج اس کی حالت مختلف تھی۔ آج اس کا دل مسرت سے اچھلنے کی بجائے خوف سے لرز رہا تھا۔ یہ آواز اُسے بہاروں، نغموں، مسکراہٹیں اور قہقہوں کی دنیا کی طرف کھینچ رہی تھی

جسے وہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے والی تھی۔ دل میں بار بار یہ کہہ رہی تھی۔ ”رام ناتھ! کاش تم میرے پاس نہ آؤ۔“

گانے والا اچانک خاموش ہو گیا۔ روپ وتی کو اس کے پاؤں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ روپ وتی میں اپنی گردن اُٹھانے یا پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی ہمّت نہ تھی لیکن جب کسی نے جنگلی گلاب کے پھول اس کی جھولی میں ڈالا تو وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چند پھول دریا میں گِر پڑے اور آن کی آن میں پانی کی سطح پر بہتے ہوئے دور چلے گئے۔

رام نام ایک کھلتے ہوئے سانولے رنگ کا نوجوان روپ وتی کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کا قد درمیانہ لیکن سینہ غیر معمولی طور پر کشادہ تھا۔ وہ بولا۔ ”آج دیوی نے اپنے پجاری کی بھینٹ ٹھکرا دی ہے۔“

روپ وتی نے گردن اٹھا کر رام ناتھ کی طرف دیکھا۔ اس کی سیاہ اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

”روپا! روپا!!“ رام ناتھ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کیا ہوا؟ تم رو رہی

ہو؟ کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟"

روپا نے اپنی اوڑھنی سے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ "رام ناتھ! تم میری ایک بات مانو گے؟"

رام ناتھ نے بے تاب سا ہو کر جواب دیا۔ "تمہارے آنسو مجھ سے ہر بات منوا سکتے ہیں روپا۔ کہو۔"

وہ بولی۔ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ آئندہ تم میرے پاس نہ آیا کرو تو؟"

رام ناتھ نے جواب دیا۔ "دیوی اپنے پجاری کو موت کا حکم دے سکتی ہے، اُسے پوجا کرنے سے نہیں روک سکتی۔"

روپ وتی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ میری بات کا مذاق اڑاؤ گے۔ لیکن یہ سب میرا قصور ہے۔ کاش! میں تمہیں پہلے ہی سب کچھ بتا دیتی۔"

رام ناتھ نے اور زیادہ مُضطرب ہو کر کہا۔ "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمارے درمیان نہیں آسکتی۔"

روپ وتی نے کہا۔ ”میں بہت جلد ایسی جگہ جا رہی ہوں جہاں تم نہیں پہنچ سکو گے۔ ہمارے لیے ایک دوسرے کو بھول جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

رام ناتھ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ مذاق نہ کرو روپا۔ اگر تم آکاش پر چڑھ جاؤ تو میں وہاں بھی تمہارا پیچھا کروں گا۔ تم میری ہو اور تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اگر تمہارے ماموں کسی اور کے ساتھ تمہارا رشتہ کرنا چاہتے ہیں تو میں آج ہی اپنے پِتا کو ان کے پاس بھیجتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ماموں کو منا سکیں گے۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”آج جو کچھ میں بتانا چاہتی ہوں اس کے بعد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرے معاملے میں تم، تمہارے پِتا جی اور میرے ماموں سب بے بس ہیں۔ میں سومنات کے مندر میں ایک داسی بن کر جا رہی ہوں۔ میرے ماموں اگر کوشش کریں گے تو بھی مجھے نہیں روک سکتے۔ میری ماں میری پیدائش سے دو دن بعد مر گئی تھی۔ اس دن

سومنات کے مندر کا ایک پجاری ہمارے گاؤں میں آیا ہوا تھا اور میرے پِتا نے اس کے سامنے یہ منّت مانی تھی کہ اگر میری بچی زندہ رہی تو میں اسے سومنات کے مندر کی بھینٹ کر دوں گا۔ میں ایک سال کی تھی کہ میرے پِتا بھی چل بسے۔ میرے ماموں کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے وہ مجھے میرے چچا کے گھر سے اپنے پاس لے آئے۔ میرے ماموں کو معلوم تھا کہ میرے پِتا مجھے سومنات کے مندر کی بھینٹ کر چکے ہیں لیکن وہ اس راز کو چھپانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی یہ نہیں بتایا تھا لیکن پچھلے سال میرے چچا ہمارے پاس آئے اور ان کی زبانی معلوم ہوا کہ میرا اصلی گھر سومنات کا مندر ہے۔ یہ میرا پاپ تھا کہ میں نے اسی وقت تمہیں یہ نہ بتایا۔ دراصل میں تمہیں دھوکا دینے کی بجائے اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی تھی۔ میرے ماموں کہا کرتے تھے کہ ہر سال ہزاروں لوگ اپنے بچوں کو سومنات کی بھینٹ کرتے ہیں لیکن ایسی لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں جنہیں بڑی ہونے پر مندر کی سیوا کے قابل سمجھا جاتا ہے اور میں اسی امید پر جی رہی تھی کہ سومنات کے پجاری مجھے بھی ہزاروں لڑکیوں کی طرح ٹھکرا کر چلے جائیں گے اور ہمارے درمیان وہ دیوار

حائل نہ ہو گی جسے آج تک کوئی نہیں گرا سکا لیکن بھگوان کو یہ منظور نہیں۔ پرسوں جب پجاری سومنات کا لگان وصول کرنے کے لیے آئے تو میرا چچا بھی آ پہنچا اور انہیں لے کر ہمارے گھر آ گیا۔ اس سال میرے چچا کے دو بیل مر گئے ہیں اور وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میرے اب تک سومنات نہ جانے کی وجہ سے دیوتا ناراض ہو گئے ہیں۔ پجاریوں نے پرسوں مجھے دیکھتے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ وہ واپسی پر مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

آن کی آن میں رام ناتھ کے سپنوں کی حسین دنیا ویران ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آج یا چند دن اور میں تمہارے پاس نہ آتا تو تم مجھے دیکھے بغیر چلی جاتیں۔"

روپ وتی نے جواب دیا۔ "ہاں! میں کبھی یہ گوارا نہ کرتی کہ میری وجہ سے تم سے شیو جی مہاراج خفا ہو جائیں۔ ان کا غصّہ پہاڑوں کو بھسم کر ڈالتا ہے۔ رام ناتھ مجھ سے وعدہ کرو کہ میرا پیچھا نہیں کرو گے۔"

را، ناتھ نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”روپا! میں اس بات سے ہر گز پریشان نہیں کہ تم سومنات جارہی ہو۔ دولت ہر مشکل آسان کر سکتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ سومنات کی بعض داسیوں کو شادی کی اجازت بھی مل جاتی ہے بشر طیکہ ان سے شادی کرنے والے سونے چاندی سے پجاریوں کی جھولیاں بھر دیں۔ میں آج تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں گوالیار کے راجہ کی فوج میں بھرتی ہو کر جارہا ہوں اور اب آئندہ ایک غریب کسان کے بیٹے کی حیثیت سے تمہارے پاس نہیں آؤں گا، بلکہ میرے بازو میرے لیے ترقی کے بہت سے راستے کھول چکے ہوں گے۔ میری خواہش تھی کہ کسی دن میں ہاتھی پر سوار ہو کر تمہارے ماموں کے گھر آؤں اور ان کے سامنے تمہارے لیے جھولی پھیلاؤں۔ لیکن اب اگر تم سومنات کے مندر میں جارہی ہو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں بہت جلد وہاں آؤں گا اور تمہیں حاصل کرنے کے لیے اگر مجھے کسی راجہ کے تاج کے ہیرے بھی نوچنے پڑے تو دریغ نہیں کروں گا۔“

روپ وتی نے جواب دیا۔ ”تم ان لڑکیوں کی باتیں کر رہے ہوں جو وہاں اپنی خوشی سے تعلیم حاصل کرنے جاتی ہیں اور جن کے والدین انہیں اس امید پر وہاں بھیجتے ہیں کہ ان کی شہرت میں اضافہ ہو اور بڑے بڑے سردار ان کے طلبگار بن جائیں۔ لیکن میں شیو جی کی بھینٹ ہوں اور وہاں جانے کے بعد میرے لیے باہر کی دنیا کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ میری زندگی کا مقصد صرف مندر کی سیوا ہو گا۔ پجاری کہتے تھے کہ مجھ جیسی لڑکیاں ہی سومنات کی دیویاں بنتی ہیں اور تم جانتے ہو کہ سومنات کی دیوی کی طرف ہندوستان کا بڑے سے بڑا راجہ بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں تمہارے لیے مر چکی ہوں گی۔“

رام ناتھ ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح تنکوں کا سہارا لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”نہیں میں سومنات کا پجاری بن کر وہاں آؤں گا۔ میرے لیے یہی کافی ہو گا کہ ہم دونوں ایک ہی مقصد کے لیے زندہ رہیں۔ میں تمام عمر اسی امید پر سومنات کے دیوتاؤں کے آگے بھجن گاتا رہوں گا کہ وہ کسی دن خوش ہو کر ہمیں اپنی اُجڑی ہوئی دنیا بسانے کی اجازت دے دیں

گے۔"

"روپا!روپا!!" کسی نے گھنے درختوں کی اوٹ سے آواز دی۔

روپ وتی نے گھبرا کر آہستہ سے کہا۔ "رام ناتھ جاؤ۔ بھگوان کے لیے جاؤ، میں نے ماموں سے وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ کبھی تم سے بات نہیں کروں گی۔"

"مجھے ابھی تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم سومنات چلی گئیں تو میں بھی جلد وہاں آؤں گا اور جو باتیں ہم انسانوں کے سامنے نہیں کہہ سکتے وہ دیوتاؤں کے سامنے کہیں گے؟" رام ناتھ یہ کہہ کر پاس ہی چند جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔

روپ وتی نے جلدی سے ایک کپڑا اُٹھا کر نچوڑتے ہوئے بُلند آواز میں کہا۔ "کیا ہے ماموں؟ میں یہاں ہوں؟"

ایک عمر رسیدہ آدمی نے درختوں کے جھنڈ سے نمودار ہوتے ہوئے کہا۔ "بیٹی بہت دیر کر دی تم نے۔ اب جلدی گھر چلو!"

"ابھی چلتی ہوں ماموں، صرف ایک کپڑا رہ گیا ہے۔"

"اچھا جلدی کرو۔" روپ وتی کا ماموں یہ کہہ کہ اس سے چند قدم دور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد روپ وتی اور اس کا ماموں اپنے گھر کا رُخ کر رہے تھے اور رام ناتھ گھنے درختوں سے باہر نکال کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کھیت عبور کر کے ایک بستی میں روپوش ہو گئے تو رام ناتھ بھی اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔

۲

رام ناتھ کا باپ گوپی چند ایک معمولی حیثیت کا زمیندار تھا۔ اس کا گاؤں دریا کے کنارے بیس میل لمبے اور پندرہ میل چھوٹے سرسبز و شاداب علاقے میں تھا جو سومنات کے مندر کی جاگیر تھا۔ سومنات کے مندر کو ایسی جاگیریں ہندوستان کے طول و عرض میں کئی ریاستوں کے حکمرانوں نے عطا کر رکھی تھیں۔

گوالیار کے اس سرسبز علاقے کی بستیوں پر راجہ کی حکومت برائے نام تھی، اصل اقتدار برہمنوں کے ہاتھ میں تھا جو سومنات کے پروہت کے نمائندوں کی حیثیت سے کسانوں اور زمینداروں سے لگان وصول کرتے تھے۔ ہر سال مندر کے پجاری ہاتھیوں پر سوار ہو کر آتے اور لگان کی جمع شدہ رقم وصول کر کے لے جاتے۔ لگان کی شرح مقرر نہ تھی۔ سومنات کے نمائندے لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے۔ اگر کوئی ادائیگی میں تاخیر کرتا تو اس کے مال مویشی ضبط کر لیے جاتے تھے۔ پجاریوں کے قیام کے دوران میں ان کے ہاتھیوں کو لوگوں کے کھیتوں میں چرنے اور ان کی فصلیں تباہ برباد کرنے کی عام اجازت تھی۔ پچاس ساٹھ مسلح آدمی سومنات کے پروہت کی طرف سے اس علاقے پر متعین تھے۔ لوگ سومنات کے پجاریوں کے اشارے پر ہر وقت لگان ادا نہ کرنے والے کسانوں کو ڈرانے، دھمکانے، پیٹنے یا بے عزّت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ سومنات کے پجاریوں کی بڑھتی ہوئی ہوس سے تنگ آ کر ان بستیوں کے عوام اکثر ان پرانے وقتوں کو یاد کیا کرتے تھے جب ان کے آباؤ اجداد سومنات کے پروہت کی بجائے اپنے حکمرانوں کو لگان ادا

کرتے تھے اور وہ اتنے خوشحالی تھے کہ اپنی خوشی سے ہر سال ہزاروں روپیہ سومنات کے مندر کو دان کر دیتے تھے۔

رام ناتھ کا باپ گوپی چند خاص طور پر اس زمانے کا ذکر کیا کرتا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے پر سومنات کے پجاریوں کے تسلط سے پہلے اس کے دادا کے قبضہ میں ایک سالم گاؤں تھا لیکن جب یہ علاقہ سومنات کے مندر کی جاگیر بن گیا تو لگان وصول کرنے والے برہمنوں کی لوٹ گھسوٹ نے اسے چند ہی سالوں میں قلاش بنا دیا۔

جب گوپی چند نے ہوش سنبھالا تو اس کے قبضے میں صرف چند کھیت تھے۔ وہ اپنے باپ اور دادا کی طرح کاشتکاروں سے صرف اپنا جائز حصّہ لینے پر اکتفا کرتا تھا لیکن برہمنوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس کی آمدنی کیا ہے۔ وہ اس کے منہ سے روٹی کا نوالہ چھیننے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اپنی وضعداری قائم رکھنے کے لیے گوپی چند ہر دوسرے یا تیسرے سال ایک آدھ کھیت بیچنے پر مجبور ہو جاتا۔ تمام ہندوؤں کی طرح وہ بھی سومنات کے مندر کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینا اپنا فرض

سمجھتا تھا لیکن وہ اس بات سے بہت کڑھتا تھا کہ ہزاروں انسانوں کے خون اور پسینے کی کمائی چند پجاریوں کی عیاشی کا سامان فراہم کرنے کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ وہ انہیں ظالم، لٹیرے اور ڈاکو کہا کرتا تھا۔ سومنات کے پجاریوں کو ایسے الفاظ سے یاد کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن لوگ گوپی چند کا احترام کرتے تھے۔ وہ طبعاً فیاض تھا۔ اگر کسی کے مویشی مر جاتے یا فصل تباہ ہو جاتی تو وہ اپنی زمین بیچ کر اس کی مدد کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ اگر پجاری کسی مفلوک الحال کسان کو لگان کی عدم ادائیگی کی صورت میں پکڑ کر سپاہیوں کے حوالے کر دیتے تو وہ گوپی چند ہی کو اپنا آخری سہارا سمجھتا۔

ان حالات میں گوپی چند کا ہر قدم غربت کی طرف تھا۔ دل کی وسعت اور وسائل کی تنگی نے اسے بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا لیکن لوگ اس کے چڑچڑے پن سے بھی پیار کرتے تھے۔ اس کے نزدیک سومنات کے مندر کا بُت دُنیا کی سب زیادہ واجب التعظیم شے تھی اور سب سے زیادہ قابلِ نفرت انسان وہ لوگ تھے جو سومنات کی مورتی کے نام پر اس کی

بستی میں لگان وصول کرنے آیا کرتے تھے۔ اسی طرح جانوروں میں وہ جس قدر گائے کو چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ ہاتھی سے نفرت کرتا تھا۔ خصوصاً اس دن سے تو اس کی نفرت جنون کی حد تک نے پہنچ چکی تھی، جب پجاریوں نے اس کے کھیتوں میں آٹھ ہاتھی چھوڑ دیے تھے اور تین دن میں اس کی آدھی فصل برباد ہو گئی تھی۔ لوگ ہاتھی کو دیوتا کہتے تھے لیکن گوپی چند کہا کرتا تھا کہ اگر دیوتاؤں کا کام فصلیں برباد کرنا ہے تو بے شک ہاتھی بہت بڑا دیوتا ہے۔ گاؤں کے زندہ دل لوگ کبھی کبھی اُسے گھیر لیتے اور کہتے "بابا آپ ہاتھی سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں؟" گوپی چند یہ سُنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا اور کہتا۔ "بیٹا! اگر تمہاری فصل تیار کھڑی ہو اور ہاتھی اُسے اپنی سونڈ سے روندنا شروع کر دیں تو میں دیکھوں کہ تم انہیں کس زبان سے دیوتا کہتے ہو۔ بھگوان کی قسم! دیوتا تو در کنار میں ہاتھی کو جانوروں میں بھی شمار نہیں کرتا۔"

شمال میں محمود کے ابتدائی حملوں کے باعث ہندوستان کے راجاؤں کی افواج کے ساتھ ان کے ہاتھیوں کا بھی چرچا ہونے لگا اور لوگوں کی نگاہوں

میں ہاتھیوں کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ گوپی چند کو کچھ عرصہ گنیش دیوتا کے متعلق اپنی نفرت اور حقارت کے اظہار میں ضبط سے کام لینا پڑا لیکن جب ہندوستان کی پے در پے شکستوں کی اطلاعات کے ساتھ اس قسم کی خبریں بھی آنے لگیں کہ فلاں جنگ میں دشمن نے ہمارے اتنے ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا ہے اور فلاں لڑائی میں ہاتھیوں نے بدحواس ہو کر ہماری اپنی صفیں روند ڈالی ہیں تو گوپی چند کا پارہ پھر تیز ہونے لگا۔ وہ اکثر یہ کہا کرتا۔ ''بھگوان کی قسم! یہ دیوتا ہمارا ستیاناس کر کے چھوڑے گا۔ اس جانور کا سر خالی ہے اور عقل کی جگہ بھگوان نے اسے ناک عطا کر رکھی ہے۔ ہمارے لیے دو مصیبتیں ہیں۔ سومنات مہاراج کے پجاریوں کی توندیں اور ہاتھی کی ناک۔

رام ناتھ کے مستقبل کے متعلق گوپی چند کو ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ رام ناتھ سپاہی بنے اور اگر اُسے راجہ کی فوج میں کوئی بڑا عہدہ مل جائے تو وہ اس علاقے کو چھوڑ کر کسی اور جگہ آباد ہو جائے جو سومنات کے پجاریوں کی لوٹ مار سے محفوظ ہو۔ ان

دِنوں سپاہیوں کو اپنے بہادرانہ کارناموں کے صلے میں راجہ کی طرف سے بڑی بڑی جاگیریں ملتی تھیں۔ گوپی چند نے بھی اسی امید پر اپنے بیٹے کو چند سال ایک پنڈت سے تعلیم دلوانے کے بعد تیر اندازی، تیغ زنی اور شہسواری کی مشق کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ آس پاس کی بستیوں میں کئی آدمی ایسے تھے جو اپنی جوانی کے دن راجہ کی فوج میں گزار چکے تھے۔ رام ناتھ ان لوگوں کے پاس جا کر فنونِ سپہ گری سیکھا کرتا تھا۔ دیہاتی میلوں میں کشتیاں ہوتیں تو رام ناتھ بھی ان میں حصّہ لیتا۔ اپنی جوانی کے آغاز ہی میں وہ اپنے علاقے کے نامی گرامی پہلوانوں کو پچھاڑ چکا تھا۔ گوپی چند کو اپنے بیٹے کی شہ زوری پر ناز تھا لیکن اس کی ایک خصلت اُسے سخت ناپسند تھی اور وہ یہ کہ رام ناتھ کو موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس کے لیے یہ بات ایک گالی سے کم نہ تھی کہ اس کا بیٹا بہت اچھا گاتا اور گیت بناتا ہے۔

رام ناتھ کے گیت بہت مشہور تھے اور آس پاس کی بستیوں کے چرواہے اور کسان رام ناتھ کے گیتوں کو اسی کے سُروں میں گانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ روپ وتی کو انھی گیتوں نے رام ناتھ کی طرف متوجہ کیا تھا۔

گوپی چند کے چند کھیت روپ وتی کے ماموں کے کھیتوں سے ملتے تھے۔ رام ناتھ کبھی کبھی اپنے کاشت کاروں کا ہاتھ بٹانے کے لیے چلا جاتا۔ ایک دن ایک کاشتکار بیمار تھا اور رام ناتھ اس کی جگہ ہل چلانے کے لیے چلا گیا۔ اس کے قریب دوسرے کھیت میں روپ وتی کا ماموں ہل چلا رہا تھا۔ رام ناتھ نے کچھ دیر آہستہ آہستہ گنگنانے کے بعد اپنے گرد و پیش سے بے پروا ہو کر بلند آواز سے گانا شروع کر دیا۔ روپ وتی کے ماموں کی طرح آس پاس کے دوسرے کسان بھی اس کی سُریلی آواز سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ روپ وتی اپنے ماموں کے لیے کھانا لے کر آئی اور کچھ دیر دم بخود ہو کر رام ناتھ کا راگ سنتی رہی۔ روپ وتی کے ماموں نے رام ناتھ کو آواز دے کر کہا۔ ”آؤ بھی کھانا کھالو۔“

رام ناتھ نے ہل روکتے ہوئے جواب دیا۔ ”کھانا تو میں کھا کر آیا تھا۔ اگر لسّی ہے تو آتا ہوں۔“

”آؤ لسّی بہت ہے۔“

رام ناتھ ہل چھوڑ کر ان کے قریب جا بیٹھا۔ روپ وتی نے اُسے لسّی کا کٹورا

بھر دیا۔ رام ناتھ نے لسّی پینے کے بعد جب خالی کٹورا واپس کیا تو روپ وتی نے پوچھا۔ ''اور دوں؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

روپ وتی کے ماموں نے کہا۔ ''پی لو بھئی لسّی بہت ہے۔ تم جیسے آدمی کا ایک کٹورے میں کیا بنتا ہے۔''

''اچھا لائیے!''

روپ وتی نے مسکراتے ہوئے دوسرا کٹورا پیش کیا۔ لسی پینے کے بعد رام ناتھ نے روپ وتی کے ماموں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی چند باتیں کیں اور اُٹھ کر چل دیا لیکن دیر تک اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی لڑکی کی تصویر ناچتی رہی۔ چند دن تک وہ روپ وتی کو دوبارہ نہ دیکھ سکا۔

ایک صبح وہ دریا میں نہانے کے بعد کپڑے پہن رہا تھا کہ چند قدم دور درختوں کی اوٹ میں کوئی ہلکے ہلکے سُروں میں گاتا ہوا سنائی دیا۔ یہ کسی

عورت کی دل کش آواز تھی اور گیت وہی تھا جو چند دن قبل رام ناتھ نے ہل چلاتے ہوئے گایا تھا۔ گانے والی ایک مصرع کہہ کر اچانک خاموش ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے دوسرے مصرعے کو کچھ رام ناتھ اور کچھ اپنے الفاظ کے ساتھ ایک بگڑی ہوئی صورت میں پورا کر دیا۔ رام ناتھ نے جھجکتے جھجکتے اصلی مصرع پڑھا اور گانے والی پھر خاموش ہو گئی۔

ایک لڑکی چند مویشیوں کو ہانکتی ہوئی درختوں کی اوٹ سے نمودار ہوئی اور رام ناتھ دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ روپ وتی تھی۔ جب مویشیوں کو پانی پلانے کے بعد وہ واپس جانے لگی تو رام ناتھ نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو جی! تمہیں میرے شعر بگاڑنے کا کوئی حق نہیں؟“

روپ وتی نے مڑ کر رام ناتھ کی طرف دیکھا۔ مُسکرائی اور کچھ کہے بغیر اپنے مویشیوں کو ہانکتی ہوئی درختوں میں روپوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد رام ناتھ پھر اس کے گانے کی آواز سن رہا تھا اور اب وہ ایک مصرعے کی بجائے دونوں مصرعے بگاڑ کر گا رہی تھی۔

یہ ابتدا تھی اور چھ ماہ کے بعد وہ اسی دریا کے کنارے ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا عہد باندھ رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دریائے ستلج سے آگے محمود غزنوی کی فتوحات کے باعث ہندوستان کے تمام راجے مستقبل کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے اپنی فوجی قوّت میں اضافہ کر رہے تھے۔ رام ناتھ کے بہت سے ہم عمر گوالیار کی فوج میں بھرتی ہو کر جا چکے تھے۔ ایک سپاہی کی حیثیت میں نام پیدا کرنے کی خواہش تو رام ناتھ کے دل میں پہلے ہی موجود تھی۔ اب روپ وتی کی محبت نے اپنے مستقبل کے متعلق اس کے عزائم اور زیادہ بلند کر دیے تھے۔ لیکن اپنی ماں کی طویل علالت کے باعث وہ گھر چھوڑ کر نہ جا سکا۔ قریباً چار ماہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد رام ناتھ کی ماں چل بسی اور اس کی وفات کے تین مہینے بعد وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن جانے سے پہلے روپ وتی سے آخری ملاقات کے بعد اس کے تصوّرات کے محل مسمار ہو چکے تھے۔ اب وہ صرف اپنے باپ کی دیرینہ آرزو پوری کرنے کے لیے جا رہا تھا۔

۳

رام ناتھ کو گھر سے گئے دو سال گزر چکے تھے۔ اس عرصہ میں محمود غزنوی کی فتوحات کا سیلاب گنگا اور جمنا کے میدانوں کا رُخ کر چکا تھا۔ جنوب مشرقی ہندوستان کے عوام کو ابتدا میں یہ اطمینان تھا کہ مہاراجہ قنوج کی قیادت میں باقی راجاؤں کی متحدہ افواج آگے بڑھ کر دشمن کا منہ پھیر دیں گی۔ لیکن محمود کی تیز رفتاری نے ان کے دل میں یہ خدشات پیدا کر دیے کہ اس لشکرِ جرار کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی غزنی کی افواج راستے کے شہروں اور قلعوں کی مزاحمت کو کچلتی ہوئی قنوج اور کالنجر تک پہنچ جائیں گی۔ متھرا کے برہمنوں کو یقین تھا کہ وطن کا ہر سپاہی اس مقدس شہر کی دیوار کے نیچے کٹ مرے گا اور دشمن کو اس عظیم الشان مندروں کے قریب نہیں آنے دے گا جنہیں تمام راجے اور مہاراجے صدیوں سے خراج دے رہے ہیں۔ سرسوا سے لے کر گوالیار اور کالنجر تک ہر مندر کے پجاری ”متھرا کو بچاؤ“ کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ جب محمود غزنوی سرسوا کے حکمران کو شکست دینے کے بعد برن کی طرف بڑھا تو متھرا کے برہمن راجوں کو کوستے ہوئے قرب و جوار کی

ریاستوں میں پھیل گئے اور عوام سے متھرا کی حفاظت کے لیے جانی اور مالی قربانی کی اپیل کرنے لگے۔

دوسری ریاستوں کی طرح گوالیار کے باشندوں پر بھی متھرا کے برہمنوں کی چیخ و پکار نے اثر کیا۔ سینکڑوں نوجوان رضاکارانہ طور پر متھرا کی حفاظت کے لیے روانہ ہو گئے اور عوام نے ان رضاکاروں کی اعانت کے لیے دل کھول کر چندے دیے۔ چند برہمن گوپی چند کے گاؤں میں بھی پہنچے اور انہوں نے ارد گرد کی بستیوں کے چیدہ چیدہ لوگوں کو جمع کر کے مدد کے لیے اپیل کی۔ متھرا کے برہمنوں کی باتوں سے متاثر ہو کر اس علاقے سے بھی کئی نوجوان متھرا جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن جب گھوڑے اور اسلحہ فراہم کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو لوگوں نے یہ عذر پیش کیا کہ عنقریب سومنات کے پجاری لگان وصول کرنے کے لیے آنے والے ہیں اور وہ کسی کو ایک کوڑی بھی معاف نہیں کریں گے۔ اگر ان کا خوف نہ ہو تو اس علاقے کا ہر آدمی اپنا پیٹ کاٹ کر بھی متھرا کی حفاظت کرنے والے رضاکاروں کی مدد کے لیے تیار ہے۔ متھرا کے برہمنوں نے

لوگوں کو سمجھایا کہ سومنات کے مندر کی جاگیریں تمام ریاستوں میں ہیں اور ان جاگیروں کے اکثر زمیندار اور کسان ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ساری پونجی متھرا کے مقدس شہر کی حفاظت کے لیے پیش کر دی ہے۔ سومنات کا مندر یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے۔ اس لیے اس کے پروہت کو محمود غزنوی سے کوئی خدشہ نہیں لیکن متھرا پہنچنے میں محمود غزنوی کو دیر نہیں لگے گی۔ اگر ہم نے متھرا میں دشمن کے دانت کھٹے نہ کیے تو وہ دن دور نہیں جب ان کے گھوڑے ان بستیوں میں دوڑ رہے ہوں گے۔

گوپی چند نے ان برہمنوں کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو! دُشمن کے راستے میں متھرا ہمارا سب سے بڑا مورچہ ہے۔ متھرا کی شکست ہندو دھرم کی شکست ہو گی۔ اگر سومنات کے پجاری اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ انہیں دشمن کو گنگا اور جمنا کی پوتر دھرتی پر دیکھ کر بھی جوش نہیں آتا تو ہمیں ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ جب وہ آئیں گے تو ہم ان سے کہہ سکیں گے کہ جب تک ہماری اپنی آزادی خطرے میں ہے ہم

تمہیں لگان نہیں دے سکتے۔ ہم اپنے راجہ سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ان لوگوں کو ہم پر ظلم کرنے کی اجازت نہ دے جو ہمارے خون اور پسینے کی کمائی سے اپنے توندیں بڑھا رہے ہیں اور اگر راجہ نے ہماری چیخ و پکار نہ سنی تو ہم اپنی حفاظت خود کریں گے۔ متھرا کے برہمن اپنے لیے کچھ مانگتے تو میں یقیناً! انہیں یہ جواب دیتا کہ ہم سومنات کی رعایا ہیں اور ہمارے پاس تمہارے لیے ایک کوڑی بھی نہیں لیکن اب اگر میں متھرا کی حفاظت کے لیے ساری پونجی لٹانے کے لیے تیار ہوں تو میری قربانی کا مقصد ہندو دھرم کے ناموس اور اپنی عزّت و آزادی کی حفاظت ہے۔" سومنات کے پجاریوں کے متعلق لوگوں کے احساسات گوپی چند سے مختلف نہ تھے لیکن بھری محفل میں ایسے خیالات کے اظہار کی جرأت صرف گوپی چند ہی کر سکتا تھا۔

گوپی چند کی تقریر کے بعد بستی کے لوگ اپنے گھروں سے روپیہ اور جن کے پاس روپیہ نہ تھا وہ غلّہ لا کر متھرا کے برہمنوں کے قدموں میں ڈھیر کر رہے تھے۔ عورتیں اپنے زیور اتار کر انہیں پیش کر رہی تھیں۔ گوپی

چند نے اپنا غلّہ بیچ کر سومنات کے لیے لگان کی جو رقم جمع کی تھی، وہ سب متھرا کے برہمنوں کی نذر کر دی۔ اس کے علاوہ اس کی بیوی کا زیور پڑا تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ زیور کسی دن اس کے بیٹے کی بیوہ پہنے گی لیکن اس نے بستی کے ہر آدمی سے سبقت لے جانے کے لیے یہ زیور بھی متھرا کے برہمنوں کو پیش کر دیا۔ اس کے بعد گوپی چند نے اس وفد کے ساتھ علاقے کا دورہ کیا۔ ہندوستان کے اور مندروں کی طرح متھرا کے مندروں کے پجاری بھی سومنات کے پجاریوں کے اثر و اقتدار سے جلتے تھے۔ انہوں نے گوپی چند جیسے منہ پھٹ آدمی کے تعاون سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور سومنات کے پجاریوں کے خلاف جو باتیں وہ اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتے تھے وہ گوپی چند سے کہلوانے لگے۔ گوپی چند کو اُکسانے کے لیے ان کا صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ اس زمانے میں ایسے نڈر اور صاف آدمی کا دم غنیمت ہے اور گوپی چند اپنی ہر تقریر میں اپنی دلیری اور صاف گوئی کا ایک نیا ثبوت پیش کرنا ضروری سمجھ لیتا۔ بعض بستیوں کے لوگ گوپی چند کو ٹوکتے لیکن وہ اپنے ہر معترض کو یہ جواب دیتا کہ تم بزدل ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں۔

کوئی بیس دن بعد متھرا کے برہمنوں کا وفد اس علاقے کی رہی سہی دولت سمیٹنے کے علاوہ متھرا کی حفاظت کے لیے ایک ہزار رضا کار روانہ کر چکا تھا۔ اس وفد کی روانگی سے ایک ماہ بعد جب سومنات کے پجاری لگان وصول کرنے کے لیے آئے تو انہوں نے علاقے کے کسانوں اور زمینداروں میں عام بغاوت کے آثار دیکھ کر گوالیار کے راجہ سے شکایت کی۔ راجہ نے اپنے ایک وزیر کو تحقیقات کے لیے بھیجا۔ وزیر نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد راجہ کو یہ رپورٹ پیش کی کہ لوگوں نے غلطی ضرور کی ہے لیکن ان کی نیت بُری نہ تھی۔ تاہم انہیں تنبیہہ کر دی گئی ہے کہ اگر انہوں نے سومنات کا لگان ادا کرنے میں کوتاہی کی تو حکومت انہیں سزا دینے کے لیے سومنات کے پجاریوں کی مدد کرے گی۔ اس سال ان کے پاس کچھ نہیں رہا۔ اس لیے انہیں معاف کر دینا چاہیے۔ راجہ نے پجاریوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے خزانے سے ایک معقول رقم ادا کر دی۔ یہ رقم اس علاقے کے لگان کی رقم سے کم نہ تھی لیکن سومنات کے پجاریوں کی نگاہ میں یہ جرأت قابلِ معافی نہ تھی۔ واپس جاتے ہوئے انہوں نے اپنے چند ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ تم یہیں رہ کر ہمارے خلاف متھرا کے

برہمنوں کی تبلیغ کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرو۔

ان واقعات سے چند دن بعد علاقے کے لوگوں نے یہ خبر سنی کہ سلطان محمود کی افواج برن اور مہابن کی تسخیر کے بعد متھرا کا محاصرہ کر چکی ہیں۔ پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ سلطان محمود متھرا پر قبضہ کر چکا ہے۔ یہ خبر سن کر سب سے زیادہ صدمہ گوپی چند کو ہوا۔ سومنات کے وہ پجاری جو ابھی تک اس علاقے میں تھے، ہر گاؤں کے لوگوں کو سمجھا رہے تھے کہ متھرا کے برہمنوں نے سومنات کے دیوتا کو ناراض کیا تھا اور اب انہیں اس پاپ کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ سومنات کا دیوتا ہر اس شخص کو سزا دے گا جو اس سے منہ موڑ کر دوسرے دیوتاؤں کی سیوا کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ تمام مندر نابود ہو جائیں گے اور وہ تمام مورتیاں توڑ دی جائیں کی جن کے پجاری سومنات کے پجاریوں کی عزّت نہیں کرتے اور جن ریاستوں کے راجوں نے ہماری جاگیروں سے اپنی فوجی ضروریات کے لیے چندہ جمع کیا ہے یا کسی اور مندر کو چندہ جمع کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان سب کا حشر بہت برا ہو گا۔ اب اس ملک کی نجات اس میں ہے کہ تمام ریاستوں کے

حکمران اور عوام اور تمام مندروں کے پروہت اور پجاری سومنات کی تعظیم کے لیے سر جھکادیں۔

ایسی باتیں سن کر علاقے کے وہ لوگ جنہیں گوپی چندتے اپناہم خیال بنالیا تھاتائب ہوچکے تھے اور اپنے روٹھے ہوئے دیوتا کو خوش کرنے لے لئے اپنے مویشی بیچ بیچ کر سومنات کے پجاریوں کو نذرانے پیش کر رہے تھے اور جو کسی حد تک ضدّی تھے، انہوں نے قنوج کے راجہ کی شکست کے بعد توبہ کرلی۔ گوپی چند اپنی ہٹ پر قائم رہالیکن اب اس کاساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ لوگ جو اس کی جرأت اور بے باکی کی تعریف کیا کرتے تھے، اب اس کے ساتھ بات کرتے بھی گھبراتے تھے۔ وہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ انسان ایک دوسرے کے دشمن ہوسکتے ہیں لیکن بھگوان کے دیوتا ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوسکتے۔ یہ کیسے ہو سکتاہے کہ سومنات کے پجاری ہمارے ساتھ خفاہوں، اور سومنات کے دیوتا کی مورتی متھرا، مہابن، قنوج اور آسی کے مندروں سے انتقام لے۔ ہماری قربانی کا مقصد ان شہروں میں بھگوان کے دیوتاؤں کے مندروں

اور ان کی مورتیوں کی حفاظت تھا۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ سومنات کا دیوتا ہم سے خوش ہونے کی بجائے خفا ہو چکا ہے۔ ہماری شکست کا باعث حکمرانوں کی بزدلی اور مختلف مندروں کے پجاریوں کے باہمی عناد کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن اب کوئی گوپی چند کی باتوں پر کان دھرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ گاؤں کی عورتیں اپنے مردوں کو اس کے ساتھ باتیں کرنے سے منع کیا کرتی تھیں۔ نو عمر لڑکے جو اس کی گالیوں پر ہنسا کرتے تھے، اب اسے بات بات پر ٹوکا کرتے تھے اور بوڑھے اسے سمجھایا کرتے تھے۔ "بھائی! اب اپنی زبان کو لگام دو۔ تمہارے خلاف سومنات کے پروہت تک شکایات پہنچ چکی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ تمہاری وجہ سے ہم سب کی شامت نہ آ جائے۔" متھرا کی حفاظت کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ کر جانے والے رضاکاروں میں سے بعض گرفتار ہو چکے تھے اور ان کے خویش و اقارب اس تباہی کی تمام ذمہ داری گوپی چند کے سر تھوپتے تھے۔ جو بچ کر آ گئے تھے وہ بھی گوپی چند سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔

ان حالات میں گاؤں کے ہر آدمی سے گوپی چند کی نفرت و حقارت جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اب وہ انتہائی بے چینی کے ساتھ رام ناتھ کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اور اس کی تمام دلچسپیاں رام ناتھ کی یاد تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ رام ناتھ اپنی ملازمت کے پہلے ہی سال راجہ کی فوج میں نیزہ بازوں کے ایک دستے کا افسر بن چکا تھا۔ اگلے سال وہ چند ہفتوں کی رُخصت پر گھر آیا تو ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار تھا۔ روپ وتی اس کی غیر حاضری میں سومنات جا چکی تھی۔

روپ وتی کے دائمی جدائی کے تصوّر سے رام ناتھ کو اپنے گرد و پیش کی ہر شے اُداس اور مغموم دکھائی دیتی تھی۔ اس کے سازِ حیات کے وہ تار ٹوٹ چکے تھے جو ان دلکش فضاؤں کو نغموں سے لبریز کر دیا کرتے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے ایک دائمی مسکراہٹ چھن چکی تھی اور اس کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں ہر وقت یہ ظاہر کرتی رہتی تھیں کہ وہ کسی کھوئی ہوئی شے کا متلاشی ہے۔ کبھی کبھی گوپی چند اس سے پوچھتا۔ ”بیٹا! تم پریشان کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں پِتا جی!“ وہ چونک کر جواب دیتا۔ ”میں کچھ سوچ رہا تھا۔“

”کیا سوچ رہے تھے بیٹا!“

”کچھ نہیں پِتا جی!“ رام ناتھ کوئی بہانہ کر کے اٹھتا اور چپکے سے باہر نکل جاتا۔ ایک شام رام ناتھ اکیلا دریا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ کئی بار روپ وتی سے مل چکا تھا۔ اس نے گانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز سینے میں گھٹ کر رہ گی۔ گوپی چند اسے تلاش کرتا ہوا وہاں آ نکلا۔

”یہاں کیا کر رہے ہو بیٹا؟“ گوپی چند نے پوچھا۔

”کچھ نہیں پِتا جی۔ یونہی پھرتے پھراتے یہاں آ کر بیٹھ گیا ہوں؟“

گروپی چند اس کے قریب بیٹھ گیا۔ باپ اور بٹیا کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر گوپی چند نے کہا۔ ”بیٹا! لوگ کہتے ہیں کہ تم نے گانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”ہاں پتا جی! آپ کو گانے سے نفرت جو تھی۔“

گوپی چند نے کہا۔ ”میں تمہارے گانے سے صرف اس وقت کی چِڑتا تھا جب تک تم سپاہی نہیں بنے تھے اور اب تو میں خود تمہارا گانا سننا چاہتا

ہوں۔"

"پِتا جی اب میں گا نہیں سکتا۔ اب میں شاید کبھی نہ گا سکوں۔ چلیے گھر چلیں۔" رام ناتھ یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

رام ناتھ کو زیادہ دن گھر میں ٹھہرنے کا موقع نہ ملا۔ گنگا اور جمنا کے میدانوں کی طرف محمود غزنوی کی پیش قدمی کی اطلاع سنتے ہی وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد کئی مہینے گوپی چند کو اس کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔ محمود غزنوی کی واپسی کے بعد گوپی چند نے اسے ملنے کے لیے گوالیار کی راجدھانی کا رُخ کیا لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا گوالیار کی فوج کے ساتھ کسی ایسی مہم پر جا چکا ہے جس کے بارے میں کچھ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فوج کے ایک بڑے عہدیدار سے ملا تو اس نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا بیٹا زندہ ہے لیکن ابھی ہم تمہیں یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کہاں ہے۔ اگر تم اسے کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہو تو خط لکھ کر مجھے دے دو۔" گوپی چند نے ایک خط لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس کا مضمون یہ تھا:

”میری آنکھوں کے تارے!

مجھے تمہارے متعلق مدّت سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اب میرے لیے گاؤں میں رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ بھگوان کے لیے چند دن کی چھٹی لے کر آؤ اور مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ یا مجھے اپنا پتہ بھیج دو تاکہ میں خود آ جاؤں۔

تمہارا باپ

گوپی چند“

گوپی چند اپنے گاؤں میں واپس آ کر انتہائی بے تابی سے اپنے بیٹے کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ چند دنوں کے بعد ملک میں یہ افواہ گرم تھی کہ سلطان محمود کے گزشتہ حملے کے دوران میں فوج کے مہاراجہ کی پسپائی کے باعث ہمسایہ ریاستوں کے بہت سے حکمران اس کے خلاف ہو چکے ہیں۔ یہ حکمران راجہ گنڈا کی دعوت پر کالنجر میں جمع ہوئے تھے اور انہوں نے قنوج کے حکمران کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ مسلمانوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلنے کے بعد تمہارا تخت پر بیٹھے رہنا راجپوتوں کی توہین ہے۔ اس لیے اگر

تم تخت سے دستبردار ہو جاؤ تو بہتر، ورنہ ہم زبردستی تمہیں تخت سے اتار دیں گے۔

پھر یہ خبر مشہور ہوئی کہ گوالیار اور دوسری کئی ریاستوں کی افواج کالنجر کے ولی عہد کی رہنمائی میں قنوج کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔

کوئی ایک ماہ بعد قنوج کا حکمران اپنے بیٹے اور فوج کے بڑے بڑے عہدیداروں کی غدّاری کے باعث میدان میں شکست کھانے کے بعد مارا گیا اور حملہ کرنے والے راجوں نے قنوج کی نئی راجدھانی باری پر قبضہ کر کے اس کے بیٹے ترلوچن پال [۳] کو تخت بٹھایا۔

گوپی چند اب یہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا بیٹا گوالیار کی فوج کے ساتھ جس مہم پر گیا ہوا تھا وہ یہی تھی۔ چنانچہ اب وہ زیادہ بیقراری سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

---

[۳] یہ ترلوچن پال ویہند کا شکست خوردہ حکمران نہیں جو ابھی اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا بلکہ قنوج اور باری کے مہاراجہ کا ولی عہد تھا۔

۴

دن ڈھلے گوپی چند کے گاؤں کا ایک بوڑھا دریا کے قریب مویشی چرا رہا تھا کہ اسے دور سے ایک سرپٹ سوار آتا دکھائی دیا۔ سوار قریب پہنچا تو چرواہا اُسے پہچانتے ہی بھاگ کر پگڈنڈی میں کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے چلّایا۔ "ٹھہرو! ٹھہرو!!"

سوار نے دونوں ہاتھوں سے لگام کھینچ کر گھوڑا روکنے کی کوشش کی لیکن تیز رفتار گھوڑا رُکتے رُکتے کئی گز آگے نکل گیا اور چرواہے کو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کر ایک طرف ہٹنا پڑا۔

یہ رام ناتھ تھا۔ وہ گھوڑے کی لگام موڑ کر چرواہے کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہا۔ "رام ناتھ! بھگوان کے لیے آگے نہ جاؤ، یہیں سے واپس ہو جاؤ۔" رام ناتھ چند ثانیے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چرواہے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے قدرے ہمّت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "کیوں چچا کیا بات ہے؟"

چرواہے نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”گاؤں میں سومنات کے پجاری آئے ہوئے ہیں اور۔۔۔۔“

”بھگوان کے لیے جلدی کہو۔“ رام ناتھ نے بے چین ہو کر کہا۔

”انہوں نے تمہارے پِتا کو گرفتار کر لیا ہے۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سومنات کے پجاری لگان جمع کرنے آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تمہارے پِتا کی تمام جائداد چھین کر نیلام کر دی ہے اور گھر کو آگ لگا دی ہے۔ تمہارے پِتا نے آپے سے باہر ہو کر ایک پجاری کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ اب سپاہیوں نے اسے باندھ رکھا ہے اور دو پہر سے اُسے پیٹ رہے ہیں۔ وہ کئی بار بے ہوش ہو چکا ہے اور جب بھی ہوش میں آتا ہے سومنات کے پروہت اور پجاریوں کو گالیاں دینی شروع کر دیتا ہے۔ بھگوان کے لیے تم وہاں نہ جاؤ۔ ان کے ساتھ پوری فوج ہے۔“

رام ناتھ کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر لگام کھینچ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور چرواہے نے گھبرا کہ لگام چھوڑ دی۔

گوپی چند چوپال کے سامنے ایک کھلی جگہ منہ کے بل پڑا ہوا تھا۔ ایک سپاہی بید کی چھڑی لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ سومنات کے دو پجاری ایک طرف چارپائیوں پر اور کوئی چالیس مسلح آدمی پجاریوں کے آس پاس زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگ ارد گرد کھڑے تھے۔ ایک پجاری چارپائی سے اُٹھ کر آگے بڑھا اور اُس نے گوپی چید کو اپنے پاؤں سے چند ٹھوکریں مارنے کے بعد جھک کر اس کی نبضیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”یہ مر چکا ہے۔“

گاؤں کے لوگ جو ابھی تک خاموش کھڑے تھے سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ چند آدمی ڈرتے گوپی چند کی لاش کی طرف بڑھے لیکن پجاری نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آگے مت آؤ، وہیں کھڑے رہو۔“

لوگ سہم کر پیچھے ہٹ گئے لیکن ایک عمر رسیدہ کسان نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! اب رات ہونے والی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس لاش کو ٹھکانے لگا دیں۔“

”پجاری نے جواب دیا۔ ”یہ لاش اس وقت تک یہیں رہے گی جب تک اس علاقے کے تمام لوگ اسے دیکھ نہیں لیتے۔“

عمر رسیدہ آدمی کچھ اور کہے بغیر پیچھے ہٹ گیا اور گاؤں کے لوگ یکے بعد دیگرے اپنے اپنے گھر کا رُخ کر رہے تھے۔ سپاہی لوگوں کی فصلوں میں چرنے والے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی دیکھ بھال کے لیے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پجاریوں کے گرد صرف آٹھ سپاہی اور گاؤں کے پندرہ بیس آدمی رہ گئے تھے۔

رام ناتھ نے چوپال کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا۔ گاؤں کے لوگوں نے ”رام ناتھ آ گیا! رام ناتھ آ گیا!!“ کی صدائیں بلند کیں۔ اس نے گھوڑے سے کود کر ادھر ادھر دیکھا اور بھاگتا ہوا اپنے باپ کی لاش کی طرف بڑھا۔ اس کے گھوڑے اور لباس نے تھوڑی دیر کے لئے پجاریوں اور ان

کے سپاہیوں کو مرعوب کر دیا۔ گاؤں کے ایک نوجوان نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ رام ناتھ "پِتا جی! پِتا جی!!" کہتے ہوئے اپنے باپ کی لاش گود میں لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"یہ کون ہے؟" ایک پجاری نے چارپائی سے اٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے گاؤں کے لوگوں سے سوال کیا۔ لیکن گاؤں کے آدمی جواب دینے کی بجائے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تو پجاری نے رام ناتھ کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔ "تم کون ہو؟"

رام ناتھ سے گردن اُٹھا کر پجاری کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے۔

پجاری نے دوسری بار گرجتی ہوئی آواز میں اپنا سوال دہرایا تو رام ناتھ لاش کو زمین پر لٹا کر کھڑا ہو گیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "اسے کس نے مارا ہے؟"

رام ناتھ کی آنکھوں میں آگ کے شعلوں نے پجاری کو پریشان کر دیا۔

تاہم اس نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم ہو کون اور تمہیں ایسے ملیچھ آدمی کے ساتھ ہمدردی جتانے کی جرأت کیسے ہوئی؟“

”ملیچھ تم ہو۔“ رام ناتھ نے یہ کہتے ہوئے پوری قوّت کے ساتھ ایک مکّا پجاری کے منہ پر رسید کیا۔ بھاری بھر کم پجاری لڑکھڑاتا ہوا پیٹ کے بل جا گرا اور اس کے گرتے ہی آٹھ مسلح سپاہی جو وہاں موجود تھے ”پکڑ لو، مار دو“ کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اتنی دیر میں رام ناتھ اپنی تلوار نکال چکا تھا۔ ان سپاہیوں نے آج تک اپنے بازوؤں کی قوّت صرف ہاتھ جوڑنے والے لوگوں پر آزمائی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اپنی زنگ آلو تلواروں کی جواب میں ایک چمکتی ہوئی تلوار دیکھ رہے تھے۔ رام ناتھ کو مدافعت کے لیے پیچھے ہٹنے کی بجائے حملے کے لیے تیار دیکھ کر وہ چند قدم دور رُک کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

دوسرے پجاری چلایا۔ ”بزدلو! دیکھتے کیا ہو؟“

سپاہیوں نے بادل نخواستہ آگے بڑھ کر رام ناتھ کو گھیرے میں لینے کی

کوشش کی لیکن اس نے پہلے حملے ہی میں یکے بعد دیگرے دو سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تیسرا سپاہی بدحواس ہو کر الٹے پاؤں بھاگا لیکن اس نے زمین پر پڑے ہوئے پجاری سے ٹھوکر کھائی اور پیٹ کے بل گر پڑا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن رام ناتھ کی تلوار اس کے سر پر لگی اور وہ دوبارہ حرکت نہ کر سکا۔ باقی سپاہی ادھر ادھر بھاگ کر اپنے ان ساتھیوں کو آوازیں دے رہے تھے جو کھیتوں میں گھوڑے اکٹھے کر رہے تھے۔ دوسرا پجاری بدحواس ہو کر پاس ہی ایک درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گاؤں کے لوگ چلّا رہے تھے "رام ناتھ اب بھاگ جاؤ۔ سپاہی کھیتوں سے اپنے گھوڑے پکڑنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی آ جائیں گے۔ جلدی کرو۔"

لیکن رام ناتھ اب نیچے پڑے ہوئے پجاری کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ تلوار کی نوک پجاری کے سینے پر تھی اور پجاری ہاتھ باندھ کر چلّا رہا تھا۔ "دیا کرو مہاراج! میں سومنات کا پجاری ہوں۔ مہاراج! مہاراج!!"

رام ناتھ نے اس کے منہ پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ ”بزدل! وہ میرا باپ تھا۔“

گاؤں کے لوگوں نے بھاگ کر پجاری کو بچانے کی کوشش کی لیکن رام ناتھ کی تلوار اس کے سینے کے آر پار ہو چکی تھی اور وہ خود بھاگ کر گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سومنات کے پجاریوں کے جاں نثار سپاہی اس کی تلاش میں نکلے تو رام ناتھ دو کوس دور رات کی تاریکی میں پناہ لے چکا تھا لیکن اس کے بعد آنے والی ہر نئی صبح کی روشنی اُسے یہ پیغام دیتی تھی کہ موت سائے کی طرح اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ دیوتاؤں کی سرزمین میں سومنات کے پجاری کے قاتل کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

اپنا گھر

ایک پہر رات گئے رنبیر اور شمبھوناتھ چاند کی روشنی میں تھوڑی دور اپنی منزلِ مقصود دیکھ رہے تھے۔ تھکے ہوئے گھوڑے گردنیں جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ پگڈنڈی کے آس پاس مینڈکوں اور جھینگروں نے اپنا نہ ختم ہونے والا راگ شروع کر رکھا تھا۔ رنبیر کا رواں رواں اپنے وطن کی زمین کی مہک سے سرشار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی گردن پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے دوست! مجھے تمہاری بھوک اور تھکاوٹ کا علم ہے لیکن اب ہماری منزل دور نہیں۔“

کھیتوں سے نکل کر وہ ایک گھنے باغ میں داخل ہوئے اور رنبیر کے دل و دماغ پر ایک بار پھر ماضی کے حسین و دلفریب نقوش اُبھرنے لگے۔ یہ وہی باغ تھا جہاں وہ بچپن میں کھیلا اور قہقہے لگایا کرتے تھے۔ یہ قہقہے اب بھی اس کے ذہن مین گونج رہے تھے۔

باغ عبور کرنے کے بعد وہ اپنے قلعہ نما محل کی چار دیواری دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں اور آنکھوں میں تشکّر کے آنسو جھلک رہے تھے۔ محل کے اندر کامل سکوت تھا۔ بالائی منزل کے ایک کمرے کے دریچے سے جس کا بیشتر حصّہ صحن کے ایک تناور درخت کی شاخوں نے چھپا رکھا تھا چراغ کی مدھم روشنی باہر آرہی تھی۔ شمبھوناتھ نے دریچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ادھر دیکھیے، شکنتلا کے کمرے میں دیا جل رہا ہے۔ وہ جاگ رہی ہو گی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آپ کی غیر حاضری میں ایک رات اس نے سپنا دیکھا تھا کہ آپ کھڑکی کے راستے اس کے کمرے میں داخل ہوئے ہیں۔ اس کے بعد وہ رات کو کبھی اپنے کمرے کا دیا نہیں بجھاتی۔''

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ پھاٹک کا رُخ کر رہے تھے۔ اچانک رنبیر نے اپنا گھوڑا روکتے ہوئے کہا ”ٹھہرو شمبھو! اس وقت اگر ہم نے پھاٹک پر آوازیں دیں تو نوکر شور مچا کر سارا گاؤں جمع کر کریں گے۔ میں سب پہلے شکنتلا اور پِتا جی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر یہیں ٹھہرو۔ دیکھوں آج شکنتلا مجھے پہچانتی ہے یا نہیں۔“

شمبھو ناتھ نے کہا۔ ”اگر آپ کے بال سفید ہو چکے ہوتے تو بھی شکنتلا آپ کو پہچان لیتی۔“

رنبیر اپنا گھوڑا دیوار کے قریب لے گیا۔ پھر زین پر کھڑا ہو کر دیوار پر چڑھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد صحن میں کود پڑا۔ کشادہ صحن طے کر کے وہ رہائشی مکان کے پچھواڑے کی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا کونے میں ایک جامن کے درخت کے نیچے رکا اور اوپر دیکھنے لگا۔ بالائی منزل کے کمرے کے دریچے سے ابھی تک روشنی آ رہی تھی۔ رنبیر کے دل کی دھڑکنیں ہر لحظہ تیز ہو رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”شکنتلا پہلے مجھے چور سمجھے گی۔ پھر بھیّا! بھیّا!! کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ جائے گی اور میں کہوں گا۔

پگلی! تم خواب دیکھ رہی ہو۔“ پھر وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ ”نہیں، میں دبے پاؤں اندر داخل ہو کر اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کرلوں گا لیکن نہیں۔ اس طرح وہ ڈر جائے گی۔ میں کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھوں گا۔ پھر اگر وہ جاگ رہی ہو گی تو میں درخت کی ٹہنیوں میں چھپ کر اسے آہستہ سے آواز دوں گا۔ وہ پریشان ہو کر دیکھے گی اور پھر میرے لیے اپنے قہقہے روکنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم دونوں پِتا جی کے کمرے میں جائیں گے۔“

اپنے باپ کے متعلق سوچتے ہوئے رنبیر کو ایک بار پھر طرح طرح کے خدشات پریشان کرنے لگے۔ اپنے وطن کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے وہ قنوج کے اندرونی انقلاب کی خبر سن چکا تھا اور اس نے آخری منزل انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ طے کی تھی۔ اگرچہ اسے شمبھوناتھ کی باتوں سے یہ یقین ہو چکا تھا کہ سلطان محمود کے ہاتھوں قنوج کی شکست کے باعث اس کا باپ قنوج کے شاہی خاندان سے ہی نہیں بلکہ آس پاس کے تمام راجاؤں سے مایوس اور متنفّر ہو چکا ہے اور اس نے قنوج کے

حکمران اور اس کی جنگ میں کوئی حصّہ نہیں لیا ہو گا، تاہم کبھی کبھی نامعلوم سے خدشات اس کے دل میں ابھر آتے تھے۔

محل کے دوسرے کونے سے ایک پہریدار نمودار ہوا۔ رنبیر درخت کے ساتھ سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار رنبیر کے دل میں سے آواز دینے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن وہ ابھی تذبذب کی حالت میں تھا کہ پہریدار بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے نکل گیا۔ پہریدار کی چال رنبیر کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھی کہ محل کے مکین سکون واطمینان کی نیند سو رہے ہیں۔ وہ جامن کے درخت پر چڑھا ہوا روشن کھڑکی کے سامنے جا پہنچا۔

درخت کی شاخ پر کھڑا ہو کر وہ کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر جھانکنے لگا۔ کھڑکی کے سامنے صرف دو قدم کے فاصلے پر ایک عورت سفید چادر اوڑھے پلنگ پر سو رہی تھی۔ اس کا سر چادر سے باہر تھا لیکن اس کے چہرے کا بیشتر حصّہ بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے خوبصورت ہاتھ سر سے اوپر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور کلائیوں میں باریک طلائی

چوڑیاں چمک رہی تھیں۔

"شکنتلا!" رنبیر نے اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے آواز دی لیکن سونے والی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہنے کے بعد اس نے شکنتلا کو جگانے کے ارادے سے اپنا ہاتھ بستر کی طرف بڑھایا لیکن پھر کچھ سوچ کر اچانک رُک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے اپنی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی زیورات کی تھیلی اُتاری اور تمام زیورات نکال کر سونے والی کے قریب رکھ دیے۔ پھر اس نے ایک کنگن اُٹھایا اور آہستہ سے اس کی ایک کلائی میں ڈال دیا لیکن اس کے بعد جب وہ دوسرا کنگن اٹھا کر دوسرے ہاتھ کی کلائی میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا تو سونے والی نے اچانک اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کروٹ بدل کے انتہائی بدحواسی اور خوف کی حالت میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چلّانا چاہتی تھی لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

رنبیر بھی چند ثانیے متحیّر سا ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ شکنتلا نہ

تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ معاًز بیر کے دل میں خیال آیا کہ شاید یہ کوئی شکنتلا کی سہیلی ہے اور ہمارے گھر مہمان آئی ہے۔اس خیال سے اس کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"ڈریے نہیں۔" اس نے لڑکی کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں ہوں۔ آپ کون ہیں۔ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میری بہن کی سہیلیوں میں آپ کی شکل کی کوئی لڑکی نہ تھی۔"

لڑکی کا خوف اضطراب اور پریشانی میں تبدیل ہونے لگا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر تم چور یاڈاکو نہیں تو اس وقت یہاں کیا لینے آئے ہو، یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ میں شور مچاؤں گی۔"

زبیر نے کہا۔ "میں خوشی سے آپ کو شور مچانے کی اجازت دیتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کسی اور کو آواز دینے کی بجائے میری بہن کو یہاں بُلا لیں تو بہت اچھا ہو گا۔"

لڑکی کی پریشانی غصّے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے کہا "تم اگر چور نہیں

تو دیوانے ضرور ہو۔ اگر مجھے اپنی بدنامی کا ڈر نہ ہو تو ابھی شور مچا کر گھر کے تمام آدمیوں کو جگا دوں۔"

"بہت اچھا! مچایئے شور۔" رنبیر نے اطمینان سے جواب دیا۔

لڑکی کا اضطراب ایک بار پھر خوف میں تبدیل ہونے لگا۔ وہ بولی۔ "تمہیں اپنی جان کا خون نہیں۔"

"بالکل نہیں۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟ تم کون ہو اور اس وقت میرے کمرے میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

"جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گی کہ آپ کون ہیں میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

"موت کے لیے تم میرے کمرے کے سوا کوئی اور جگہ تلاش نہیں کر سکتے؟"

”نہیں۔ اب مجھے زندگی اور موت کے لیے کسی اور جگہ کی تلاش نہیں۔“

لڑکی اضطراب کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ رنبیر نے غصّے کی حالت میں آج تک کسی کا چہرہ اس کی جاذبِ نگاہ نہیں دیکھا تھا۔ اچانک لڑکی کی نگاہ اپنی کلائیوں پر مرکوز ہو گئی۔ ان میں چمکتے ہوئے کنگن دیکھ کر اس کا غصّہ حیرانی میں تبدیل ہو گیا اور قدرے توقف کے بعد اس نے ملتجانہ لہجے میں کہا۔ ”تم صرف ایک لڑکی کو بدنام کرنے کے لیے موت قبول کرنا چاہتے ہو۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر رنبیر نے قدرے متاثر ہو کر کہا۔ ”معاف کیجیے میں غلطی سے اس کمرے میں آ گیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میری یہ حرکت ایک مہمان کی پریشانی کا باعث ہو گی۔“

”مہمان! کس کا مہمان، یہ میرا اپنا گھر ہے۔“

”یہ اچھا یہ آپ ہی کا گھر سہی لیکن یہ بتایئے کہ شکنتلا کہاں ہے۔ میں کسی اور کو جگانے سے پہلے اسے دکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ موہن چند کی بیٹی کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔“

”ہاں! میں اس کا بھائی ہوں۔“

لڑکی کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا اور اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم مسلمانوں کی قید میں تھے؟“

”ہاں، میں ابھی یہاں پہنچا ہوں اور درخت پر چڑھ کر اس کھڑکی کے راستے داخل ہوا ہوں۔ میرا خیال تھا میں شکنتلا کو پریشان کروں گا لیکن شکنتلا کے حصّے کی پریشانی بھگوان نے آپ کی قسمت میں لکھی تھی۔ اب میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں شکنتلا کے کمرے تک میری رہنمائی کریں۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میں آپ کی طرح کسی اور مہمان کو پریشان نہ کروں۔“

لڑکی کا دل اب خوف یا غصّے کی بجائے مروّت اور ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے اب چور، ڈاکو یا کسی پاگل انسان کی بجائے ایک ایسا نوجوان کھڑا تھا جس کی صورت دیوتاؤں سے ملتی تھی۔ وہ

رنبیر کے متعلق سن چکی تھی اور اس کے لئے یہ تصوّر کرنا مشکل نہ تھا کہ یہ نوجوان جو پانچ سال قید کے بعد آج اپنی بہن اور باپ سے ملنے کی آرزو لے کر آیا ہے کسی المناک حادثے کا سامنا کرنے والا ہے۔ وہ رنبیر کی طرف بار دیکھ کر بار بار اپنے دل میں یہ الفاظ دہرا رہی تھی۔ ”کاش! تم یہاں نہ آتے۔ کاش! میں یہاں نہ ہوتی۔“

رنبیر نے اس کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار دیکھ کر سوال کیا۔ ”میرے پِتا جی اور شکنتلا کیسے ہیں؟“

لڑکی نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا۔ ”وہ یہاں نہیں ہیں اور اگر تم بھی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھتے ہو تو بھگوان کے لیے یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

رنبیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ورنہ آپ کا حکم ماننے سے انکار نہ کرتا۔“

”میں سچ کہتی ہوں۔ تمہارا باپ اور بہن یہاں نہیں ہیں۔“

”کہاں ہیں وہ؟“

”بھگوان کے لیے آہستہ بولو۔ میں ان کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ اگر آپ موہن چند کے بیٹے ہیں تو اس مکان کی چار دیواری کے اندر آپ کی زندگی محفوظ نہیں۔“

رنبیر نے دروازے کی طرف بڑھ کر کنڈی پر ہاتھ ڈالتے ہوئے مُڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”یہ مذاق میری برداشت سے باہر ہے۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس مکان سے باہر میں اپنی زندگی کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا ہوں۔“

”ٹھہریے! بھگوان کے لیے اس طرف نہ جایئے۔“ لڑکی نے یہ کہتے ہوئے بھاگ کر رنبیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لڑکی کی اس حرکت نے رنبیر کا اطمینان متزلزل کر دیا۔ تاہم اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں آپ اپنی پریشانی کا کافی بدلہ لے چکی ہیں۔ اب اور مذاق نہ کیجئے۔“ لڑکی نے آبدیدہ

ہو کر کہا۔ ”مجھے بھگوان کی سوگند میں تم سے مذاق نہیں کرتی۔ میرا کہا مانو اور جس راستے سے آئے ہو اسی راستے واپس چلے جاؤ۔ اب یہ گھر تمہارے لیے نندنہ کے قلعے سے کم خطرناک نہیں۔ جاؤ! جلدی کرو!“ وہ رنبیر کو کھڑکی کی طرف کھینچنے لگی لیکن وہ بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے باہر سے دروازے کو دھکے دیتے ہوئے آوازیں دیں۔ ”نرملا! نرملا! دروازہ کھولو۔“

لڑکی سراپا التجا بن کر رنبیر کی طرف دیکھنے لگی۔

”نرملا دروازہ کھولو!“ کسی نے اور زیادہ کرخت آواز میں کہا۔

لڑکی سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیا ہے پِتا جی؟“

کوئی پوری قوّت سے چلّایا۔ ”دروازہ کھولو!“

”کھولتی ہوں پِتا جی!“ یہ کہہ کر لڑکی رنبیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی تمام قوّتِ گویائی سمیٹ کر نگاہوں میں آچکی تھی۔ رنبیر نے بھی اس کی طرف دیکھا لیکن اب صورتِ حال اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ اس نے

لڑکی کا ہاتھ جھٹک کر جلدی سے کنڈی کھول دی۔ اچانک دھماکے کے ساتھ دونوں کواڑ کھلے اور رنبیر کے سامنے ایک قوی ہیکل آدمی ننگی تلوار لیے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے چند اور آدمی تھے۔ لڑکی "پِتا جی پِتا جی!" کہتی ہوئی بھاگ کر قوی ہیکل آدمی کے ساتھ لپٹ گئی اور رنبیر نے اضطراری حالت میں چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی تلوار نکال لی۔

"پِتا جی! اس نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ یہ چور نہیں۔ یہ موہن چند کا بیٹا ہے۔ یہ اپنی بہن کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔"

عمر رسیدہ آدمی نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے لڑکی کو برآمدے کی طرف دھکیل دیا اور چلّا کر کہا۔ "تم خاموش رہو۔ میں جانتا ہوں یہ کون ہے۔" میں اس کی بکواس سن چکا ہوں۔" پھر نوکروں کی طرف متوجہ ہو کر چلّایا۔ "بُزدِلو! تم کیا دیکھ رہے ہو، پکڑ لو اسے۔"

چار مسلح آدمی "گھیر لو، پکڑ لو" کے نعرے لگاتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور محل کے نچلے حصّے سے بھی اسی قسم کے نعرے سنائی دینے لگے۔ لڑکی برآمدے ایک عورت کے ساتھ لپٹ کر چلّا رہی تھی۔ "ماتا جی، پِتا جی کو

روکو۔ وہ بے قصور ہے۔ اس نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔“

رنبیر کے لیے اب اس معمّے کے متعلق سوچنے کا وقت نہ تھا۔ وہ کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے تذبذب کی حالت میں کھڑا اپنے سامنے تلواریں دیکھ رہا تھا۔

قوی ہیکل آدمی احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور رنبیر کے گرد آدمیوں کا گھیرا تنگ ہونے لگا۔ رنبیر فطرتاً نڈر تھا لیکن اس کی قوّتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ قوی ہیکل آدمی نے کہا۔ ”تلوار پھینک دو، تم لڑ کر اپنی جان نہیں بچا سکتے۔“

”تلوار کا کھیل میرے لیے نیا نہیں لیکن کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرا دشمن کون ہے؟“ رنبیر نے یہ کہتے ہوئے اپنی تلوار پھینک دی۔

قوی ہیکل آدمی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان کا شکر ہے کہ تم خود ہی یہاں پہنچ گئے۔ ورنہ مجھے ساری عمر تمہاری تلاش رہتی۔“

تھوڑی دیر کے بعد ننگی تلواروں کے پہرے میں محل کے اس دروازے

کا رُخ کر رہا تھا جو دریا کی سمت کھلتا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر سپاہیوں نے رنبیر کے دونوں ہاتھ ایک مضبوط رسّی سے باندھ دیے۔

قوی ہیکل آدمی نے کہا۔ ”اب اسے جلدی دریا کے پار لے جاؤ۔ صبح ہونے سے پہلے اسے ٹھکانے لگانا ضروری ہے۔ گاؤں کے کسی آدمی کو اس واقعے کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ اگر دریا کے پار کوئی اسے دیکھ لے تو یہی کہنا کہ یہ ایک چور ہے۔ اگر تم سے کوئی غفلت ہوئی تو میں تم سب کو پھانسی دے دوں گا۔“

نرملا چند قدم دور اپنی ماں کے ساتھ کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔ جب سپاہی رنبیر کو باہر لے گئے تو وہ بھاگ کر اپنے باپ کے قریب پہنچی اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی ”پِتا جی! یہ پاپ ہے۔ بہت بڑا پاپ ہے۔ بھگوان کے لیے سپاہیوں کو روکیے۔“

نرملا کے باپ نے کہا۔ ”بے وقوف نہ بنو نرملا! ایک سانپ کے بچے کا سر کچلنا کوئی پاپ نہیں۔ موہن چند کے بیٹے کی زندگی میں ہم اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے۔ تم بھگوان کا شکر ادا کرو کہ وہ میری زندگی میں ہی یہاں آ

گیا۔"

"نہیں نہیں پِتا جی! یہ پاپ نہ کیجیے۔"

"خاموش رہو! میں اپنے بدترین دشمن کے بیٹے کے لیے تمہارے یہ آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔ چلو اپنے کمرے میں۔"

۲

آٹھ پہرے داروں کی حراست میں رنبیر محل سے نکل کر گھنے سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں سے گزرنے کے لیے دریا کے کنارے پہنچا۔ پاس ہی ایک چھوٹی کشتی کھڑی تھی۔ پہریداروں نے رنبیر کو کشتی کے پاس زمین پر بٹھا کر اس کے پاؤں میں رسّا ڈال دیا۔ تین پہریدار رنبیر کے پاس کھڑے رہے اور باقی پانچ کشتی میں بھرا ہوا پانی نکال کر باہر پھینکنے لگے۔ یہ سب رنبیر کے لیے اجنبی تھے۔

تھوڑی دیر بعد رنبیر کے گرد پہرہ دینے والوں میں سے ایک سپاہی نے جو ان کا رہنما معلوم ہوتا تھا، کشتی سے پانی نکالنے والوں کے قریب جا

کر کہا۔ ”بھئی! جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔“

ان میں سے ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ”کشتی کا پیندا بہت خراب ہے۔ میرے خیال میں ہم سب کا اس پر سوار ہونا خطرناک ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ آدھے آدمی ایک بار اور آدھے دوسرے پھیرے میں پار جائیں۔ ویسے بھی یہ کشتی پانچ چھ آدمیوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔“

سپاہی نے قدرے توقّف کے بعد جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے تم ان چار آدمیوں کو لے کر چلے جاؤ اور انہیں دوسرے کنارے چھوڑ کر جلدی واپس آجاؤ۔ پھر ہم قیدی کے ساتھ آجائیں گے لیکن دیر نہ ہو۔“

دوسرے سپاہی نے چپّو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“

کشتی پانچ آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گئی اور باقی تین پہریدار رنبیر کے قریب بیٹھ گئے۔ اپنے پہریداروں کی تعداد میں کمی دیکھ کر بھی رنبیر کی مایوسی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بے بسی کی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف اسے موت کی تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ سوچ رہا

تھا"قدرت کا یہ مذاق کس قدر عجیب ہے۔ کیا اسی وقت کے انتظار میں مَیں نے پانچ سال ایک قیدی کی حیثیت سے گزارے ہیں۔ کیا اس وقت کے لیے میں ہر شام اور ہر صبح زندہ رہنے کی دعائیں کرتا رہا ہوں۔ میں موت سے بغلگیر ہونے کے لئے نندنہ کے میدان تک جا نکلا تھا لیکن وہ اس محل کی چار دیواری میں چھپ کر میرا انتظار کر رہی تھی، جسے میں اپنے لیے دنیا کے ہر قلعے سے زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔ میں اس دشمن کی قید سے رہا ہو کر آیا ہوں کو قنوج تک اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ چکا ہے اور آج میں ایک ایسے دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں گا جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں۔ "شکنتلا کہاں ہے؟ پِتا جی کہاں ہیں؟ کیا میں اب بھی کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔"

اچانک وہ اپنے پہریداروں کی طرف متوجہ ہو کر چلّا اٹھا۔ "بھائیو! میں صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

پہریدار خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ رنبیر نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم مجھے قتل کرنے پر مجبور ہو۔ اپنے سردار کا حکم ماننا تمہارا فرض

ہے۔ میں رحم کی درخواست نہیں کرتا لیکن مرنے سے پہلے میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارا سردار جس نے میرے قتل کا حکم دیا ہے کون ہے؟"

پہریدار کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ "ہم تمہیں صرف یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے سردار کا نام جے کرشن ہے اور اس کے محل میں رات کے وقت چوروں کی طرح داخل ہونے کے بعد تم اس سے بہتر سلوک کے حق دار نہیں تھے۔"

جے کرشن کا نام سننے کے بعد رنبیر کی نگاہوں سے تمام پردے ہٹ گئے۔ اب اس کے لیے کوئی بات معمّہ نہ تھی۔ وہ چند ثانیے خاموش رہا پھر گھٹی آواز میں بولا۔ "میں سردار موہن چند کا بیٹا ہوں اور تم سے اپنے پِتا اور بہن کا حال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

ایک پہریدار نے جواب دیا۔ "وہ مر چکے ہیں۔"

رنبیر کے منہ سے دیر تک بات نہ نکل سکی۔ اب زندگی اور موت دونوں اس کے لیے بے حقیقت بن چکی تھیں۔

دوسرے سپاہی نے کہا۔ ”تمہارے باپ کے متعلق تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں نہیں لیکن تمہاری بہن کے متعلّق بھگوان بہتر جانتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دریا میں کود گئی تھی لیکن کسی نے اس کی لاش نہیں دیکھی۔“

رنبیر نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”میرے باپ کو جے کرشن نے قتل کیا ہے؟“

”ہاں“ سپاہی نے جواب دیا۔ ”لیکن اب ایسی باتوں سے کیا فائدہ۔ بہتر ہے کہ اب تم بھگوان کو یاد کرو۔“

رنبیر کی اداس اور مغموم نگاہیں خاموش فضا میں بھٹک رہی تھیں اور اس کا ضمیر ان دیوتاؤں کی بے بسی کا تمسخر اڑا رہا تھا جن کی تقدیس پر اپنی جان تک قربان کرنے کا عزم لے کر وہ پانچ سال قبل اپنے گھر سے نکلا تھا۔

اچانک اس کے دل میں جے کرشن سے انتقام لینے کے لیے زندہ رہنے کی خواہش بیدار ہونے لگی۔ اس وقت اس کا زخم خوردہ ضمیر پکار اٹھا: ”رنبیر! تم اس دنیا میں تنہا نہیں ہو۔ اس ملک کے کروڑوں انسان تم سے زیادہ مظلوم ہیں اور جے کرشن بھی تنہا نہیں۔ اس ملک کا ہر باشندہ دوسروں پر غالب آنے کے بعد جے کرشن بن جاتا ہے۔ اس سمندر کی ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہے۔ یہ سماج صرف اور اچھوتوں کا دشمن نہیں بلکہ ہر اس انسان کا دشمن ہے جو کسی کی طاقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس سماج کے دیوتا ہر اس ظالم اور جابر انسان کی پشت پناہی کرتے ہیں جو دوسروں کی گردن پر سوار ہونے کی ہمّت رکھتا ہے۔ دیوتاؤں کے پجاری جو ہر سال تمہارے باپ سے دان لینے کے لیے آتے تھے، اب جے کرشن سے دان لینے آیا کریں گے۔ تمہاری جنگ اور قید دونوں بے مقصد تھیں اور اب تمہاری موت بھی بے مقصد ہے۔ تمہارا خون اس مٹّی پر گرنے والا ہے جو اَن گنت لوگوں اور بے گناہوں کا خون جذب کر چکی ہے۔“

رنبیر انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اس کو کوئی تیس قدم کے فاصل پر سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں کوئی متحرک شے دکھائی دی۔ چند ثانیے غور سے دیکھنے کے بعد وہ محسوس کرنے لگا کہ کوئی انسان زمین پر رینگ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی مایوسی کی بھیانک تاریکیوں میں اسے امید کی ہلکی سی کرن نظر آنے لگی۔ اجنبی چند قدم رینگنے کے بعد رُک گیا اور گردن اُٹھا کر پیچھے کی طرف دیکھنے کے بعد ہاتھ سے اشارہ کرکے بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ رنبیر کے پہرے دار کشتی کے انتظار میں دوسرے کنارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اجنبی قدرے توقّف کے بعد زمین پر رینگتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی رنبیر کو اس کے چند قدم پیچھے آٹھ دس اور آدمی اسی طرح زمین پر رینگتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس کا خون جو تھوڑی دیر پہلے منجمد ہو چکا تھا، اب تیزی سے اس کے رگ وپے میں دوڑ رہا تھا۔ زندگی دونوں ہاتھ پھیلا کر اُسے سینے سے لگانے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔

اچانک پہریداروں کا افسر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ٹکٹکی باندھ کر

دوسرے کنارے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کمبخت ابھی تک واپس نہیں آئے، اب صبح ہونے والی ہے اور سردار بے چینی سے ہماری واپسی کا انتظار کر رہا ہوگا۔ ہم قیدی کو پہلے لے جاتے تو بہتر تھا۔“

دوسرے پہریدار نے کہا۔ ”مجھے آپ کی ناراضگی کا ڈر تھا ورنہ میں اسی وقت یہ کہنا چاہتا تھا کہ قیدی کو یہیں ختم کر کے لاش پہلے پھیرے میں پار بھیج دی جائے۔“

افسر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”واہ واہ کیا عقل کی بات کہی ہے تم نے۔ اگر اسے یہیں قتل کرنا ہوتا تو تمام آدمیوں کو دوسرے کنارے لے جانے کیا ضرورت تھی۔ سردار کا حکم ہے کہ قیدی کو دوسرے کنارے لے جا کر ٹھکانے لگایا جائے۔ تم نہیں جانتے سردار بہت دور کی سوچتے ہیں۔“ یہ کہہ کر افسر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ ریت پر رینگتے ہوئے آدمیوں کی ٹولی اب بہت قریب آچکی تھی۔ پہریداروں کی باتیں ختم ہو چکی تھیں اور اب ان کی خاموشی رنبیر کے لیے پریشان کن تھی۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ جھاڑیوں میں چھپ کر آنے والے لوگ قدرت نے اس کی مدد کے لیے

بھیجے ہیں لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اگر پہرے دار ان کی آمد سے باخبر ہو گئے تو سب سے پہلے اسے قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ اپنے مددگاروں کو اچانک حملے کا موقع دینے کے لیے پہریداروں کو باتوں میں مصروف رکھنا ضروری تھا۔ رنبیر نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ مسلمانوں کی فوج عنقریب دوبارہ اس ملک پر حملہ کرنے والی ہے اور اب واپس جانے کی بجائے وہ اس ملک پر قبضہ کر کے حکومت کریں گے۔"

پہریدار جواب دینے کی بجائے پریشانی کی حالت میں اس کا منہ دیکھنے لگے۔ رنبیر نے پھر کہا۔ "جب وہ اس علاقے میں آئیں گے تو جے کرشن جیسے لوگ جس قدر ظالم ہیں اسی قدر بزدل ثابت ہوں گے۔"

پہریداروں کے افسر نے کہا۔ "تم سمجھتے ہو کہ موت تو آ ہی رہی ہے، اس سے زیادہ کوئی تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن اگر تم نے ہمارے سردار کی شان میں کوئی گستاخی کی تو میں ابھی تمہاری زبان کاٹ ڈالوں گا۔"

رنبیر نے کہا۔ "یہ تمہارا سردار اگر احمق نہیں تھا تو اس نے یہ کیسے سمجھ لیا

کہ میں اکیلا محل میں گھس آیا تھا۔ میرے پچاس آدمی محل کے بڑے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اب تک محل پر قبضہ کر کے جے کرپشن کو پھانسی دے چکے ہوں گے اور تم اپنے سردار سے بھی زیادہ بے وقوف ہو۔ اس وقت تمہارے پیچھے، دائیں اور بائیں میرے آدمی کھڑے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔"

پہریدار سکتے کے عالم میں اپنے گرد دس مسلح آدمیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان ڈھاٹوں میں چھپے ہوئے تھے۔ رنبیر کو انہیں دیکھے بغیر اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ وہ اس کے گاؤں کے آدمی ہیں اور ان میں سے ایک شمبھوناتھ ضرور ہے۔

رنبیر نے حملہ آوروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "انہیں کچھ نہ کہو، یہ بے چارے نوکر ہیں۔"

رنبیر کی چال کامیاب رہی۔ حملہ کرنے والوں نے پہریداروں کی سراسیمگی سے فائدہ اٹھا کر انہیں تنگ گھیرے میں لے لیا اور انہوں نے شور مچانے یا مزاحمت کرنے کی بجائے اپنی تلواریں ان کے حوالے کر

دیں۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر رنبیر کے ہاتھ اور پاؤں کی رسّیاں کاٹ ڈالیں۔ رنبیر نے اُٹھ کر ایک آدمی کے ہاتھ سے تلوار پکڑ لی اور بدحواس پہریداروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم اگر اپنی جانیں بچانا چاہتے ہو تو خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے آؤ۔“

پہرے داروں کے افسر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! ہم پر دِیا کریں۔“

رنبیر نے اپنے مددگاروں سے کہا۔ ”انہیں جھاڑیوں میں لے جا کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں اگر کوئی شور مچانے کی کوشش کرے تو اس کی گردن اڑا دو۔“

یہ آدمی پہریداروں کو پکڑ کر جھاڑیوں میں لے گئے اور ان کی پگڑیوں اور دھوتیوں سے انہیں اچھی طرح جکڑ کر جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ رنبیر نے دو آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ تلواریں لیے ان کے سر پر کھڑے رہیں۔ پھر وہ باقی مددگاروں کو ساتھ لے کر دوبارہ کنارے کی طرف آ گیا۔

وہ قیدیوں سے ذرا دور آکر رکا اور اپنے مدد گاروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں تم میں سے کسی کو پہچان نہ لیں، اس لیے میں نے ان کے سامنے تم سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن تمہارے چہرے دیکھے بغیر میں تم سب کو پہچان چکا ہوں۔“ اس کے بعد رنبیر یکے بعد دیگرے اپنے گاؤں والوں کے نام لینے لگا اور وہ باری باری اس کے ساتھ بغلگیر ہونے لگے۔ صرف چار آدمی ایسے تھے جن کی بجائے اس نے دوسرے آدمیوں کے نام لیے۔ سب سے آخر میں اس نے رام ناتھ کا نام لیا لیکن وہ بغلگیر ہونے کی بجائے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”مہاراج! اب باتوں کا وقت نہیں۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے کوسوں دور نکل جانا چاہیے۔ میں گھوڑا یہاں سے تھوڑے فاصلے پر چھوڑ آیا ہوں۔ چلیے!“

رنبیر نے کہا۔ ”ابھی نہیں، ابھی تھوڑا سا کام باقی ہے۔ تم سب یہیں رہو۔ میرے ساتھ صرف تین آدمی آئیں۔ شمبھو ناتھ تم ان قیدیوں کے سامنے جا کر ایسی باتیں کرو جن سے ان پر یہ ظاہر ہو کہ یہ لوگ اس گاؤں کے نہیں بلکہ نندنہ سے میرے ساتھ آئے ہیں اور جو آدمی ان کے پاس

کھڑے ہیں، انہیں الگ لے جا کر اچھی طرح سمجھا دو کہ وہ ان کے سامنے بالکل خاموش رہیں اور تم میں سے کوئی جا کر ہمارے گھوڑے یہاں لے آئے۔"

۳

تھوڑی دیر بعد رنبیر اور اس کے تین ساتھی دریا کے کنارے بیٹھے واپس آنے والی کشتی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کشتی ذرا قریب آئی تو رنبیر کے ساتھیوں نے اس کا اشارہ پاتے ہی منہ دوسری طرف کر لیا۔ رنبیر اٹھ کر آگے بڑھا اور گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑا ہو گیا۔ جب کشتی اور قریب آئی تو اس نے جھک کہ اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے شروع کر دیے۔ کشتی میں صرف ایک آدمی سوار تھا۔ کشتی جب چار قدم کے فاصلے پر آگئی تو رنبیر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کشتی کا رُخ تبدیل چلانے والے نے رنبیر کو پہچان لیا اور اپنے آپ کو خطرے میں دیکھ کر فوراً کشتی کا رُخ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آن کی آن میں رنبیر کشتی میں سوار ہو چکا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ کشتی کے پریشان حال ملّاح کی گردن پر

تھے۔

رنبیر کے ساتھی بھاگتے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے کشتی کے رسّے کے ساتھ اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ رنبیر نے اس کی پگڑی اس کے منہ میں ٹھونس دی اور اسے اوندھا لٹا دیا۔ اس کے بعد اس نے نیچے اتر کر کشتی کو گہرے پانی کی طرف دھکیل دیا۔

رنبیر کے باقی ساتھی جو تھوڑی دور چھپ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے بھاگ کو اس کے ساتھ آملے۔ رنبیر نے ان سے پوچھا۔ "اس وقت محل میں کتنے پہریدار ہوں گے؟"

ایک عمر رسیدہ آدمی نے جو رنبیر کے باپ کا پرانا نوکر تھا، جواب دیا۔ "محل میں پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے لیکن گاؤں میں جے کرشن کے تقریباً ڈیڑھ سو سپاہی رہتے ہیں۔ جے کرشن نے محل پر قبضہ کرنے کے بعد گاؤں کے بہت لوگوں کو نکال دیا تھا اور ان کے گھر اپنے سپاہیوں کے حوالے کر دیے۔ ہم نے صرف آپ کی خاطر یہ خطرہ مول لینے کی جرات کی ہے۔ بھگوان کے لیے آپ محل پر حملہ کرنے کا خیال

چھوڑ دیں اور اپنی جان کی فکر کریں۔ جے کرشن صبح ہوتے ہی اس علاقے کا چپّہ چپّہ چھان مارے گا۔"

رنبیر نے کہا۔ "میں تم لوگوں کی جانیں خطرے میں نہیں ڈال سکتا، لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت جلد دوبارہ دوں گا۔ اب میں صرف اپنے پِتا اور شکنتلا کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔"

دیہاتی مغموم نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ رنبیر نے کہا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جے کرشن کے آدمی مجھے پِتا جی کے متعلّق بتا چکے ہیں کہ وہ قتل ہو چکے ہیں لیکن میں شکنتلا کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ "شام کے قریب جب جے کرشن کے آدمیوں نے محل پر حملہ کیا تھا تو چند آدمی مکان کی چھت پر کھڑے بیرونی دیوار پھاندنے کی کوشش کرنے والوں پر تیر برسا رہے تھے اور باقی محل کے دونوں دروازوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ شکنتلا تلوار ہاتھ میں لیے محل کی چار دیواری کے اندر چاروں طرف بھاگ کر

سپاہیوں کو جوش دِلا رہی تھی۔ سورج غروب ہونے تک محل کے مٹھی بھر پہریداروں نے انہیں روکے رکھا۔ ہمیں یہ امید تھی کہ گاؤں کے لوگ ہماری مدد کے لئے آئیں گے لیکن جے کرشن کی فوج کا ایک دستہ گاؤں پر بھی حملہ کر چکا تھا اور گاؤں کے لوگوں نے جو آپ کے پِتا جی کی موت کے باعث جی ہار چکے تھے معمولی مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ سورج غروب ہوتے ہی دشمن نے محل کے چاروں طرف سے ہلّہ بول دیا اور پہلے حملے ہی میں کئی آدمی دیوار پھاند کر محل کے اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے ہمارے سپاہیوں کو ایک طرف دھکیل کر بڑا دروازہ کھول دیا۔ چند سپاہیوں نے ہتھیار پھینک دیے لیکن باقی ابھی تک اندرونی دیواروں کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی تاریکی میں آدمیوں کی چیخ و پکار کے درمیان کبھی کبھی شکنتلا کی آواز بھی سنائی دیتی تھی جو آدمی چھت پر سے تیر برسا رہے تھے ہمارے ساتھ آ ملے اور ہم نے ایک زور دار حملے سے دشمن کے پاؤں اکھاڑ دیے لیکن ہماری تعداد ہر لحظہ کم ہو رہی تھی۔ دشمن نے ہمیں جلد مغلوب کر لیا۔ میں زخمی ہونے کے بعد مشرقی دروازے کی طرف بھاگا۔ وہاں ہمارے چند آدمی ابھی تک ڈٹے ہوئے

تھے اور دشمن کا گروہ جو شاید تاریکی میں حملہ کرنے سے گھبرا رہا تھا کچھ فاصلے پر کھڑا انہیں للکار رہا تھا۔ میں تاریکی میں دشمن کی نگاہوں سے بچتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا ملا۔ تھوڑی دیر بعد شکنتلا بھی دو آدمیوں کے ہمراہ آم کے درختوں میں چھپتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ میں نے تاریکی میں اس کی آواز پہچانتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے سمجھایا کہ تم باہر نکل جاؤ۔ اب ہم بازی ہار چکے ہیں۔ اس کونے کے سوا باقی سارے محل پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اتنے میں دشمن کے کسی آدمی نے بلند آواز میں کہا "اب تم آٹھ دس آدمیوں کی لڑائی بے فائدہ ہے۔ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو۔ لیکن ہم ہتھیار ڈالنے کی بجائے دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔

دروازے سے باہر دشمن کے چند آدمی ہماری تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہم پر تیر برسائے۔ ہمارے چند ساتھی وہیں ڈھیر ہو گئے لیکن اُس کے بعد دشمن نے ہمارا تعاقب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مجھے یقین ہے کہ شکنتلا میرے ساتھ باہر نکلی تھی لیکن اس کے بعد مجھے معلوم

نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ لچھمن نے کسی کو دریا میں چھلانگ لگاتے دیکھا تھا لیکن وہ وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ شکنتلا تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بہت اچھی تیراک تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے دریا عبور کر لیا ہو گا۔ میں اپنے زخموں کی وجہ سے اگلے دن تک دریا کے کنارے جھاڑیوں میں پڑا رہا۔ اس کے بعد جے کرش کے آدمی مجھے پکڑ کر اس کے پاس لے گئے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی بیوی اور لڑکی کو میرے بڑھاپے پر ترس آ گیا اور ان کی سفارش سے میری جان بچ گئی۔"

رنبیر نے سوال کیا۔ "لچھمن کہاں ہے؟"

عمر رسیدہ آدمی نے جواب دیا۔ "وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں جا چکا ہے۔"

رنبیر نے سوال کیا۔ "پِتا جی محل پر حملے سے پہلے قتل ہو چکے تھے؟"

"ہاں! انہیں دریا کے پار سردار انوپ چند کے گاؤں میں قتل کیا گیا تھا۔ سردار انوپ چند نے انہیں یہ پیغام بھیجا تھا کہ آسی کا پروہت اور علاقے کے سردار اس کے پاس آئے ہوئے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ان کی صحت ٹھیک نہ تھی۔ پھر بھی وہ صبح سویرے دونوکروں کو ہمراہ لے کر وہاں چلے گئے جن میں ایک میرا بھتیجا جے دیال تھا۔ سردار انوپ چند کے باغ میں آسی کے پروہت اور علاقے کے سرداروں کے علاوہ باہر کے چند آدمیوں کے ساتھ جے کرشن بھی موجود تھا۔

پروہت اور علاقے کے سرداروں نے آپ کے پِتا کو مہاراجہ کے خلاف راجکمار کی سازش میں شریک ہونے کے لیے کہا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور جواب دیا ''مسلمانوں کے خلاف ہمارے راجہ نے جو بزدلی دکھائی ہے اس کا مجھے افسوس نہیں لیکن میں باپ کے خلاف اس کے بیٹے کی سازش میں حصّہ نہیں لے سکتا۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کالنجر اور گوالیار کی قومیں ہمارے وطن پر چڑھائی کریں گی۔ راجکمار اگر اپنے باپ کی گدّی پر بیٹھنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو بھی وہ اس کی کامیابی نہیں بلکہ کالنجر کے راجہ کی فتح ہو گی۔ راجکمار اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہو گا۔ آپ اپنے راجہ کو بزدلی کا طعنہ دے سکتے ہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ جب مسلمانوں نے حملہ کیا تھا تو کالنجر اور گوالیار کی فوجیں

کہاں چھپ گئی تھیں۔ اگر ان میں زیادہ غیرت تھی تو وہ گھر میں بیٹھے تماشا دیکھنے کی بجائے ہمارے راجہ کی مدد کے لیے کیوں نہ آئے۔"

آپ کے پِتا نے یہ بھی کہا۔ "اس وقت جے کرشن جیسا آدمی بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے وطن کی عزّت و آزادی کا سودا ہو چکا ہے۔ پہلے اس نے مہابن کے راجہ کی شہ پر ملک میں بغاوت کرانے کی کوشش کی تھی اور اب یہ ہمیں کالنجر اور گوالیار کے راجاؤں کا غلام بنانا چاہتا ہے۔"

یہ سن کر جے کرشن خاموش نہ رہ سکا اور اس نے پِتا کو بزدلی کا طعنہ دیا۔ آپ کے پِتا نے طیش میں آکر تلوار نکال لی۔ جے کرشن پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ آپ کے پِتا تھوڑی دیر لڑنے کے بعد زخمی ہو کر گِر پڑے اور جے کرشن نے انہیں دوبارہ اٹھنے کا موقع نہ دیا۔ انوپ چند کے اشارے سے اس کے آدمیوں نے ان کے نوکروں پر حملہ کر دیا جو قریب ہی گھوڑوں کے پاس کھڑے تھے۔ کالو مارا گیا لیکن جے دیال گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ آیا۔

اس واقعے سے اٹھارہ دن بعد ہم نے مہاراجہ کے قتل اور راجکمار کے گدّی پر بیٹھنے کی خبر سنی۔ پھر دس دن بھی نہیں گزرے تھے کہ جے کرشن نے نئے راجہ سے اپنی پرانی جاگیر پر قبضہ کرنے کی اجازت لے کر ہمارے گاؤں پر حملہ کر دیا۔"

رنبیر نے پوچھا۔ "تمہیں یقین ہے کہ جے کرشن کے آدمی شکنتلا کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے؟"

عمر سیدہ آدمی نے جواب دیا۔ "ہاں جے کرشن نے شکنتلا کی تلاش سے مایوس ہو کر اس کا پتہ دینے والے کے لیے انعام مقرر کیا تھا، لیکن کسی کو اس کا سُراغ نہیں ملا۔"

ایک دیہاتی نے کہا۔ "مہاراج! اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ آپ جلدی کریں۔"

رنبیر نے کہا۔ "میں قیدیوں کو کچھ دور اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ کسی ایسی جگہ چھوڑنا ضروری ہے جہاں دیر تک انہیں کوئی تلاش نہ کر سکے۔

اس طرح ہمیں کافی وقت مل جائے گا۔ اب مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں قیدیوں سامنے تمہیں ایسی ہدایات دوں گا جن سے ان پر یہ ظاہر ہو کہ تم ہمارے ساتھ آئے تھے اور ہمارے ساتھ ہی جا رہے ہو۔ لیکن تمہارے لیے یہ ضروری ہے کہ مجھ سے رخصت ہوتے ہی سیدھے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ اب میرے ساتھ آؤ اور گھوڑے بھی وہیں لے آؤ۔"

دوبارہ قیدیوں کے پاس جا کر رنبیر نے اپنے گھوڑے کا رسّا کھول کر اس کا ایک سرا زین کے ساتھ باندھا اور دوسرے سے دوسرے قیدیوں کے ہاتھ باندھ دیے۔ اور تیسرے قیدی کو اس نے شمبھو ناتھ کے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ دیہاتیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "اب تم جاؤ اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر باقی فوج کے ساتھ جاملو۔ ان قیدیوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر میں تمہارے ساتھ آملوں گا اور دیکھو سرحد عبور کرنے سے پہلے تمہارے لیے دیہاتیوں کا لباس ہی ٹھیک رہے گا۔ اب جاؤ!"

دیہاتی جھاڑیوں میں روپوش ہو گئے اور رنبیر اور شمبھو ناتھ گھوڑوں پر سوار

ہو گئے۔ تین قیدی ان کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ ان کا رُخ دریا کے کنارے شمال کی طرف تھا۔

اُفقِ مشرق پر صبح کا ستارہ نمودار ہو چکا تھا۔ یہ لوگ کوئی دو کوس فاصلہ طے کر چکے تھے۔ بائیں ہاتھ ایک گھنے جنگل میں داخل ہونے کے بعد رنبیر نے گھوڑا روکا اور نیچے اُتر کر یکے بعد دیگرے تین قیدیوں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باندھ دیا۔

دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد اسے اپنی منزل مقصود کا علم نہ تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ صبح کی روشنی میں جنگل اس کے لیے زیادہ محفوظ ہے۔

شمبھو ناتھ نے پوچھا۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

رنبیر نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کہا۔ ”تم پِتا جی اور شکنتلا کے متعلق سُن چکے ہو؟“

”ہاں میں سب کچھ سُن چکا ہوں۔“ رنبیر نے کہا۔ ”اب شکنتلا کی تلاش

کے سوا میری زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں۔ میں اسے جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں میں تلاش کروں گا، میں اسے جھونپڑیوں، محلوں اور مندروں میں ڈھونڈوں گا۔ مجھے ہر وقت شکنتلا کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں گی اور میں کبھی چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

شمبھوناتھ نے کہا۔ "آپ میری ایک بات مانیں گے؟"

"وہ کیا؟"

"دیکھیے شکنتلا اگر آس پاس ہوتی تو علاقے کے لوگ اب تک اسے ڈھونڈ نکالتے۔ وہ ضرور کہیں دور جا چکی ہے۔ آپ پڑوس کی ریاستوں میں اُسے تلاش کریں اور تمام راجاؤں اور بڑے بڑے راجپوت سرداروں سے ملیں۔ آپ کے پِتا کو کون نہیں جانتا، پھر آپ نے پانچ سال مسلمانوں کی قید میں گزارے ہیں۔ ملک کے ہر راجہ اور سردار کے دل میں آپ کی عزت ہو گی۔ وہ آپ کی ضرور مدد کریں گے۔ ممکن ہے کہ شکنتلا ان میں سے کسی کی پناہ میں ہو۔ لیکن قنوج اور باری میں آپ آزادی سے نہیں پھر سکتے۔ جے کرشن کے آدمی ہر وقت آپ کی کھوج میں ہوں گے۔ اپنے

دیس میں ایک سادھو کا بھیس بدل کر میں اُس تلاش کروں گا۔ مجھ پر کسی کو شک نہیں ہو گا۔ اس جنگل سے آگے ایک گاؤں ہے جہاں میرے ماموں زاد بھائی رہتے ہیں۔ اگر مجھے شکنتلا کا کوئی پتہ چلا تو میں ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

رنبیر نے مُرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شمبھوناتھ! ابھی میرا دماغ کام نہیں کرتا۔“

جنگل عبور کرنے کے بعد رنبیر اور شمبھوناتھ اپنے سامنے ایک چھوٹی سی بستی دیکھ رہے تھے۔ شمبھوناتھ نے کہا۔ ”وہ میرے ماموں کے لڑکوں کا گاؤں ہے۔“ رنبیر نے اپنا گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔ ”شمبھو! تم اپنا گھوڑا وہاں لے جانے کی بجائے جنگل میں چھوڑ دو۔ تمہارے لیے چند دن لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر رہنا بہتر ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ جے کرشن تمہاری تلاش میں یہ تمام علاقہ چھان مارے گا۔“

شمبھوناتھ نے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیں۔ میں بھیس بدل کر لوگوں کی نگاہوں کو دھوکا دینا سیکھ چکا ہوں۔ مجھے صرف آپ کے متعلق پریشانی

ہے۔“

رنبیر نے کہا۔ ”میں سیدھا سردار پورن چند کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ پِتا جی کا پرانا دوست ہے۔ اگر وہ کوئی اور مدد نہ دے سکا تو کم از کم مجھے تازہ دم گھوڑا دینے سے انکار نہیں کرے گا۔ اس کے بعد میں گوالیار جاؤں گا۔ وہاں کے ایک سردار کا بیٹا میرے ساتھ نندنہ کے قلعے میں قید تھا۔ مجھے امید ہے کہ اس کے ذریعے میں گوالیار کے راجہ کو اپنی مدد کے لیے آمادہ کر سکوں گا۔“

شمبھو ناتھ نے کہا۔ ”تو وقت ضائع نہ کیجئے۔ پورن چند کا گاؤں یہاں سے بہت دور ہے اور آپ کا گھوڑا جواب دے چکا ہے۔“

رنبیر اور شمبھو ناتھ یہاں سے جدا ہو کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور خطرے سے دور ہو گئے۔

تلاش

جے کرشن محل کے کشادہ صحن میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ چند نوکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ جے کرشن نے غضب ناک نگاہوں سے ایک نوکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے انہیں گاؤں میں بھی تلاش کیا ہے؟“

”ہاں مہاراج! گاؤں کے کسی آدمی نے انہیں نہیں دیکھا۔“

”اگر کشتی بھی اس کنارے پر نہیں تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ گدھے ابھی تک دریا کے پار بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”لیکن مہاراج! مجھے اس کنارے پر بھی کوئی کشتی دکھائی نہیں دی۔“

جے کرشن نے چلّا کر کہا۔ ”تو پھر کشتی کہاں گئی؟“

نوکر نے جواب دیا۔ ”مہاراج! میرا خیال ہے کہ انہوں نے دوسرے کنارے پہنچ کر کشتی کو کسی چیز سے باندھنے کی بجائے کھلا چھوڑ دیا ہو گا اور وہ بہہ گئی ہو گی۔ میں نے نچلے گھاٹ سے گاؤں والوں کی کشتی میں ایک آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ ابھی پتہ کر کے آ جائے گا۔“ ”تم نے گاؤں کے آدمیوں کو کہیں یہ تو نہیں بتایا کہ میرے نوکر ایک آدمی کو قتل کرنے کے لیے پار لے گئے ہیں؟“

”نہیں مہاراج!“

”سچ کہو۔“

”سچ کہتا ہوں مہاراج۔“

”تم خود پار کیوں نہیں گئے؟“

”مہاراج! آپ نے حکم دیا تھا کہ میں اسی کنارے سے دیکھ کر فوراً واپس آ جاؤں۔“

”کشتی ڈوب تو نہیں گئی؟“

”مہاراج میں یہ کہنے کو ہی تھا۔ کشتی بہت خراب تھی۔ آٹھ نو آدمیوں کا اس پر سوار ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔“

”اسے مرمّت کیوں نہیں کرایا گیا۔ میں نے پیارے لال سے کہا تھا کہ وہ کشتی کو فوراً ٹھیک کرائے۔“

”مہاراج! اس نے بڑھئی کو میرے سامنے کہا تھا لیکن ابھی تک اس نے کچھ نہیں کیا۔“

”بلاؤ بڑھئی کو۔ جلدی کرو۔“

نوکر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور جے کرشن نے اضطراب کی حالت میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد چار اور نوکر محل میں داخل ہوئے۔ جے کرشن کے قریب کھڑے ہونے والے نوکروں میں سے ایک نے کہا۔

"مہاراج! وہ آ گئے!"

جے کرشن چھڑی گھماتا ہوا آگے بڑھا اور گرجتی ہوئی آواز میں بولا۔ تم نے آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی؟" ایک نوکر بولا۔ "مہاراج! ہم اس پار کشتی۔۔۔۔"

جے کرشن نے اسے اپنا فقرہ پورا کرنے کی مہلت نہ دی اور چلّا کر کہا۔ "بدمعاش! یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم اس کشتی پر گئے تھے لیکن تم نے اتنی دیر کیوں کی اور تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔"

"معلوم نہیں مہاراج! ہم نے پار پہنچتے ہی کشتی بھیج دی تھی۔"

"کہاں؟"

"اِس پار مہاراج!"

"اِس پار، اُس پار۔ کیا کہہ رہے ہو تم۔"

سپاہی نے بدحواس ہو کر کہا۔ "مہاراج! ہم ان کے لیے کشتی بھیج کر انتظار

کرتے رہے۔ لیکن بھگوان جانے وہ کیوں نہ آئے اور کشتی غائب ہو گئی۔"

اس مرتبہ جے کشن نے چلّانے کی بجائے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے آگے بڑھ کر سپاہی کو دو تین چھڑیاں رسید کر دیں اور اس کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "اور تم میری طرف آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟ بکتے کیوں نہیں۔ کس کا انتظار کرتے رہے تم اور کون نہیں آیا؟"

دوسرے نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "مہاراج! دریا کے کنارے پہنچ کر پیارے لال نے سوچا کہ ہم تمام آدمیوں کا ایک ہی پھیرے میں پار جانا ٹھیک نہیں، اس لیے اس نے بھگت رام کے ساتھ ہم چار آدمیوں کو پہلے بھیج دیا۔ ہم نے پار پہنچتے ہی بھگت رام کو کشتی پر واپس بھیج دیا کہ باقی آدمیوں کو لے آئے۔ لیکن وہ نہ آئے۔ انہوں نے کشتی بھی واپس نہ بھیجی اور ہم دریا کے پار ان کا انتظار کرتے رہے۔ کافی دیر بعد مجھے اس پار کنارے کے ساتھ ساتھ کوئی چیز بہتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ شاید کشتی نیچے کی طرف جا رہی ہے لیکن ان کا خیال تھا کہ کشتی میں کچھ اور ہے۔"

جے کرشن نے پوچھا۔ ”اب تک تم نے قیدی کو قتل کیا ہے یا نہیں؟“

”مہاراج! قیدی پیارے لال، جے چند اور ستیارام کے ساتھ اس کنارے پر تھا۔“

”میں پوچھتا ہوں، تم قیدی کو تین آدمیوں کی حفاظت میں چھوڑ کر کیوں گئے۔“

”مہاراج! یہ پیارے لال کا حکم تھا اور قیدی رسّیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس لیے ہمیں کوئی خطرہ نہ تھا۔“

جے کرشن نے غصّے سے کانپنے اور چھڑی گھماتے ہوئے کہا ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تم سب گدھے ہو۔ میں تم سب کو پھانسی پر لٹکا دوں گا اور اب تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جاؤ اور انہیں دریا کے آس پاس ہر جگہ تلاش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ رنبیر محل میں داخل ہونے سے پہلے اپنے چند ساتھیوں کو باہر کھڑا کر آیا ہو اور وہ اسے پیارے لال سے چھڑا کر لے گئے ہیں۔ اگر تمہیں قیدی کی لاش نہ ملی تو پیارے لال اور اس کے

ساتھیوں کی لاشیں ضرور ملنی چاہیں۔ جاؤ انہیں تلاش کرو۔"

نوکر بھاگتے ہوئے باہر نکل گئے اور جے کرشن نے پھر اسی طرح ٹہلنا شروع کر دیا۔ رنبیر کے بچ نکلنے کے تصوّر سے اس کا غصّہ اور اضطراب خوف میں تبدیل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بھگت رام مشرقی دروازے سے نمودار ہوا اور جے کرشن اُسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر چلّایا۔ "تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ گوپال کہاں ہے؟"

"مہاراج!" اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا "انہوں نے مجھے باندھ کر کشتی میں ڈال دیا تھا اور مجھے یہاں سے تین چار کوس نیچے ایک چرواہے نے کشتی سے نکالا ہے۔"

"تمہیں کس نے باندھ کر کشتی میں ڈالا تھا؟"

"قیدی نے مہاراج!"

"کہاں؟ کب؟"

"مہاراج! میں پہلے ان چار آدمیوں کو کشتی پر لے کر دوسرے کنارا۔"

جے کرشن نے تلملا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ بکواس میں بار بار نہیں سننا چاہتا۔ تم صرف میرے سوال کا جواب دو۔“

”میں آپ ہی کے سوال کا جواب دے رہا ہوں مہاراج! پیارے نے مجھے کہا کہ کشتی خراب ہے۔ اس لیے پہلے۔۔۔۔“

جے کرشن نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان تمہارا ستیاناس کرے۔ اچھا بکتے رہو۔“

جگت رام نے کہا۔ ”مہاراج! میں نے پہلے ان چار آدمیوں کو پار پہنچایا۔ پھر جب میں پیارے لال، جے چند، ستیارام اور قیدی کو لینے آیا تو انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور کشتی کو گہرے پانی میں دھکیل دیا۔“

”انہوں نے۔ کس نے؟“

”مہاراج! پہلے مجھ پر قیدی نے حملہ کیا۔ پھر وہ بھی اپنے منہ ڈھاٹوں میں چھپا کر اس کے ساتھ مل گئے۔“

”کون! پیارے لال اور اس کے ساتھی؟“

”ہاں مہاراج! وہاں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ قیدی مزے سے پانی میں کھڑا تھا اور وہ کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب قیدی نے مجھ پر حملہ کیا تو وہ بھی بھاگ کر آ گئے، ڈھاٹوں کی وجہ سے میں ان کی شکلیں تو نہیں دیکھ سکا لیکن مہاراج وہ پیارے لال، سیتا رام اور جے چند کے سوا اور کون ہو سکتے تھے۔“

”پاجی، نمک حرام، میں انہیں کتّوں کے آگے ڈال دوں گا۔ میرا گھوڑا تیّار کرو اور گاؤں میں میرے تمام سپاہیوں کو حکم دو کہ وہ اپنے گھوڑوں پر فوراً یہاں پہنچ جائیں۔“

۲

جے کرشن محل سے باہر سواروں کے چھوٹے چھوٹے دستے مختلف سمتوں کو روانہ کر کے خود تیس سواروں کی معیّت میں شمال کی طرف روانہ ہوا۔ گاؤں سے کوئی ڈیڑھ کوس دور اُسے پیارے لال اور اس کے دو ساتھی اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ جے کرشن نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے آن کی آن میں ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

”قیدی کہاں ہے؟“ جے کرشن نے ان کے قریب اپنا گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! قیدی جا چکا ہے؟“

”کہاں؟“

”جہاں اس کی فوج تھی مہاراج!“

جے کرشن نے گھوڑے سے کود کر پیارے لال کو بید کی چھڑی سے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ چلّا رہا تھا۔ ”مہاراج! دِیا کیجیے، ہم بے قصور ہیں۔ اس کے ساتھ ایک پورا لشکر تھا۔ مہاراج! مہاراج!! وہ بہت تھے۔ وہ گاؤں پر حملہ کرنے لے لیے آئے تھے۔ ہائے مر گیا۔ بھگوان کے لیے معاف کر دیجیے۔ مہاراج! جے چند اور ستیارام سے پوچھ لیجیے۔“ اب جے کرشن جے چند اور سیتارام پر ٹوٹ پڑا۔ جب اس کا غصّہ ٹھنڈا ہوا تو پیارے لال نے اس کے پاؤں پر گرتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! دریا کے کنارے ہم پر ان کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ ہم تلواریں بھی نہ نکال سکے۔ وہ ہمیں گرفتار

کر کے جنگل میں لے گئے اور وہاں ہمیں درختوں سے باندھ دیا۔ ہمارے منہ پر کپڑے باندھ دیے گئے تھے تا کہ ہم کسی کو آواز نہ دے سکیں۔ ابھی ایک چرواہا اس طرف آنکلا اور اس نے ہمیں آزاد کیا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم اس کے ساتھ مل گئے تھے اور اسے بھگا دینے کے بعد اب تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو۔ میں تم سب کو زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ سچ کہو تم نے قیدی کو کہاں چھپایا ہے؟"

"مہاراج! بھگوان کی سوگند، میں سچ کہتا ہوں۔ آپ چرواہے سے پوچھ لیں۔ وہ ابھی تک وہیں ہو گا۔"

جے کرشن نے قدرے توقّف کے بعد پوچھا۔ "اگر تم سچ کہتے ہو تو بتاؤ قیدی کس طرف گیا ہے۔"

"مہاراج! ان کے پاس گھوڑے تھے اور وہ جنگل میں روپوش ہو گئے ہیں۔ ہمیں گرفتار کرنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ تم اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر باقی فوج کے ساتھ جا ملو۔ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں

گا۔ اس کے بعد وہ اور اس کے آدمی ہمیں گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر جنگل کی طرف لے گئے۔ مہاراج! اس کی فوج کہیں نہیں جا چکی تو جنگل میں ہو گی۔ مہاراج! وہ اس علاقے میں دیہاتیوں کا بھیس بدل کر پھر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی وقت اچانک ہم پر حملہ نہ کریں۔“

جے کرشن نے سوال کیا۔ ”تمہارے خیال میں اس کے ساتھ کتنے آدمی ہوں گے؟“ پیارے لال نے جواب دیا۔ ”مہاراج! ہم نے آٹھ دس آدمیوں سے زیادہ نہیں دیکھے۔ لیکن اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے۔“

جے کرشن چلّایا۔ ”تم بالکل گدھے ہو۔ اس نے تمہیں اُلّو بنانے کے لیے یہ بات کہی ہو گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی دور سے ایک فوج لے کر آیا ہو اور نندنہ سے لے کر یہاں تک راستے میں کسی کو خبر نہ ہوئی ہو۔ پھر اگر اس کے پاس اتنی فوج تھی تو اس نے محل پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ اس کے ساتھ صرف وہی آدمی ہوں گے جو تم نے دیکھے ہیں۔“

ایک سوار نے کہا۔ ”مہاراج! آپ تسلّی رکھیں، ہم انہیں بھی ڈھونڈ نکالیں

گے۔“

لیکن جے کرشن صرف اپنی قوّت کے بل بوتے پر جنگل میں پاؤں رکھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے چند سواروں کو آس پاس کے سرداروں کی طرف یہ پیغام دے کر روانہ کیا۔ ”محمود غزنوی کے چند جاسوس جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس لیے تم سب اپنی اپنی فوج لے کر پہنچ جاؤ۔“ اس کے بعد اس نے باقی آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم صرف ابھی جنگل کے ارد گرد پہرا دیتے رہو۔ وہ لوگ اگر اب تک جنگل عبور نہیں کر چکے تو رات سے پہلے باہر نہیں نکلیں گے۔ اتنی دیر میں یہاں تمام علاقوں کے آدمی جمع ہو جائیں گے اور ہم اگر آج شام تک نہیں تو کل صبح پو پھٹتے ہی جنگل میں ان کی تلاش شروع کر دیں گے۔ اگر تم میں سے کسی کی غفلت کے باعث وہ لوگ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں سخت سزا دوں گا۔ تم جنگل کے آس پاس ہر کسان اور ہر چرواہے سے اس کا پتہ دریافت کرتے رہو۔ میں احتیاط کے طور پر گاؤں اور محل کی حفاظت کا انتظام کر کے واپس آتا ہوں۔ اور پیارے لال تم میری بات کان کھول کر سن لو اگر

اب تم نے کوئی بیوقوفی کی تو میں تمہیں اسی جنگل کے کسی درخت پر لٹکا دوں گا۔ تم کسی سے گھوڑا لے لو اور ابھی دو تین سواروں کے ساتھ جنگل کی دوسری طرف پہنچ کر آس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو خبردار کرو اور انہیں یہ بتاؤ کہ میں رنبیر اور اس کے ساتھیوں کو زندہ پکڑنے یا قتل کے والے کی جھولی سونے چاندی سے بھر دوں گا۔"

۳

دن ڈھلے پیارے لال اور بھگت رام جنگل کے قریب ایک کھیت میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے دائیں بائیں دیہات کے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں اِدھر اُدھر چکّر لگا رہی تھیں۔

پیارے لال نے بھگت رام سے کہا۔ "بھگت رام! ہماری مصیبت کی دوسری رات شروع ہونے والی ہے۔"

بھگت رام بولا۔ "یار رات تو یہ بھی گزر جائے گی لیکن مجھے صرف اس بات کا ڈر ہے کہ اگر صبح کو بھی ان کا پتہ نہ چلا تا تو تمہارا کیا بنے گا؟"

”اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جنگل میں ٹھہرے ہی نہ ہوں؟“

بھگت رام نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ دیہاتیوں کے بھیس میں نکل جائیں اور کسی کہ ان پر شک نہ ہو۔ آخر رات کے وقت جنگل کے چاروں طرف پہرا دینا آسان کام نہیں۔“

”تمہارا مطلب یہ ہے کہ مجھے آئندہ اس علاقے کے ہر آدمی کی غلطی کی سزا ملا کرے گی۔“

”دوست بات یہ ہے کہ تمہیں سردار کے سامنے رنبیر کی فوج کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب تمہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ رنبیر کے ساتھ سچ مچ ایک فوج تھی۔“ پیارے لال جے کرشن کے تمام نوکروں سے زیادہ معتبر تھا اور عام حالات میں وہ باقی نوکریوں سے ایسی باتیں سن کر آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا لیکن گزشتہ چھ پہر کے واقعات سے اس کے مزاج میں ایک غیر متوقع تبدیلی آچکی تھی۔ بھگت رام کے طنز پر اس نے اپنا غصّہ ضبط کرتے ہوئے کہا ”بھگت رام! تمہیں خوش نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں

معلوم ہے کہ اگر سردار مجھے دن میں بیس مرتبہ برا بھلا کہے گا تو چھ سات بار تمہاری شامت بھی آئے گی۔“

بھگت رام خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک دیہاتی کو آواز دے کر پوچھا۔ ”ارے بھائی! یہاں کہیں پانی ہے یا نہیں؟“

دیہاتی نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ”پانی کے لیے آپ کو ندی پر جانا پڑے گا۔“

”ندی کتنی دور ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”زیادہ دور نہیں۔ میرے خیال میں آدھ کوس سے بھی کم ہو گی۔“

پیارے لال نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”یار پیاس سے تو میرا ابھی برا حال ہو رہا ہے چلو، ہم گھوڑوں پر جلد واپس آ جائیں گے۔ ابھی وقت ہے، ورنہ ہمیں ساری رات یہاں سے ہلنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”بھگت رام نے اُٹھ کر اپنے گھوڑے کہ لگام سنبھالی اور دیہاتی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”دیکھو، تم چوکس رہو۔ اگر کوئی ہمارے متعلق پوچھے تو

کہہ دینا کہ ہم جنگل کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر میں پیارے لال اور بھگت رام گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ وہ نیچے اتر کر پانی پینے کے بعد گھوڑوں پر سوار ہوئے تھے کہ سامنے کے کنارے سرکنڈوں میں ایک اجنبی آدمی دکھائی دیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام پکڑ رکھی تھی جو بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ اجنبی کے پیچھے قدم اٹھا رہا تھا۔ پیارے لال اور اس کا ساتھی واپس مڑنے کے بجائے وہیں ٹھہر کر اجنبی کی طرف دیکھنے لگے۔ گھوڑے کی چال اس کی بھوک پیاس اور تھکاوٹ کی آئینہ دار تھی۔ ندی کے قریب پہنچ کر اس نے چند قدم تیزی سے اٹھائے اور پانی میں منہ ڈال دیا۔

پیارے لال نے اپنے ساتھی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ دونوں گھوڑوں کو ایڑ لگا کر ندی کے پار پہنچ گئے۔“

”تم کہاں سے آئے ہو؟“ پیارے لال نے اجنبی سے سوال کیا۔

”مہاراج! میں بہت دور سے آیا ہوں۔“

بھگت رام نے کہا۔ ”یہ گھوڑا بہت تھکا ہوا ہے ؟“

اجنبی نے جواب دیا۔ ”یہ گھوڑا میرا نہیں۔ مجھے راستے میں ملا ہے۔ یہ گر پڑا تھا۔ اس کا سوار اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں نے سوچا رات کے وقت اسے درندے مار ڈالیں گے۔ اسی لیے بڑی مشکل سے ساتھ لے آیا ہوں۔ ابھی مجھے دو کوس اور آگے جانا ہے۔“

پیارے لال نے پوچھا۔ ”تمہیں یہ گھوڑا یہاں سے کتنی دور ملا تھا؟“

”مہاراج! یہاں سے کوئی آٹھ کوس دور ایک پہاڑی ہے۔ میں اس پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا کہ مجھے نیچے سے ایک سوار آتا ہوا دکھا دیا۔ اس کا گھوڑا چلتے چلتے اچانک گر پڑا۔ سوار نے اسے اٹھایا لیکن جب وہ دوبارہ سوار ہوا تو گھوڑے میں چلنے کی ہمّت نہ تھی۔ سوار مجبوراً اُتر کر پیدل چل پڑا۔ میں نے اسے آواز دی کہ اپنا گھوڑا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو، لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔“

پیارے لال نے سوال کیا ”تم اس سوار کا حلیہ بتا سکتے ہو؟“

”ہاں! وہ ایک خوب صورت جوان تھا۔ سفید رنگ، مجھ سے ذرا لمبا قد، چوڑا سینہ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سے لڑ کر آیا ہے یا لڑنے جا رہا ہے۔ اُس کی پگڑی کا رنگ شاید گلابی تھا۔“

”تم نے اس کے ساتھ کسی اور کو بھی دیکھا ہے؟“

”نہیں!“

”تم نے اسے کس وقت دیکھا تھا؟“

”دوپہر سے کچھ دیر بعد۔“

”تم نے اس سے پہلے یا اس کے بعد اپنے راستے میں کسی جگہ ایسے آدمیوں کی ٹولی تو نہیں دیکھی جنھوں نے اپنے منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے ہوں۔“

”نہیں۔“

جگت رام نے کہا۔ ”تم سے ثابت کر سکتے ہو کہ تم خود اس کے ساتھ نہیں

تھے؟"

اجنبی اس سوال کے جواب میں پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

پیارے لال نے گرج کر کہا۔ "دیکھو! اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو بتاؤ رنبیر کہاں ہے؟"

"رنبیر کون؟" اجنبی نے اور زیادہ بدحواس ہو کر کہا۔

پیارے لال نے پھر پوچھا۔ "رات کے وقت تم اس کے ساتھ تھے۔ تم نے اپنے منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اب تم ہمیں دھوکا دے کر کسی اور طرف بھیجنا چاہتے ہو تاکہ وہ بچ کر نکل جائے۔ لیکن یاد رکھو اگر وہ صحیح سلامت نکل گیا تو ہم تمہیں زندہ جلا ڈالیں گے۔"

اجنبی اب یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ دو پاگل آدمیوں کے درمیان کھڑا ہے اور بولنا شاید اس کے لیے سودمند ثابت نہ ہو۔ لیکن جب پیارے لال اور بھگ رام نیچے اتر کر رسّے اس کے ہاتھ باندھنے لگے تو وہ بلبلا اُٹھا۔ "بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میں نے تم

سے کوئی جھوٹی بات نہیں کی۔ میں اپنی سسرال سے واپس آ رہا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ وہاں تک چلنے لے لیے تیار ہوں۔ اس گاؤں کے لوگ گواہی دیں گے کہ میں صبح کے وقت وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ میں نے صرف اس گھوڑے پر ترس کھانے کی غلطی کی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں کرتے تو میں خوشی سے تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے باندھنے کی ضرورت نہیں۔"

لیکن انہوں نے اس کی چیخ پکار کی پروانہ کی اور اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ پھر بھگت رام اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور پیارے لال نے اجنبی کو سہارا دے کر اس کے پیچھے بٹھا دیا۔

۴

جنگل کا محاصرہ کرنے والے آدمیوں کی تعداد میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ قرب وجوار کی بستیوں کے سردار اور زمیندار جے کرشن کی مدد کے لیے پہنچ رہے تھے۔ جے کرشن اپنے محل کی حفاظت کے انتظامات سے فارغ ہو کر واپس آ چکا تھا۔ بعض سرداروں کی رائے یہ تھی کہ وہ فوراً جنگل میں

چھپے ہوئے آدمیوں کی تلاش شروع کر دیں۔ لیکن جے کرشن دریا کے پار رہنے والے سرداروں اور ان آدمیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ چند با اثر زمینداروں اور سرداروں کے ساتھ جنگل کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیہاتی آدمیوں کو تلقین کر رہا تھا کہ وہ ہوشیار رہیں۔ اچانک پیارے لال اور بھگت رام کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے گھوڑا روکا اور چلّا کر بولا۔
"تم کہاں گئے تھے؟"

پیارے لال نے اپنے گھوڑے سے کود کر قیدی کو جلدی سے بھگت رام کے گھوڑے سے گھسیٹا اور جے کرشن کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔
"مہاراج! ہم نے ان کا ایک ساتھی پکڑ لیا ہے۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ میں ان کا ساتھی نہیں۔"

"تم اسے کہاں سے لائے ہو؟" جے کرشن نے سوال کیا۔

مہاراج! یہ ہمیں ندی کے کنارے ملا تھا۔"

جے کرشن چلّا اٹھا۔ "میں نے تمہیں ہدایت کی تھی کہ تم اپنی جگہ سے نہ

ہلنا۔“

بھگت رام نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”مہاراج! اگر ہم نے کوئی غلطی کی ہو تو ہمیں آپ بعد میں بھی سزا دے سکتے ہیں لیکن یہ آدمی کہتا ہے کہ رنبیر اُسے آٹھ نو کوس دور ملا ہے۔ ممکن ہے یہ جھوٹ بکتا ہو لیکن اگر سب کہتا ہے تو رنبیر کا پیچھا کرنا ضروری ہے۔“

پیارے لال نے کہا۔ ”مہاراج! ہم اسے آپ کے پاس اس لیے لے آئے ہیں کہ آپ اسے سچ بولنے پر مجبور کر سکیں گے۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”تم خاموش رہو۔ بھگت رام کو بات کرنے دو۔“

بھگت رام نے مختصراً اپنی سرگزشت سنا دی تو جے کرشن نے قیدی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”بتاؤ رنبیر اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟ اگر تم سچ کہو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا ورنہ میں سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ہیں زندہ جلا دوں گا۔“

قیدی نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”مہاراج! میں یہ نہیں جانتا کہ

رنبیر کون ہے۔"

قیدی اپنی سرگزشت سنا رہا تھا کہ چند اور سوار وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں چند ایسے سردار اور زمیندار بھی تھے جو آس پاس کے دیہات سے جے کرشن کی مدد کے لیے آئے تھے۔ ایک سردار نے قیدی کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور اپنا گھوڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ہمارے گاؤں کا آدمی ہے۔"

جے کرشن نے پیارے لال اور بھگت رام کی طرف دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

بھگت رام بولا۔ "مہاراج! ہم ایک بے گناہ کو سزا دلانے کی نیّت سے آپ کے پاس نہیں لائے۔ لیکن اس کی باتیں سننے کے بعد آپ یہ ضرور مان لیں کہ رنبیر دور جا چکا ہے اور اب کسی تاخیر کے بغیر اس کا تعاقب کرنا چاہیے۔"

قیدی سے چند سوالات پوچھنے کے بعد جے کرشن اور اس کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا چند سوار رنبیر کا پیچھا کریں اور باقی جنگل میں داخل ہو کر اس

کے ساتھیوں کی تلاش شروع کردیں۔

پیارے لال اور بھگت رام کے ہمراہ دس سوار مغرب کی طرف روانہ ہو گئے اور وہی شخص جسے وہ پکڑ کر لائے تھے ان کی رہنمائی کر رہا تھا اور بار بار اپنے دل رہا تھا کہ کاش میں اس گھوڑے کو ہاتھ نہ لگاتا۔

۵

سردار پورن چند ایک عافیت پسند آدمی تھا۔ غروبِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد جب وہ گھر میں بیٹھا اپنے پالتو طوطے سے دل پہلا رہا تھا تو نوکر نے اسے آکر کہا کہ ایک مہمان آیا ہے اور وہ آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ پورن چند اپنے دل پر جبر کر کے اٹھا اور مہمان خانے کی طرف چل دیا۔ اُسے پریشان کرنے کے لیے نوکر کا یہی کہہ دینا کافی تھا کہ اسے فوراً ملنا چاہتا ہے۔

اس نے رنبیر کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟“ رنبیر نے جواب دیا۔ ”آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں سردار موہن چند کا بیٹا

ہوں۔“

پورن چند یہ سنتے ہی رنبیر کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا اور اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”اوہو! میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تم تو بہت کمزور ہو گئے ہو۔ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟“

گزشتہ آٹھ پہر کے واقعات نے رنبیر کو کافی محتاط بنا دیا تھا۔ بوڑھے سردار کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر اس نے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”میں نندنہ سے آیا ہوں۔ آپ کے گاؤں کے قریب سے گزرتے ہوئے خیال آیا کہ آپ کو دیکھتا جاؤں۔“

”تم نے بہت اچھا کیا لیکن۔۔۔“ سردار نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے پھر اپنی نگاہیں رنبیر کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

رنبیر نے کہا۔ ”معاف کیجیے! میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی ہے لیکن یہاں سے تھوڑی دور میرے گھوڑے نے دم توڑ دیا تھا۔ اب مجھے ایک تازہ دم گھوڑے کی ضرورت ہے۔“

سردار نے قدرے توقّف کے بعد جواب دیا۔ ”گھوڑا تمہیں مل جائے گا لیکن تمہارا اپنے گاؤں جانا ٹھیک نہیں۔“

”میرا ابھی یہی ارادہ ہے کہ میں رات کے وقت سفر کرنے کی بجائے پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ ویسے بھی ایک طویل سفر کے بعد میری ہمّت جواب دے چکی ہے۔“

پورن چند بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن رنبیر کا بھوک اور تھکاوٹ سے مُرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور نوکروں کو فوراً کھانا لانے کا حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد رنبیر اپنے میزبان کے رہائشی مکان کے ایک کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا اور پورن چند بالا خانے کے ایک کمرے میں اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ”بھگوان کا شکر ہے کہ میرے نوکروں میں سے کسی نے اسے نہیں پہچانا۔ ورنہ جے کرشن بہت ذلیل آدمی ہے۔ اگر اسے پتہ چل جائے کہ موہن چند کا لڑکا میرے ہاں ٹھہرا ہے تھا تو وہ عمر بھر کے لیے میرا دشمن بن جائے گا۔ اب مجھے اس بات کی پریشانی ہے کہ میں صبح اسے

کیسے بتاؤں گا کہ تمہارا گھر برباد ہو چکا ہے۔ کھانا کھاتے وقت میں نے کئی بار ارادہ کیا لیکن اس کی صورت دیکھ کر مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ تمام حالات جاننے کے بعد بھی شاید اپنے گاؤں جانے سے باز نہ آئے۔ کاش! میں اس کی مدد کر سکتا لیکن جے کرشن جیسے آدمی کے ساتھ دشمنی مول لینا پہاڑ سے ٹکرانے کے مترادف ہے۔"

بیوی نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ وہ چپکے سے کسی طرف نکل جائے۔"

علی الصبح سردار پورن چند اور اس کی بیوی رنبیر کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ سردار کی بیوی نے کہا "آپ اس کے لیے گھوڑا تیار کرا دیں تو میں اسے جگا کر سمجھاتی ہوں۔"

پورن چند نیچے اتر کر ایک کھلے صحن میں داخل ہوا تو ایک نوکر نے آگے بڑھ کر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا "مہاراج! رات کے وقت جب آپ سو رہے تھے تو ایک سوار یہاں آیا تھا اور اس نے ہم سے پوچھا تھا کہ وہ مہمان جو تمہارے سردار کے پاس ٹھہرا ہوا ہے کون ہے؟ میں نے کہا تھا

کہ میں نہیں جانتا۔ پھر وہ آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن میں نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ مجھے دراصل اسی آدمی سے کام ہے جو یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے اسے جواب دیا کہ وہ مہمان خانے کی بجائے گھر کے اندر ٹھہرا ہوا ہے اور میں اس وقت وہاں نہیں جا سکتا۔ تم رات ہمارے پاس بسر کرو۔ صبح اس سے مل لینا لیکن اس نے کہا کہ مجھے بہت دور جانا ہے۔ جب وہ باہر نکل گیا میں نے پھاٹک سے جھانک کر باہر دیکھا۔ تھوڑی دور دو اور سوار کھڑے تھے۔ وہ کچھ دیر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے پھر ایک طرف نکل گئے۔ مجھے ان پر شک ہوا اور میں نے تمام نوکروں کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کرنے کے بعد گاؤں کا چکر لگایا اور گاؤں والوں کو بھی یہ ہدایت کی کہ وہ رات کے وقت ہوشیار رہیں۔ گاؤں کے چند آدمیوں نے مجھے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے تین سوار ان سے پوچھ رہے تھے کہ تم نے اس گاؤں میں کسی اجنبی کو تو نہیں دیکھا۔"

"تم نے بہت برا کیا۔ مجھے فوراً خبر کر دینی چاہیے تھی۔ اب جلد اصطبل

سے ایک گھوڑا لے آؤ۔" یہ کہہ کر پورن چند بھاگتا ہوا رنبیر کے کمرے میں پہنچا اور ہانپتے ہوئے کہا۔ "رنبیر! تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ رات کے وقت چند سوار تمہاری تلاش میں آئے تھے۔ تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔"

سردار کی بیوی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "رنبیر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ جے کرشن کے آدمی اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہوں۔ لیکن اب رنبیر کی جان بچانا ہمارا فرض ہے۔"

پورن چند نے رنبیر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "تم اپنے گاؤں گئے تھے؟"

"ہاں! میں موت کے منہ سے نکل کر آیا ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ جے کرشن کے آدمی میری تلاش میں یہاں تک آ پہنچے ہیں۔"

"اگر تم جے کرشن کے ہاتھ سے بچ کر نکل آئے ہو تو یقین رکھو کہ اب تک اس کے آدمی اس گاؤں کو محاصرے میں لے چکے ہوں گے۔ اگر تم آتے ہی مجھے یہ واقعات بتا دیتے تو میں تمہیں اس وقت تک تمہیں یہاں

سے کوسوں دو پہنچا دیا ہوتا۔ اب میرے ساتھ آؤ!"

٦

رنبیر کچھ کہے بغیر سردار کے پیچھے چل دیا۔ اصطبل کے سامنے نوکر گھوڑا لیے کھڑا تھا۔ رنبیر نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لیا اور اپنے میزبان سے کہا۔ "میں عمر بھر آپ کے احسان کا بدلہ نہیں دے سکوں گا۔"

"میں ایک راجپوت کا فرض ادا کر رہا ہوں۔ بھگوان کے لیے اب جاؤ، یہ باتوں کا وقت نہیں۔ اگر راستے میں کوئی تمہارا پیچھا کرے تو تم جنوب مشرق کی طرف جنگل میں چھپنے کی کوشش کرنا۔"

رنبیر نے گھوڑے کی رکاب پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ گاؤں میں کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں اور اس کے ساتھ ہی گھوڑوں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ ایک آدمی پھاٹک کی طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ "مہاراج! مسلح سواروں کی ایک ٹولی محل کے گرد جمع ہو رہی ہے۔ چند آدمی پھاٹک

پر کھڑے ہیں اور وہ دروازہ کھولنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محل پر دھاوا بولنے والے ہیں۔"

"شاید وہ آ گئے ہیں۔" پورن چند نے بدحواس ہو کر کہا۔

رنبیر نے کسی توقّف کے بغیر نیام سے تلوار نکالتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ حویلی سے باہر نکلتے ہی اُسے اپنے بائیں ہاتھ ایک گلی میں چند سوار دکھائی دیے۔ اس نے گھوڑے کو بائیں ہاتھ کی تنگ گلی کی طرف موڑ لیا۔ سوار شور مچاتے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیے۔ تھوڑی دور ایک موڑ سے آگے دو تنگ گلیاں نکلتی تھیں۔ رنبیر کو ایک گلی میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی تو وہ فوراً دوسری گلی میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اس گلی سے نکل کر ایک کھلی جگہ پہنچا تو سامنے تین سوار کمانوں میں تیر چڑھائے کھڑے تھے۔ اس نے زمین کے ساتھ لپٹ کر تیروں کی زد سے بچنے کی کوشش کی۔ دو تیر اس کے قریب سے نکل گئے اور ایک تیر اس کے کندھے کے قریب بازو کی جلد چیرتا ہوا گزر گیا۔ پھر آن کی آن میں ایک

سوار اس کی زد میں آ گیا۔ رنبیر نے تلوار کے ایک ہی وار سے اسے گھوڑے سے نیچے لڑھکا دیا۔ اس کے دو ساتھی ابھی تلواریں سونت رہے تھے کہ رنبیر آگے نکل گیا۔ پھر گلی اور گاؤں کے مختلف کونوں سے کوئی تیس سوار اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ قریباً دو کوس فاصلہ طے کرنے کے بعد رنبیر کا گھوڑا تعاقب کرنے والوں سے کافی دور نکل گیا تھا۔ کوئی آدھ کوس اور طے کرنے کے بعد اُسے دائیں اور بائیں سے دو چھوٹی چھوٹی بستیاں دکھائی دیں۔ سامنے ایک وسیع جنگل تھا اور یہی جگہ اس کی آخری امید تھی۔ وہ ایک بستی کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک آٹھ سواروں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی۔ رنبیر نے پگڈنڈی چھوڑ کر ایک طرف نکلنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے جلدی سے اس کا راستہ روک لیا۔ اب رنبیر کے لیے کھلے میدان میں ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو تھا۔ چنانچہ وہ دوبارہ گاؤں کی طرف مڑا اور ایک گھنے باغ میں سے ہوتا ہوا جنگل میں داخل ہو گیا۔ سواروں کی نئی ٹولی ابھی تک اس کے پیچھے تھی اور دائیں اور بائیں طرف سے اسے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ جنگل کا وہ حصّہ جہاں گھنے درخت اور جھاڑیاں رنبیر کو اپنی پناہ لے سکتی تھیں، ابھی کچھ

دور تھا۔ دو سوار رنبیر کے دائیں ہاتھ سے پر چکر لگاتے ہوئے اس سے آگے نکل گئے اور انہوں نے اچانک مُڑ کر اس پر حملہ کر دیا۔ رنبیر نے ایک سوار کو مار گرایا اور دوسرا خوفزدہ ہو کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اتنی دیر میں باقی سات سوار اس کے گرد گھیرا ڈال کر ایک دوسرے کو پہل کی تلقین کر رہے تھے۔

ایک سوار نے کہا۔ ”اب تم بچ کر نہیں جاسکتے۔ تلوار پھینک دو۔“

”تم میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو مجھے تلوار پھینکتا ہوا دیکھیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے رنبیر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ایک طرف حملہ کر دیا۔ اس کی زد میں آنے والا سوار اپنا گھوڑا بھگا کہ ایک طرف ہٹ گیا اور رنبیر چند گز آگے نکل گیا۔ سوار ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے پھر اس کا تعاقب کرنے لگے۔ ایک سوار نے رنبیر کے قریب پہنچ کر پہلو سے نیزہ مارنے کی کوشش کی۔ لیکن سامنے کسی جھاڑی کی اوٹ سے ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور سوار کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے چند اور تیر آئے اور تین سوار گھائل ہو گئے۔ باقی سواروں نے

اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں اور چیختے چلاتے جنگل سے باہر نکل گئے۔ اتنی دیر میں جے کرشن کا باقی لشکر جنگل کے قریب پہنچ چکا تھا اور پیارے لال اس لشکر کے سالار کی حیثیت سے یہ خبر سُن رہا تھا۔ دشمن تنہا نہیں۔ اس جنگل کے ہر درخت کے پیچھے اس کے تیر انداز چھپے ہوئے ہیں۔

رنبیر اپنا گھوڑا روک کر حیرت و استعجاب کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان کمان ہاتھ میں لیے ایک جھاڑی سے نمودار ہوا اور رنبیر کی طرف بڑھا۔

"تمہارے پیچھے اور کتنے آدمی ہیں؟" نوجوان نے سوال کیا۔

"کوئی تیس چالیس کے قریب ہوں گے۔" رنبیر نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ باقی آدمی جنگل میں داخل ہونے سے پہلے کافی دیر سوچیں گے۔ تم میرے پیچھے آؤ۔" یہ کہہ کر اجنبی ایک طرف کو چل دیا اور رنبیر کوئی سوال پوچھے بغیر اس کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دور ایک گھوڑا درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اجنبی نے گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو گیا۔

کوئی آدھ کوس فاصلہ طے کرنے کے بعد اجنبی نے گھوڑے کی رفتار کم کر دی اور مڑ کر رنبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا گھوڑا بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اب اسے اطمینان سے چلنے دو۔“

نیا ساتھی

دوپہر کے وقت رنبیر اور اس کا ساتھی جنگل عبور کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے گھوڑے جو تھکان اور بھوک سے نڈھال ہو چکے تھے، ندی کے آس پاس اُگی ہوئی گھاس چر رہے تھے۔ رنبیر کی سرگزشت سننے کے بعد اجنبی نے اس سے سوال کیا۔ ”اب آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟“

رنبیر نے جواب دیا۔ ”میری منزل کوئی نہیں۔ اس وقت زندہ رہنے کی خواہش مجھے کہیں دور لے جانا چاہتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ آپ کو

دیکھنے کے بعد تک میں نے یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں کہاں جارہاہوں اور اس وقت بھی اگر آپ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھتے تو میرے دل میں یہ خیال نہ آتا۔ میں یہ محسوس کررہاتھا کہ قدرت نے میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور مجھے سوچے سمجھے بغیر آپ کے پیچھے چلنا چاہیے۔"

اجنبی نے غور سے رنبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ عجیب بات ہے۔ میں کئی دنوں سے یہی محسوس کررہاتھا کہ دنیا میں مَیں ایک ایسا انسان ہو جس کی کوئی منزل نہیں۔ جس کی تمام دلچسپیاں صرف زندہ رہنے تک محدود ہیں۔ صرف موت کا خوف میرا دائمی رفیق ہے اور اپنی زندگی کے اداس، مغموم اور نہ ختم ہونے والے راستوں پر مجھے کوئی ساتھی نہیں ملے گا۔ جنگل میں اپنے دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کے بعد جب آپ میرے پیچھے چل دیے تو ہر آن میں یہ محسوس کررہاتھا کہ اگر آپ کسی جگہ اچانک اپنا گھوڑا روک کر کہیں گے کہ میں فلاں شہر یا فلاں بستی کی طرف جارہا ہوں۔ آپ کا چہرہ مغموم ہونے کے باوجود بھی اس بات کی گواہی دے رہا

ہے کہ آپ کی دنیا میری دنیا سے مختلف ہے۔ آپ کسی بڑے آدمی کے بیٹے ہیں۔ کسی عالی شان محل میں آپ کا انتظار ہو رہا ہو گا۔ اتنے آدمی ایک معمولی آدمی کے دشمن نہیں ہوتے۔ آپ کے دشمنوں کی طرح آپ کے دوست بھی بہت ہوں گے۔ بہر حال میں آپ کی عارضی رفاقت میں بھی ایک لذّت محسوس کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے راستے میں آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کچھ دیر اور میرے ساتھ چلتے رہیں اور اب آپ کی آپ بیتی سننے کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کی رہنمائی کرنے کے قابل نہیں لیکن اگر آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

رنبیر نے کہا۔ "میں اس ملاقات کو محض ایک حادثہ نہیں سمجھتا۔ شاید قدرت نے اپنے کسی نامعلوم مقصد کی تکمیل کے لیے ہمیں مختلف سمتوں سے دھکیل کر ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے اور شاید ہمارے لیے اپنی اپنی منزل اور راستہ متعین کرنے کے لیے کچھ عرصہ ایک دوسرے کی رفاقت ضروری ہے۔ کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟

کہاں سے آئے ہیں اور وہ واقعات کیا ہیں جنہوں نے آپ کو میرا ساتھی بنا دیا ہے؟" اجنبی نے رنبیر کے سوالات کے جواب میں اپنی سرگزشت سنا دی۔

۲

یہ اجنبی رام ناتھ تھا۔ جس نے اپنے باپ کے قتل پر غصّے سے مغلوب ہو کر ایک برہمن پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ جسے سومنات کا پجاری ہونے کی حیثیت سے بڑے بڑے راجے واجب التعظیم خیال کرتے تھے۔ اپنے گاؤں سے فرار ہونے کے بعد رام ناتھ کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ سومنات کے پجاریوں کا عتاب مول لینے والے انسان کے لیے دیوتاؤں کی مقدس سرزمین میں کوئی جگہ نہیں۔ سومنات کی عظمت کا خوف لوگوں کے دلوں میں پہلے بھی کم نہ تھا لیکن محمود غزنوی کے ہاتھوں کئی مندروں کی تسخیر کے بعد ملک کے طول و عرض میں یہ بات مشہور ہو چکی کی کہ ان مندروں کی شکست کی وجہ یہ ہے کہ سومنات کا دیوتا باقی تمام دیوتاؤں اور ان کے پجاریوں سے ناراض ہو چکا ہے اور

اُسے خوش کیے بغیر ہندوستان کے برہمن سردار اور راجے محمود غزنوی کو شکست نہیں دے سکتے۔

گوالیار کے عوام کے لیے یہ خبر انتہائی پریشان کن تھی کہ ایک سنگ دل سپاہی نے سومنات کے ایک پجاری کو ہلاک کر دیا ہے۔ گوالیار کا راجہ بھی اس واقعہ سے کم پریشان نہ تھا۔ اس نے یہ خبر سنتے ہی سومنات کے بڑے پروہت کے عتاب سے بچنے کے لیے اس کی خدمات میں بیش قیمت تحائف بھیج دیے تھے اور ہمسایہ راجاؤں کی ملامت اور اپنی رعایا کے غم و غصّہ کے پیشِ نظر یہ اعلان کر دیا کہ سومنات کے پجاری کے قاتل کو زندہ پکڑنے یا گرفتار کرنے والے کو بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔

رام ناتھ کو آٹھ دن کے بعد اپنے گاؤں سے کئی کوس دور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ سومنات کے پجاری کی موت کی خبر ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی ہے۔ اب اسے فوراً گوالیار کی سرحد عبور کرنے کی فکر ہوئی۔ شہروں اور بستیوں کے قریب جاتے ہوئے اسے ہمیشہ اس بات کا خطرہ رہتا کہ اس کا کوئی نہ کوئی جان پہچان والا اچانک اس کی

طرف دیکھتے ہی چلّا اُٹھے گا۔ ''یہ رام ناتھ ہے۔ میں جانتا ہوں، اسے پکڑ لو۔''

ایک شام وہ سرحد کے قریب رات گزارنے کی نیّت سے ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ گاؤں کے دھرم شالہ میں چند اور مسافر بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان نے جو رام ناتھ کے ساتھ فوج میں رہ چکا تھا اسے دروازے پر دیکھتے ہی پہچان لیا۔

''آپ یہاں کیسے آئے؟''نوجوان نے حیران ہو کر کہا۔

رام ناتھ نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں متھرا جا رہا ہوں۔ وہاں میں نے ہنومان جی کے مندر میں منّت مانی تھی۔''

نوجوان نے کہا۔ ''یہ عجیب اتفاق ہے۔ میں بھی متھرا جا رہا ہوں۔ وہاں میرے چند رشتہ دار ہیں۔ مسلمانوں کے حملے کے بعد ان کے متعلق کوئی خبر نہیں آئی۔ آپ کا گاؤں سومنات کی جاگیر میں ہے نا؟''

"ہاں!" رام ناتھ نے قدرے پریشان ہو کر جواب دیا۔

"تو آپ نے یہ خبر سنی ہو گی کہ اس علاقے میں کسی نے سومنات کے ایک پجاری کو قتل کر دیا ہے۔"

رام ناتھ نے اور زیادہ پریشان ہو کر جواب دیا۔ "میں نے راستے میں یہ خبر سنی تھی۔"

نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کسی نے آپ پر شک تو نہیں کیا۔ میں تو ایک گاؤں میں پھنس گیا تھا۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔" "میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں سے گزر رہا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ اسے پکڑ لو، یہ سومنات کے پجاری کا قاتل ہے۔ چند آدمی میرے گرد جمع ہو گئے۔ خوش قسمتی سے ان میں سے ایک ہماری فوج کا سپاہی نکل آیا جو مجھ سے صرف ایک دن پہلے چھٹی پر آیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے لوگوں کو سمجھا کر میری جان چھڑائی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقے کے

سر دار نے لوگوں کو بلا کر سرحد کی طرف جانے والے ہر شخص کی نگرانی کرنے کی ہدایت کی تھی اور لوگوں نے اس کی زبانی قاتل کا جو حلیہ سنا تھا وہ مجھ سے ملتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرا رنگ زیادہ سانولا تھا۔"

رام ناتھ نے کہا۔"اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مجھے دیکھتے تو زیادہ شک کرتے کیونکہ میرا رنگ زیادہ سانولا نہیں۔"

نوجوان نے غور سے رام ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے۔"ہاں آپ کو دیکھ کر وہ زیادہ شک کرتے۔ آپ کا سینہ بھی زیادہ کشادہ ہے اور قد بھی مجھ سے ذرا لمبا ہے اور۔۔۔۔"

"اور میرا نام بھی قاتل کے نام سے ملتا ہے۔" رام ناتھ نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

یہ رات رام ناتھ نے جنگل میں گزاری۔ اگلے دن اس نے دریائے جمنا عبور کیا اور قنوج کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ اب اس کا خطرہ نسبتاً کم ہو چکا تھا۔ لیکن اسے اطمینان نصیب نہ ہو سکا۔ رات کے وقت وہ کسانوں یا

چرواہوں کی کسی چھوٹی سی بستی میں ٹھہر جاتا اور دن بھر ویرانوں اور جنگلوں میں بھٹکتا رہتا۔ ان تلخ ایّام میں صرف روپ وتی ہی اس کا آخری سہارا تھی۔ تنہائی میں وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ زندگی کی ناہموار اور دشوار گزار راہوں سے گزرنے کے بعد وہ کسی دن اس کے پاس پہنچ سکے گا۔ سرِ دست سومنات کے مندر کا رُخ کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن شاید کچھ عرصے بعد لوگ پجاری کے قتل کو بھول جائیں اور وہ وہاں جا سکے۔

ہمالیہ کے دامن کی کسی دور افتادہ ریاست میں پناہ لینے کی نیّت سے رام ناتھ نے شمال مشرق کا رُخ کیا۔ ایک مرتبہ اسے ایک جنگل کے قریب رات ہو گئی اور اس نے ایک چرواہے کی جھونپڑی میں پناہ لی۔ ابھی صبح وہ جنگل کے ساتھ ساتھ مشرق کا رُخ کر رہا تھا کہ اسے چند سوار ایک اور سوار کا تعاقب کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ جلدی سے جنگل میں داخل ہو کر ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ جب سوار قریب آئے تو وہ جلدی سے گھوڑے سے اترا اور اسے کچھ دور درختوں میں باندھ دیا۔ پھر وہ واپس آ کر جنگل کے کنارے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔

یہ رنبیر کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جنگل میں داخل ہوتے ہی اس طرف آ نکلا تھا جہاں رام ناتھ بیٹھا ہوا تھا اور جب اس پر آخری حملہ ہونے والا تھا تو اس کے دشمن رام ناتھ کے تیروں کی زد میں آ چکے تھے۔ ابتدا میں رام ناتھ ان لوگوں کی لڑائی میں مداخلت کی بجائے صرف چھپ کر یہ تماشا دیکھنا چاہتا تھا لیکن جب یہ لڑائی انتہائی مرحلے پر پہنچ گئی تو اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ میری مداخلت ایک بہادر نوجوان کی جان بچا سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے نتائج سے بے پروا ہو کر فوراً تیر چلانے شروع کر دیے۔

رام ناتھ کی سرگزشت سُننے کے بعد رنبیر نے کہا۔ ”تو آپ نے صرف اس لیے میری مدد کی ہے کہ میں اکیلا تھا اور میرے دشمن زیادہ تھے۔“

”ہاں! لیکن اس سے زیادہ مجھے آپ کی ہمّت اور جرأت نے متاثر کیا تھا۔ اگر آپ دشمن کے کہنے پر ہتھیار پھینک دیتے تو میں شاید آپ کی مدد کرنے کی بجائے اپنی جان بچانے کی فکر کرتا لیکن جب آپ نے انتہائی مایوسی کی حالت میں بھی حوصلہ نہ ہارا اور زندگی اور موت سے بے پروا ہو

کر اپنے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ آپ کی مدد نہ کرنا انتہائی بزدلی ہے۔“

”آپ نے ایک ایسے آدمی کی جان بچائی ہے جو کبھی کسی کا احسان نہیں بھولا۔ آج سے آپ میرے بھائی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے رنبیر نے اپنا ہاتھ رام ناتھ کی طرف بڑھا دیا اور رام ناتھ نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا چھوٹا بھائی۔“

قنوج کی شمالی سرحد عبور کرنے کے بعد رنبیر اور رام ناتھ چند دن اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ دیہاتی لوگ بیرونی حملوں کے باعث اپنے وطن کے ہر سپاہی کی آؤ بھگت کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لیے راستے کی ہر بستی کے سرکردہ آدمی ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ رام ناتھ نے فوج کی ملازمت کے آخری چند مہینوں کی تنخواہ سے سونے اور چاندی کے چند سِکّے بچا رکھے تھے اور چھوٹی سی رقم ابھی تک اس کے پاس تھی۔ رنبیر شکنتلا کے زیورات کی تھیلی کھو بیٹھنے کے بعد تہی دست تھا۔

۳

رنبیر سوتے جاگتے اور اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت اپنی بہن کے خیال میں کھویا رہتا تھا۔ ایک روز وہ ایک چھوٹی سی بستی کے چودھری کے مہمان تھے۔ رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد جب وہ ایک الگ کمرے میں چارپائیوں پر لیٹ گئے تو رام ناتھ نے سوال کیا۔ اب ہم خطرے کی حدود سے بہت دور آ چکے ہیں۔ صبح آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

رنبیر نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک اٹھ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "رام ناتھ! حالات نے ہم دونوں کو ایک ہی کشتی میں ڈال دیا ہے۔ تم جس کی تلاش میں ہو وہ یہاں سے سینکڑوں میل دور سومنات کے مندر میں تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔ لیکن جب تک ایک پجاری کی موت کا قصّہ پرانا نہیں ہو جاتا، تم وہاں نہیں جا سکتے اور اس طرح نہ جانے کتنی مدّت گزر جائے۔ لیکن تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے تہیّہ کر لیا ہے کہ تمہاری جگہ خود سومنات جاؤں گا اور اگر روپ وتی کو میں وہاں سے لانے میں کامیاب نہ بھی ہو سکا تو بھی اتنا ضرور معلوم ہو جائے گا کہ مستقبل میں

ہماری کامیابی اور ناکامی کے امکانات کیا ہیں۔ لیکن میرے حالات اس کے برعکس ہیں۔ میرے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ میں ایک اپنی منزل کا راہی ہوں جس کا راستہ متعین نہیں۔ کاش مجھے صرف اتنا معلوم ہوتا کہ شکنتلا کہاں ہے؟ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ جے کرشن کے خوف سے قنوج کی حدود سے باہر نکل گئی ہو گی اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے گاؤں کے حالات ضرور معلوم کرتی رہے گی۔ اگر میں اپنے گاؤں اور اپنے محل پر قبضہ کر سکوں تو اس کا پتہ لگانا میرے لیے مشکل نہ ہو گا۔ اگر وہ زندہ ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ خود ہی یہاں پہنچ جائے گی۔ اس مقصد کے لیے جے کشن اور اس کے حلیف سرداروں کو مغلوب کرنا ضروری ہے لیکن میرے یہ ارادے ایک دیوانے کے خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ قنوج کا نیا حکمران جے کرشن کی پشت پر ہے۔ اس صورت میں جے کرشن کو وہی طاقت مغلوب کر سکتی ہے جو قنوج کی نئی حکومت کا تختہ الٹ سکتی ہو۔ آج میں تم سے ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں جو میری روح کی آواز سے دل کی پکار ہے۔ شاید تم اسے سننے کے بعد محسوس کرو کہ تم نے مجھے اپنا دوست اور بھائی سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میری آخری امید

محمود غزنوی ہے۔"

رنبیر یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ رام ناتھ اچانک اٹھ کر اس کا گلہ دبانے کی کوشش کرے گا لیکن جب وہ اطمینان سے لیٹا رہا تو رنبیر نے کہا۔ "کئی دن سے میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔ قدرت نے اسے جو کام سونپا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ کالنجر کے راجہ نے جو حالات پیدا کر دیے ہیں ان کے متعلق میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میری فریاد اُسے متاثر کر سکے گی لیکن اس کی فوج میں عبدالواحد جیسے لوگ موجود ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ضرور مدد کریں گے۔ تم کہو گے کہ میں اپنے وطن کے ساتھ غدّاری کر رہا ہوں لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے۔ وطن کی خدمت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے جے کرشن جیسے بھیڑیوں سے پاک کیا جائے۔ تم مجھے سماج کا دشمن کہو گے لیکن میری نگاہوں میں سماج ٹوٹ چکا ہے جو انسانوں کو بھیڑوں اور بھیڑیوں کے گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ رام ناتھ! میں محمود غزنوی کی راہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ اگر میری یہ آرزو پوری ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ شکنتلا کو تلاش

کرنے میں دیر نہیں لگے گی اور اس کے بعد میں تمہارے لیے سومنات جانے کا وعدہ پورا کر سکوں گا۔ اگر شکنتلا کے بارے میں ایسی مایوسی ہوئی تو بھی میں سومنات ضرور جاؤں گا۔ لیکن اس وقت میں تمہیں اپنا ساتھ دینے پر مجبور نہیں کروں گا۔"

رام ناتھ نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کاش! تمہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری زبان سے میرے دل کی آواز نکل رہی ہے۔ محمود صرف تمہارا ہی نہیں میرا بھی آخری سہارا ہے۔ میں فوراً سومنات کا رُخ کرنے سے اس لیے نہیں گھبراتا کہ مجھے موت کا خوف ہے۔ میرے نزدیک اپنی جان کی کوئی قیمت نہیں رہی اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ سومنات کے جن پجاریوں نے مجھے صرف ایک ثانیہ کے لیے دیکھا ہے وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیں۔ میری جھجک کی وجہ اور ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ روپ وتی ان لڑکیوں میں سے نہیں جو اپنی خوشی سے سومنات کے مندر میں داخل ہوتی ہیں اور اپنی مرضی سے واپس آجاتی ہیں۔ اسے اس کی پیدائش سے پہلے سومنات کی بھینٹ کیا جا چکا ہے اور پروہت کی مرضی کے بغیر اگر ہندوستان کے تمام

راجہ اسے وہاں سے نکالنے کی کوشش کریں تو بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میرے اور روپ وتی کے درمیان پروہت کی مرضی اور مندر کی ناقابلِ تسخیر دیواریں حائل ہیں۔ کبھی میں یہ سوچتا کرتا تھا کہ ایک دن میں راجہ کا سپہ سالاروں بنوں گا اور پروہت کے سامنے سونے اور جواہرات کا انبار لگا کر یہ کہوں گا کہ میں روپ وتی کی آزادی کی قیمت ادا کرنے آیا ہوں۔ لیکن اب میری آخری اُمّید یہی ہے کہ قدرت کی اَن جانی اور اَن دیکھی قوّت میری راہ کی مشکلات دور کر دے گی۔ جس دن آپ واسدیو کا قصّہ سنا رہے تھے میں یہ سوچ رہا تھا، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ محمود غزنوی کو راستہ دکھانے والی قوّت جسے وہ خدا کے نام سے یاد کرتا ہے کسی دن سومنات کی طرف اس کے گھوڑے کی باگ پھیر دے۔ رنبیر میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

رُہت کے کنارے

نندنہ کی شکست کے بعد راجہ ترلوچن پال نے اپنی رہی سہی فوج کے ساتھ کوہ شوالک میں ڈیرے ڈال دیے لیکن سلطان محمود کی فوج کی خبر سنتے ہی وہ قنوج کے نئے حکمران (قنوج کے نئے حکمران کا نام بھی ترلوچن پال تھا) اور کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کی نیّت سے جنوب کی طرف بھاگ نکلا۔ سلطان محمود ایک حیرت انگیز رفتار سے اس کا تعاقب کرتا ہوا دریائے رُہت کے کنارے جا پہنچا لیکن اس سے قبل ترلوچن پال کی فوج دریا عبور کر چکی تھی۔

کوہ شوالک سے دریائے رُہت کے طویل سفر میں راستے کے کئی سردار اور چھوٹے چھوٹے راجے ترلوچن پال کی فوج کے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ تاہم وہ اپنی قوّت کے بل بوتے پر کسی میدان میں محمود کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اب اس کی فوج اور دشمن کے درمیان دریا حائل ہو چکا تھا اور اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ کسی خطرے کا سامنا کے بغیر محمود کو کئی دن تک دریا عبور کرنے سے روک سکتا ہے۔ اس نے دریا کے کنارے تھوڑی دور ہٹ کر پڑاؤ ڈال دیا اور جنوب میں اپنے حلیف راجاؤں کو یہ پیغام بھیج دیا کہ دشمن کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ کے لیے یہ مقام نہایت موزوں ہے، اگر دشمن دریا عبور کرنے کی جرأت کرے تو اس کے سامنے کنارے کے ساتھ ساتھ تیر اندازوں اور جنگی ہاتھیوں کی ناقابلِ تسخیر دیواریں کھڑی کی جاسکتی ہیں اور اگر وہ ہمّت ہار کر لوٹ جائے تو بھی ہماری ہی فتح ہو گی۔ اس کی پسپائی ہمارے ملک کے لوگوں میں ایک نیا عزم پیدا کر دے گی۔ ترلوچن پال کے اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلطان محمود کے تیز رفتار دستوں کے سوا باقی فوج ابھی کئی منزلیں پیچھے تھی اور اس کا یہ خیال تھا کہ سلطان دریا عبور کرنے سے پہلے ان کا

انتظار ضرور کرے گا۔ ترلوچن پال کے ہمراہ بیس ہزار سپاہی اور قریباً تین سو ہاتھی تھے۔ ان کے ساتھ وہ سلطان کی پوری فوج کو کئی دن تک دریا عبور کرنے سے روک سکتا تھا۔

سلطان محمود ایک سفید گھوڑے پر سوار دریائے رہت کے کنارے ایک ٹیلے کہ چوٹی پر کھڑا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹیلے سے نیچے اس کے سپاہی صفیں درست کر رہے تھے۔ چند افسر اور سپاہی ٹیلے کی چوٹی سے لے کر نیچے تک سلطان کے دائیں، بائیں اور پیچھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے سلطان اور فوج کے مختلف دستوں کے درمیان پیغام رسانی کا کام دے رہے تھے۔ سلطان اپنے قریب کھڑے ہونے والے افسروں میں سے کسی کو کوئی حکم دیتا اور آن کی آن میں یہ حکم میمنہ، میسرہ یا عقب کے دستوں تک جا پہنچتا۔ پھر اچانک ہی صفوں کی ترتیب بدل جاتی۔ آٹھ ہزار جان نثار دریا کی طوفانی موجوں سے کھیلنے کے لیے امیر، لشکر کے اشارے کے منتظر تھے۔

ترلوچن پاک کی فوج کے سوار کبھی کبھی اپنے پڑاؤ سے نکل کر دریا کے

دوسرے کنارے نمودار ہوتے اور سلطان کے سپاہیوں کو للکارتے اور ہاتھوں سے انہیں دریا عبور کرنے کی دعوت دینے کے بعد جنگل میں روپوش ہو جاتے۔

سلطان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ اپنے جانبازوں کو فتح کی بشارت دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ ایک دریا کا سکون، جو شور مچاتی ہوئی پہاڑی ندیوں اور آبشاروں کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا گزر جاتا ہے۔ گزشتہ تین سال میں وہ کئی دریاؤں کی گہرائیوں اور پہاڑوں کی بلندیوں اور صحراؤں کی وسعتوں کے سامنے ایک انسان کے ناقابلِ تسخیر عزم وہمّت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں اس کا چہرہ سمندر کی چٹان کی طرح تھا جس کے ساتھ اَن گنت لہریں ٹکرا چکی ہوں لیکن اس کی نگاہوں میں ابھی تک عقاب کی تیزی اور شیر کا جبروت تھا۔

ترلوچن پال کو معلوم نہ تھا کہ جس فوج کو وہ دریا کے پار روکنا چاہتا ہے اس کا ہر سپاہی آنے والی رات دریا کے دوسرے کنارے گزارنے کا عزم کر چکا ہے۔

سلطان نے اپنے ایک افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”ہم ظہر کی نماز دریا پار ادا کریں گے۔“ اور آن کی آن میں یہ الفاظ فوج کے ہر افسر اور ہر سپاہی کے کانوں تک پہنچ گئے۔

۲

دشمن پر حملے کے لیے سلطان کے حکم کا انتظار کرنے کی بجائے ترکمانوں کے ایک دستے کے آٹھ سرفروش ہوا سے بھرے ہوئے مشکیزوں کے سہارے تیرتے ہوئے منجدھار میں پہنچ چکے تھے۔ دشمن کا ایک دستہ جو دوسرے کنارے کی دیکھ بھال پر متعین تھا۔ ان پر تیر برسا رہا تھا۔ سلطان جس قدر بہادری کا قدر دان تھا اسی قدر حکم عدولی کے معاملے میں سخت گیر تھا لیکن اس موقعہ پر اس نے غیر متوقع ضبط سے کام لیا اور اپنے گرد جمع ہونے والے افسروں کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔ ”آگے بڑھو!“ آن کی آن میں فوج کے بعض سپاہی مشکیزوں کے ساتھ اور باقی گھوڑوں سمیت دریا میں کود پڑے۔ سلطان نے خود بھی ٹیلے سے نیچے اتر کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔

آٹھ سرفروش جنہوں نے مشکیزوں کے سہارے دریا عبور کرنے میں سبقت کی تھی دشمن کے تیروں کی زد میں آ چکے تھے۔ اچانک دو سرپٹ سوار جو بظاہر ہندو فوج کے سپاہی معلوم ہوتے تھے، ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور انہوں نے دریا عبور کرنے والے ترکمانوں کی طرف توجہ دینے کی بجائے تیر اندازوں کے مورچے پر حملہ کر دیا اور پانچ آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ باقی تیر انداز انتہائی سراسیمگی کی حالت میں بھاگ نکلے۔ ہندو سواروں کے چند اور دستے جو دریا اور پڑاؤ کے درمیان پھیلے ہوئے تھے آگے بڑھے لیکن دریا عبور کرنے والے لشکر کی جرأت وہمّت سے مرعوب ہو کر وہ مقابلہ کیے بغیر پیچھے ہٹ گئے۔

آٹھ ترکمان دریا عبور کرتے ہی اپنے ہندی مددگاروں کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے سر سے کھال کی ٹوپی اتار کر ایک سوار کو پیش کرتے ہوئے ملی جلی ہندی اور فارسی میں کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ تم کون ہو لیکن ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے ساتھی تمہیں پہچاننے میں غلطی کریں۔ اس لیے اپنی پگڑی کی جگہ یہ ٹوپی پہن

لو۔"

ایک ترکمان نے اس کی تقلید کی اور اپنی ٹوپی اتار کر دوسرے سوار کر پیش کر دی۔

ان سواروں میں سے ایک رنبیر اور دوسرا رام ناتھ تھا۔ ترکمانوں کی ٹوپی پہننے کے بعد دریا عبور کرنے والی فوج کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رام ناتھ نے ساتھی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "بھگوان کی قسم! یہ انسان نہیں۔ آج کے بعد کوئی مجھ سے یہ کہے کہ لشکر سمندر کی سطح پر دوڑ کر کسی دوسرے ملک پہنچ گیا ہے تو میں تعجب نہیں کروں گا۔"

دریا کے کنارے گھنے درختوں کے پیچھے سے گھوڑوں کی ٹاپیں، ہاتھیوں کی چنگھاڑیں اور آدمیوں کی چیخ و پکار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ترلوچن پال کی ساری فوج اس غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے حرکت میں آچکی ہے لیکن اتنی دیر میں سلطان کی فوج کے کئی دستے دریا عبور کر چکے تھے۔

رنبیر کو اپنے قریب درختوں کے پیچھے سے پانچ ہاتھیوں کا ایک دستہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہاتھیوں کا رُخ رنبیر کے دائیں ہاتھ سپاہیوں کے اس گروہ کی طرف تھا جنہیں دریا عبور کرنے کے بعد ابھی کنارے پر پاؤں جمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بعض سپاہی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور بعض نے کنارے کی آڑ لے کر ہاتھیوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ دو ہاتھی بدحواس ہو کر واپس مڑے اور اپنے عقب میں پیش قدمی کرنے والے تیر اندازوں کو روندتے ہوئے نکل گئے لیکن تین ہاتھی بدستور آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک ہاتھی پتھروں کی آڑ سے تیر برسانے والے آدمیوں کے قریب آ چکا تھا۔ چند سپاہی الٹے پاؤں بھاگتے ہوئے دریا میں کود پڑے اور باقی اِدھر اُدھر ہٹ گئے لیکن تین جو سب سے آگے تھے اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ایک ہاتھی ان کے تیروں سے زخمی ہونے کے بعد غضب ناک ہو کر اپنی سونڈ بلند کیے چیختا چنگھاڑتا آگے بڑھا۔ ایک آدمی نے اچانک پتھر کی آڑ سے نکل کر تلوار سونت لی اور ہاتھی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی ہلاکت یقینی سمجھ کر رنبیر نے اچانک گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نیزہ بلند کرتے ہوئے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ اس کا نیزہ ہاتھی کی سونڈ میں اٹک کر رہ گیا۔

ہاتھی نے ایک دل ہلا دینے والی چیخ کے ساتھ رنبیر پر حملہ کیا۔ رنبیر نے گھوڑے کو ایک طرف موڑنے کی کوشش لیکن بدحواس گھوڑا سیخ پا ہو کر گر پڑا۔ رنبیر ایک طرف لڑھک کر اس کے نیچے آنے سے بچ گیا لیکن ابھی وہ اٹھ کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوبارہ ہاتھی کی زد میں آگیا۔ رام ناتھ نے اسے بچانے کے لیے حملہ کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ایک اور سپاہی نے تلوار کے بھرپور وار سے ہاتھی کی سونڈ کاٹ دی۔ پھر رام ناتھ کا نیزہ بھی ہاتھی کی آنکھ پر آکر لگا اور وہ ایک چکر کاٹنے کے بعد بھاگ نکلا۔ اتنی دیر میں ترکمان آگے بڑھ کر باقی دو ہاتھیوں کا منہ پھیر چکے تھے۔

ترلوچن پال کی فوج میں تقریباً تین سو ہاتھی تھے لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اپنی فوج کو منظّم کر کے حملہ کرتا سلطان کی فوج دریا عبور کر چکی تھی۔ ہاتھیوں کے منتشر دستے ساری فوج میں بکھرے ہوئے تھے اور وہ دشمن کی بجائے اپنی ہی فوج میں تباہی مچا رہے تھے۔

سلطان کی فوج نے آن کی آن میں پوری تنظیم کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔ ان کی قیادت میں ترک اور افغان سواروں کے چند دستے آندھی کے

تیز جھونکوں کی طرح دشمن کی فوج کو درمیان سے چیرتے ہوئے عقب میں جا پہنچے۔ اس کے علاوہ باقی سوار ترلوچن پال کی فوج کے دائیں اور بائیں بازو پر ٹوٹ پڑے۔ سلطان کی فوج کے ہندی سپاہیوں کے دستے ساٹھ ہاتھیوں کی ایک قطار کے سامنے آچکے تھے۔ ہر ہاتھی کی ہودج میں دو دو تیر انداز بیٹھے ہوئے تھے جو بے تحاشا تیر برسا رہے تھے۔ رنبیر اور رام ناتھ سلطان کی فوج کے ہندی دستوں میں شامل ہو چکے تھے۔ ہاتھیوں کی قطار جو ان دستوں کی طرف بڑھ رہی تھی اس قدر منظّم تھی کہ سامنے سے حملہ کر کے ان کا منہ پھیر دینا ناممکن تھا۔ ہندی سپاہی ہاتھیوں پر تیر برساتے ہوئے اُلٹے پاؤں دریا کی طرف ہٹنے لگے۔ ان کے سالار نے انہیں دائیں بائیں سمٹ کر دریا کا کنارہ خالی کرنے کا حکم دیا۔ یہ دیکھ کر فیل بانوں نے ہاتھیوں کا رُخ بھی اُسی طرف پھیرنے کی کوشش کی لیکن ہندی دستوں کے سالار نے اچانک ایک چھوٹا چکر کاٹنے کے بعد دائیں ہاتھ مُڑ کر ہاتھیوں کے عقب میں پیش قدمی کرنے والے دستوں پر حملہ کر دیا اور کسی شدید مزاحمت کا سامنا کیے بغیر انہیں تتّر بتّر کر دیا۔

اس کے بعد ہندی سپاہی ہاتھیوں کو تین اطراف سے گھیر کر دریا کی طرف ہانک رہے تھے۔ رنبیر نے ان کے سالار کی طرف دکھا اور اس کا دل مسرّت سے اچھلنے لگا۔ یہ عبدالواحد تھا۔ رنبیر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور عبدالواحد کے قریب جا پہنچا اور اس کی زرہ میں اٹکا ہوا تیر کھینچ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

عبدالواحد اسے دیکھ کر مسکرایا اور کہا۔ ”میرے دوست! میں تمہیں دیکھ چکا ہوں۔“

میدانِ جنگ کے باقی حصّوں میں بھی ترلوچن پال کی فوج منتشر ہو رہی تھی۔ ترلوچن پال زخمی ہونے کے بعد میدان سے بھاگ گیا اور سلطان کے چند دستوں نے اس کے مستقر پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں مالِ غنیمت کے ہاتھیوں کی تعداد دو سو ستّر تھی۔

۳

کچھ دیر بعد سلطان کی فوج دریا کے کنارے ظہر کی نماز پڑھ رہی تھی اور

رنبیر اور رام ناتھ تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد عبدالواحد ان کے قریب آ بیٹھا۔ رنبیر نے رام ناتھ سے اس کا تعارف کرایا پھر عبدالواحد کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی اور اپنے ساتھی کی سرگزشت سنادی۔

عبدالواحد نے رنبیر سے چند اور سوالات پوچھے۔ پھر اس نے ہاتھ سے بالشت بھر زمین صاف کی اور اپنے خنجر کی نوک سے چند لکیریں کھینچنے کے بعد کہا۔ ”یہ قنوج کا نقشہ ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کا گاؤں کس جگہ واقع ہے؟“

رنبیر نے ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”قریباً اس جگہ۔“

عبدالواحد نے کہا۔ ”یہ مقام ہمارے راستے سے زیادہ دور نہیں ہو گا۔ اگر مجھے آج شام سلطانِ معظّم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو ممکن ہے کہ سونے سے پہلے آپ کو کوئی اچھی خبر سنا سکوں۔ سرِدست آپ یہ اطمینان رکھیں کہ اگر اب نہیں تو اس مہم کے خاتمے پر آپ کے گاؤں ضرور جائیں گے۔“

رنبیر کے لیے عبدالواحد کے چہرے کا خلوص اس کے الفاظ سے کہیں زیادہ مؤثر تھا۔

عبدالواحد نے رام ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔ ”ممکن ہے کہ سلطان معظّم آپ کو بھی باریابی کا موقع دیں اور گوالیار، کالنجر اور قنوج کی فوجی قوت کے متعلق آپ سے سوالات پوچھیں۔ اگر آپ کسی سوال کا جواب دینا اپنے ضمیر کے خلاف سمجھیں تو بے شک جواب نہ دیں۔ آپ کو مجبور نہیں کیا جائے گا لیکن کوئی غلط جواب نہ دیں کیونکہ سلطان کی معلومات آپ کی نسبت بہرحال زیادہ ہوں گی۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ رنبیر کے دوست ہیں۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”رنبیر کے دوست کی حیثیت سے میں بھی آپ کی کشتی میں سوار ہو چکا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں سلطان میری صاف گوئی پر برہم نہ ہو جائے۔ فرض کیجیے اگر میں یہ کہہ دوں کہ صرف کالنجر کا راجہ آپ کے ہر سپاہی کے مقابلے میں سپاہی میدان میں لا سکتا ہے اور سلطان اگر قنوج کے بعد کالنجر کا رُخ چاہتا ہے تو اس کا ہر قدم فتح کی بجائے تباہی

کی طرف ہو گا تو اس ملاقات کے بعد مجھے کتنی دیر زندہ رہنے کی اجازت دی جائے گی؟"

عبدالواحد مسکرایا۔ "اس بارے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ کہہ چکا ہوں کہ سلطان کی معلومات تمہاری معلومات سے زیادہ ہوں گی۔ ایک اور دس کی نسبت سلطان کو پریشان نہیں کر سکتی۔ شہباز جب پرواز کے لیے پَر کھولتا ہے تو وہ کبوتروں اور مُرغابیوں کی تعداد سے مرعوب نہیں ہوتا۔ معاف کیجیے میں ہندی سپاہیوں کو حقیر نہیں سمجھتا۔ میں راجپوتوں کی بہادری کا معترف ہوں لیکن ہماری فتح کا راز اس اصول کی برتری میں ہے جو زمانے کے ہر اصول پر حاوی ہے۔ ہم اپنی تلواروں کی تیزی اور بازوؤں کی طاقت سے زیادہ اپنے ضمیر کی روشنی کو اپنی فتوحات کا ضامن سمجھتے ہیں۔ ہماری طاقت کا سر چشمہ اسلام ہے۔ جب تک ہمارا مقصد ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا ہمارا ہر قدم فتح کی طرف اُٹھے گا۔ جو لوگ کل ہمارے راستے میں کھڑے تھے، آج ہمارے جھنڈے تلے لڑ رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل قنوج، گوالیار

اور کالنجر کے سپاہی ہمارے رفیق نہیں ہوں گے ؟"

عبدالواحد کی گفتگو کے دوران فوج کے چند افسر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ایک ترک جرنیل چند افسروں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اس طرف آنکلا اور عبدالواحد کو دیکھ کر تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ایک افسر نے عبدالواحد کو جرنیل کی طرف متوجہ کیا اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ترک جرنیل نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "میں آپ کو دیر سے تلاش کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ دو سوار جنہوں نے ہمارے آنے والوں کو دریا عبور کرنے کے بعد دشمن کے تیر اندازوں سے بچایا تھا، ہندی تھے۔ ایک نوجوان نے مجھے بھی ہاتھی کے پاؤں تلے روندے جانے سے بچایا تھا۔ شاید آپ کو ان کا پتہ ہو۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" اچانک اس کی نگاہ رنبیر پر پڑی اور اس نے کہا۔ "اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ تم ہی تھے۔"

ترک جرنیل نے رنبیر کے جواب کا انتظار کے بغیر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد رام ناتھ کی طرف متوجہ

ہوا۔ ”اچھا تو یہ تمہارا ساتھی ہے۔“ پھر عبدالواحد کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ان نوجوانوں کو ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی دریا کے پار بھیج چکے ہیں۔“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”یہ میرے دستوں سے تعلّق نہیں رکھتے۔ ان میں سے ایک قنوج کے رہنے والے ہیں اور دوسرے گوالیار سے آئے ہیں۔ حالات نے ان دونوں کو ہمارا رفیق بنا دیا ہے۔“

”پھر تو مجھے ان کا زیادہ شکر گزار ہونا چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے جرنیل نے رنبیر اور رام ناتھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور اپنے خیمہ کی طرف چل دیا۔

”میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر عبدالواحد تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا جرنیل کے ساتھ جا ملا۔

۴

اگلی صبح رنبیر اور رام ناتھ سلطان محمود کے خیمے کے سامنے کھڑے تھے۔ عبدالواحد رات کے وقت انہیں یہ بتا چکا تھا کہ سلطانِ معظّم نے صبح کی نماز

کے بعد فوج کے اعلیٰ عہدیداروں کا اجلاس بلایا ہے اور اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ آپ سے ملاقات کریں گے۔

رنبیر اور رام ناتھ دیر تک باہر کھڑے رہے۔ بالآخر اُمرا کی مجلس برخاست ہوئی اور وہ سلطان کے خیمے سے نکل کر اپنی اپنی قیام گاہ کی طرف چل دیے۔ افسر خیمے سے نکلتے ہی سیدھا رنبیر اور رام ناتھ کی طرف بڑھا اور ان کے قریب آ کر بولا۔ "سلطانِ اعظم ابھی تمہیں ملاقات کے لیے بلائیں گے۔ عبدالواحد ابھی تک خیمے کے اندر رہے۔"

یہ وہی ترک جرنیل تھا جو ایک دن قبل رنبیر اور رام ناتھ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ رنبیر اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ عبدالواحد خیمے سے باہر نکلا اور اس نے قریب آ کر کہا۔ "آیئے۔"

رنبیر اور رام ناتھ عبدالواحد کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ سلطان خیمے کے درمیان کھڑا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ ایک کاتب قالین پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ رنبیر اور رام ناتھ ہندو رسم کے مطابق ہاتھ باندھ کر آداب بجالائے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

عبدالواحد نے فارسی زبان میں کہا۔ ”عالی جاہ! یہ رنبیر ہے اور یہ رام ناتھ۔ میں ان دونوں کے متعلق آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں۔“

سلطان نے رنبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو یہ وہ نوجوان ہے جو ہماری قید میں تھا؟“

”ہاں عالی جاہ!“ عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”قید کے زمانے میں یہ فارسی زبان سیکھ چکا ہے۔“

سلطان نے براہِ راست رنبیر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”نوجوان میں نے تمہاری سرگزشت سنی ہے اور تمہاری بہن کی تلاش اپنے فرائض میں شامل کر چکا ہوں۔“

رنبیر نے تشکّر کے جذبات سے مغلوب ہو کر سلطان کی طرف دیکھا اور دوبارہ گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ ”عالی جاہ! مجھے یہی امید تھی۔“

سلطان نے عبدالواحد کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”عبدالواحد اگر تمہیں

یقین ہے کہ تم اپنی مہم سے فارغ ہو کر بر وقت ہمارے ساتھ آملو گے تو آج ہی روانہ ہو جاؤ۔ باقی فوج بھی بہت جلد پہنچ جائے گی اور میں کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے قنوج کا رُخ کروں گا۔"

عبدالواحد نے جواب دیا۔ "عالی جاہ! آپ مجھے اپنے راستے میں منتظر پائیں گے۔"

سلطان نے رام ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "اور میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

رام ناتھ کی خاموشی پر عبدالواحد نے ترجمان کے فرائض ادا کرتے ہوئے کہا۔ "عالی جاہ! یہاں پہنچنے سے قبل یہ نوجوان گوالیار کے راجہ کی فوج میں ملازم تھا۔ اس کے باپ کو سومنات کے پجاریوں نے قتل کیا تھا اور یہ ایک پجاری کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس ملک کے ہر ہندو کو اپنا دشمن بنا چکا ہے۔"

"سومنات" کا لفظ سُن کر سلطان زیادہ دلچسپی کے ساتھ رام ناتھ کی طرف

دیکھنے لگا اور اس نے قدرے توقّف کے بعد سوال کیا۔ ”تم نے سومنات کا مندر دیکھا ہے؟“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”نہیں عالی جاہ! میرا گاؤں گوالیار میں سومنات کے مندر کی جاگیر کا حصّہ ہے اور سومنات کے پجاریوں نے میرے پِتا کو لگان ادا نہ کرنے کے جرم میں قتل کیا تھا۔“

سلطان نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ باقی ریاستوں کے حکمرانوں نے بھی سومنات کے مندر کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کر رکھی ہیں۔“

”ہاں عالی جاہ! سومنات ایک مندر نہیں بلکہ ایک سلطنت ہے۔ ہند کی سب سے بڑی سلطنت۔ سومنات کا پروہت ہندوستان کے ہر حکمران سے خراج وصول کرتا ہے۔ راجے اور مہاراجے اس کے قدموں میں سر جھکاتے ہیں۔“

”اس کی وجہ کیا ہے؟“ سلطان نے سوال کیا۔

”اس کی وجہ سومنات کے پجاریوں کی طاقت اور دولت ہے اور ہمیں

طاقت اور دولت کی پوجا کرنا سکھایا گیا ہے۔"

سلطان مسکرایا۔ "میں نے سنا ہے سومنات کے پجاری یہ کہتے ہیں کہ میری فتوحات کی وجہ صرف یہ ہے کہ دوسرے مندروں کے بتوں اور ان کے پجاریوں سے سومنات کا بُت خفا ہو چکا ہے؟"

"ہاں عالی جاہ! وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب آپ سومنات کی طرف بُرے ارادے سے بڑھیں گے تو آپ کا ہر قدم فتح کی بجائے تباہی کی طرف ہو گا۔"

"میں یہ بھی سن چکا ہوں اور یہ میرے لیے ایک دعوت ہے لیکن کیا سومنات کے پجاریوں کی خود اعتمادی کا باعث یہ نہیں کہ وہ مجھ سے دور رہیں؟"

رام ناتھ نے جواب دیا۔ "عالی جاہ! اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ اُن کی خود اعتمادی کی وجہ صرف یہی نہیں۔ اگر وہ محض اپنی قوّت کے بل بوتے پر سومنات کو ناقابلِ تسخیر سمجھیں تو اُسے اُن کی نادانی یا حماقت

نہیں سمجھنا چاہیے۔ انہیں یہ یقین ہے کہ سومنات کی مورتی کی حفاظت کے لیے گنگا اور جمنا کے میدانوں سے لے کر جنوبی ہندوستان کے آخری کونے تک تمام راجے اور سردار جمع ہو جائیں گے۔ سومنات کے دیوتا کی بدولت فتح کی اُمّید لاکھوں انسانوں کو مندر کی چار دیواری کے نیچے جانیں دینے پر آمادہ کر دے گی۔"

سلطان نے کہا۔ "اور وہ دن پتھر کی مورتیوں پر انسان کے اعتماد کا آخری دن ہو گا۔ پھر سومنات کے کھنڈروں سے وہ انسانیت نمودار ہو گی جو اپنے معبودِ حقیقی کو پہچان سکے گی۔ سومنات کفر کی تاریکیوں کا آخری مسکن ہے اور تاریکیوں کے آغوش میں آنکھ کھولنے والے یقیناً اس کی حفاظت کے لیے آئیں گے۔ لیکن وہ ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔ میں اس دن کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں اور شاید وہ دن دور نہ ہو۔" سلطان بظاہر رام ناتھ سے مخاطب تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہے۔ عبدالواحد نے اس مرحلہ پر مترجم کے فرائض ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

”سومنات بتوں کا آخری مسکن۔ سومنات تاریکیوں کی آماجگاہ۔“

سلطان نے قدرے توقّف کے بعد دبی زبان سے یہ الفاظ دہرائے اور عبدالواحد کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”عبدالواحد! اب تم جا سکتے ہو اور دیکھو جب تک یہ نوجوان ہمارے مہمان ہیں، ان کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔“

خیمے سے باہر نکلتے ہی زبیر نے عبدالواحد سے سوال کیا۔ ”آپ کون سی مہم پر جا رہے ہیں؟“

”تمہیں معلوم نہیں؟“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ۔۔۔۔؟“

”ہاں!“ عبدالواحد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمہارے گاؤں جا رہے ہیں۔“

رنبیر کی واپسی

طلوعِ آفتاب کے ساتھ چرواہے اپنے ریوڑ اور کسان اپنے ہل چھوڑ کر واپس اپنے گاؤں کی طرف بھاگے اور انھوں نے یہ خبر سنائی کہ جنگل کی طرف سے ایک فوج آرہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد رنبیر، عبدالواحد اور پانچ سو سواروں کے ہمراہ گاؤں میں داخل ہوا۔ جے کرشن نے سپاہیوں نے لڑنے کی بجائے بھاگنا بہتر خیال کیا اور رنبیر نے ایک قطرہ خون بہائے بغیر اپنے گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ گاؤں کے کسان اور چرواہوں میں سے بعض نے خوفزدہ ہو کر اپنے گھروں کے دروازے تک بند دیے اور اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ حملہ آور چند آدمیوں کو گھیر کر رنبیر کے پاس لے آئے۔ ان

میں سے بعض نے رنبیر کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ رنبیر نے انہیں تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میرا مقصد تمہیں جے کرشن کے مظالم سے نجات دلانا ہے۔ تم جاؤ اور باقی آدمیوں کو بھاگنے سے منع کرو۔“

اس کے بعد حملہ آور فوج نے محل کا رُخ کیا محل کے پہریداروں کی اکثریت سلطان محمود کی فوج کی آمد کی اطلاع ملتے ہی راہِ فرار اختیار کی چکی تھی۔ چند آدمی دروازوں کی حفاظت کے لیے کھڑے تھے لیکن جب حملہ آور چار دیواری پھاند کر اندر داخل ہونے لگے تو انہوں نے مقابلہ کرنا بے سود سمجھ کر ہتھیار ڈال دیے۔ عبدالواحد باقی فوج کو باہر رہنے کا حکم دے کر رنبیر، رام ناتھ اور اپنے چند افسروں کے ساتھ محل کے اندر داخل ہوا۔ اس نے دہشت زدہ پہریداروں کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”ہتھیار ڈالنے کے بعد تم ہماری پناہ میں آچکے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ ہم صرف تمہارے سردار کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟“

”سردار یہاں نہیں ہے۔ وہ یہاں سے آٹھ کوس پر ایک دوسرے گاؤں گیا ہوا ہے۔“

عبدالواحد نے رنبیر طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ تسلّی کر لیں۔“

رنبیر نے پہریدار سے سوال کیا۔ ”مکان کے اندر کتنے آدمی ہیں؟“

”اندر سردار کی بیوی اور لڑکی کے علاوہ صرف دو نوکرانیاں ہیں۔“

”میں ابھی آتا ہوں۔“ رنبیر یہ کہہ کر رہائشی مکان کی طرف بڑھا۔ عبدالواحد نے رام ناتھ اور تین اور سپاہیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ رنبیر کے پیچھے ہو لیے۔

نچلی منزل کے تمام کمرے خالی تھے۔ بالائی منزل کی سیڑھی کا دروازہ بند تھا۔ رنبیر نے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے کئی مرتبہ آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ پا کر اپنے ساتھیوں کو دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ چار آدمیوں نے مل کر دروازے کو زور سے دھکیلا۔ اچانک اندر سے کنڈی ٹوٹ گئی اور کواڑ پھٹ سے کھل گئے۔ رنبیر بھاگتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ رام

ناتھ اور باقی تین آدمی بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ بالائی منزل کے کونے کے ایک کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ رنبیر کواڑ پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے چلّایا۔ ''دروازہ کھولو، ورنہ ہم توڑ ڈالیں گے۔''

اچانک اندر سے عورتوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ ایک عورت بلند آواز سے چلّائی۔ ''کیا کر رہی ہو نرملا۔ بھگوان کے لیے ایسا نہ کرو۔ پکڑو اسے، تم کیا کر رہی ہو۔''

''نہیں نہیں۔'' دوسری عورت کی آواز آئی۔ ''وہ صرف میری لاش کو ہاتھ لگا سکیں گے۔ مجھے چھوڑ دو، مجھے مرنے دو۔''

''نرملا ہوش میں آؤ بیٹی، بھگوان کے لیے ایسا نہ کرو۔''

رنبیر کے اشارے سے اس کے ساتھیوں نے دھکا دے کر دروازہ توڑ دیا۔ رنبیر بھاگ کر اندر داخل ہوا۔ اسے عورتوں کی چیخ و پکار کی وجہ معلوم کرنے میں دیر نہ لگی۔ ایک نوجوان لڑکی کھڑکی سے باہر کودنے کی کوشش کر رہی تھی اور تین عورتیں اسے بازوؤں سے پکڑ کر اندر کھینچ

رہی تھیں۔ رنبیر کے اندر داخل ہوتے ہی اس لڑکی نے اپنا ایک بازو چھڑایا اور دوسرا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ رنبیر نے بھاگ کر لڑکی کا بازو پکڑ لیا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ عورتوں کی چیخ و پکار ایک دم بند ہو گئی اور نوجوان لڑکی چند ثانیے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے کے بعد رنبیر کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گئی۔

رنبیر نے کہا۔ ”تم ہر انسان کو جے کرشن سمجھنے کی غلطی نہ کرو۔ اس مکان کی چار دیواری میں عورتوں کو کوئی خطرہ نہیں۔“

لڑکی نے گردن اٹھائی اور اس کی نگاہیں رنبیر کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ ”تم!“ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”رنبیر!“

”ہاں!“ رنبیر نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

عمر رسیدہ عورت نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”بھگوان کے لیے ہم پر دِیا کرو۔ میری بچی نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ اگر تم معاف نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو۔ لیکن ہمیں غیروں کے حوالے نہ کرو۔“

”تم میری پناہ میں ہو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ مکان کے اس حصّے میں تمہاری اجازت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہو گا۔“

رنبیر یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

۲

رُہت کی جنگ میں ترلوچن پال کی شکست اور قنوج کی طرف سلطان محمود کی پیش قدمی کی خبر ملک کے طول و عرض میں مشہور ہو چکی تھی۔ جے کرشن کے گاؤں کے جنوب میں کوئی آٹھ دس کوس کے فاصلے پر اردگرد کے تمام سردار علاقے کے پروہت کے گاؤں میں جمع ہو کر اپنی حفاظت اور راجہ کو مدد دینے کی تجاویز پر بحث کر رہے تھے۔

سرداروں کا یہ اجلاس ایک عالیشان مندر سے باہر کھلے صحن میں ہو رہا تھا۔ پروہت اس بات پر زور دے رہا تھا کہ ہر سردار اپنے سپاہیوں کو تین مساوی حصّوں میں تقسیم کر کے ایک حصّہ وہ اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے چھوڑ دے۔ ایک حصّہ اس مندر کی حفاظت کے لیے بھیج دے اور باقی سپاہیوں کی ایک فوج فوراً راجہ کی مدد کے لیے روانہ کی جائے۔

جے کرشن نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنی قوّت کو اس طرح منتشر نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی مجموعی فوج کا تیسرا حصّہ فوراً راجہ کی مدد کے لیے بھیج دینا چاہیے لیکن باقی تمام سپاہیوں کو شمالی سرحد کی حفاظت کے لیے بھیج دینا چاہیے۔ اگر سرحد محفوظ ہے تو اس مندر اور ہماری بستیوں کو کوئی خطرہ نہیں اور اگر دشمن کے چند دستے سرحد عبور کر کے اس طرف آ نکلے تو ہم کئی حصّوں میں تقسیم ہونے کے باعث ان کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ دشمن صرف شمال سے آ سکتا ہے اس لیے ہمیں اب باقی تمام قوّت سرحد پر جمع کر دینی چاہیے۔“

ایک عمر سیدہ سردار نے اٹھ کر کہا۔ ”آپ یہ مشورہ اس لیے دیتے ہیں کیونکہ آپ کا گاؤں سرحد کے زیادہ قریب ہے۔ آپ کی خواہش ہے کہ ہم نہ تو اس مندر کی فکر کریں اور نہ اپنے گھروں کی بلکہ سب کچھ چھوڑ کر آپ کے گاؤں کی حفاظت کے لیے جمع ہو جائیں۔ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ دشمن کا سب سے پہلا مقصد باری اور قنوج کو فتح کرنا ہے اور ہمارا علاقہ اس کے راستے سے بہت دور ہے۔ قنوج اور باری کو بچانے کے لیے یہ

ضروری ہے کہ ہم اپنی فوج کا ہر سپاہی راجہ کی مدد کے لیے بھیج دیں۔ اگر ہمارا راجہ سلامت ہے تو ہمارے گھروں کو کوئی خطرہ نہیں اور اگر اسے شکست ہوئی تو ہم سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ ہمیں اپنے تمام سپاہیوں کے ساتھ راجہ کی مدد کے لیے پہنچ جانا چاہیے۔"

جے کرشن نے غصّے سے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ "تم میں سے کوئی مجھے بُزدلی کا طعنہ نہیں دے سکتا اور نہ کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ مجھ سے بڑھ کر راجہ کا وفادار ہے۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم اپنے تمام سپاہی بھیجنے سے پہلے یہ معلوم کر لیں کہ دشمن کا رُخ کِس طرف ہے۔ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ دشمن کا لشکر سیدھا قنوج یا باری کا رُخ کر رہا ہے اور اس کی فوج کے کسی حصّے کے اس طرف آنے کا کوئی امکان نہیں تو ہم اپنے باقی تمام سپاہیوں کا رُخ بھی اس طرف پھیر دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دفعہ اگر دشمن نے ان شہروں کا رُخ کیا تو ہمارا راجہ تنہا نہیں ہو گا۔ کالنجر، گوالیار اور آس پاس کے تمام راجاؤں کی فوج اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے گی۔"

عمر رسیدہ سردار نے اُٹھ کر جواب دیا۔ "لیکن ہم چند دن انتظار کیوں نہ کریں۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ دشمن کی فوج کا کوئی حصّہ اس طرف ضرور آئے گا۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ سردار موہن چند کے بیٹے اور اس کی اَن دیکھی فوج کا خوف ابھی تک آپ کے دل پر سوار ہے؟"

چند بڑے بڑے سردار اس پر ہنس پڑے لیکن حاضرین کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو ایک قہقہے کے عوض عمر بھر کے لیے جے کرشن کا عتاب مول لینے سے گھبراتے تھے۔ عام حالات میں جے کرشن ایسا مذاق برداشت کرنے کا عادی نہ تھا لیکن یہ صورت عام حالات سے مختلف تھی۔ وہ پرلے درجے کا جلد باز ہونے کے باوجود کسی کی گالی کا جواب دینے سے پہلے اس کی قوّت کا اندازہ کرنے کا عادی تھا اور عمر رسیدہ سردار جس نے بھری محفل میں اس کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی تھی سارے علاقے میں غیر معمولی اثر و رسوخ کا مالک تھا۔

جے کرشن نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، اس لیے میں آپ کی ہر گالی برداشت کر سکتا ہوں لیکن میں

آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب آپ تمام سپاہیوں کے ساتھ راجہ کی مدد کے لیے روانہ ہوں گے تو مجھے ہر منزل پر اپنے آگے پائیں گے۔“

اچانک کہیں پاس ہی چند گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور حاضرینِ مجلس اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مندر کے صحن کے سامنے آٹھ سوار نظر آئے۔ جے کرشن نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ سب اس کے نوکر تھے۔ پیارے لال سب سے آگے تھا۔ وہ گھوڑا روک کر اپنے سردار کی طرف دیکھتے ہی چلّایا۔ ”مہاراج! مہاراج!! اندھیر ہو گیا۔ مسلمانوں کی فوج ہمارے گاؤں پر قبضہ کر چکی ہے اور رنبیر ان کے ساتھ ہے۔“

حاضرینِ مجلس چند ثانیے مبہوت ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے آہستہ آہستہ ان کی زبانیں حرکت میں آنے لگیں۔ چند آدمی اُٹھ کر پیارے لال اور اس کے ساتھیوں کے گرد جمع ہو گئے۔ ”وہ کب آئے؟ وہ کتنے ہیں؟ تم نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ کسی نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہو گا۔ ہو کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔“

اور پیارے لال اپنے ساتھیوں کو ان سوالات کے جواب کا موقع دینے کی

بجائے بلند آواز سے چلّا رہا تھا۔ ”آپ سب میرا مذاق اڑایا کرتے تھے اور وہ آ گئے ہیں، وہ اب کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ان کی فوج کا کوئی شمار نہیں۔ آس پاس کی تمام بستیاں خالی ہو چکی ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔ اس ملک کا کوئی کونہ ان سے محفوظ نہیں۔“

جے کرشن سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ چکا تھا۔ آن کی آن میں تمام سردار وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ پیارے لال اپنے گھوڑے سے اُترا اور آگے بڑھ کر جے کرشن کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”مہاراج! اپنی جان بچایئے، رنبیر ان کے ساتھ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ محل پر قبضہ کر چکے ہیں۔ مہاراج جلدی کیجئے۔“

۳

دن کے تیسرے پہر گاؤں کے قریباً ڈیڑھ سو آدمی محل کے دروازے پر جمع ہو چکے تھے۔ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے کسان بھی رنبیر کی آمد کی اطلاع پا کر جوک در جوک محل کا رُخ کر رہے تھے۔

رنبیر عبدالواحد کے ساتھ محل کے دروازے سے باہر نکلا تو اسے دیکھتے ہی اس کے باپ کے پرانے وفادار آگے بڑھ بڑھ کر اس کے پاؤں چومنے لگے۔ ان لوگوں میں وہ نوجوان بھی تھے جنہوں نے چند ماہ قبل رنبیر کی جان بچائی تھی اور رنبیر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ بغلگیر ہو رہا تھا۔ رنبیر کے باپ کے چند جانثاروں نے مطالبہ کیا کہ شکنتلا کا انتقام جے کرشن کی بیوی اور بیٹی سے لیا جائے، لیکن رنبیر نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں جے کرشن کے جرم کی سزا اس کی بیوی اور بیٹی کو نہیں دے سکتا۔ میں بے بس عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا مشورہ دینے والوں کو دوست نہیں سمجھتا۔ وہ میری پناہ میں ہیں اور ان کی حفاظت میرا فرض ہے۔"

عبدالواحد نے کہا۔ "میرے دوست اب یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے اور میں کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے کوچ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اپنے چند آدمی تمہارے پاس چھوڑ جاؤں لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں میری مزید اعانت کی ضرورت نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آس پاس کے سردار بھی تمہارے گرد جمع ہو جائیں گے۔ تم انہیں یہ بتا

سکتے ہو کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان کی پوری فوج اس راستے سے گزرے گی جو لوگ تمہارے دوست ہوں گے ان کے ساتھ ہمارا سلوک بھی دوستانہ ہو گا۔ میں رخصت ہونے سے پہلے ایک بار یہ مشورہ دیتا ہوں کہ عفو اور درگزر انتقام سے بہتر ہے۔ میں تم سے دوبارہ ملنے کی امید پر رُخصت ہوتا ہوں۔"

رنبیر کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد عبدالواحد رام ناتھ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "رام ناتھ! ابھی تمہاری منزل بہت دور ہے اور مجھے اُن مشکلات کا احساس ہے جو تمہاری راہ میں حائل ہیں۔ لیکن تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ امید کا دامن تھامے رہو اور وقت کا انتظار کرو۔"

تھوڑی دیر بعد عبدالواحد اور اس کے ساتھ آنے والے سوار جنوب کی طرف روانہ ہو رہے تھے اور رنبیر اور رام ناتھ لوگوں کے ہجوم میں گاؤں سے باہر انہیں گرد و غبار کے بادلوں میں روپوش ہوتا دیکھ رہے تھے۔ گاؤں والے کہہ رہے تھے۔ "اس فوج کا سردار تو دیوتا معلوم ہوتا ہے۔"

۴

عبدالواحد کا قیاس صحیح ثابت ہوا۔ چند دن کے بعد کسانوں اور چرواہوں کی طرح علاقے کے سردار بھی رنبیر کے گرد جمع ہونے لگے۔ یہ خبر دور دور تک مشہور ہو چکی تھی کہ سلطان محمود رنبیر کی پشت پر ہے اور جب واپسی پر سلطان کی فوج اس راستے سے گزرے گی تو صرف وہی لوگ محفوظ ہوں گے جو رنبیر کی نظر میں قابلِ رحم ہوں گے۔ چنانچہ رنبیر کی دوستی کو اپنی حفاظت کا ضامن سمجھ کر یہ لوگ اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر سردار جے کرشن کے خلاف انتہائی نفرت کا اظہار کرتا تھا اور بعض سردار رنبیر کے پاس آنے سے پہلے اس کے سامنے اس کا عملی ثبوت پیش کرنے کے لیے انتہائی شد و مد کے ساتھ جے کرشن کی تلاش شروع کر چکے تھے۔ انہوں نے اس کی گرفتاری کے لیے انعامات کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ علاقے بھر میں رنبیر کی بہن شکنتلا کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔

وہ سردار جو جے کرشن کی دوستی کے باعث زیادہ بدنام ہو چکے تھے اور جنہیں رنبیر سے کسی نیک سلوک کی توقع نہ تھی سرحد عبور کر کے دوسری ریاستوں میں پناہ لے چکے تھے۔

رنبیر کے پاس جو لوگ آتے تھے وہ ان سے بظاہر خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا تھا لیکن جب اُسے رام ناتھ کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ اکثر یہ کہا کرتا تھا۔ "رام ناتھ! مجھے اُن میں سے کسی کے متعلق غلط فہمی نہیں۔ یہ سب چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہیں۔ میرا باپ انہی لوگوں کے سامنے قتل کیا گیا تھا اور پھر جب مجھ پر مصیبت آئی تھی تو یہ لوگ جے کرشن کو خوش کرنے کے لیے میری تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ آج یہ سب میرے دوست ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جے کرشن بازی ہار چکا ہے۔"

شکنتلا کے متعلق رنبیر کی بے قراری میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ چند سواروں کے ہمراہ علی الصبح باہر نکل جاتا اور میلوں اِدھر اُدھر گھومتا رہتا۔ راستے کی بستیوں کے لوگ اس کے ساتھ ہو لیتے۔ شام کے وقت وہ تھکا

ماندہ اپنے دل کو تسلّیاں دیتا ہوا گھر لوٹتا کہ شکنتلا گاؤں کے تازہ حالات سے باخبر ہوتے ہی گھر پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ ممکن ہے کہ آج جب میں گھر پہنچوں تو وہ دروازے پر کھڑی میرا انتظار کر رہی ہو، لیکن محل کے اندر پاؤں رکھتے ہی اس کا دل بیٹھ جاتا۔ عام طور پر ہر روز علاقے کے دو چار با اثر آدمی اس کے مہمان خانے میں موجود ہوتے اور وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ شکنتلا کی تلاش میں کم پریشان نہیں۔

جے کرشن کی بیٹی نرملا کے بارے میں رنبیر کا طرزِ عمل علاقے کے ہر آدمی کی توقع کے خلاف تھا۔ حملے کے روز سے ان کی ملاقات کے بعد اس نے دوبارہ انہیں دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ رہائشی مکان کا ایک حصّہ ان کے لیے وقف تھا جس میں کسی نوکر کو بن بلائے جانے کی اجازت نہ تھی۔ رنبیر اور رام ناتھ نچلی منزل کے ایک کونے کے دو کمروں میں رہتے تھے اور ان کمروں میں آنے کے لیے وہ صحن کی بجائے باہر کی طرف کھلنے والے برآمدے کا راستہ استعمال کرتے تھے۔ صحن کی طرف کھلنے والے دروازے عام طور پر بند رہتے تھے۔ اس طرح رنبیر نے دو کمروں کے سوا

باقی تمام محل نرملا، اس کی ماں اور ان کی نوکرانیوں کے سپرد کر رکھا تھا۔ بیٹھک اور مہمانوں کے کمرے محل سے الگ صحن کے حصّے میں تھے۔

گاؤں پر قابض ہونے کے آٹھ دن بعد ایک شام رنبیر دن بھر اِدھر اُدھر گھُوم کر واپس آیا رہا تھا کہ محل کے دروازے پر ایک سادھو دکھائی دیا۔ رنبیر نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ شمبھوناتھ تھا۔

رنبیر نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”شکنتلا کا کچھ پتہ چلا؟“

شمبھوناتھ نے مغموم نگاہوں سے رنبیر کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے اپنا سر ہلا دیا۔

۵

”میرے پِتا کہاں ہیں؟ میرا اور میری ماں کو انجام کیا ہو گا؟“ نرملا ہر وقت ان سوالات کا جواب سوچا کرتی تھی۔ اس کے سامنے تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کبھی کبھی رنبیر کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے

لگتی اور اسے اُمّید کی ہلکی سی روشنی دکھائی دینے لگتی۔ ایک عورت کی ذکاوتِ حس سے وہ رنبیر کے کردار اس کے چہرے پر دیکھ چکی تھی۔ پہلے دن جب وہ ایک اجنبی کی حیثیت سے اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو وہ اسے چور سمجھ کر ڈر گئی تھی لیکن ان غیر متوقع حالات میں بھی رنبیر کے خدوخال اسے یہ اطمینان دِلانے کے لئے کافی تھے کہ وہ چور نہیں۔ پھر جب رنبیر کی باتوں سے اسے یہ اطمینان ہوا کہ وہ موہن چند کا بیٹا ہے تو اس کا اطمینان خوف میں تبدیل ہو گیا تھا اور وہ انتہائی اضطراب کی حالت میں یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی یہ حالات سے بے خبر ہے لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میرا باپ اس کے باپ کا قاتل ہے تو میرا کیا حشر ہو گا۔ لیکن اس موقع پر بھی رنبیر کی صورت دیکھ کر وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ زندگی کے بدترین حادثات سے دوچار ہونے کے بعد بھی یہ نوجوان ایک عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا۔ رنبیر اس کی نگاہ میں ایک شریف اور باوقار دشمن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ گرفتار ہوا اور اس نے اپنے باپ سے رحم کی التجائیں کی تھیں اور جب وہ اسے قتل کرنے کے لیے لے گئے تھے تو وہ اپنی زندگی میں پہلی بار جی بھر کر روئی تھی۔ اسے اپنے باپ کے دشمن

کی موت نہیں بلکہ ایک ایسے مرد کی موت کا افسوس تھا جسے اس نے پہلی بار اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے بعد جب اسے معلوم ہوا کہ وہ فرار ہو چکا ہے تو اپنے باپ کے خوف و اضطراب کے باوجود وہ مسرور تھی۔ جب جے کرشن کے آدمی رنبیر کو تلاش کر رہے تھے تو وہ محل کے ایک کمرے میں بھگوان کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر اس کی سلامتی کے لئے مانگ رہی تھی۔

اگلے دن اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی دعائیں قبول ہو چکی ہیں۔ رنبیر بچ کر نکل گیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے اور وہ چاہتی بھی یہی تھی لیکن رنبیر کا موہوم سا تصوّر اس کے دل پر چند نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ گیا تھا۔ کبھی کبھی یہ نقوش اس کے دل کی گہرائیوں تک جا پہنچتے اور وہ یہ سوچتی، اگر وہ موہن چند کا بیٹا نہ ہوتا اور اس قسم کا حادثہ ہمیں چند لمحات کے لیے ایک دوسرے کے قریب لے آتا تو کیا ہوتا؟ پھر وہ خود ہی اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتی۔

اب وہ رنبیر کے رحم و کرم پر تھی اور یہ محل اس کے لیے ایک وسیع قید

خانہ تھا۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ رنبیر اپنی بہن کے عوض ہمیشہ کے لیے ہمیں قید میں رکھے گا۔ رنبیر کو اس بات کا بھی یقین ہو گا کہ تمہارا باپ ہماری خاطر اس کے پاس ضرور آئے گا اور وہ اپنے باپ کا انتقام لے سکے گا۔ لیکن نرملا کے احساسات اپنی ماں سے مختلف تھے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار تھی کہ اس کے باپ کے لیے رنبیر کے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھی کہ انتقام کے جوش میں وہ اپنے دشمن کی بیوی اور بیٹی کو بھی قابلِ رحم نہیں سمجھے گا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ رنبیر اگر انہیں قابلِ عزّت نہیں تو قابلِ رحم ضرور سمجھتا ہے۔ رنبیر کے طرزِ عمل سے بھی نرملا کے ان خیالات کی تائید ہوتی تھی۔ اس نے دو کمروں کے سوا باقی سارا محل انہیں سونپ رکھا تھا۔ اس کے نوکر ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے اور براہِ راست ان سے ہمکلام ہونے کی بجائے دروازے سے باہر نوکرانیوں کو آواز دے کر پوچھ لیا کرتے کہ گھر میں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ انہیں کھانے پینے کی جو اشیا بھیجی جاتی تھیں وہ ہمیشہ ان کی ضرورت سے وافر ہوتی تھیں۔ محل کے ایک کمرے میں جے کرشن کی دولت کے صندوق بند پڑے تھے اور ان

کو کس نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

یہ تمام حالات نرملا کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے کافی تھے کہ اس کا معاملہ ایک ایسے دشمن کے ساتھ ہے جو انتہائی غضب کی حالت میں بھی شرافت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو گا۔ ایک عورت کی حیثیت میں نرملا رنبیر کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور تھی لیکن جے کرشن کی بیٹی کی حیثیت میں اسے اپنے باپ کے بدترین دشمن کی فتح گوارا نہ تھی۔ ایسے انسان کی قربت کا تصوّر بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا جو اس کے باپ کے ہاتھوں اس درجہ مجروح ہو چکا تھا۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی۔ گوالیار میں اس کے ماموں تھے اور وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ وہاں پہنچ گیا ہو گا۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچتی تھی کہ اگر میں اپنی ماں کے ساتھ وہاں جانے کا ارادہ ظاہر کروں تو رنبیر شاید مجھے روکنے کی کوشش نہ کرے۔ ممکن ہے اس نے اتنے دن ہمیں صرف اس خیال سے یہاں رہنے دیا ہو کہ ہمارا باپ روپوش ہے اور ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔

ایک رات وہ دیر تک سوچتی رہی۔ علی الصبح اس نے ایک نوکرانی کو

زیورات کی تھیلی دے کر رنبیر کے پاس بھیج دیا۔ یہ وہی زیورات تھے جو رنبیر جے کرشن کے گرفتار کرنے سے پہلے نرملا کے پاس چھوڑ گیا تھا۔

نوکرانی رنبیر سے ملاقات کے بعد واپس آئی تو اس نے کہا۔ ”اس نے زیورات لینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ میں نے اصرار کیا تو یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا کہ بھگوان کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔“

نرملا کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ وہ رنبیر کے خیالات کی دنیا سے کوسوں دور ہے۔ جس شخص کے سامنے وہ اپنی نفرت کا مظاہرہ ضروری سمجھتی تھی وہ اس کا وجود تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔

نرملا کی ماں کی حالت اس کی نسبت کہیں زیادہ قابلِ رحم تھی۔ وہ اپنے شوہر کے غم اور اپنی بیٹی کے مستقبل کے فکر میں گھلی جا رہی تھی۔ اسے رنبیر سے کسی نیک سلوک کی توقع تھی۔ رنبیر اس کی نگاہ میں صرف اس کے شوہر کے خون کا پیاسا تھا بلکہ ہندو سماج کا باغی اور اپنے وطن کا دشمن بھی تھا۔ اس کا آخری سہارا صرف یہ یقین تھا کہ جن لوگوں کی مدد سے

رنبیر نے اس کے شوہر پر فتح حاصل کی ہے وہ بالآخر قنوج اور اس کے ہمسایہ راجاؤں کے ہاتھوں شکست کھائیں گے اور اس کا شوہر قنوج کے راجہ کی مدد سے دوبارہ اس گاؤں پر قبضہ کرلے گا۔ وہ صبح شام بھگوان اور اس کے دیوتاؤں کے سامنے مسلمانوں کی شکست کے لیے دعائیں مانگا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ نرملا بھی اپنی ماں کی ہم خیال ہو گئی۔ رنبیر اپنے دھرم کا باغی اور اپنے وطن کا دشمن ہونے کے باعث اس کی نگاہ میں بد ترین سزا کا مستحق بن چکا تھا۔

ایک دن نرملا کی ماں شدید بخار کی حالت میں بستر پر لیٹی نرملا سے کہہ رہی تھی۔ ”بیٹی! مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی فوج کو شکست ہو گی۔ تمہارا باپ راجہ کی فوج لے کر آئے گا لیکن میں شاید موہن چند کے بیٹے کا انجام دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہوں۔“

”نہیں ماتا جی!“ نرملا نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسی باتیں نہ کیجیے۔ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹی تم سمجھتی ہو گی کہ تمہارے باپ نے ہمیں دشمن کے

قبضے میں چھوڑ کر بھاگنے میں بے غیرتی کا ثبوت دیا ہے لیکن تم جانتی ہو کہ وہ اکیلا اتنے آدمیوں سے نہیں لڑ سکتا۔ وہ وقت کا انتظار کر رہا ہو گا۔"

ایک نوکرانی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور کہا۔ "محل سے باہر گاؤں کے آدمی جمع ہو رہے تھے اور رنبیر کے سپاہی گھوڑوں پر زینیں ڈال کر باہر نکل رہے تھے۔ رنبیر کا ایک نوکر کہتا ہے کہ وہ کہیں دور جا رہا ہے۔ علاقے کے کئی سردار بھی اپنی اپنی فوج لے کر اس کے ساتھ جا رہے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آج صبح چند سردار رنبیر کے پاس آئے تھے۔"

نرملا نے کہا۔ "ماتا! معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان نے آپ کی دعائیں سن لی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کو شکست ہو چکی ہے اور رنبیر اب بھاگنا چاہتا ہے اور جن سرداروں نے اسے خوش کرنے کے لیے راجہ کی مدد کے لیے اپنے سپاہی بھیجنے سے انکار کر دیا تھا، وہ بھی اب راجہ کے انتقام کے خوف سے بھاگنے کی فکر میں ہیں۔"

دوسری نوکرانی جو گاؤں کے طبیب سے نرملا کی ماں کے لیے دوائی لینے گئی

تھی ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔ ”آپ نے سن لیا مسلمانوں نے باری پر قبضہ کر لیا ہے اور راجہ بھاگ گیا ہے۔ اب مسلمانوں کی فوج کالنجر پر حملہ کرنے والی ہے اور رنبیر علاقے کے کئ سرداروں کے ساتھ ان کی مدد کے لیے جارہا ہے۔“

نرملا اور اس کی ماں سکتے کے عالم میں خادمہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اچانک ایک نوکرانی چِلاّئی۔ ”نرملا! نرملا! انہیں کچھ ہو گیا ہے۔“

”ماتا! ماتا!“ نرملا اپنی ماں کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے چِلاّئی لیکن آنکھوں کے سوا اس کے جسم کے کسی حصّے میں زندگی کے آثار نہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد شمبھو ناتھ گاؤں کے طبیب کو لے آیا۔ اس نے بتایا کہ مریضہ پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔

دس دن بعد جب نرملا کی ماں اپنی زندگی کا آخری سانس لے رہی تھی تو اس کی نگاہیں اپنی بیٹی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ان نگاہوں میں نرملا کے لیے ایک نہ بھولنے والا پیغام تھا۔ موت کے بعد نرملا ماں کے سینے پر سر رکھ کر یہ کہہ رہی تھی۔ ”ماتا! میں تمہارا انتقام لوں گی۔ میں تمہارے

دشمن کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ مجھے بھگوان کی قسم! مجھے دیوتاؤں کی قسم۔"

ایک اور فتح

کالنجر کا حکمران راجہ گنڈا اپنے تخت پر رونق افروز تھا۔ کالنجر کے با اثر سرداروں کے علاوہ پڑوس کی سلطنتوں کے چند حکمران جو اس کے باجگزار تھے، تخت سے نیچے دائیں اور بائیں دو قطاروں میں حسبِ مراتب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دوسرے درجے کے سردار اور عہدہ دار کرسیوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ عبدالواحد اور غزنی کی فوج کے چار اور افسر تخت کے سامنے کھڑے تھے۔

راجہ کچھ دیر خاموشی سے درباریوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ایک با

وقار انداز میں کہنے لگا۔ ”میں اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ صلح کے لیے دُشمن کی شرائط کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“

پڑوس کے راجاؤں کے ترجمان کی حیثیت سے گوالیار کے راجہ ارجن نے اُٹھ کر جواب دیا۔ ”مہاراج! ہم ان شرائط پر صلح کرنے کی بجائے موت کو ترجیح دیں گئے۔ دشمن صرف ہماری لاشوں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ سکتا ہے۔“

ایک اور راجہ نے اُٹھ کر کہا۔ ”اَن داتا! دشمن نے ایسی شرائط پیش کر کے اس ملک کے کروڑوں انسانوں کی توہین کی ہے۔ اس توہین کا بدلہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہم ملک کا بچّہ بچّہ اس کے راستے میں کھڑا کر دیں اور اسے ایسی شکست دیں کہ وہ دوبارہ اس پوتر دھرتی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔“

چند سرداروں نے یکے بعد دیگرے جنگ کی حمایت میں تقریریں کیں، اُس کے بعد سرداروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اسی قسم کے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ کالنجر کے ایک سردار نے جو راجہ کے بعد سلطنت

میں سب سے زیادہ اثر و رسوخ کا مالک سمجھا جاتا تھا، ایک پُرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ”اَن داتا! دشمن کی اس جرأت کا جواب صرف تلوار ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ آپ کے اشارے کی ضرورت ہے۔ کالنجر کا ہر بچّہ، جوان اور بوڑھا اپنی گردن کٹانے کے لیے تیار ہے۔ جنگ میں ہم ثابت کر دکھائیں گے کہ کالنجر کا خون منجمد نہیں ہوا اور ہم شمال کے راجاؤں کی طرح بے غیرت نہیں، جنہوں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے قومی عزّت اور آن بان قربان کر دی۔ ہماری تلواریں حاضر ہیں۔“

راجہ گنڈا نے کہا۔ ”کیا کوئی ایسا بھی ہے جو ان شرائط کے ماننے کے حق میں ہو؟“

”مہاراج! کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔“ حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا۔

راجہ نے وفد کے ارکان کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم ہمارا جواب سُن چکے ہو۔ ہندوستان کی پوتر دھرتی کے دیوتا تمہارے بادشاہ کے پاپ کا بدلہ لینے کے لیے جس وقت کا انتظار کر رہے تھے وہ آ چکا ہے۔ اب وہ ہمارے دیوتاؤں کے عتاب سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ اُسے جا کر ہماری

طرف سے یہ پیغام دو کہ موت اس کا انتظار کر رہی ہے اور ہماری تلواریں اپنے دیوتاؤں کی توہین کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہیں۔" عبدالواحد نے اپنے ساتھیوں کو فارسی زبان میں راجہ کے الفاظ کا مفہوم سمجھایا اور پھر راجہ کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔"میں آخری بار یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر قنوج کے مہاراج تدبّر سے کام لیں تو اَن گنت انسانوں کو بلا وجہ ہلاک ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ ریت کے بند دریاؤں کے سیلاب نہیں روک سکتے۔ تم عنقریب وہ طوفان دیکھو گے جو اپنے راستے کی ہر شے کو تنکوں کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ تم اس شخص کی راہ میں الفاظ کی دیواریں کھڑی نہیں کر سکتے جو اژدھوں کی گردنیں مروڑنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ تمہارے دیوتا وہ بھاری پتھر ہیں جن کے بوجھ کے نیچے انسانیت صدیوں سے پِس رہی ہے۔ یہ پتھر اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ وہ آئے گا اور ان گنت مظلوموں اور بے گناہوں کی بھٹکتی ہوئی روحیں اس کا استقبال کریں گی۔ صدیوں کی روندی اور پسی ہوئی انسانیت اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گی۔ جو اس کا ساتھ دے گا سرخرو ہو گا اور جو اس کا راستہ روکیں گے، کانٹوں کی طرح مسل دیے جائیں

گے۔“

حاضرین کے پُرخلوص احتجاج نے عبدالواحد کو اپنی تقریر ختم کرنے کا موقع دیا۔ چند سردار تلوار سونت کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ راجہ نے بلند آواز سے کہا۔ ”ٹھہرو!“ اور محفل پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔

راجہ نے قدرے توقّف کے بعد عبدالواحد کی طرف متوجہ ہو کت کہا۔ ”تم ایک ایلچی کی حدود سے تجاوز کر چکے ہو۔ جاؤ یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔“

عبدالواحد کُچھ کہے بغیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ باہر نکل گیا۔

۲

راجہ گنڈا نے کھلے میدان میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی نیّت سے اپنی راجدھانی سے چند کوس دور شمال کی طرف پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کی فوج ایک لاکھ پینتالیس ہزار پیادہ سپاہیوں، تیس ہزار سواروں اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ سلطان محمود نے دریائے جمنا عبور کر کے اپنے لشکر کو دشمن کے پڑاؤ سے پانچ کوس دور قیام کا حکم دیا۔

دشمن کی فوجی طاقت کے متعلق اپنے جاسوسوں کی اطلاعات سننے کے بعد سلطان نے ایک عام سپاہی کے بھیس میں اپنے چند افسروں کے ہمراہ دشمن کے پڑاؤ کا رُخ کیا۔ غروبِ آفتاب سے کچھ دیر قبل مغرب کی جانب ایک طویل چکر کاٹنے کے بعد وہ دور سے دشمن کے پڑاؤ کا منظر دیکھ رہا تھا۔ دشمن کی فوج کے خیمے میلوں تک پھیلے ہوئے تھے اور مختلف اطراف سے راج گنڈا کے باجگزار راجاؤں اور سرداروں کی افواج پڑاؤ میں داخل ہو رہی تھیں۔ سلطان نے اس سے زیادہ حوصلہ شکن منظر اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور اسے پہلی بار اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ غزنی سے بہت دور آ چکا ہے۔ کسی نازک مرحلے پر اُسے کمک پہنچنے کی امید نہ تھی۔ شکست یا پسپائی کی صورت اس کے لشکر کی مکمل تباہی یقینی تھی۔

غروب آفتاب کے ساتھ پڑاؤ کے طول و عرض میں ہاتھیوں کی چنگھاڑ، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور آدمیوں کی چیخ و پکار، ناقوس اور گھنٹیوں کی صداؤں میں دب کر رہ گئی۔ سلطان نے اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہوں نے ایک جگہ اُتر کر نمازِ مغرب ادا کی اور دوبارہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے خیموں میں آگئے۔

رات کے تیسرے پہر سلطان اپنے خیمے میں سر بسجود ہو کر یہ دُعا مانگ رہا تھا۔ ”رب العزّت! مجھے اس امتحان میں ثابت قدم رہنے کی ہمّت دے۔ دشمن کو اپنی بے شمار فوج اور اپنے ان گنت دیوتاؤں کی اعانت پر بھروسہ ہے لیکن میں صرف تیری رحمت کا سہارا لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے اور میرے سپاہیوں کو ہمّت دے کہ ہم اپنے آپ کو تیری رحمت کا حق دار ثابت کر سکیں۔ ہمیں ہمّت دے کہ ہم دشمن کے تیروں اور نیزوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے اور ہمیں اپنے غازیوں اور اپنے شہیدوں کے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔ ہم زندگی اور موت میں صرف تیری رضا کے طلب گار ہوں۔ مولائے کریم! جن لوگوں کے سر تیری بارگاہ میں جھکتے ہیں وہ کسی اور کے جاہ و جلال سے مرعوب نہ ہوں۔ ہمیں صرف ایسی زندگی اور ایسی موت کی تمنّا دے جو تیرے حبیب کے غلاموں کی شان کے شایان ہو۔“

دُعا کے اختتام پر سلطان کے منہ سے الفاظ کی بجائے صرف ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اچانک اُسے اپنے پڑاؤ کے ایک گوشے میں پہریداروں کا شور و غوغا سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی پڑاؤ کے طول و عرض میں نقّاروں کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ سلطان نے دُعا ختم کی اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ فوج کے چند افسر خیمے کے دروازے سے باہر کھڑے تھے اور باقی اپنے اپنے دستوں کو کسی غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیّار کر رہے تھے۔

سلطان نے اس ہنگامے کی وجہ پوچھی تو ایک افسر نے جواب دیا۔ سلطانِ معظّم پڑاؤ کے شمال مشرقی کونے میں پہریداروں نے اچانک شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ فوج ہر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن اب نقّارے کی صدا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طرف دشمن کے شب خون کا خطرہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جاسوس پکڑا گیا ہے۔ ابھی تمام حالات معلوم ہو جائیں گے۔"

سلطان نے حکم دیا۔ "میرا گھوڑا لاؤ۔" تھوڑی دیر کے بعد سلطان چند

افسروں کے ہمراہ پڑاؤ کے جنوب مشرقی کونے کا رُخ کر رہا تھا۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ سامنے سے چند مشعل بردار پہریداروں کی ایک ٹولی آتی ہوئی دکھائی دی۔ سلطان کے ساتھیوں میں سے ایک سوار گھوڑا بھگا کو ان کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا۔ "ٹھہرو!"

پہریدار رُک گئے اور ان کے ایک ساتھی نے کہا۔ "ہم سلطانِ معظّم کے پاس جا رہے ہیں۔"

"سلطانِ معظّم یہاں ہیں۔" سلطان کے ایک اور ساتھی نے چند قدم سے آواز دی۔ پہریدار ایک نوجوان کو سلطان کے پاس لے آئے اور اس نے آگے بڑھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "سلطانِ معظّم! میرا نام رنبیر ہے۔ آپ کی فوج کا ہندی سالار عبدالواحد مجھے جانتا ہے۔ رہت کی لڑائی کے بعد مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔"

سلطان نے گھوڑا بڑھاتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

”عالی جاہ! میرے ساتھ میرے وطن کے پندرہ سردار دو ہزار سپاہی لے کر آپ کی مدد کے لیے آ رہے تھے۔ شام کے وقت ہم لوگ یہاں سے مشرق کی طرف کوئی دس کوس کے فاصلے پر جنگل عبور کر رہے تھے کہ ہمیں ایک جگہ گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو شمال کی طرف ہٹنے کا مشورہ دیا اور خود اس طرف چل دیا۔ گھنے جنگل میں کالنجر کی فوج کے کئی دستے ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا گھوڑا ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ان کے ساتھ جا ملا۔ وہاں سپاہیوں کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ مشرق کی طرف سے جنگل کے راستے ایک لمبا چکر کاٹ کر آپ کے پڑاؤ پر حملہ کرنے کی نیّت سے یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ سپاہیوں کی باتوں سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر پیش قدمی کریں گے۔ پھر سواروں کے دستے کچھ دُور رُک جائیں گے اور پیادہ سپاہی پڑاؤ کے نزدیک پہنچ جائیں گے۔ صبح ہوتے ہی وہ پڑاؤ پر حملہ کر دیں گے۔ سواروں کے دستے ان کی مدد کریں گے۔ اس کے بعد کالنجر کی فوج عام حملہ شروع کر دے گی۔ میں وہاں سے بھاگ کر اپنے ساتھیوں کے پاس

پہنچا اور انہیں دشمن کے ان دستوں کے عقب میں رہنے کا مشورہ دیا۔ پھر آپ کی فوج کے پڑاؤ کا رُخ کیا۔ میرا کچھ وقت آپ کے پہرے داروں کو یہ یقین دلانے میں بھی ضائع ہوا ہے کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔"

سلطان نے سوال کیا۔ "ان کی تعداد کے متعلّق تمہارا اندازہ کیا ہے؟"

"میرے خیال میں وہ بیس ہزار سے زیادہ ہوں گے۔ سواروں کی تعداد کوئی چار ہزار ہو گی، باقی پیادہ ہیں۔" رنبیر نے جواب دیا۔

اتنی دیر میں سلطان کی فوج کے چیدہ چیدہ افسر وہاں جمع ہو چکے تھے۔ سلطان نے اپنے ہراول دستوں کے نامور جرنیل ابو عبداللہ محمد کو حکم دیا کہ تم آٹھ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

اس کے بعد اس نے فوج کے باقی افسروں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "مجھے اُمّید ہے کہ راجہ صبح سے پہلے اپنا ارادہ تبدیل کر دے گا۔ تاہم تم لوگ مدافعت کے لئے تیّار ہو۔ اگر دشمن نے ہم پر حملہ نہ کیا تو ابو عبداللہ کی کامیابی کے بعد ہم دشمن کی سراسیمگی سے فائدہ اٹھائیں گے۔ عبدالواحد تم

چند ہوشیار آدمی لے کر دشمن کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور ہمیں اس کی نقل و حرکت سے باخبر رکھو۔"

تھوڑی دیر بعد ابو عبد اللہ کی قیادت میں پانچ ہزار سوار اور تین ہزار پیادہ سپاہی مشرق کا رُخ کر رہے تھے۔ رنبیر ان کا رہبر تھا۔ چند کوس چلنے کے بعد رنبیر نے ابو عبد اللہ سے کہا۔ "میرے خیال میں اب دشمن زیادہ دور نہیں ہو گا۔"

ابو عبد اللہ نے فوج کو رکنے کا حکم دیا اور پیادہ سپاہیوں کے سالار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم احتیاط کے ساتھ پیش قدمی جاری رکھو۔ ہم دشمن کو دائیں اور بائیں بازو سے گھیرے میں لینے کے بعد اس کے عقب میں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اگر رنبیر کا اندازہ صحیح نکلا تو دشمن طلوعِ سحر سے قبل تمہارے تیروں کی زد میں ہو گا اور ہم اُسے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے ہانک رہے ہوں گے۔ اگر دشمن نے تمہاری صفوں کو توڑ کر نکلنے کی کوشش کی تو سواروں کے چند دستے تمہاری مدد کے لیے پہنچ جائیں گے۔"

۳

افق مشرق سے صبح کا ستارہ نمودار ہو رہا تھا۔ راجہ گنڈا اپنے ہاتھی کے سنہری ہودج میں کھڑا اپنی سپاہ کی قوّت و شوکت کا نظّارہ کر رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور اس کے پیچھے گھڑ سواروں اور ہاتھیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ اور پیادہ سپاہی صفیں باندھے کھڑے تھے۔ ناقوس بجانے اور بھجن گانے والے برہمنوں کی ٹولیاں سپاہیوں کی صفوں میں گھوم رہی تھیں۔ فضا میں ''بھگوان کی جے، دیوتاؤں کی جے، مہاراجہ کی جے'' کے نعرے گونج رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی ساری مدافعت سمٹ کر اس خطّۂ زمین پر جمع ہو گئی ہے۔ راجہ نے اپنے اُن باجگزار حکمرانوں کی طرف دیکھا جو ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے اور بلند آواز میں چلّایا۔ ''بھگوان کی قسم! اس لشکر کے ساتھ میں دنیا کے آخری گوشے تک دشمن کا پیچھا کر سکتا ہوں۔''

''مہاراج کی جے ہو۔'' راجہ کے جانثاروں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ایک سردار گھوڑا دوڑاتا مہاراجہ کے قریب رُلا اور بولا۔ ''مہاراج! آگیا دیجیے۔

اب صبح ہونے والی ہے۔"

راجہ نے جواب دیا۔ "نہیں، جب تک راج کمار کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آتی، ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس کے حملے سے پہلے دشمن کو چوکنّا کر دینا ہمارے لئے نقصان دہ ہو گا۔ ہم اس وقت پہنچیں گے جب راجکمار دشمن کی ساری توجّہ اپنی طرف پھیر چکا ہو گا۔"

راجہ کے قریب ایک سردار جو اپنے ہاتھی کے ہودے میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں چلّایا۔ "مہاراج! ادھر دیکھیے۔ شاید کوئی راج کمار کا پیغام لے کر آرہا ہے۔"

راجہ دم بخود ہو کر سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ صبح کے دُھندلکے میں کچھ فاصلے پر سرپٹ سواروں کی ایک ٹولی دکھائی دی۔ تھوڑی دیر میں ایک سوار ہاتھیوں کی قطار کے سامنے سے گزرتا ہوا راجہ کے سامنے رُکا۔ یہ کالنجر کا ولی عہد تھا اور راجہ گنڈا اسے دیکھتے ہی کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

"کیا ہوا؟ تم خود کیوں آگئے۔ تمہاری فوج کہاں ہے؟ بھگوان کے لیے کچھ

تو بولو۔۔۔"

"مہاراج!" راجکمار نے اپنے باپ کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! دشمن نے ہمیں جنگل سے نکلتے ہی گھیرے میں لے لیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ تمام علاقہ اس کے آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے بہت کم آدمی زندہ بچ کر نکل سکیں گے۔ دشمن نے پہلے ہمارے دائیں اور بائیں حملہ کیا۔ ہم پیچھے ہٹ کر دوبارہ جنگل میں داخل ہونے پر مجبور ہو گئے لیکن جنگل کا یہ حصّہ دشمن کے آدمیوں سے بھر چکا تھا۔ اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو سامنے دشمن کے تیر اندازوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ اگر آپ کو خبر دار کرنا ضروری نہ ہوتا تو میں دشمن کا گھیرا توڑ کر باہر نکلنے کی بجائے لڑ کر جان دینا بہتر سمجھتا۔ ہمارے آدمیوں کو دشمن مکمل طور پر نرغے میں لے چکا ہے اور صبح کی روشنی کے ساتھ ہی وہ ان کا صفایا کر دے گا۔ اب تک شاید۔۔۔"

راجہ نے ولی عہد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن کا پڑاؤ خالی ہو گا اور ہمیں کسی تاخیر کے بغیر حملہ کر دینا چاہیے"

ولی عہد نے کہا۔ ”نہیں میں دشمن کے نرغے سے نکل کر اس کے لشکر کے پڑاؤ کے قریب سے گزرا ہوں۔ پڑاؤ میں اس کی فوج اطمینان سے صفیں درست کر رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پیش قدمی کے لیے صبح کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ فوج جس نے ہم پر حملہ کیا تھا کسی اور سمت سے آئی تھی۔ ممکن ہے یہ دشمن کی کمک کے دستے ہوں جنہوں نے اپنے پڑاؤ کا رُخ کرتے ہوئے ہمیں راستے میں دیکھ لیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن ہمیں دھوکے میں رکھنے کے لیے اپنی فوج کا بیشتر حصّہ کہیں پیچھے چھوڑ آیا ہو۔ بہر حال یہ یقینی امر ہے کہ دشمن کی تعداد ہماری توقع سے زیادہ ثابت ہوگی۔“

راجہ گنڈا کے تمام حوصلے اور ولولے مایوسی اور خوف میں تبدیل ہو گئے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ فتح کے خیال میں مگن تھا لیکن اب تصوّر میں دشمن کی لاتعداد فوج دیکھ کر سراسیمہ ہو رہا تھا۔ اس کی قوّتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی۔

”اب ہمیں کرنا چاہیے۔“ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

راج کمار نے جواب دیا۔ ”مہاراج! ہمیں آگے بڑھنے کی بجائے اپنی حفاظت کی فکر کرنی چاہیے۔“

ایک سردار جو اپنے ہاتھی سے اتر کر راجہ کے قریب آ چکا تھا، ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ”مہاراج اگر ہمیں پسپا ہونا پڑا تو دشمن کے سوار آندھی کی طرح ہماری راجدھانی میں داخل ہو جائیں گے۔ اسی لیے ہمیں راجدھانی کی فکر کرنی چاہیے۔“

تھوڑی دیر میں ہمسایہ ریاستوں کے حکمران اور سردار بھی راجہ گنڈا کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ بعض فوری حملے کے حامی تھے لیکن اکثریت کی رائے یہ تھی کہ جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اچانک سامنے سے تیس چالیس سوار نمودار ہوئے اور کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر رُک کر چند ثانیے راجہ کی طرف دیکھنے کے بعد واپس چلے گئے۔

ایک سردار نے کہا۔ ”مہاراج! دشمن حملہ کرنے والا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فوج قریب آ چکی ہے۔ آپ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔“

راجہ گنڈا قدرے ردّ و قدح کے بعد ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ فوج کے چیدہ چیدہ سرداروں نے اس کی تقلید کی۔ ایک ساعت کے اندر اندر فوج میں افراتفری مچ گئی۔ ناقوس اور نرسنگوں کی صدائیں انسانوں کی چیخ و پکار میں دب کر رہ گئیں، راجہ کی ٹڈی دل فوج انتہائی انتشار کی حالت میں پسپا ہو رہی تھی۔ ہر سپاہی کے دل پر تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی سنسناہٹ کے خوف سے کہیں زیادہ ان دیکھے دشمن کا خوف طاری تھا۔

طلوعِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد سلطان محمود اس مقام سے پانچ کوس دور اپنے خیمے کے سامنے کھڑا تحیّر کے عالم میں خبر سن رہا تھا کہ دشمن میدان سے فرار ہو چکا ہے۔ ذاتِ باری کے لیے ہونٹوں پر دُعائیں اور آنکھوں میں تشکّر کے آنسو تھے۔ فوج کی قیام گاہ کے طول و عرض میں اللہ اکبر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ سلطان نے فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا اور دوپہر تک دشمن کا تعاقب جاری رکھا۔ اس کے بعد وہ اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹ آیا۔ شام تک پانچ سو ہاتھی سلطان کے قبضے میں آچکے تھے۔

اس فتح کے چند دن بعد سلطان کا لشکر واپس غزنی کا رُخ کر رہا تھا۔ رنبیر اور علاقے کے وہ سردار جو اس کے ساتھ آئے تھے، سلطان کے ہم رکاب تھے۔ سلطان نے عبدالواحد کو حکم دیا کہ ہندی سپاہیوں کے ساتھ قنوج چلے جاؤ اور میری واپسی تک وہیں رہو۔

جے کرشن کی بیٹی

اپنی ماں کی موت کے بعد نرملا محل میں انتہائی بے بسی کے دن گزار رہی تھی۔ رنبیر کے لیے اس کے دل میں اب نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ رنبیر کی غیر حاضری کے دوران میں اس کی نگرانی شمبھوناتھ کے سپرد تھی اور شمبھوناتھ کے سلوک نے اس پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ اس کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں۔ اسے پہلی بار صرف اپنی ماں کی ارتھی کے ساتھ مرگھٹ تک جانے کے لئے محل سے باہر نکلنے کی اجازت دی گئی تھی لیکن وہاں بھی شمبھوناتھ اور چند نوکر اس کے پاس کھڑے رہے۔ اس کے بعد بھی اسے کبھی کبھی رنبیر کے نوکروں کے پہرے میں

ماں کی سمادھی تک جانے کی اجازت ملتی تھی اور خاص طور پر شمبھوناتھ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ان پابندیوں نے اس کے دل میں فرار ہونے کی خواہش پیدا کر دی۔ چنانچہ ایک دن علی الصبح وہ اپنی نوکرانی کا لباس پہن کر گھونگھٹ نکالے مکان سے باہر نکلی لیکن شمبھوناتھ نے اس کی چال دیکھ کر پہچان لیا اور آگے بڑھ کر راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟“

اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”میں۔۔۔ میں نرملا کے لیے دوا لینے جا رہی ہوں۔ اسے بخار ہے۔“

شمبھوناتھ نے جواب دیا۔ ”آپ تکلیف نہ کریں۔ میں وید کو بلاتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”گاؤں میں مجھے ایک اور کام بھی ہے۔“

شمبھوناتھ نے کہا۔ ”آپ مجھے گستاخی پر مجبور نہ کریں۔ میں جانتا ہوں آپ کون ہیں۔“

نرملا نے تلملا کر گھونگھٹ اتار دیا اور غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہاری قید میں ہوں۔“

شمبھوناتھ نے جواب دیا۔ ”جب تک ہمارا سردار واپس نہیں آتا آپ تنہا اس محل سے باہر نہیں جا سکتیں۔ وہ مجھے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ کر گیا ہے۔“

”میری حفاظت!“ نرملا نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ اپنی ماں کی طرح مجھے بھی صرف موت ہی اس قید خانے سے رہائی دلا سکتی ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ کسی دن تمہارا سردار پچھتائے گا۔“

شمبھوناتھ نے کہا۔ ”جب وہ یہاں تھے تو آپ نے کبھی یہاں سے جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ آپ اپنی خوشی سے یہاں رہنا چاہتی ہیں۔ اگر انہیں یہ بتا دیتیں کہ آپ کہیں جانا چاہتی ہیں تو وہ کبھی آپ کو روکنے کی کوشش نہ کرتے۔ لیکن اب ان کی غیر حاضری میں ہم آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“

”میں اپنے باپ کے دشمن، اپنی ماں کے قتل اور اپنی قوم اور اپنے وطن

کے دشمنوں کے دوست کو اپنا محافظ سمجھنے کی بجائے مر جانا بہتر سمجھتی ہوں۔“

شمبھوناتھ نے کہا۔ ”میں آپ کی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ سردار کی طرف سے ہمیں حکم ہے کہ آپ کی عزّت کی جائے۔“

نرملا کچھ کہے بغیر واپس چلی آئی لیکن وہ اپنے دل میں بار بار یہ الفاظ دہرا رہی تھی۔ ”تم پچھتاؤ گے۔ رنبیر کو میرے انتقام سے ڈرنا چاہیے۔ میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

۲

ایک دن نرملا کی نوکرانی اس کے پاس خبر لے کر آئی کہ گاؤں کے لوگ جو رنبیر کے ساتھ گئے تھے، واپس آ گئے ہیں۔ سلطان محمود کی فوج یہاں سے تین کوس دور پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ واپس آنے والے سپاہی بتاتے ہیں کہ سلطان نے رنبیر کے ساتھ کالنجر کے راجہ کے خلاف جنگ میں حصّہ لینے والے تمام سرداروں میں خلعتیں تقسیم کی ہیں اور سلطان کے

سامنے علاقے کے تمام سرداروں نے رنبیر کو اپنا بڑا سردار مان لیا ہے۔ مسلمانوں کا لشکر کل روانہ ہو جائے گا اور رنبیر انہیں رخصت کرنے کے بعد یہاں آ جائے گا۔ سپاہی کہتے ہیں کہ سلطان کی فوج اس گاؤں کے قریب سے گزرے گی۔"

اگلے دن نرملا اپنی نوکرانیوں سمیت بالائی منزل کی چھت سے مسلمانوں کا لشکر گزرتا دیکھ رہی تھی۔

دوپہر کے قریب نرملا کے پاس شمبھوناتھ آیا اور اس نے کہا۔ "مجھے سردار نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہیں آپ کی ماتا جی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو وہ ابھی آپ کے پاس آ جائیں۔"

نرملا نے جواب دیا۔ "اسے ایک قیدی کے پاس آنے کے لئے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔" شمبھوناتھ چلا گیا تو نرملا نے اپنی نوکریوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "وہ آئے تو اسے میرے کمرے میں بھیج دو اور دیکھو جب تک میں آواز نہ دوں، تم میں سے کوئی وہاں نہ آئے۔"

نرملا اپنے کمرے میں جا کر ایک کونے میں پڑا ہوا صندوق کھولا اور ایک چمکتا ہوا خنجر نکال کر اپنی قمیص میں چھپا لیا۔ اس کے بعد وہ اضطراب کی حالت میں کمرے کے اندر ٹہلنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سن کر اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ جلدی سے اپنے پلنگ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ رنبیر اندر داخل ہوا تو اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی نرملا نے اپنے جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی۔ رنبیر کمرے کے درمیان رکا اور ایک ثانیہ نرملا کی طرف دیکھنے کے بعد آنکھیں نیچی کر کے بولا۔ ”میں نے ابھی آپ کی ماں کے متعلّق سنا ہے۔ مجھے بُہت افسوس ہے۔“

نرملا نے کوئی جواب نہ دیا۔ رنبیر نے ایک ثانیہ کے لیے پھر اس کی طرف دیکھا اور اضطراری حالت میں آگے بڑھ کر باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ قدرے توقّف کے بعد اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو شاید میری بات پر یقین نہ آئے لیکن اگر میں یہاں ہوتا تو ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ میں آپ کے

باپ کو معاف نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک عورت کے ساتھ مجھے کوئی دشمنی نہ تھی۔"

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔" نرملا نے ذرا آگے بڑھ کہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

رنبیر نے اس کی طرف مُڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ "یہ مکان میری نگاہ میں ایک مندر ہے اور یہاں کسی کی موت بھی میرے لیے تکلیف دہ ہے۔" نرملا نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کمرے میں آپ کی بہن رہا کرتی تھی۔"

"ہاں!" رنبیر نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اس رات میں یہی سمجھ کر اس کمرے میں داخل ہوا تھا کہ شکنتلا یہاں ہے۔ نندنہ میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ میرے انتظار میں رات بھر اپنے کمرے میں دِیا روشن کرتی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ جب وہ یہاں نہ تھی تو آپ کو دِیا جلانے کا خیال کیسے آیا۔ میں نے گاؤں کے لوگوں سے سنا ہے کہ شکنتلا کے روپوش ہونے کے بعد یہ کمرہ ساری رات روشن رہتا تھا۔ آپ نے شاید

شکنتلا کو دیکھا بھی نہ ہو گا لیکن اگر آپ اسے ایک بار دیکھ لیتیں تو مجھے اس کی خاطر اس سماج کے خلاف تلوار اٹھانے میں حق بجانب سمجھیں۔ کاش مجھے کوئی یہ بتا سکے کہ شکنتلا کہاں ہے؟"

رنبیر نرملا کی طرف دیکھے بغیر بولتا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اس درخت پر مرکوز تھیں جس سے وہ بچپن میں اس کمرے تک پہنچنے کے لیے سیڑھی کا کام لیا کرتا۔ وہ اس بات سے غافل نہ تھا کہ نرملا اس کے بہت قریب آ چکی ہے لیکن یہ احساس کہ وہ شکنتلا کا بھائی، موہن چند کا بیٹا ہے، اس کا نگاہوں کے سامنے دیوار بن کر حائل ہو چکا تھا۔ غیرت اس کی آنکھوں کے سامنے پہرا بٹھا چکی تھی۔ شکنتلا کے متعلّق بڑھتی ہوئی مایوسی نے اسے تنکوں کا سہارا بنا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نرملا ضرور شکنتلا کے متعلق جانتی ہے۔ چنانچہ آج وہ یہ اُمّید لے کر آیا تھا کہ شاید نرملا کا دل پسیج جائے اور وہ شکنتلا کے بارے میں کچھ بتا دے۔

نرملا نے رنبیر کی گفتگو کے دوران میں دو دفعہ وار کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا لیکن ہر دفعہ اس کی ہمّت جواب دے گئی۔ اس نے تیسری دفعہ ہاتھ بلند

کیا تو رنبیر نے اچانک مُڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نرملا کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ رنبیر نے جھک کر خنجر اُٹھالیا اور نرملا کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے قتل نہیں کر سکیں۔“

نرملا بھاگ کر منہ کے بل اپنے بستر پر گر پڑی اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”کاش میں آپ کو قتل کر سکتی۔ کاش میں آپ کو اپنا دشمن سمجھ سکتی۔“

رنبیر نے آگے بڑھ کہ اس کا بازو پکڑ کر اُٹھانا چاہا لیکن اس کا لرزتا ہوا ہاتھ نرملا کے بازو تک پہنچ کر رُک گیا۔ ایک جھرجھری لینے کے بعد اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”شمبھوناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کہیں جانا چاہتی تھیں، میں آپ کی یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ آپ میری قید میں ہیں۔ اگر آپ کو یہاں رہنا پسند نہ ہو تو آپ جا سکتی ہیں۔ سنا ہے کہ آپ کے رشتہ دار گوالیار میں ہیں۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو میں آپ کو وہاں پہنچانے کا بندوبست کر دوں۔ شکنتلا کا بھائی کسی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ میں پہلی اور آخری بار آپ سے اپنی بہن کے متعلّق پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے تھوڑی بہت ہمدردی کا مستحق سمجھیں تو مجھے اس

کے بارے میں بتادیں ورنہ میں آپ کو جواب دینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شکنتلا کہاں ہے؟ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے؟"

نرملا اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر مجھے شکنتلا کے متعلّق معلوم ہوتا تو میں آپ کو پوچھے بغیر بتا دیتی۔ آپ میری بات پر یقین نہیں کریں لیکن بھگوان جانتا ہے کہ اس سے متعلق میرے پِتا کو بھی کوئی علم نہیں۔ پِتا جی نے اُسے ہر جگہ تلاش کرایا لیکن اس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ جھوٹ نہیں کہہ سکتیں۔ میں آپ سے آیندہ ہرگز یہ سوال نہیں کروں گا۔ لیکن کیا یہ محض اتّفاق تھا کہ آپ شکنتلا کے روپوش ہو جانے کے بعد بھی یہ کمرہ رات بھر روشن رہتا تھا؟ کیا آپ کو یہ معلوم تھا کہ محل میں داخل ہوتے ہی میں سیدھا اس کمرے میں آؤں گا؟ آپ کی ایک نوکرانی بھی کہتی تھی کہ اس محل میں آنے کے بعد آپ نے کسی رات انہیں اس کمرے کا دِیا بجھانے کی اجازت نہیں دی۔"

نرملا نے جواب دیا۔ ”یہ محض اتفاق نہ تھا۔ مجھے گاؤں کی عورتوں نے بتایا تھا کہ رات کے وقت شکنتلا کے کمرے میں لکشمی دیوی آیا کرتی تھی اور وہ اس کے انتظار میں ہر رات اپنا کمرہ روشن رکھتی تھی۔ چنانچہ میں نے بھی رہنے کے لیے اسی کمرے کو پسند کیا اور سوتے وقت بھی اسے روشن رکھتی تھی۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے کمرے کی روشنی کسی دن آپ کو دھوکا دے گی۔ میں سچ کہتی ہوں میں نے شکنتلا کو نہیں دیکھا۔ میں اس کے روپوش ہونے کے چند دن بعد یہاں آئی تھی۔ اگر میں اسے دیکھ لیتی تو پتا جی کی ناراضی کا خوف بھی مجھے اس کی حمایت سے باز نہ رکھ سکتا۔ لیکن مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اس کے کسی کام نہ آ سکی۔ میں آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں کہہ رہی بلکہ یہ ایک عورت کے متعلق ایک عورت کے جذبات ہیں۔ میں اپنے باپ کے دشمن سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ اگر مجھ سے اپنی بہن کا بدلہ لے کر آپ کو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے تو میں حاضر ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ میں جے کرشن کی بیٹی ہوں اور آپ موہن چند کے بیٹے ہیں۔ ابھی اگر میری ہمّت جواب نہ دے جاتی تو میں آپ کو قتل کر دیتی۔

شکنتلا سے ہمدردی کے باوجود آپ کو قتل کرنا میرا فرض تھا۔ آپ کو بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔“

رنبیر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس میں نرملا کی طرف آنکھ اُٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ اس کے سامنے صرف ایک لڑکی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جس کا ہلکا سا تبسّم پتھر کی بے جان چٹانوں میں بھی نغمے بیدار کر سکتا تھا۔ جس کے آنسو ایک جلّاد کے سینے میں بھی دھڑکنیں پیدا کر سکتے تھے۔ جے کرشن کی بیٹی التجا کرنے کے یہ نہیں حکم دینے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔“ رنبیر نے کہا۔ ”شاید ہم دونوں عمر بھر اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ ان یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ آپ کب اور کہاں جانا چاہتی ہیں؟“

”میں اسی وقت جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”کہاں؟“

”گوالیار، اپنے ماموں کے پاس۔“

”آپ کے پِتاجی وہاں ہوں گے؟“

”شاید۔“

”اب شام ہونے کو ہے۔ میں علی الصبح آپ کو یہاں سے روانہ کر دوں گا۔ شمبھوناتھ آپ کے ہمراہ جائے گا۔“ رنبیر یہ کہہ کر باہر نکل آیا۔

۳

رات کو رنبیر دیر تک کھلے صحن میں ٹہلتا رہا۔ آدھی رات کے قریب اس نے اپنے کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہ آئی۔ نرملا کا تصوّر اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکا تھا۔ تیسرے پہر اس نے دوسرے کمرے میں جا کر رام ناتھ کو جگایا اور اسے ساتھ لے کر دریا کی طرف چلا گیا۔ شام کو اس نے رام ناتھ کو بتایا تھا کہ نرملا علی الصبح گوالیار جا رہی ہے اور وہ رخصت کے وقت اس سے دور رہنا چاہتا ہے۔ رام ناتھ اس کے چہرے سے اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا چکا تھا۔

وہ خاموشی سے کچھ دور تک دریا کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ رام ناتھ نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔“ رنبیر نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اس کی طرف غور سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ نرملا صرف ایک عورت نہیں، بلکہ توڑنے پھوڑتے اور بہا لے جانے والی قوّت کا نام ہے۔ دیکھنے والے کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہونے کی بجائے اِدھر اُدھر بھٹک جاتی ہیں۔ رام ناتھ! تم ایک شاعر ہو اور شاید ان باتوں کو میری نسبت زیادہ سمجھ سکو۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”اگر وہ جے کرشن کی بیٹی نہ ہوتی تو آپ کیا کرتے؟“

”مجھے معلوم نہیں۔ شاید میرے لیے اس کا جانا تکلیف دہ ہوتا۔“

”آپ کو یقین ہے کہ اب اس کا جانا آپ کے لیے تکلیف دہ نہیں۔ آپ ساری رات نہیں سوئے اور اب بھی آپ کا محل سے دور چلے آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ میں ایک تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمّت نہیں۔“

”میں نے کل ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اسے دوبارہ نہیں دیکھوں گا۔“

”اور آپ اپنے اس فیصلے پر قائم رہنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں مجھے یقین ہے کہ اگر میں کم ہمتی کا ثبوت دوں تو بھی ہمارے راستے ایک دوسرے سے کبھی نہیں مل سکتے۔“

رام ناتھ نے سوال کیا۔ ”وہ آپ کے متعلّق کیا خیال کرتی ہے؟“

”میں تمہیں بتانا بھول گیا، اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”پھر تو اس کی حالت آپ کی نسبت زیادہ قابلِ رحم ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔“

”تم سچ مچ شاعر ہو۔ اب کوئی اور بات کرو۔“

طلوعِ آفتاب کے وقت رنبیر واپس گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ نرملا جا چکی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا تو کسی نے اندرونی

صحن میں کھلنے والے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" رنبیر نے کہا۔

نرملا کی ایک خادمہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ اس نے کہا۔ "یہ تھیلی مجھے نرملا دے گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کے پاس پہنچادوں۔ اس میں وہی زیور ہیں جنہیں آپ نے اس دن واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔"

رنبیر نے کہا۔ "تم نے اس سے کیوں لیے؟"

"میں نے اسے کہا تھا کہ آپ خفا ہوں گے لیکن وہ پھینک کر چلی گئی۔"

"بہت اچھا، اسے اپنے پاس رکھو۔"

نوکرانی نے کہا۔ "اور ہمارے متعلّق آپ کا کیا حکم ہے؟"

"کیسا حکم؟"

"ہمارے یہاں رہنے کے متعلّق۔"

”اگر تم یہاں رہنا چاہو تو مجھے خوشی ہو گی۔“

خادمہ دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

نئی منازل

چند دن بعد دوپہر کے وقت رنبیر اور رام ناتھ محل کے بیرونی صحن میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ رام ناتھ ہلکے ہلکے سُروں میں گارہا تھا۔

رنبیر نے کہا۔ "رام ناتھ! ذرا بُلند آواز میں گاؤ۔"

رام ناتھ نے جواب دیا۔ "گانا کیسا، اب تو آواز گلے سے باہر ہی نہیں نکلتی۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر رنبیر نے کہا۔ ”رام ناتھ! میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں رہو اور میں سومنات ہو آؤں۔“

”آپ تنہا وہاں جا کر کیا کریں گے؟“

”ممکن ہے میں وہاں تمہارے اور روپ وتی کے ملاپ کا کوئی راستہ معلوم کر سکوں۔“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”یہ کام بہت مشکل ہے لیکن اگر آپ کوئی صورت پیدا کر بھی لیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی جان کے خوف سے آپ کو وہاں جانے دوں؟ موجودہ حالات میں آپ کو سب سے پہلے اپنی بہن کو تلاش کرنا چاہیے۔“

رنبیر نے مغموم لہجے میں کہا۔ ”میری بہن قنوج کی حدود میں ہوتی تو اب تک مجھے اس کا سراغ ضرور مل چکا ہوتا۔ مجھے ابھی تک قطعی طور پر یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔“

رام ناتھ نے ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے شمبھو ناتھ آ

رہا ہے۔"

رنبیر نے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھا۔ سامنے شمبھو ناتھ آ رہا تھا۔

شمبھو ناتھ ابھی چند قدم دور ہی تھا کہ رنبیر نے پوچھا۔ "چچا شمبھو! انہیں پہنچا آئے؟"

"جی مہاراج!" اس نے ہاتھ باندھ کر آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں مہاراج۔"

"جے کرشن سے ملے تھے۔"

"نہیں مہاراج۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ نرملا کا ماموں گھر میں تھا اور کہتا تھا کہ اگر میں بیمار نہ ہوتا تو تمہارے سردار کے چرن چھونے جاتا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جے کرشن سے بہت نفرت کرتا ہے۔ نرملا نے آپ کے نام ایک خط دیا ہے۔" یہ کہہ کر شمبھو ناتھ نے جیب میں ہاتھ

ڈالا اور ایک خط نکال کر رنبیر کو پیش کر دیا۔ رنبیر نے خط کھول کر پڑھا۔
نرملا نے لکھا تھا۔

”ماموں جان نے حکم دیا ہے کہ میں خط لکھ کر آپ کا شکریہ ادا کروں۔ اگر پِتا جی یہاں موجود ہوتے تو شاید یہ خط ان سے لکھوایا جاتا۔ آپ نے مجھ سے جو نیک سلوک کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ بھگوان آپ کو اس کا بدلہ ضرور دے گا اور جس طرح میں اپنے ماموں کے ہاں پہنچ گئی ہوں اسی طرح کسی دن آپ کی بہن بھی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔ آپ اس کی تلاش جاری رکھیں۔ میں آپ کو ایک بار پھر اس بات کا یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی بہن کے غائب ہونے میں میرے پِتا جی کا کوئی ہاتھ نہیں۔

میرے اور آپ کے خاندان کے درمیان نفرت کی جو خلیج حائل ہو چکی ہے، اسے پاٹنا میرے بس کی بات نہیں لیکن اس کے باوجود میں بھگوان سے ہمیشہ یہ دُعا کروں گی کہ آپ کی بہن جلد آپ کو مِل جائے۔

نرملا۔“

رنبیر نے خط پڑھ کر رام ناتھ کو دے دیا اور وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد رام ناتھ نے خط واپس دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے دوست! اس خدا کا ہر لفظ یہ بتا رہا ہے کہ وہ تم سے پریم کرتی ہے۔“

رنبیر نے قدرے جوش میں آکر کہا۔ ”نہیں رام ناتھ! اُسے یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ میں اس کی باتوں میں آکر اپنے باپ کے قاتل کو بھول جاؤں گا۔ جے کرشن جیسے سنگدل انسان کے متعلق میں یہ کیسے سوچ سکتا ہوں کہ اگر میری بہن اس کے قابو میں آجاتی تو وہ اس کے ساتھ شرافت سے پیش آتا۔ میں وہ وقت بھی کیسے بھول سکتا ہوں جب اس کے ہاتھ میری شہ رگ تک پہنچ چکے تھے۔ جے کرشن نے جس زمین میں کانٹے بوئے ہیں، میں وہاں کیونکر پھُول تلاش کر سکتا ہوں۔ تمہیں میرے سامنے پریم کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے میری غیرت کو ٹھیس لگتی ہے۔ میں نے نرملا سے جو سلوک کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کے باپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں۔“

رام ناتھ نے نادم سا ہو کر کہا۔ ”معاف کیجیے مجھ سے غلطی ہوئی۔“

رنبیر نے شمبھو ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”چچا شمبھو! جاؤ اب تم آرام کرو۔“ شمبھو ناتھ چلا گیا۔ رنبیر اور رام ناتھ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر رام ناتھ کہا۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”رنبیر نے جواب دیا۔ ”میرا ارادہ ہے کہ میں قنوج کے مشرقی اور مغربی علاقوں میں شکنتلا کو دوبارہ تلاش کروں اور اس کے بعد بھیس بدل کر کالنجر جاؤں۔ ممکن ہے اس نے وہاں کسی آشرم یا مندر میں پناہ لے رکھی ہو۔“

۲

اگلے دن رنبیر اور رام ناتھ چند نوکروں کے ساتھ قنوج کی مشرقی سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کوئی تین ہفتوں میں انہوں نے کئی شہر اور گاؤں چھان مارے لیکن شکنتلا کا سراغ نہ ملا۔ چوتھے ہفتے وہ جنوبی سرحد کے شہروں اور بستیوں کا دورہ کر رہے تھے کہ رام ناتھ بیمار ہو گیا۔ رنبیر نے اسے ایک گاؤں میں ٹھہرا دیا اور شمبھو ناتھ کو اس کی تیمار داری کے لیے چھوڑ کر خود آگے روانہ ہوا۔

پندرہ دن تک ایک وسیع علاقے میں گھومنے کے بعد رنبیر واپس آ گیا۔
اب رام ناتھ کا بخار اتر چکا تھا۔ اس نے کالنجر کے سفر میں رنبیر کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن رنبیر نے اسے سمجھایا "تم ابھی بہت کمزور ہو اور میرا یہ سفر بہت دشوار ہے۔ میں ایک سنیاسی کا بھیس بدل کہ وہاں جا رہا ہوں۔ مجھے روزانہ کئی کئی میل پیدل چلنا پڑے گا۔ شمبھوناتھ کے سوا میں کسی نوکر کو بھی ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ تم باقی نوکریوں کے ساتھ واپس چلے جاؤ اور چند دن میرے گھر میں آرام کرو۔ میں واپس آتے ہی سومنات روانہ ہو جاؤں گا۔ رام ناتھ نے اس کا ساتھ دینے پر اصرار کیا لیکن رنبیر نے اسے مجبور کر کے باقی نوکروں کے ہمراہ واپس بھیج دیا۔
قریباً ڈیڑھ ماہ رنبیر اور شمبھوناتھ سنیاسیوں کے بھیس میں کالنجر کے مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ انھوں نے کالنجر کے تمام مشہور مندر اور آشرم دیکھ ڈالے لیکن شکنتلا کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کے بعد جب وہ دونوں گاؤں پہنچے تو رنبیر کو نوکروں کی زبانی معلوم ہوا کہ رام ناتھ بیس دن قبل کہیں جا چکا ہے اور اس کے نام ایک خط چھوڑ گیا ہے۔ رنبیر نے جلدی سے خط کھولا۔ رام ناتھ نے لکھا تھا۔

”میرے دوست!

میں آپ کی اجازت کے بغیر جا رہا ہوں اور آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میری منزل کہاں ہے۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ آپ اپنی بہن کی تلاش چھوڑ کر میری خاطر وہاں جائیں۔

آپ سے التجا ہے کہ آپ میرا پیچھا نہ کریں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہاں میری نسبت آپ کو پہچاننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گی۔ ممکن ہے کہ اس علاقے کے کئی آدمی وہاں پہنچ چکے ہوں اور آپ بھیس بدل کر بھی ان کی نگاہوں کو دھوکا نہ دے سکیں۔ میں ایک معمولی آدمی ہوں اور انسانوں کی بھیڑ میں چھپ سکتا ہوں اور اگر مجھے کسی نے پہچان لیا تو بھی روپ وتی کے بغیر اب میرے لیے زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر میں زندہ رہا تو کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔

آپ کا رام ناتھ۔“

۳

عبدالواحد قنوج کے قلعہ میں مقیم تھا۔ ایک دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ ”حضور! سردار رنبیر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔“

عبدالواحد نے چونک کر جواب دیا۔ ”انہیں فوراً یہاں لے آؤ۔“

تھوڑی دیر بعد رنبیر کمرے میں داخل ہوا۔ عبدالواحد نے اُٹھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اپنے قریب ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا ہوا کہ تم آ گئے، ورنہ میں تمہارے گاؤں جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ بہن کا کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں۔“ رنبیر نے مایوسی کی حالت میں گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے قنوج کا کونہ کونہ چھان مارا ہے لیکن اس کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔“

عبدالواحد نے کہا۔ ”مجھے بہت افسوس ہے۔ میں بھی اپنی طرف سے ہر

ممکن کوشش کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں قنوج کے ہر سردار نے مجھ سے تعاون کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ قنوج میں نہیں ہے۔"

رنبیر نے کہا۔ "میں ایک سادھو کا بھیس بدل کر کالنجر گیا تھا لیکن کئی ہفتے اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد بھی کچھ نہیں ملا۔ مقامی حکومت کا تعاون حاصل کیے بغیر میرے لیے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا ممکن نہ تھا۔"

عبدالواحد نے کہا۔ "تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ دن دور نہیں جب تمام ریاستوں کی حکومتیں تمہاری بہن کی تلاش اپنا اوّلین فرض سمجھیں گی۔ خدا کی رحمت پر بھروسہ رکھو۔ اگر وہ زندہ ہے تو کسی دن تمہیں ضرور مل جائے گی۔ ہاں! وہ تمہارا دوست رام ناتھ کہاں ہے؟"

"رام ناتھ سومنات جا چکا ہے اور میں بھی اب وہاں جانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ شاید شکنتلا بھی وہیں چلی گئی ہو۔ کچھ عرصہ سے اس ملک کے لوگوں نے اپنی تمام اُمّیدیں سومنات سے وابستہ کر دی ہیں۔ جن دِنوں قنوج پر آپ کے حملے کا خدشہ تھا، کئی سرداروں نے اپنی نوجوان لڑکیوں کو سومنات بھیج دیا تھا۔ ممکن ہے شکنتلا کچھ مدّت

اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد کسی قافلے میں شامل ہو کر سومنات پہنچ گئی ہو۔ اسے بچپن میں سومنات کا مندر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک سردار کی لڑکی اس کی سہیلی تھی اور اس کے باپ نے اُسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہاں بھیج دیا تھا۔ ایک سال بعد جب وہ اپنے گھر آئی تو وہ ناچ گانے میں اپنے کمالات کے باعث تمام علاقے کی لڑکیوں کے لیے باعثِ رشک بن چکی تھی۔ پچھلے دنوں جب میں اپنی بہن کی اس سہیلی سے ملا تو اس نے بھی مجھے یہی بتایا کہ شکنتلا کو واقعی سومنات دیکھنے کا بہت شوق تھا اور پِتا جی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب میں قید سے رہا ہو کر واپس آؤں گا تو ہم سب سومنات کی یاترا کو جائیں گے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ شاید میری بہن یاتریوں کے کسی قافلے کے ساتھ سومنات پہنچ گئی ہو۔"

عبدالواحد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "میرے خیال میں اس کا وہاں پہنچنا ممکن نہیں۔ تم سے دوبارہ ملنے کی امید پر اس نے اتنی دور جانا گوارا نہیں کیا ہو گا۔"

رنبیر نے کہا۔ ”میں خود بھی یہی محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو فریب دے رہا ہوں لیکن اس قسم کے فریب ہی میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میں سومنات جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور اس فیصلہ کی بڑی وجہ رام ناتھ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس نے سومنات کے ایک پجاری کو قتل کر دیا تھا۔ اس لیے میری کوشش یہ تھی کہ اس کی جگہ میں وہاں جاؤں لیکن وہ کالنجر سے میری واپسی کا انتظار کیے بغیر چلا گیا۔ اب چار مہینے ہو چکے ہیں، مجھے اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گیا ہو۔ اس لیے فوراً میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ شکنتلا کی تلاش تو دل کو تسلّی دینے کا ایک بہانہ ہے۔“

عبدالواحد نے کہا۔ ”رنبیر! کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ قدرت اپنا مقصد ظاہر کیے بغیر بعض لوگوں کو کسی کام پر لگا دیتی ہے۔ سومنات تم جا نہیں رہے بلکہ تمہیں بھیجا جا رہا ہے۔ سومنات ان تاریکیوں کی آخری جائے پناہ ہے جس کے خلاف ہم برسرِ پیکار ہیں۔ وہاں جا کر شاید تم یہ محسوس کرو کہ سومنات کی تسخیر اس کے مستقبل کے لیے سلطان محمود کی

باقی فتوحات کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ سلطان کے دِل میں سومنات کی تسخیر کا عزم بیدار کرنے کے لیے اس ملک کے برہمنوں کا یہ مشہور کر دینا کافی ہے کہ سومنات ناقابلِ تسخیر ہے۔ میں تمھیں یہ نہیں بتا سکتا کہ سلطان کب سومنات کا رُخ کرے گا لیکن اگر حالات نے اسے مہلت دی تو وہ کسی نہ کسی دن وہاں ضرور پہنچے گا۔ سرِ دست وہاں کے حالات کے متعلق باخبر رہنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ تمھیں وہاں ایسے آدمی ملیں گے جو برسوں سے سلطان کی راہ دیکھ رہے ہیں اور ان کی مدد سے تم وہاں بہت کچھ کر سکو گے۔ گجرات میں عرب کے مسلمان تاجروں کی کئی بستیاں تھیں لیکن اب سومنات کے پجاریوں کے ظلم کے باعث مسلمانوں کی اکثریت مالا بار اور سندھ میں پناہ لے چکی ہے اور جو مسلمان ابھی تک وہاں موجود ہیں، وہ اچھوتوں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ سلطان ان لوگوں کی مظلومیت کی داستانیں سن چکا ہے۔ پچھلے چند برس میں کئی وفد سلطان کے پاس پہنچے ہیں۔ گجرات کا ایک پر اسرار شخص ان لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ وہ ایک سادھو کے بھیس میں شہر سے باہر ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا ہے۔ اس کا اصل نام عبداللہ

ہے لیکن عوام میں وہ بھگوان داس کے نام سے مشورہ ہے۔ تھانیسر کے محاصرے کے دوران میں جب وہ ایک وفد کے ساتھ سلطان کے پاس آیا تھا تو میں اس سے ملا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے چند آدمی واپس جانے کی بجائے ہماری فوج میں شامل ہو گئے تھے اور ان میں سے ایک اسلام کے مبلّغ کی حیثیت سے یہاں رہتا ہے۔ وہ تمہیں عبداللہ کے متعلق تمام معلومات بہم پہنچا دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کسی مشکل وقت عبداللہ تمہارے لیے بہترین مددگار ثابت ہو گا۔ اگر تمہیں نہیں تو شاید رام ناتھ کو کبھی اس کی ضرورت پڑے۔ اپنے قیام کے دوران میں اگر تم سومنات کی دفاعی قوّت کے متعلّق صحیح اعداد و شمار فراہم کر سکو تو یہ بہت بڑی خدمت ہو گی۔ میں عبداللہ کی وساطت سے تمہارے ساتھ رابطہ قائم رکھوں گا۔ تمہاری غیر حاضری میں تمہاری بہن کی تلاش میں میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔ مجھے اُمّید ہے کہ سلطان شمال کی مہمات سے فارغ ہوتے ہی کالنجر اور گوالیار کا رُخ کرے گا اور ان ریاستوں کی تسخیر کے بعد میں تمہاری بہن کی تلاش کے لیے مقامی عوام اور سرداروں کا تعاون حاصل کر سکوں گا۔“

زبیر نے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میرے سفر کا مقصد وسیع کر دیا ہے۔ لیکن میرے دل پر ایک بوجھ ہے اور میں جانے سے پہلے آپ سے چند باتیں ضروری سمجھتا ہوں۔“

”کہیے!“

”مجھے یہ کہتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے کہ سلطان کی فتوحات نے ابھی تک وہ نتائج پیدا نہیں کیے جن کی مجھے توقع تھی۔ اس نے ظلم کی بوسیدہ عمارت کو گرا یا ضرور ہے لیکن ان کی جگہ وہ عمارت ابھی تک تعمیر نہیں ہوئی جس کے اندر دائمی امن اور عدل و انصاف کے متلاشی پناہ لے سکیں۔ اس نے کانٹوں کو روندا ہے لیکن مُرجھائے ہوئے پھولوں کی آبیاری نہیں کی۔ اس نے فتوحات حاصل کی ہیں لیکن ملک کے عوام ان فتوحات کے انعامات سے ابھی تک محروم ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ اس ملک میں جو انقلاب اس کی آمد سے پیدا ہوا ہے اس کے اثرات سطحی اور ہنگامی ہیں۔ وہ اس سرزمین کی بھیانک تاریکیوں کے لیے ایک نئی صبح کا آفتاب نہیں، بلکہ ایک ایسا ستارہ ہے جو آسمان سے ٹوٹتا ہے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو

تھوڑی دیر کے لیے خیرہ کرنے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے؟

آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کریں گے کہ قنوج کے راجہ کی شکست کے باوجود یہاں کے باشندے ایک استبدادی نظامی کی گرفت سے آزاد نہیں ہوئے۔ سلطان کے خوف نے جن سرداروں کو اس کی اطاعت پر مجبور کر دیا ہے وہ لوگوں پر اسی طرح مسلّط ہیں اور جب سلطان کا خوف اُٹھ جائے گا تو لوگوں پر عدل و انصاف کے جو دروازے آپ نے کھولے ہیں وہ پھر بند ہو جائیں گے اور برہمن ایک بار پھر لوگوں کی گردن پر سوار ہو جائے گا۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ قنوج کے کئی سردار جن پر آپ نے اعتماد کیا تھا، پھر راجہ گنڈا سے ساز باز کر رہے ہیں؟"

عبدالواحد نے جواب دیا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہے لیکن ہمیں ان باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ جو کام قدرت نے سلطان کو سونپا ہے وہ پورا ہو رہا ہے۔ اس نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جو ایک نئے نظام کے لیے سازگار ہیں۔ ان حالات سے فائدہ اُٹھانا میرا اور آپ کا کام ہے۔ اس

نے استبداد کے قلعوں کو مسمار کیا ہے تاکہ اس ملک کے معمار ایک نئی عمارت کی بنیاد رکھ سکیں۔ اس نے ظلم کے پرچم سرنگوں کیے ہیں تاکہ ہم عدل و انصاف اور مساوات کے جھنڈے لہرا سکیں۔ اس نے انسان کو پستی اور ذلّت کی طرف دھکیلنے والے دیوتاؤں کی مورتیاں توڑی ہیں تاکہ ہم انسانیت کا بول بالا کر سکیں۔ وہ ایک سیلاب کی لہر ہے جو اپنی تندی و تیزی کی بدولت دریاؤں اور ندیوں کے لیے گزر گاہیں تیار کرتی ہے۔ تم دیکھو گے کہ ظلم کے ایوانوں پر اس کی ضرب آخری ضرب نہیں ہو گی۔ اس نے جو راستے ہموار کیے ہیں وہ کئی فاتحین کو اس ملک میں آنے کی دعوت دیتے رہیں گے۔ غزنی اور ہندوستان کے درمیان اس کے پاؤں کے نشان کسی دن ایک ایسی شاہراہ کا کام دیں گے جس پر ہماری آنے والی نسلیں نت نئے قافلے دیکھیں گی۔ ان مسافروں کے قافلے جن کے ہاتھوں میں تلواروں کی بجائے نورِ ہدایت کی مشعلیں ہوں گی۔ یہ لوگ تم جیسے انسانوں کے ساتھ مل کر اس عمارت کی تکمیل کریں گے جس کی بنیادیں کھودنے کا کام قدرت نے سلطان کے سپرد کیا ہے۔

اس وقت بھی افغانستان کے پہاڑوں اور گنگا کے میدانوں کے درمیان کے سینکڑوں مبلغ آزادی کے ساتھ تبلیغ کر رہے ہیں اور وہ اس ملک کے ہزاروں انسانوں کے دلوں پر دائمی فتح حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی پر امن فتوحات کے نتائج ان فتوحات کی نسبت کہیں زیادہ دور رس ہوں گے جو سلطان نے بزورِ شمشیر حاصل کیے ہیں۔ ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک کے مؤرّخ شاید سلطان محمود کو صرف کا ایک اولوالعزم فاتح کی حیثیت سے یاد کریں لیکن جب اس ملک کے مؤرّخ اس کی فتوحات کے قصّے لکھیں گے تو وہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے کہ وہ ایک نئے زمانے کا نقیب اور ایک نئی روشنی کا مشعل بردار تھا۔ اس نے اس ملک میں صرف مغرور بادشاہوں کی گردنیں نہیں جھکائیں بلکہ ان بتوں کا طلسم بھی توڑ دیا ہے جن کی خدائی میں انسانیت کے اُبھرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تمہارا یہ اعتراض درست ہے کہ سلطان نے اس ملک کے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کر کے ان کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا لیکن تمہیں اس کی مجبوریوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے اپنی زندگی کے بیشتر ایّام گھوڑے کی زین پر گزارے ہیں۔ اس کی شاہراہِ حیات پر آرام و

سکون کے لیے کوئی مقام نہیں۔ اس کی منزل بھی کوئی رزمگاہ نہیں جہاں کشائی کے اَن تھک ولولے نے اُسے جہاں بانی کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان گنت مفتوحہ ممالک پر تسلّط قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی موجود فوج سے کئی گنا زیادہ فوج کی ضرورت ہے۔ ہندوستان سے باہر اس کا تصادم ان قسمت آزماؤں سے ہے جو اقتدار کی مسندیں اپنے خاندانوں کی میراث سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں نے کبھی اسے فراغت سے بیٹھنے کا موقع نہیں دیا اور ہندوستان میں اس کا تصادم ایک ایسے سماج سے ہے جس کا بااختیار طبقہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ ان حالات میں سلطان کے لیے ایک راستہ یہ تھا کہ وہ ایک محدود سے خطّۂ زمین پر قابض ہو کر بیٹھ جاتا اور اپنی زندگی اس کے انتظام میں صرف کر دیتا۔ پھر شاید اس کی نگاہ شمال اور جنوب کے دور افتادہ ممالک کی طرف نہ اُٹھتی۔ لیکن اس نے اپنے لیے دوسرا راستہ منتخب کیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ قدرت نے اسے ایک حکمران کی مسند پر بٹھانے کی بجائے ایک سپاہی کے فرائض انجام دینے کے لیے منتخب کیا ہے۔ ایک سپاہی کی حیثیت سے اس کی کامیابی کا راز اپنی ساری فوجی قوّت کو ایک مرکز پر جمع رکھنے میں ہے۔

فرض کیجیے اگر وہ ابتدائی حملوں کے ساتھ ہی لمغان اور دریائے سندھ کے درمیان وسیع علاقوں پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتا تو اسے اپنی فوج کی ایک بڑی تعداد وہاں رکھنی پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مرکز میں اس کی طاقت کمزور ہو جاتی۔ پھر ایک طرف شمال کے ممالک میں دبے ہوئے عناصر اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے اور دوسری طرف ہندوستان کی سلطنتوں کو اس کے خلاف متحد ہونے کا موقع مل جاتا۔ چنانچہ ان خطرات سے بچنے کے لیے سلطان نے اپنی قوّت کو متحد رکھا۔ وہ ایک طرف تقریباً ہر سال شمال کے دور افتادہ مقامات پر فوج کشی کر کے اپنے حریفوں کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتا رہا کہ اس کی قوّتِ تسخیر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور دوسری طرف ہندوستان میں ویہند کے حکمران اور اس کے حلیفوں کو پے در پے ضربیں لگانے کے بعد اس نے اُن کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست کر دیے۔ چنانچہ آج اس کے مٹھی بھر آدمی کسی بغاوت کے خطرے کے بغیر شمالی ہند کے علاقوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ اگر قدرت نے سلطان کو مہلت دی تو کسی دن یہی حالت وسطی ہندوستان کی ہو گی۔ اب بھی اگر میں مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ قنوج میں ٹھہر گیا ہوں اور

میرے خلاف کوئی بغاوت نہیں ہوئی تو اس کی وجہ غزنی کے اس لشکر کا خوف ہے جو ہر سمت پوری قوّت کے ساتھ یلغار کرنے کے لیے تیّار رہتا ہے۔

میں ان سرداروں کے متعلق قطعاً پریشان نہیں جو سلطان کی اطاعت قبول کرنے کے بعد پھر راجہ گنڈا سے اپنی امیدیں وابستہ کر چکے ہیں۔ راجہ گنڈا کے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اس کے اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی ان لوگوں کی اُمّیدیں بھی خاک میں مل جائیں گی لیکن اس کے باوجود اگر کچھ عرصہ تک سلطان اپنے تمام مفتوح علاقوں پر پوری طرح قبضہ نہ جما سکا تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ سومنات اس ملک کا آخری دفاعی حصار بن چکا ہے۔ سومنات کی شکست اس ملک کے دیوتاؤں اور ان کے پجاریوں کی آخری شکست ہو گی۔ سومنات کا بت ہندوستان کا سب سے بڑا بت ہے اور اسے توڑنے کے بعد اس ملک میں سلطان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔"

شکنتلا کی سر گزشت

شکنتلا اپنے بھائی کی واپسی اور گاؤں کے نئے حالات سے بے خبر کئی کوس
دور گوالیار کے ایک کسان کے ہاں اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔
جے کرشن کے حملے کی رات اپنے محل سے فرار ہو کر اس نے تیر کر دریا
عُبور کیا لیکن اس کے بعد اُسے معلوم نہ تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے۔ وہ رات
بھر دریا کے کنارے کنارے چلتی رہی۔ علی الصبح وہ تھکاوٹ سے چور ہو کر
ایک جگہ بیٹھ گئی۔ طلوعِ آفتاب سے تھوڑی دیر قبل پاس کی کسی بستی سے
ایک عمر رسیدہ آدمی اور اس کی بیوی وہاں آ نکلے اور شکنتلا سے تھوڑے
فاصلے پر بیٹھ کر دوسرے کنارے سے کشتی کا انتظار کرنے لگے۔ یہ عمر

رسیدہ آدمی جس کا نام کیدار ناتھ تھا، گوالیار کا باشندہ تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ سالے کی لڑکی کی شادی میں یہاں آیا تھا اور اب یہ دونوں گوالیار واپس جا رہے تھے۔ کیدار ناتھ کی بیوی نے ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کو جس کے چہرے سے حزن و ملال کے باوجود امارت ٹپک رہی تھی، دیکھا تو اپنے خاوند سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے یہ لڑکی کسی مصیبت میں ہے۔ اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ کسی اچھے گھرانے کی ہے۔ دیکھو کتنی پیاری صورت ہے۔“ کیدار ناتھ نے جواب دیا۔ ”جاؤ اس کا حال پوچھو۔“

کیدار ناتھ کی بیوی اُٹھ کر شکنتلا کے پاس جا بیٹھی اور کہا۔ ”بیٹی یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ شکنتلا نے جواب دیا۔

”تمہارا گھر کہاں ہے بیٹی؟“

شکنتلا نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا کوئی گھر نہیں۔“

کیدار ناتھ کی بیوی نے اپنی چھوٹی سی گٹھری کھولی اور ایک چادر نکال کر

شکنتلا کے اوپر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی تمہیں سردی لگ رہی ہو گی۔“

کیدار ناتھ بھی اُٹھ کر قریب آ گیا اور بولا۔ ”بیٹی تم کہاں جانا چاہتی ہو؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے شکنتلا اٹھی اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ایک طرف چل پڑی۔

”ٹھہرو بیٹی! شاید ہم تمہارے کسی کام آ سکیں۔“ یہ کہتے ہوئے کیدار ناتھ کی بیوی نے آگے بڑھ کر شکنتلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شکنتلا نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے جانے دیجیے۔ آپ میری مدد نہیں کر سکتیں۔ بھیڑیوں کی ایک فوج میرا پیچھا کر رہی ہے۔“

کیدار ناتھ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! ایک راجپوت کا دھرم اُسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایک کنیا کو مصیبت میں دیکھ کر منہ پھیر لے۔ ہم پر اعتبار کرو۔“

شکنتلا نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ”آپ اس علاقے میں رہتے

ہیں؟“

”نہیں، ہم گوالیار کے رہنے والے ہیں۔ ہم اپنے ایک رشتہ دار کی لڑکی کی شادی پر آئے تھے اور اب واپس جارہے ہیں۔ اگر تمہیں اس علاقے میں کسی مدد کی ضرورت ہے تو ہم تمہیں اپنے رشتہ داروں کے ہاں پہنچا دیتے ہیں، ان کا گاؤں یہاں سے صرف ایک کوس پر ہے۔“

”نہیں، میں یہاں سے بہت دُور جانا چاہتی ہوں۔“

دریا کے دوسرے کنارے سے ایک کشتی آ رہی تھی اور اس پر چند مردوں اور عورتوں کے علاوہ تین گھوڑے بھی لدے ہوئے تھے۔ کشتی کے قریب آتے ہی شکنتلا کو تین مسلح آدمی دکھائی دیے اور اس کے چہرے پر زردی چھاگئی۔ وہ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑی کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کی طرف دیکھتی رہی پھر ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہ زمین میرے لیے تنگ ہو چکی ہے۔ شاید وہ مسلح آدمی میری تلاش میں آ رہے ہیں۔“

کیدار ناتھ نے کہا۔ ”اب تمہارے لیے بھاگنے کی کوئی صورت نہیں۔ تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ بھگوان تمہاری مدد کرے گا۔“

شکنتلا کچھ کہے بغیر سر جھکا کر بیٹھ گئی اور کیدار ناتھ کی بیوی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے چادر کھینچ کر اس کے چہرے پر گھونگھٹ ڈال دیا۔

کشتی کنارے لگی اور مسلح آدمی نیچے اتر کر اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ ایک سوار نے آگے بڑھ کر کیدار ناتھ سے سوال کیا۔ ”تم کون ہو؟“

”جی میں ایک غریب کسان ہوں۔“

”تم کہاں سے آئے ہو اور تمہارے ساتھ کون ہیں؟“

”جی یہ میری بیٹی اور میری بیوی ہیں۔ ہم یہاں پاس ہی ایک گاؤں سے آئے ہیں، میں اپنی بیٹی کو اس کے سسرال سے اپنے گاؤں لے جا رہا ہوں۔“

”تمہارا گاؤں کہاں ہے؟“

”جی میرا گاؤں دریا کے پار کوئی دس کوس کے فاصلے پر ہو گا۔“ ”تم کب سے یہاں ہو؟“

”جی ہم کافی دیر سے کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔“

”تم نے اپنے راستے میں ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو تو نہیں دیکھا؟“

”جی نہیں۔“

مسلح آدمی ابھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے تھوڑی دور عورتوں اور مردوں کی ایک ٹولی کشتی کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی اور وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر ان کے قریب جا پہنچا۔ وہ ان سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کے باقی دو ساتھیوں نے بلند آواز میں کہا۔ ”تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ ہم نے بہت آگے نکل کر دریا عبور کیا ہے۔ اس نے دریا پار کرتے ہی پڑوس کی کسی بستی میں چھپنے کی کوشش کی ہو گی۔ اب ہمیں اوپر کی طرف جانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پیارے لال اور اس کے ساتھی اسے تلاش بھی کر چکے

ہوں۔"

مسلح سوار دریا کے اوپر کی طرف چل پڑے اور شکنتلا کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گئی۔ دریا عبور کرنے کے بعد شکنتلا ایک بار پھر بے بسی اور پریشانی کی حالت میں کھڑی کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کیدار ناتھ نے کہا۔ "چلو بیٹی! ہمارے ساتھ چلو۔"

شکنتلا نے کہا۔ "میں محسوس کرتی ہوں کہ بھگوان نے آپ کو میری مدد کے لیے بھیجا ہے لیکن یاد رکھیے کہ آپ نے مجھے اپنی بیٹی کہا ہے۔"

"ہم تمہیں ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھیں گے۔ چلو!"

شکنتلا ان کے ساتھ چل پڑی۔

۲

چند دن کے بعد شکنتلا کیدار ناتھ کے گھر پہنچ چکی تھی۔ کیدار ناتھ گوالیار

کی راجدھانی کے قریب ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا تھا۔ وہ ایک معمولی حیثیت کا کسان تھا، لیکن ان کی شرافت اور تدبّر کے باعث گاؤں کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔

گاؤں کا ٹھاکر ایک با اثر آدمی تھا۔ آس پاس کی کئی بستیاں اس کی ملکیت تھیں۔ گوالیار کے راجہ کا وزیر اس کا رشتہ دار تھا اور علاقے کا ہر آدمی اس کے اشارے کو اپنے لیے حکم سمجھتا تھا۔ پڑوس کے سردار اس کے سامنے نوکروں کی طرح کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن کیدار ناتھ کا وہ بھی احترام کرتا تھا۔

شکنتلا کے آنے سے کیدار ناتھ اور اس کی بیوی خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پڑوسیوں سے کہا کرتے تھے۔ ”صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، بھگوان نے ہمیں بڑھاپے میں ایک ایسی لڑکی دی ہے جو چاند سے زیادہ سندر اور گنگا کے پانی سے زیادہ پوتر ہے۔ ہم بے اولاد تھے اور شکنتلا کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ بھگوان نے ہم پر دیا کی اور گنگا کے کنارے ہمیں ایک دوسرے سے مِلا دیا۔“ چند دن میں شکنتلا کی

خوبیوں کی شہرت ٹھاکر کے محل تک جا پہنچی۔ ٹھاکر کی بیوی نے کیدار ناتھ کی بیوی کو پیغام بھیج کر اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کیا۔ کیدار ناتھ کی بیوی شکنتلا کو ترین لباس پہنا کر اس کے گھر لے گئے۔ اس ملاقات کے بعد ٹھاکر کی لڑکی بھاگو نتی شکنتلا کی بے تکلّف سہیلی بن گئی۔

شکنتلا کو یقین تھا کہ جے کرشن اُسے تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت کرے گا اور اگر میں نے یہ بات لوگوں پر ظاہر کر دی کہ وہ موہن چند کی بیٹی ہے تو ممکن ہے کسی دن جے کرشن کے کانوں تک یہ بات پہنچ جائے۔ چنانچہ کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کے سوا دوسرے لوگ اس کے ماضی کا تذکرہ چھیڑتے تو وہ انہیں صرف یہ کہہ کر ٹال دیا کرتی تھی کہ ”دنیا میں میرا ایک بھائی کے سوا کوئی نہ تھا اور وہ بھی اب مسلمانوں کی قید میں ہے۔“ دو ماہ بعد کیدار ناتھ کے گاؤں کے حالات پتہ کرنے کے لے گیا اور واپس آ کر رنبیر کے گرفتار اور فرار ہونے کے واقعات بتائے اور شکنتلا کو ہدایت کی کہ تمہیں آئندہ بھی کسی پر اپنا بھید ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ جے کرشن قنوج کے نئے راجہ کے دربار میں

غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل کر چکا ہے اور قنوج کا نیا راجہ گوالیار کا مہاراجہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگرچہ کرشن کو معلوم ہو جائے کہ تم یہاں ہو تو یہ گاؤں بھی تمہارے لیے محفوظ نہیں رہے گا۔ اس نے تمہارا سُراغ لگانے والے کے لیے بہت بڑا انعام مقرر کیا ہے اور علاقے کے تمام سردار اس کے طرفدار بن چکے ہیں۔ تمہارا بھائی دوبارہ اس علاقے میں پاؤں نہیں رکھ سکتا۔

اس کے بعد اپنے بھائی کے متعلق شکنتلا کی تشویش بڑھتی گئی۔ پھر ایک دِن جب اس نے یہ خبر سنی کہ سلطان کی افواج قنوج اور باری کے نئے راجہ کو شکست دینے کے بعد کالنجر کا رُخ کر رہی ہیں تو اس نے کیدار ناتھ سے کہا۔ "چچا! آپ ایک بار پھر میرے گاؤں ہو آئیں۔ کیا عجب میرا بھائی وہاں پہنچ چکا ہو۔ مجھ یقین ہے راجہ کی حمایت سے محروم ہونے کے بعد جے کرشن ہمارے گاؤں پر قابض نہیں رہ سکتا۔ میرا بھائی چین سے بیٹھنے والا نہیں۔ اس نے موقع ملتے ہی گاؤں پر حملہ کیا ہو گا۔ میرے بھائی نے دھرم کے لیے جو قربانیاں دی ہیں علاقے کے لوگ اس سے واقف ہیں۔

انہوں نے یقیناً اس کا ساتھ دیا ہو گا۔“

کیدار ناتھ نے کہا۔ ”میں خود بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ جے کرشن کی قماش کے لوگ قنوج کے نئے راجہ کے ساتھ ہی ملک چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں گے۔ قنوج کے باشندے اپنے ان سرداروں کے سخت خلاف تھے جنہوں نے ترلوچن کو اپنے باپ کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔“

کیدار ناتھ اگلے دن ہی اپنے گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ چند دن بعد قنوج کی حدود میں پاؤں رکھتے ہی اس نے رنبیر کے گاؤں کے تازہ حالات سُنے تو اسے نے بے حد تعجب ہوا۔ وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ شکنتلا کا بھائی مسلمانوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ اور ان کی اعانت کے لیے علاقے سے ایک فوج جمع کر کے کالنجر روانہ ہو چکا ہے۔ لیکن راستے کی ہر بستی کے لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی۔ اب اس کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ شکنتلا کو ان واقعات سے کس طرح آگاہ کرے۔ وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھتا۔ ”کیا میں واپس جا کر شکنتلا کو یہ بتا سکوں گا کہ تمہارا

بھائی اپنے دھرم اور وطن کا دشمن بن چکا ہے؟"

رنبیر کے گاؤں پہنچ کر کیدار ناتھ نے کالنجر کے راجہ کی شکست کی خبر سنی تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ رنبیر کے خلاف اس کے دل میں پہلے ہی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اب اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ گاؤں کے کسی آدمی کے ساتھ رنبیر کی بہن کا ذکر کیے بغیر دریا عبور کر کے اپنی بیوی کے رشتہ داروں کے ہاں چلا گیا۔ وہاں چند دن وہ ایک ذہنی کرب میں مبتلا رہا۔ کبھی اسے یہ خیال آتا کہ وہ رنبیر کی آمد کا انتظار کیے بغیر لوٹ جائے اور کبھی اس کے ضمیر کی آواز اس ارادے کی مخالفت کرتی۔

چار دن بعد اسے رنبیر کے گھر واپس آنے کی خبر ملی۔ اس کے ساتھ ہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سلطان محمود نے رنبیر کو کالنجر کی جنگ میں مدد دینے کے صلہ میں علاقے کے تمام سرداروں کا سربراہ بنا دیا ہے تو اس کے دل میں نفرت کی آگ کو کسی حد تک دب چکی تھی پھر بھڑک اٹھی۔ اب اس کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ میں دوبارہ رنبیر کے گاؤں نہیں جاؤں گا۔ میں اس سے نہیں ملوں گا۔ وہ ہمارے دھرم کے دشمنوں کے ساتھ ناطہ

جوڑنے کے بعد شکنتلا جیسی دیوی کا بھائی کہلانے کا حقدار نہیں۔ شکنتلا کو اب یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا بھائی مر چکا ہے۔ کیدار ناتھ کی بیوی اپنے مکان کے صحن میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ باہر گاؤں کے بچّوں کا شور سنائی دیا۔ ''چچا آ گیا! چچا آ گیا۔'' تھوڑی دیر بعد کیدار ناتھ صحن میں داخل ہوا اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''شکنتلا کہاں ہے؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''وہ ٹھاکر کی لڑکی کے پاس گئی ہے۔ آپ نے بہت دن لگا دیے۔ اس کے بھائی کا پتہ چلا؟''

کیدار ناتھ نے جواب دینے کی بجائے سر کنڈے کا موڑھا گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بیوی نے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر اپنا سوال دہرانا مناسب نہ سمجھا اور چرخہ چھوڑ کر اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں ابھی کھانا تیار کرتی ہوں۔''

''نہیں، میں نے راستے میں ایک گاؤں سے کھانا کھا لیا تھا۔ صرف ٹھنڈا پانی لے آؤ۔''

”دودھ لاؤں؟“

”نہیں صرف پانی۔“

کیدار ناتھ کی بیوی پانی کا ایک کٹورا لے آئی اور اس کے قریب دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ کیدار ناتھ نے پانی پینے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہو کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے شکنتلا سے سچّی بات کہہ دی تو اسے بے حد صدمہ ہو گا۔“

”کیا ہوا؟“ بیوی نے بد حواس ہو کر پوچھا۔

کیدار ناتھ نے جواب دیا۔ ”اس کے بھائی نے اپنے گاؤں پر قبضہ کر لیا ہے لیکن وہ مسلمانوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ قنوج پر مسلمانوں کا حملہ اسی کی غدّاری کا نتیجہ تھا۔ کالنجر کی جنگ میں بھی اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس کی کوششوں آس پاس کے تمام سردار مسلمانوں کی اطاعت قبول کر چکے ہیں اور انہوں نے بھی کالنجر کی جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے۔“

بیوی نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا کہ شکنتلا کا بھائی ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ تو اسے انسان کی بجائے دیوتا سمجھتی ہے۔ بھگوان کے لیے یہ باتیں شکنتلا سے نہ کہیں۔ وہ مر جائے گی۔ لوگوں کے طعنے اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں گے۔“

”لیکن اسے دھوکے میں رکھنا بھی تو ٹھیک نہیں۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”اگر وہ ملیچھ ہو چکا ہے تو شکنتلا کے ساتھ اس کے تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ جیسے ہی اس کے پاس جانا تو درکنار وہ مر کر بھی گوارا نہ کرے گی کہ ایسا بھائی اس کی لاش کو ہاتھ لگائے۔ بھگوان کے لیے آپ شکنتلا کو کچھ نہ بتائیں۔ صرف اتنا کہہ دیں کہ رنبیر ابھی گاؤں نہیں آیا۔ اس کے لیے یہ سوچنا زیادہ آسان ہو گا کہ وہ مر چکا ہے۔ اگر یہ بات چھپی رہی تو ہم شکنتلا کو کسی اچھی جگہ بیاہ سکیں گے۔ ٹھاکر کی بیوی کچھ عرصہ سے شکنتلا پر بہت مہربان ہے۔ ممکن ہے وہ اسے اپنے لڑکے کے لیے پسند کر لیں۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ رنبیر جیسے بھائی کی بہن ہے تو پھر کے لیے کوئی ٹھکانا نہ ہو گا۔“

کیدار ناتھ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شکنتلا صحن میں داخل ہوئی اور آگے بڑھ کر جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کیدار ناتھ نے اُٹھ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مغموم لہجے میں کہا۔ ”بیٹی مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی خوشخبری لے کر نہیں آیا۔ تمہارے بھائی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔“

شکنتلا نے گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”کیا آپ ہمارے گاؤں گئے تھے؟“

”ہاں! لیکن تمہارے بھائی کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی۔“

”کیا ہمارے محل پر ابھی تک جے کرشن کا قبضہ ہے؟“ ایک ثانیہ کے لیے کیدار ناتھ کی ہمّت جواب دے گی لیکن بیوی کا اشارہ پا کر اس نے مُرجھائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”ہاں!“

شکنتلا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ کیدار ناتھ نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ ”بیٹی! پہلی بار جب میں وہاں گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ رات کے

وقت تمہارے بھائی کو جے کرشن کے سپاہیوں سے چھڑانے والے مسلمان تھے۔ میں نے یہ بات تمہیں اس لیے نہ بتائی تھی کہ تمہیں دکھ ہو گا۔ اس مرتبہ میں یہ سوچ کر وہاں گیا تھا کہ شاید یہ بات سچ ہو اور مسلمانوں نے قنوج کی فتح کے بعد گاؤں پر قبضہ کرنے میں اُسے مدد دی ہو۔"

شکنتلا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میرے بھائی کے متعلق آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ دنیا بدل سکتی ہے لیکن وہ نہیں بدل سکتا۔ اگر رنبیر مسلمانوں کی مدد سے بادشاہ بن جائے تو میں اس کے عالیشان محلات کی بجائے بھیک مانگ کر پیٹ پالنے کو ترجیح دوں گی۔"

۳

گاؤں کے ٹھاکر کی لڑکی بھاگو نتی شکنتلا کی بے تکلّف سہیلی بن چکی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن شکنتلا کو اپنے گھر بلایا کرتی۔ قنوج سے کیدارناتھ کی واپسی کے بعد شکنتلا چند دن بے حد مغموم رہی۔ بھاگو نتی کی نوکرانی اُسے دو بار بلانے کے لیے آئی لیکن شکنتلا نے دونوں بار اُسے یہ کہہ کر

ٹال دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔

ایک دن بھا گو نتی خود اس کے پاس آئی اور شکنتلا کو مجبور کر کے ساتھ لے گئی۔ بھا گو نتی کے مکان میں داخل ہوتے ہی شکنتلا کو ایک نوجوان دکھائی دیا جو صحن سے باہر کے دروازے کی طرف آرہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ ''کہاں جا رہے ہو بھیّا؟'' بھا گو نتی نے قریب پہنچ کر سوال کیا۔

''ذرا باہر جا رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

شکنتلا نے بھا گو نتی کے بھائی کو دو بار پہلے بھی دیکھا تھا لیکن اسے علم نہ تھا کہ وہ لنگڑا ہے۔ وہ اسے پہلی بار چلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ چند قدم آگے جا کر اس نے بھا گو نتی سے اس کے لنگڑا کر چلنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا ''میرا بھائی جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔''

''کون سی جنگ؟'' شکنتلا نے سوال کیا۔

''سرسوا کی جنگ میں گوالیار سے ایک فوج سرسوا کے راجہ کی مدد کے لیے

گئی تھی۔ بھیّا بھی اس فوج میں تھے۔ جنگ میں گھوڑے سے گر کر ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور قید ہو گئے۔ واپسی پر مسلمانوں نے بہت سے قیدیوں کو چھوڑ دیا لیکن میرے بھائی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ نندنہ سے چند قیدی رہا ہو کر آئے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ بھیّا نندنہ میں قید ہیں۔ پِتا جی خود وہاں گئے اور فدیہ ادا کے کے بھیّا کو قید سے چھڑا لائے۔"

"آپ کے بھائی نندنہ میں قید تھے؟" شکنتلا نے سوال کیا۔

"ہاں!"

"میرا بھائی بھی رہیں تھا۔ شاید اس کے متعلّق کچھ جانتے ہوں۔ ذرا اپنے بھائی صاحب کو بُلائیے۔"

بھاگونتی نے فوراً بھائی کو بُلانے کے لیے نوکرانی کو بھیجا اور شکنتلا کو لے کر محل کے ایک کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد بھاگونتی کا بھائی گلاب چند بھی وہاں آ گیا۔ شکنتلا نے اُسے دیکھتے ہی کسی تمہید کے بغیر سوال کیا۔ "میرا بھائی نندنہ کے قلعہ میں قید تھا۔ شاید آپ اسے جانتے ہوں۔ اس کا

نام رنبیر تھا۔" "رنبیر! وہ آپ کا بھائی تھا؟" گلاب چند نے شکنتلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"گلاب چند نے جواب دیا۔ "ہاں! میں اُسے جانتا ہوں۔ قلعے کے تمام قیدی اسے جانتے تھے۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ اب وہ کہاں ہے؟"

گلاب چند نے جواب دیا۔ "اسے مجھ سے ایک ہفتہ پہلے رہا کر دیا گیا تھا۔ حیران ہوں کہ وہ آپ کے پاس کیوں نہیں آیا۔"

شکنتلا نے کہا۔ "مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ رہا ہونے کے بعد گھر آیا تھا لیکن ہمارے گاؤں پر ہمارے ایک دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا لیکن بعد میں جان بچا کر کہیں بھاگ گیا۔ بھگوان جانے اب وہ کہاں ہے؟"

گلاب چند کے استفسار پر شکنتلا نے قدرے تفصیل سے اپنی سرگذشت

بیان کر دی۔ گلاب چند کچھ دیر سوچتا رہا پھر شکنتلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا بھائی ایسے ذلیل دشمن سے ہار ماننے والا نہیں۔ اگر وہ زندہ ہے تو ضرور دوبارہ نندنہ گیا ہو گا۔ قلعے کا حاکم اس پر بہت مہربان تھا مجھے یقین ہے کہ وہ ہر طرح اس کی مدد کرے گا۔“

شکنتلا کا چہرہ اچانک غصّے سے تمتما اُٹھا اور اس نے کہا۔ ”میرا بھائی ایسا نہیں۔ وہ مسلمانوں کی مدد سے زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دے گا۔“

گلاب چند نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں آپ کے بھائی کی توہین نہیں کر رہا۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو ان حالات میں یہی کرتا۔ نندنہ کے قلعے کا حاکم ان لوگوں میں سے تھا جنہیں ہر شخص اپنا دوست خیال کرتا ہے۔ آپ اگر نندنہ کے کسی قیدی سے بات کریں تو وہ یہی کہے گا کہ وہ انسان نہیں دیوتا تھا۔ آپ کا بھائی بیمار تھا اور وہ ان کی تیمار داری کے لیے آیا کرتا تھا۔ آپ کا بھائی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اور اُس نے اس کے دل میں زندہ رہنے کی تمنّا پیدا کی تھی۔ پھر ایسے حالات میں جو آپ نے بیان کیے ہیں اس کا وہاں جانا تعجّب کی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے

اُسے دیکھا ہے ان میں سے اکثر دوبارہ مسلمانوں کے خلاف تلوار نہیں اٹھا سکیں گے۔"

شکنتلا نے کہا۔ "اگر وہ نندنہ گیا ہوتا اور نندنہ کے حاکم نے اس کی مدد کی ہوتی تو اب تک اُسے اپنے گاؤں پر قابض ہو جانا چاہیے تھا لیکن چچا کیدار ناتھ حال ہی میں وہاں گیا تھا۔ اُسے بھیّا کا کوئی پتہ نہیں چلا۔"

گلاب چند نے کہا۔ "میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ضرور وہیں گیا ہے۔ ممکن ہے وہ کسی دوست کے پاس چلا گیا ہو اور اپنا گاؤں دُشمن کے قبضے سے چھڑانے کے لیے وقت کا انتظار کر رہا ہو۔ بہر حال اگر وہ زندہ ہے تو کبھی نہ کبھی اپنے گاؤں ضرور آئے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں خود اس کی تلاش کے لیے جاؤں گا۔"

۴

کالنجر کے حکمران کو شکست دینے کے بعد سلطان کو اپنی وسیع سلطنت کے شمالی ممالک کے حالات نے جنوب کی طرف پیش قدمی جاری رکھنے

کی اجازت نہ دی اور اسے اچانک واپس جانا پڑا۔ میدان سے فرار ہونے کے باوجود راجہ گنڈا کے فوجی نقصانات ایسے نہ تھے کہ وہ ہمّت ہار کر بیٹھ جاتا۔ کالنجر کے قلعے کو وہ اب بھی ناقابلِ تسخیر خیال کرتا تھا۔ چنانچہ سلطان کی واپسی کے بعد اس نے ایک بار پھر مسلمانوں کے ساتھ فیصلہ کُن جنگ لڑنے کی تیّاریاں شروع کر دیں۔

عبدالواحد قنوج میں تھا اور اس کی حیثیت ایک گورنر یا حاکم سے زیادہ ایک مبلّغ کی سی تھی۔ اس کا مقصد اہلِ قنوج کے دِلوں پر سلطان کی سطوت اور طاقت کا رعب جتانے کے بجائے ان کا ایک ایسا ذہنی انقلاب پیدا کرنا تھا، جس کے بغیر اس کے نزدیک اہلِ ہند کی نجات ممکن نہ تھی۔

شاہی گھرانے کے اقتدار کے خاتمے کے بعد قنوج کے بیشتر سردار سلطان کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے کالنجر کے حکمران کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر رکھا تھا لیکن راجہ گنڈا کی پسپائی کے بعد وہ بھی یکے بعد دیگرے عبدالواحد کے پاس پہنچ کر سلطان کی اطاعت قبول کرنے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ سلطان راجہ گنڈا اور اس کے حلیفوں

پر آخری ضرب لگانے کے لیے پھر آئے گا۔"

عبد الواحد ہر بااثر آدمی کو تلقین کیا کرتا تھا کہ سلطان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صرف زبانی اظہارِ اطاعت کافی نہیں، بلکہ عوام کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر آپ اقتدار کی مسندوں پر قابض نہیں رہ سکتے۔ سلطان کے دربار میں اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز نہیں کی جائے گی۔ وہ جس ضابطۂ اخلاق پر ایمان رکھتا ہے وہ انسانوں کو بھیڑیوں اور بھیڑوں کی ٹولیوں پر تقسیم کرنے والے سماج کا وجود تسلیم نہیں کرتا۔

قنوج کے سردار عوام سے زیادہ عبد الواحد اور اس کی وساطت سے سلطان کو خوش کرنے کے لیے اپنی اپنی رعیّت کی دوستی حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ عبد الواحد قنوج کے ہر گوشے میں جاتا۔ عوام کی شکایات سُنتا اور سرداروں کو ان کی ذمّہ داریوں کا احساس دلاتا۔ اسلام کے مبلّغین جن میں بعض ہندی نو مسلم تھے قنوج کے شہروں اور بستیوں میں توحید کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ عبد الواحد کی طرح یہ لوگ بھی ناقابلِ اصلاح سرداروں کے خلاف عوام

کی داد رسی کرتے تھے۔ ان حالات میں پنچ ذات کے لوگ صدیوں کے بعد یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے لیے عدل و انصاف کے دروازے کھُل رہے ہیں، اونچی ذات کے نخوت کے قلعے مسمار ہو رہے تھے اور جھونپڑیوں میں بسنے والوں کے دلوں میں انسانی اخوت و مساوات کا شعور ابھر رہا تھا۔ دیوتاؤں کی سرزمین میں پہلی بار اچھوت کو محسوس ہو رہا تھا کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔

لیکن چند ماہ بعد اس بیداری کے غلاف ردِّ عمل شروع ہو چکا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے صرف اقتدار کی مسندوں پر قابض رہنے کے لیے سلطان کی اطاعت قبول کی تھی اب آہستہ آہستہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ نیا شعور ان کی نسل برتری کے خلاف ایک کھلی بغاوت کا پیش خیمہ ہے۔ وہ ان انسانوں کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع دے رہے ہیں جو کسی دن منو جی کے سماج کے دیوتاؤں کا مذاق اڑائیں گے۔ برہمن جس کی برتری کا راز اچھوت کی تذلیل میں تھا، راجپوت سرداروں سے کہیں زیادہ دور اندیش تھے اور بہت پہلے ہوا کا رُخ دیکھ چکے تھے۔ وہ سرداروں کے پاس جاتے

اور انہیں سمجھاتے کہ تمہارے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اگر تم نے اس ملک میں مسلمان کے مذہب کو پھیلنے کا موقع دیا تو تمہیں کسی دن اُونچے ایوانوں سے گھسیٹ کر اچھوت کے برابر کھڑا کر دیا جائے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ سنبھل جاؤ اور اپنے دھرم کے دشمنوں کو بڑھنے اور پھولنے کا موقع نہ دو۔ راجہ کالنجر مسلمانوں کو اس ملک سے نکالنے کے لیے ایک ایسی فوج جمع کر رہا ہے جو سلطان محمود کے لشکر کو تنکوں کی طرح بہالے جائے گی۔ تم فیصلہ کُن جنگ میں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہو۔

برہمنوں کی ان سرگرمیوں کے باعث قنوج کے کئی سردار ایک بار پھر راجہ گنڈا کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے۔

صبحِ مسرّت

"وہ آ رہے ہیں۔ وہ گوالیار کی سرحد عبور کر چکے ہیں۔ انہوں نے گوالیار کے قلعے کا محاصرہ کر لیا ہے۔" لوگوں نے یکے بعد دیگرے یہ اطلاعات سنیں اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنی بدحواسی پر قابو پاتے، گوالیار کے طول و عرض میں یہ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ مہاراجہ ارجن نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

ٹھاکر کا لڑکا گلاب چند اپنے علاقے سے آٹھ سو سپاہی لے کر راجہ کی مدد کے لیے گیا ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ جنگ کی تفصیلات معلوم کرنے کے

لیے اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ بھاگونتی اپنے بھائی کے متعلّق بہت پریشان تھی۔ کیدار ناتھ نے اس کی دلجوئی کے لیے شکنتلا کو چند دن اس کے گھر رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک روز دوپہر کے وقت شکنتلا محل کے ایک کمرے میں بھاگونتی اور اس کی ماں سے باتیں کر رہی تھی کہ محل سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ یہ تینوں جلدی سے اُٹھ کر برآمدے میں آ گئیں۔ اتنے میں ایک نوکر بھاگتا ہوا اندر آیا اور بلند آواز میں چلّایا۔ ”چھوٹے ٹھاکر آ گئے۔“

تھوڑی دیر بعد گلاب چند اپنے باپ سے بغلگیر ہو رہا تھ۔ کچھ دیر دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر گلاب چند لنگڑاتا ہوا برآمدے کی طرف چل دیا۔

گاؤں کے لوگ گلاب چند کے ان ساتھیوں کے گرد جمع ہو رہے تھے جو محل سے باہر کھڑے تھے۔ بڑا ٹھاکر بھی انہیں دیکھنے کے لیے باہر نکل گیا۔ شکنتلا اس بات سے حیران تھی کی شکست کے باوجود گلاب چند کے چہرے پر رنج و ملال کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس نے اطمینان سے ماں کے

پاؤں چھونے کے بعد شکنتلا کی طرف دیکھا اور پھر بھاگونتی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں تمہاری سہیلی کے لیے ایک اچھی خبر لایا ہوں۔"

"کیسی خبر؟" بھاگونتی نے سوال کیا۔

گلاب چند نے کا بھاگونتی کی بجائے شکنتلا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آپ کا بھائی زندہ ہے۔"

ایک ثانیہ کے لیے شکنتلا کی تمام حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ گئیں اور اس نے مسرّت اور اضطراب کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "وہ کہاں ہے؟ آپ کو اس کے متعلّق کس نے بتایا؟"

گلاب چند نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ زندہ ہے۔ جس شخص نے مجھے اس سے متعلق یہ اطلاع دی تھی اس نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ وہ کہاں ہے۔ بہر حال وہ شاید کل تک خود ہی یہاں پہنچ جائے اور آپ کی پریشانی دور ہو جائے۔"

"وہ کون ہے؟"

"عبدالواحد، جس نے آپ کے بھائی کو قید سے آزاد کیا تھا۔ وہ سلطان محمود کی طرف سے صلح کی شرائط لے کر راجہ کے پاس آیا تھا۔ جب وہ اس کے دربار سے باہر نکلا تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کی فوج کے چند اور افسر تھے اور راجہ کا وزیر اور سیناپتی انہیں قلعے کے دروازے تک چھوڑنے جا رہے تھے۔ وزیر اور سیناپتی کی موجودگی میں میرے لیے اس کے بات کرنا مشکل تھا لیکن اس نے مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں نے اس سے دریافت کیا۔ "آپ کو رنبیر کے متعلق کچھ معلوم ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کی بہن ہمارے گاؤں میں پریشانی کے دن گزار رہی ہے۔ میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ ہم باہر نکل کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

میں اس کے ساتھ باہر چل دیا۔ قلعے سے نکل کر اس نے آپ کے متعلق کئی سوال پوچھے۔ میں نے اسے آپ کی سرگزشت سنا دی۔ پھر اس نے کہا۔ ”رنبیر کی بہن نے اپنے گاؤں سے اس کا پتہ کیوں نہ لگایا۔“ میں نے اس کے جواب میں بتایا کہ کیدار ناتھ وہاں گیا تھا لیکن اس نے واپس آ کر یہ اطلاع دی تھی کہ ابھی تک گاؤں پر جے کرشن کا قبضہ ہے اور میرا کوئی پتہ نہیں۔ اس نے کہا۔ ”کیدار ناتھ وہاں گیا ہوتا تو کبھی ایسا نہ کہتا۔“ میں نے اصرار کیا کہ کیدار ناتھ جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔

اس کے بعد وہ کہنے لگا۔ ”میں ایک نہایت اہم خدمت تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ تم فوراً اپنے گاؤں جاؤ اور جب تک میں وہاں نہیں پہنچتا، رنبیر کی بہن کو اپنی حفاظت میں رکھو۔ اگر مجھے اجازت مل گئی تو میں کل تک تمہارے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ ورنہ ایک اور مہم سے فارغ ہونے کے بعد وہاں آؤں گا۔ کیدار ناتھ کو ہماری اس ملاقات کا علم نہ ہو تو بہتر ہے۔“ میں نے اس سے بار بار پوچھنے کی کوشش کی کہ رنبیر کہاں ہے؟ لیکن اس نے ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کہ رنبیر زندہ ہے لیکن میں اس کے متعلق ابھی

نہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں ہے۔ تم رنبیر کی بہن سے کہہ دو کہ میں ان کے بھائی کا دوست ہوں اور جب ملوں گا تو ان کی تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ میں عبدالواحد کو گاؤں کا راستہ دکھانے کے لیے ایک آدمی کو اس کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ ممکن ہے وہ کل صبح ہی یہاں پہنچ جائے لیکن وہ چند گھڑیوں سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے گا۔ اس لیے آپ کیدار ناتھ کے ہاں جانے کی بجائے یہیں قیام کریں تو بہتر ہو گا۔"

گلاب چند کی باتوں سے اس کی ماں اور بہن کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ راجہ کی شکست اور گوالیار کے مستقبل سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جس قدر اطمینان سے باتیں کر رہا تھا اس قدر بے چینی سے اس کی ماں اور بہن ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بالآخر ماں نے کہا۔ "بیٹا! اب گوالیار کا کیا بنے گا؟"

گلاب چند نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اب آپ گوالیار کے متعلّق پریشان نہ ہوں۔ گوالیار کا مستقبل اب بھی اس ملک کے راجہ اور اس کے درباریوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر انہوں نے صلح کی شرائط کو پورا کیا تو

گوالیار کو کوئی خطرہ نہیں۔ اگر انہوں نے پھر کوئی غلطی کی تو مسلمانوں کی ضرب بہت سخت ہو گی۔ گوالیار کی بھلائی اس میں ہے کہ آئندہ مسلمانوں کے علاوہ کسی لڑائی میں حصّہ نہ لے۔"

بھاگونتی نے کہا۔ "کیسی غلطی؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ گوالیار کے لوگوں کو اس شکست کے بعد دوبارہ سر اُٹھانے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے؟"

گلاب چند نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ گوالیار کے عوام کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو اپنا دشمن خیال نہیں کریں گے۔"

ماں نے مُضطرب ہو کر کہا۔ "بیٹا! کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ اس شکست کی ذلّت کو بھول جائیں گے؟" "ماتا! یہ گوالیار کے عوام کی شکست نہیں بلکہ اس سماج کی شکست ہے جو چھوت اور اچھوت کی تفریق پر قائم ہے۔ یہ اس راجہ کی شکست ہے جس نے اپنی رعایا کو رکھوالوں کی بجائے بھیڑیوں کے حوالے کر دیکھا ہے۔ یہ اُونچی ذات کے ان برہمنوں کی شکست ہے جو اپنے سوا کسی کو انسان نہیں سمجھتے۔ اس شکست کے اثرات صرف ان

اُونچے ایوانوں میں محسوس کیے جائیں کے جن کی بنیاد عوام کی ہڈیوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ ان دیوتاؤں کی شکست ہے جنھوں نے انسانوں کے درمیان نفرت و حقارت کی دیواریں کھڑی کی ہیں۔ ایک برہمن یا کھشتری کو اس بات کا افسوس ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک نیچ ذات کے برابر کھڑا ہونے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن ایک نیچ ذات اس شکست کو اپنی فتح خیال کرے گا۔"

شکنتلا نے کہا۔ "آپ راجپوت ہو کر ایسی باتیں کہہ رہے ہیں؟"

گلاب چند نے جواب دیا۔ "ہاں! ایک راجپوت کی حیثیت سے مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیں کیونکہ مجھے اس نام کی بدولت عزت، دولت اور حکومت ملتی ہے لیکن اب وہ زمانہ گزر چکا ہے۔ میں راجپوت ہوتے ہوئے بھی اپنی شکست کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔ اب ہمارا مقابلہ اپنے سماج کے اچھوتوں کے ساتھ نہیں جنھیں ہم اپنی تلواروں اور اپنے دیوتاؤں کی قوّت سے مرعوب کر سکیں بلکہ اب بلکہ ہمارا مقابلہ ایسے لوگوں سے ہے جو ہر لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتے ہیں۔"

شکنتلا نے کہا۔ ”لیکن آپ تو ان سے جنگ کرنے گئے تھے؟“

”میں نے پِتا جی کے حکم کی تعمیل کی تھی لیکن جانے سے پہلے مجھے بات کا یقین تھا کہ راجہ معمولی مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دے گا۔“

گلاب چند کی ماں نے کہا۔ ”بٹیا! بھگوان کے لیے اپنے پِتا جی کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا۔ وہ آ رہے ہیں۔“ ”ماتا جی! آپ پریشان مت ہوں۔ پِتا جی مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔“

ٹھاکر کے ساتھ گاؤں کے دو عمر رسیدہ آدمی تھے۔ اس نے برآمدے کی طرف آنے کی بجائے دور سے گلاب چند کو اشارے سے بلایا اور پھر دیوان خانے کی طرف چلا گیا۔ گلاب چند برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

۲

بھاگونتی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔ ”شکنتلا! وہ آ رہے ہیں، وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔“

شکنتلا جو بھاگو نتی کی ماں کے قریب بیٹھی ہوئی تھی، اضطراری حالت میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بھاگو نتی اور اس کی ماں قدرے توقّف کے بعد باہر کے کمرے میں چلی گئیں اور شکنتلا کمرے میں تنہا کھڑی ہر لحظہ بڑھتے ہوئے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ دروازے سے باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سن کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ گلاب چند نے دروازے کے سامنے آ کر اندر جھانکا اور پھر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تشریف لائیے!"

عبد الواحد بڑے ٹھاکر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شکنتلا کی طرف ایک نظر دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایک موہوم سا خیال اس کے دماغ کی گہرائیوں تک جا پہنچا۔ اس نے جھجکتے ہوئے دوبارہ شکنتلا کی طرف دیکھا اور چند لمحات کے لیے اس کی نگاہیں شکنتلا کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ شکنتلا سے ملتی جلتی ایک اور صورت اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل کر شعور کی سطح پر ابھر آئی۔ "آشا!" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

گلاب چند نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ رنبیر کی بہن ہیں اور ان کا نام شکنتلا ہے۔“ عبدالواحد نے چونک کر اپنے پیچھے ٹھاکر اور گلاب چند کی طرف دیکھا اور پھر نادم سا ہو کر شکنتلا سے کہنے لگا۔ ”معاف کیجئے! میں کسی خیال میں کھو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ سکتا کہ دو صورتوں میں اس قدر مشابہت ہو سکتی ہے۔ میری نگاہیں تھوڑی دیر کے لیے دھوکا کھا گئیں تھیں۔“

بڑے ٹھاکر نے کہا۔ ”آپ تشریف رکھیں، میں آپ کے ساتھیوں کو دیکھ آؤں۔“

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے گلاب چند کو اشارہ کہا اور وہ بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

”تشریف رکھیے۔“ عبدالواحد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ شکنتلا جھجکتی ہوئی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

عبدالواحد نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آپ جس شخص کی پناہ میں ہیں وہ برا آدمی نہیں لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے آپ کو

غلط فہمی میں رکھنے کی کوشش کیوں کی۔ اگر وہ آپ کے گاؤں گیا ہوتا تو یقیناً آپ کے پاس یہ خبر لے کر آتا کہ قنوج کے کونے کونے میں آپ کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ قنوج کے حکمران کی شکست سے چند دن قبل ہی رنبیر اپنے گاؤں پر قابض ہو گیا تھا اور اب اس کی زندگی کا مقصد صرف آپ کو تلاش کرنا ہے۔"

شکنتلا نے کہا۔ "لیکن بھگوان کے لیے مجھے یہ بتائیے کہ اب وہ کہاں ہے؟"

"ان دنوں وہ اپنے گاؤں میں نہیں لیکن آپ تسلّی رکھیں، وہ عنقریب وہاں پہنچ جائے گا۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"ہاں!"

"پھر آپ مجھے کیوں نہیں بتاتے۔ میں اس کی بہن ہوں۔" عبدالواحد کو شکنتلا کے الفاظ سے زیادہ اسی کی ملتجی نگاہوں نے متاثر کیا۔ اس آپ کہا۔

"کیا آپ اپنے بھائی کی جان خطرے میں ڈالنا گوارا کریں گی؟"

"نہیں!"

"تو پھر آپ ابھی یہ نہ پوچھیے کہ وہ کہاں ہے۔ اس وقت آپ کے لیے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ اسے آپ کے متعلق اطلاع مل جائے گی۔"

"اُسے کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"نہیں۔ مجھے کوئی ڈیڑھ ماہ قبل اس کا پیغام ملا تھا۔ اسے پہلے اگر کوئی خطرہ تھا بھی تو وہ ٹل چکا ہے۔"

"کیا میرا اس کے پاس پہنچا ممکن نہیں۔"

"نہیں ابھی آپ اس کے پاس نہیں جا سکتیں۔ اس وقت آپ کا اپنے گھر پہنچنا بہتر ہو گا۔ گلاب چند کا باپ آپ کو وہاں پہنچانے کا انتظام کر دے گا۔ میں اس مقصد کے لیے اپنے چند آدمی بھی چھوڑ جاؤں گا۔ میں خود بھی آپ کے ساتھ چلتا لیکن ہماری فوج کل تک گوالیار سے روانہ ہو جائے گی اور میرے لیے آج ہی واپس جانا اور ضروری ہے۔ اپنے گاؤں میں آپ کو

رنبیر کی غیر حاضری میں بھی کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ جے کرشن جیسے لوگ اس علاقے میں دوبارہ پاؤں نہیں رکھ سکتے۔"

"جے کرشن کہاں ہے؟"

"وہ گاؤں پر ہمارے حملے سے پہلے ہی کہیں روپوش ہو گیا تھا۔"

"تو گاؤں پر قبضہ کرنے میں آپ نے میرے بھائی کی مدد کی تھی؟"

"ہاں!"

شکنتلا گہری سوچ میں پڑ گئی۔ ایک طرف کیدار ناتھ کے متعلّق اس کا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس نے جان بوجھ کر اسے دھوکے میں رکھنے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف وہ عبدالواحد کے متعلّق یہ شک کے لیے تیار نہ تھی کہ وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ایک ہی نگاہ میں دوسروں کو اپنی صداقت اور خلوص کا معترف بنا لیتے ہیں۔ چند لمحات کے اندر اندر اس کے چہرے سے اجنبیت کا نقاب اتر چکا تھا اور شکنتلا ایک عورت کی ذکاوت سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک

چکی تھی۔

عبدالواحد نے کہا۔ ”اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا تو آپ تسلّی کے لیے میں گلاب چند کو وہاں بھیجنے کے لیے تیار ہوں۔“

”نہیں۔ میں گلاب چند سے آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکی ہوں۔ لیکن اگر آپ میرے لیے بالکل اجنبی ہوتے تو بھی شاید میں آپ کی کسی بات پر شک نہ کرتی۔ میں صرف یہ سوچ رہی تھی کہ کیدار ناتھ نے مجھے تاریکی میں رکھنے کی کوشش کیوں کی۔“

”اگر آپ چاہیں تو میں اسے یہاں بلا لیتا ہوں۔“

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کیدار ناتھ کو میرے بھائی کی مسلمانوں کے ساتھ دوستی پسند نہ آئی ہو اور اس نے اس خیال سے یہ بات مجھ سے پوشیدہ رکھی ہو کہ مجھے اس سے دکھ ہو گا۔“

”تو اب آپ کا اپنے بھائی کے متعلق کیا خیال ہے؟“

شکنتلا نے جواب دیا۔ ”میرا بھائی ایک دیوتا ہے اور میں ہمیشہ اس فخر کرتی

رہوں گی؟"

"آپ نے اپنے گھر جانے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

شکنتلا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس نے کہا۔ "یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے۔ میں فوراً وہاں پہنچنا چاہتی ہوں۔"

عبدالواحد نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تو یہاں میرا کام ختم ہوا۔ کل آپ صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں۔"

شکنتلا نے کہا۔ "میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھیے!"

"گلاب چند نے مجھے بتایا تھا کہ آپ میرے بھائی پر بہت مہربان تھے۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کی اس ہمدردی کی وجہ کیا تھی؟"

عبدالواحد نے جواب دیا۔ "آپ کی تسلّی کے لیے میں صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس نے ہماری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اپنی

غیرت کا سودا نہیں کیا تھا۔"

شکنتلا اس قدر غیر مبہم الفاظ میں اپنے سوال کا جواب سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے پریشان سی ہو کر کہا۔ "آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میں اپنے بھائی کے متعلّق یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ اس نے اپنی آن پر دھبّہ آنے دیا ہو گا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ قید سے رہا ہونے کے بعد اگر جے کرشن کی دشمنی اس کی زندگی کا راستہ نہ بدل دیتی تو وہ آپ کے متعلّق اور آپ اس کے متعلّق کیا سوچتے۔ کیا وہ آپ کی مدد حاصل کر کے گاؤں پر قبضہ کرنے اور اس کے بعد کہیں روپوش ہونے کی بجائے اپنے وطن کی حفاظت کے لیے قنوج، کالنجر اور گوالیار کی جنگوں میں حصّہ نہ لیتا؟"

عبدالواحد نے دوبارہ کرسی پر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ "اگر آپ ایسے سوالات پوچھنے میں جلدی نہ کرتیں تو اچھا ہوتا۔ میرا جواب سن کر آپ کو پریشانی ہو گی لیکن وہ دن دور نہیں جب آپ ان باتوں میں اپنے بھائی کی ہم خیال ہوں گی۔ اگر جے کرشن اس کے گاؤں پر قابض نہ ہوتا اور آپ اور آپ کے پِتا رنبیر کے استقبال کے لئے موجود ہوتے تو بھی وہ ہمارے

خلاف کسی جنگ میں حصّہ نہ لیتا۔ اس کی تلوار ہمارے خلاف اسی وقت بے نیام ہو سکتی تھی جب تک اس کی آنکھوں پر پردہ ہوتا اور آپ اور آپ کے پِتار نبیر کے استقبال کے لیے تھا۔ یہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد اس کے لیے ہمیں دشمن کی حیثیت سے دیکھنا ناممکن ہو چکا ہے۔ اب ہمارا راستہ اس کا راستہ اور ہماری منزل اس کی منزل بن چکی ہے۔ ممکن تھا کہ گھر آکر وہ اس منزل کی طرف قدم اٹھانے کا ارادہ بدل دیتا لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہمارے راستے میں کھڑا ہو جاتا۔ وہ اگر ہمارا ساتھ نہ دے تو بھی اس کی دعائیں ہمارے ساتھ ہوتیں۔ جے کرشن کی دشمنی کا صرف یہ نتیجہ نکلا ہے کہ وہ زیادہ دیر تذبذب کی حالت میں نہیں رہ سکا۔ یہ ایک تازیانہ تھا جس کی ضرب نے اسے پوری رفتار سے ہمارے ساتھ دوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

شکنتلا نے بے چین میں ہو کر کہا۔ "یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ آپ سے صرف ایک بات اور پوچھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اُمّید ہے کہ آپ مجھے جھوٹی تسلّی نہیں دیں گے۔ ان واقعات کے بعد آپ نے میرے بھائی

کے متعلق کیارائے قائم کی ہے؟"

عبدالواحد نے جواب دیا۔ "میں رنبیر کا دوست ہونے پر فخر کرتا ہوں۔"

شکنتلا نے اچانک اپنے دل میں مسرت کی دھڑکنیں محسوس کیں اور تشکّر کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "آپ بہت رحم دل ہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ قید میں اس کے دن کیسے گزرے۔ رہائی کے وقت اس کی صحت کیسی تھی۔ اور آخری بار جب آپ نے اسے دیکھا تھا تو وہ کیسا تھا؟"

عبدالواحد نے ان سوالات کے جواب میں مختصر طور پر رنبیر سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک کے واقعات بیان کر دی۔ لیکن اختتام پر اس نے سومنات کا ذکر کرنے کی بجائے شکنتلا کو صرف یہ بتا دینا کافی سمجھا کہ اب رنبیر اس دنیا کے ہر جے کرشن کے خلاف جنگ کا اعلان کر چکا ہے اور اب وہ ایک ایسی جگہ کے حالات معلوم کرنے جا چکا ہے جہاں ہزاروں جے کرشن انسانیت کا مُنہ نوچ رہے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں عبدالواحد کی نگاہیں کبھی کبھی غیر شعوری طور پر

شکنتلا کے چہرے کی طرف اُٹھ جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ آشا ایک نئے روپ میں اس کے سامنے آ گئی ہے۔ لیکن جب شکنتلا اس کی طرف دیکھتی تو اس کی نگاہیں خود بخود جھک جاتیں۔

عبد الواحد اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو شکنتلا کے دل میں اچانک کوئی خیال آیا اور اس نے کہا۔ "ٹھہریے! جانے سے پہلے مجھے یہ بتاتے جایئے کہ رنبیر کے متعلّق مجھے کب اور کیسے اطلاع ملے گی؟"

عبد الواحد نے مُڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میری ذمہ داری ہے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر میں قنوج واپس آ رہا ہوں اور آپ کو اپنے بھائی کے متعلق باقاعدہ اطلاع ملتی رہے گی۔"

تھوڑی دیر بعد محل سے باہر ٹھاکر اور اس کا بٹیا عبد الواحد کو الوداع کہہ رہے تھے۔ گاؤں کے بہت سے آدمی وہاں جمع تھے۔ عبد الواحد کے ساتھ جو بیس سوار اس ان میں سے دس شکنتلا کے ہمراہ جانے کے لیے ٹھہر گئے اور باقی اس کے ساتھ چلے گئے۔

۳

عبدالواحد کے رخصت ہوتے ہی شکنتلا نے کیدار ناتھ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ بھاگونتی بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کو ابھی اس بات کا علم نہ تھا کہ سلطان محمود کی فوج کا ایک بڑا افسر صرف شکنتلا کی خاطر وہاں آیا تھا۔ کیدار ناتھ کی بیوی شکنتلا کو دیکھتے ہی اُٹھ کر آگے بڑھی اور اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔ "بیٹی! میں ابھی تمہارے پاس آنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ تمہارے بغیر یہ گھر سونا پڑا تھا۔"

صحن میں ایک کھاٹ اور سرکنڈے کے دو مونڈھے پڑے تھے۔ کیدار ناتھ اندر جا کر ایک اور مونڈھا اُٹھا لایا۔ شکنتلا اور بھاگونتی کیدار ناتھ کی بیوی کے قریب مونڈھوں پر بیٹھ گئیں اور کیدار ناتھ ان سے تھوڑی دور گھاٹ پر جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر چاروں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر شکنتلا نے کیدار ناتھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "چچا! میں کل جا رہی

ہوں۔"

"کہاں؟" کیدار ناتھ نے چونک کر سوال کیا۔

"اپنے گاؤں!"

کیدار ناتھ اور اس کی بیوی کے چہروں پر اچانک اداسی چھا گئی۔

شکنتلا نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ "چچا! میں مرتے دم تک آپ کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکوں گی۔ لیکن آپ کو مجھے اندھیرے میں نہیں دکھنا چاہیے تھا۔"

کیدار ناتھ نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! مجھے صرف اس بات کا خیال تھا کہ میں سچ بول کر تمہارے دکھوں میں اضافہ کروں گا۔ تم اپنے بھائی کو دیوتا سمجھتی تھیں اور مجھے ڈر تھا کہ جب تمہیں اس کے متعلق وہ باتیں معلوم ہوں گی جن کا مجھے پتہ چلا ہے تو تمہاری زندگی اور تلخ ہو جائے گی۔ میں تمہیں یقین دِلاتا ہوں کہ جب ہم کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے تو تم میری نیّت پر شک نہیں کرو گی۔"

شکنتلا نے کہا۔ ”میں سب کچھ سن چکی ہوں۔ آپ گاؤں گئے تو آپ کو یہ معلوم ہو کہ میرا بھائی مسلمانوں کے ساتھ مل چکا ہے اور انہوں نے گاؤں پر قبضہ کرنے میں اسے مدد دی ہے۔ اس بات سے آپ کو میرے بھائی سے نفرت ہو گئی لیکن کاش آپ یہ سوچتے کہ میرے بھائی نے صرف میری خاطر یہ سب کچھ کیا تھا۔ اگر یہ پاپ تھا تو اس کا باعث میں تھی۔ پھر وہ ان حالات میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے دشمن کو اپنے وطن کی سرحد سے سینکڑوں کوس دور روکنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی۔ اس نے اپنی جوانی کے بہترین دن قید میں گزارے اور جب وہ رہا ہو کر واپس آیا تو اس کے گھر پر اس کے باپ کا قاتل قبضہ کر چکا تھا اور اسے اپنی بہن کے متعلّق اتنا بھی علم نہ تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔ جے کرشن نے اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی لیکن قدرت نے اسے بچا لیا۔ اس کے بعد آپ ہی بتائیے کہ وہ کیا کرتا۔ کیا وہ اس راجہ کے پاس جاتا جو جے کرشن کا سرپرست تھا۔ کیا وہ ان پروہتوں کے پاس جاتا جو اب ہمارے پِتا جی کی بجائے اس کے قاتل سے دان لیتے آتے تھے۔ کیا وہ اس سماج سے بھیک مانگتا جو صرف چڑھتے سورج کی پوجا جانتا ہے۔ اس نے قنوج کو اپنا خون

پیش کیا تھا لیکن قنوج نے اسے کیا دیا؟ ذلّت، رسوائی اور بے بسی۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف آخری دم تک لڑنے کا عہد کیا تھا لیکن جب وہ ان کی قید میں زندگی سے مایوس ہو گیا تو انہوں نے اس کے دل میں زندہ رہنے کی امید پیدا کی۔ پھر جب وہ رہا ہونے کے بعد دنیا کا مظلوم ترین انسان بن کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس کے دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کی۔ کیا آپ ان واقعات کے بعد اس سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ تنہا مسلمانوں کے لشکر کے سامنے کھڑا ہو جاتا کہ جے کرشن جیسے لوگ ہمیشہ کے لیے اس دنیا پر مسلط ہو جائیں؟ آپ کو خیال آیا ہو گا کہ مسلمانوں کا ساتھی بننے کے بعد وہ میرا بھائی نہیں رہا لیکن آج گوالیار کا راجہ بھی مسلمانوں کا ساتھی بن چکا ہے۔" کیدار ناتھ نے مُرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بیٹی! میرے پاس تمہاری کسی کا جواب نہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے یہی فرض کر لو کہ میرے لیے تمہاری جدائی صبر آزما تھی اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے اس بات کا سہارا لیا تھا کہ تم ان حالات میں اپنے بھائی کے پاس جانا گوارا نہیں کرو گی۔ تمہیں معلوم ہے جب میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے گاؤں کے بعض لوگ کہتے ہیں

کہ تمہارے بھائی کو جے کرشن کی قید سے چھڑانے والے مسلمان تھے اور شاید وہ اسے گاؤں پر دوبارہ قابض ہونے میں مدد دیں تو تم نے کہا تھا کہ اگر رنبیر مسلمانوں کی مدد سے بادشاہ بن جائے تو میں اس کے عالیشان محلوں میں رہنے کی بجائے بھیک مانگ کر پیٹ پالنے کو ترجیح دوں گی۔"

"میں اب بھی کہتی ہوں کہ میرے بھائی نے مسلمانوں سے اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ اسے صرف حالات نے ان کی گود میں ڈال دیا ہے اور ایسے حالات دنیا کے ہر انسان میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ قنوج اور گوالیار کا کوئی راجپوت اُسے بزدلی یا پست ہمتی کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ جن سورماؤں نے غزنی تک مسلمان کا تعاقب کرنے کا عہد کیا تھا وہ اب اپنے شہروں اور بستیوں میں ان کا سواگت کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہے کہ اگر مسلمانوں نے گوالیار کا رُخ کیا تو یہاں کا بچّہ بچّہ اپنی جان پر کھیل جائے گا لیکن جان پر کھیلنے والے آج اس بات پر خوشیاں منارہے ہیں کہ راجہ نے ہتھیار ڈال کر ملک کو تباہی سے بچالیا ہے۔ اس دھرتی پر صرف طاقت کی پوجا کی جاتی ہے۔ ایک دن وہ تھا جب ہمارے علاقے کے سردار میرے پِتا

جی کے اشاروں پر چلتے تھے۔ پھر جے کرشن کی باری آئی اور یہ لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔ اب مسلمانوں کا طوطی بول رہا ہے تو یہ ان کے ساتھ مل گئے، لیکن مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرا بھائی ان سب سے مختلف ہے۔ اگر یہ طاقت کی پوجا کرنے والوں میں سے ہوتا تو اتنی مدّت مسلمانوں کی قید میں نہ رہتا۔ وہ شاید اس وقت بھی قید سے باہر نہ نکلتا جب اس کے مغرور راجے اور مہاراجے چاروں طرف سے نا اُمّید ہو کر مسلمانوں کی اطاعت قبول کر چکے تھے لیکن ایک بہن کی التجاؤں نے اسے مجبور کر دیا۔ میں نے اسے پیغام بھیجا تھا۔ پھر قید سے نکلنے کے بعد جو کچھ اس نے کیا وہ سب میری خاطر تھا۔ کاش اس کے متعلّق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیتے۔ میری نگاہوں میں ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ ایک دیوتا ہے۔ اسے بزدلی کا طعنہ دینے والے کون ہیں؟ یہ راجے، یہ سردار اور یہ برہمن، جن پر محمود کا نام سن کر لرزہ طاری ہو جاتا ہے؟"

شکنتلا کیدار ناتھ کو قائل کرنے سے زیادہ اپنے آپ کو تسلّی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیدار ناتھ نے انتہائی کرب انگیز آواز میں کہا۔

”بیٹی! اب شاید تم میری کسی بات پر بھی یقین نہ کرو لیکن بھگوان جانتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ مجھے ہمیشہ اس بات کی ندامت رہی کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ کئی بار میرے دل میں خیال آیا کہ تم سے سچی بات کہہ دوں لیکن ہر بار میری ہمّت جواب دے جاتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ تم جب چلی جاؤ گی تو یہ بستی ہمارے لیے ویران ہو جائے گی۔ پھر اپنے غم کو دھوکا دینے کے لئے ان باتوں کا سہارا لیا کہ شاید تم اس کے پاس جانا گوارا نہ کرو۔ لیکن گوالیار کی شکست اور راجہ کی بزدلی کی خبر نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ خاص طور پر جب میں نے سنا کہ گوالیار کے کئی سردار کالنجر پر چڑھائی کے لیے محمود کا ساتھ دینے کو تیار ہیں تو میں نے محسوس کیا کہ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ پہلے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ایک بار پھر تمہارے گاؤں جاؤں گا۔ اگر تمہارا بھائی وہاں ہوا تو اسے اپنے ساتھ لے آؤں گا اور پھر تم دونوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہوں گا کہ بھگوان کے لیے میری غلطی کو ایک بوڑھے باپ کی کمزوری سمجھ کر معاف کر دینا لیکن اب شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ اگر تم میرے گھر میں جنم بھی لیتی تو بھی مجھے اس سے زیادہ عزیز نہیں ہو سکتی تھیں۔“

شکنتلا کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اسی نے کہا۔ ''مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ میں آپ کو ہمیشہ اپنا پِتا سمجھتی رہوں گی۔ آپ دونوں میرے ساتھ چلیں۔ رنبیر ابھی تک گاؤں واپس نہیں آیا۔''

کیدار ناتھ نے قدرے مطمئن ہو کر پوچھا۔ ''تمہیں اپنے گاؤں کا کوئی آدمی ملا۔''

''نہیں!'' شکنتلا نے جواب دیا۔

''تو پھر تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟''

شکنتلا نے اس کے جواب میں عبدالواحد کے ساتھ اپنی ملاقات کا تمام حال بیان کر دیا۔ کیدار ناتھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''بیٹی! تم جا رہی ہو۔ میں بھگوان سے پراتنا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں خوش رکھے لیکن ہمیں بھول نہ جانا۔''

''آپ میرے ساتھ نہیں جائیں گے؟''

''نہیں، ابھی نہیں۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم کسی دن ضرور آئیں

گے۔"

بھاگونتی جو انتہائی پریشانی کی حالت میں ان کی گفتگو رہی تھی۔ اچانک بولی "چچا! آپ پریشان نہ ہوں۔ شکنتلا زیادہ دیر ہم سے دور نہیں رہ سکتی۔ ہم سب کسی دن اس کے گاؤں جائیں گے اور اسے وہاں سے چھین لائیں گے۔"

اگلے دن شکنتلا اپنے گاؤں کا رُخ کر رہی تھی۔ ٹھاکر نے اس کے سفر کے لیے جو انتظامات کیے تھے وہ ایک عالی نسب شہزادی کی شان کے شایاں تھے۔ وہ بیلوں کے خوبصورت رَتھ پر سوار تھی۔ گاؤں کی دو عورتیں اس کی خدمت کے لیے ساتھ تھیں۔ عبدالواحد کے دس سواروں کے علاوہ ٹھاکر کے تیس سوار بھی اس کے ہمراہ تھے۔

۴

کالنجر کا قلعہ ایک وسیع اور بلند چٹان پر تعمیر کیا گیا تھا اور اسے برسوں سے ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ قلعے کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ اس کے اندر

پانچ لاکھ انسان، بیس ہزار گھوڑے اور پانچ سو ہاتھی بآسانی رہ سکتے تھے۔ سپاہیوں کے لیے رسد اور جانور کے لیے چارے کے اس قدر ذخائر جمع کیے گئے تھے کہ راجہ کی فوج مہینوں قلعہ بند ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ یہ عظیم الشّان قلعہ وسطی اور مشرق راجاؤں کی آخری امید تھا اور اس کی تسخیر کے بعد گنگا اور گوادری کے دھانوں تک سلطان محمود کی فتوحات کے راستے کھل جاتے تھے۔

ملک کے طول و عرض میں جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ غزنی کی افواج کالنجر کا رُخ کر رہی ہیں تو مندروں میں راجہ گنڈا کی فتح کے لیے دعائیں کی جانے لگیں۔ جنوب اور مشرق کے راجے گنڈا کے حکمران کو اس قسم کے پیغامات بھیج رہے تھے کہ آپ دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔ کالنجر کے قلعے کی دیواریں بڑے سے بڑے طوفان کا رُخ پھیر سکتی ہیں۔ ہم آپ کی مدد کے لیے آ رہے ہیں۔ اگر آپ نے ہمّت ہار دی تو اس طوفان کو نہیں روک سکے گا۔ ملک کے برہمن لوگوں کو اس قسم کی تسلیاں دے رہے تھے۔ دشمن نے اب اس سمت کا رُخ کیا ہے جہاں اسے تباہی کے سوا

کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہ ایک پہاڑ سے ٹکرانے جارہاہے۔ راجہ گنڈا کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ دشمن کسی طرح قلعے کی دیواروں تک پہنچ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گزشتہ لڑائی میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اب بھگوان سے دُعا کرو کہ دشمن اپنا ارادہ تبدیل نہ کرے۔ فلاں مندر کے فلاں پجاری اور فلاں پروہت کو دیوتاؤں نے خواب میں یہ خوشخبری سنائی ہے کہ محمود کی فوج غزنی تک پسپا ہو گی اور اس کے بعد بھارت کے سورما غزنی کی دیواروں تک اس کا تعاقب کریں گے۔ پھر ایک دن ملک کے طول و عرض میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ غزنی کی فوج کالنجر کے قلعے کا محاصرہ کر چکی ہے اور چند دن کے بعد لوگ کلیجہ تھام کر یہ خبر سن رہے تھے کہ کالنجر کے راجہ نے خراج ادا کرنے کہ شرط پر صلح کرلی۔ صرف یہی نہیں کالنجر کی ہمسایہ سلطنتوں کے کئی راجے سلطان کی اطاعت قبول کر چکے ہیں۔ اب اگر مسلمانوں نے پیش قدمی کی تو وہ ملک کی آخری سرحد تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن سلطان آگے نہیں بڑھے گا۔ وہ واپس جارہاہے۔ دور شمال میں کسی اور ملک کے کے حالات اسے بلا رہے ہیں۔ مندروں کے پجاری لوگوں سے کہہ رہے تھے ”بھگوان سے دعا کرو، سلطان دوبارہ اس

طرف نہ آئے، اب خلیج بنگال تک اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں۔"

دوسری طرف سومنات کے پجاری پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ لوگوں کو یہ سمجھا رہے تھے کہ جب تک تمام دیوتاؤں کے پجاری سومنات کے دیوتا کی برتری کا اعتراف نہیں کرتے، وہ ہر میدان میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائیں گے۔ اگر تم غزنی کے سیلاب کا رُخ پھیرنا چاہتے ہو تو سومنات کے پروہت کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ۔ مہا دیو فتح کا سہرا صرف ان راجوں اور مہاراجوں کے سر باندھیں گے جو مسلمانوں کے حملے کے دن سومنات کے دروازوں پر پہرا دے رہے ہوں گے۔ چنانچہ چند مہینوں میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک "سومنات چلو" کی پکار سنائی دینے لگی۔

۵

کالنجر سے سلطان کی واپسی کے دو ہفتے بعد شکنتلا کو معلوم ہوا کہ عبدالواحد پھر قنوج کا حاکم بن کر آگیا ہے۔ اسے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ اب عبدالواحد کی بدولت اسے اپنے بھائی کے متعلق اطلاع ملتی رہے گی

لیکن ڈیڑھ مہینہ گزر جانے پر بھی عبدالواحد کی طرف سے رنبیر کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔

ایک شام شکنتلا تنہا محل کی چھت پر ٹہل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اچانک موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں اور شکنتلا وسیع چھت کے درمیان ایک چھوٹی بارہ دری میں جا کر کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بچپن کے ان دنوں کے تصور میں کھو گئی، جب وہ اور رنبیر اس جگہ کھڑے ہو کر برسات کا منظر دیکھا کرتے تھے۔

شمبھو ناتھ ہانپتا ہوا پہنچا اور بارہ دری میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی! قنوج کا حاکم اس علاقے کا دورہ کر رہا ہے۔ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ وہ دریا کے پار سنت نگر کے سردار کے ہاں قیام کرے گا۔“

”اس نے کوئی پیغام نہیں بھیجا؟“ شکنتلا نے پر امید ہو کر سوال کیا۔

”نہیں۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی اس کے پاس جا کہ رنبیر کا پتہ پوچھتا ہوں۔“

”نہیں اب شام ہونے والی ہے۔ اگر رنبیر کے متعلق کوئی اطلاع ہوئی تو وہ خود یہاں آجائے گا۔“

شمبھوناتھ نے کہا۔ ”اگر رنبیر یہاں ہوتا تو قنوج کا حاکم اس علاقے میں کسی اور کے پاس کبھی نہ ٹھہرتا۔“

شکنتلا نے کہا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ وہ وہاں پہنچ چکا ہے؟“

شمبھوناتھ نے جواب دیا۔ ”پار سے جو آدمی آیا ہے اس نے بتایا ہے کہ شام تک وہ سنت نگر پہنچ جائے گا۔“

”تو پھر ہمیں یہ اُمّید رکھنی چاہیے کہ وہ کل ضرور یہاں آئے گا۔ تم نوکروں سے کہو کہ مہمان خانے کی صفائی کریں۔“ ”ہاں مہمان خانے کی حالت بہت خراب ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔“

بارش قدرے تیز ہو چکی تھی۔ شمبھوناتھ بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد شکنتلا ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں۔ ”وہ ضرور آئے گا۔ اسے ضرور آنا چاہیے۔ کیدارناتھ کے گھر

سے اپنے گاؤں پہنچنے کے بعد وہ اکثر اسے یاد کیا کرتی تھی۔ اس نے ایسے سماج کے آغوش میں آنکھ کھولی تھی جس کی بنیاد غیروں سے نفرت پر لکھی گئی تھی لیکن عبدالواحد کا تصوّر اسے ہمیشہ تشکّر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب کر دیا کرتا تھا۔ گھر پہنچنے کے بعد شمبھوناتھ کی زبانی اسے کئی اور باتوں کا علم ہوا۔ عبدالواحد نے نہ رنبیر کی قید سے رہائی کے واقعات بیان کرتے ہوئے ان زیورات کا ذکر نہیں کیا تھا جو اس نے اپنے بھائی کا فدیہ ادا کرنے کے لیے بھیجے تھے لیکن جب اس نے شمبھوناتھ کی زبانی تمام واقعات سنے تو اس کے دل پر گہرا اثر ہوا۔

گذشتہ ملاقات کے دوران میں شکنتلا کو دیکھتے ہی عبدالواحد کے منہ سے غیر شعوری طور پر آشا کا لفظ نکل گیا تھا۔ اب وہ اکثر یہ سوچا کرتی تھی۔ ''آشا کون ہے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ انسان جو دلوں کے قلعے مسخّر کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے خود کسی کی نگاہوں کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ ایک عورت کی ذکاوتِ حس سے اس کی مسکراہٹوں میں آنسوؤں اور آہوں کے رُکے ہوئے طوفان دیکھ چکی تھی۔ شمبھوناتھ نے اس کے سوالات کے

جواب میں صرف یہ بتایا تھا کہ وہ ایک نو مسلم ہے اور نگر کوٹ کے ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ شمبھو ناتھ کو کچھ معلوم نہ تھا لیکن شکنتلا کی ذہنی اُلجھنوں میں اضافہ کرنے کے لیے یہی کافی تھا۔ اس کا دماغ ہر روز عبد الواحد اور آشا کے متعلق ایک نیا افسانہ تراشا کرتا تھا۔ کبھی وہ یہ سوچتی کہ آشا شاید اس کی بہن ہے جسے کسی جے کرشن جیسے سنگدل آدمی نے چھین لیا ہے۔ کبھی یہ خیال کرتی کہ آشا کوئی ایسی لڑکی ہو گی جو اس کی محبّت ٹھکرا کر کسی اور کی ہو گئی ہے۔ یا شاید کسی المناک حادثے کے باعث وہ اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہے۔ کبھی کبھی اسے آشا پر رشک آنے لگتا لیکن پھر ضمیر کی ملامت سے اس کا دل لرز جاتا۔ ”وہ ایک ملیچھ۔ میرے بھائی کا دوست اور میرا محسن ہونے کے باوجود وہ ایک ملیچھ ہے۔ اس کی مردانہ وجاہت، اس کی حیا اور شرافت، نفرت کے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتے جو ہمارے درمیان حائل ہے۔“

بارش تیز ہو چکی تھی اور فضا میں رات کی تاریکی چھا رہی تھی۔ شکنتلا نیچے

آنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ شمبھو ناتھ نے سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر بُلند آواز سے کہا۔ ”بیٹی شکنتلا نیچے آؤ۔“

”کیا ہے چچا؟“

شمبھو ناتھ جلدی سے اوپر آیا اور بولا۔ ”بیٹی وہ آ گئے ہیں۔“

”کون؟ عبدالواحد؟“

”میں نے انہیں مہمان خانے میں بٹھا دیا ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے بدل لیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بارش ختم ہوتے ہی سنت نگر واپس چلے جائیں گے۔“

شکنتلا نے کہا۔ ”بارش شاید آج رات نہ تھمے۔ ہمیں ان کے کھانے کی فکر کرنی چاہیے۔ چلو!“

شمبھو ناتھ نے کہا۔ ”کھانے کے متعلق میں پوچھ چکا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دوپہر کا کھانا دیر سے کھایا تھا اس لیے ابھی بھوک نہیں۔ ان کے ساتھی بھی یہی کہتے ہیں۔“

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے شکنتلا نے سوال کیا۔ ”ان کے ساتھ کتنے آدمی ہیں۔“

”صرف تین نوکر ہیں۔ انہیں میں نے باہر کے مہمان خانے میں ٹھہرادیا ہے۔“

دوسری منزل کے برآمدے میں پہنچ کر شکنتلا نے کہا۔ ”چچا شمبھو! میں نیچے نہیں جاتی۔ تم انہیں اوپر لے آؤ۔“

شمبھو ناتھ نیچے چلا گیا اور شکنتلا نوکرانی کو ایک کمرے کی کرسیاں صاف کرنے کا حکم دے کر بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ دوسری نوکرانی نے برآمدے کا فانوس روشن کر دیا۔

٦

تھوڑی دیر بعد عبدالواحد اور شمبھو ناتھ برآمدے میں آئے۔ شکنتلا دروازے سے ہٹ کر کمرے میں آگئی۔ شمبھو ناتھ عبدالواحد کو کمرے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلا گیا اور عبدالواحد ایک ثانیہ توقّف کے

بعد اندر داخل ہوا۔

"میں آپ کو رنبیر کے متعلّق کچھ بتانے آیا ہوں۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

شکنتلا خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ رنبیر خیریت سے ہے۔ پانچ دن ہوئے مجھے اس کا پیغام ملا تھا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ سے رخصت کے بعد میں اس کے پاس اپنا ایلچی نہ بھیج سکا۔ وہ آدمی جو اس کام کے لیے موزوں تھا، فوج میں تھا۔ کالنجر کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد میں قنوج پہنچا تو وہ بیمار پڑا تھا۔ قریباً ایک ہفتے کے بعد وہ ٹھیک ہوا اور میں نے اسے رنبیر کے پاس روانہ کر دیا۔ اس کی روانگی سے کوئی دس دن بعد میرے پاس آپ کے بھائی کا ایلچی پہنچ گیا۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ اسے شاید وہاں کچھ اور مدّت لگ جائے۔ ایلچی نے وہ تمام حالات بیان کیے ہیں جن کے باعث اس کا وہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔"

شکنتلا نے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ابھی تک میرے یہاں پہنچنے کی اطّلاع نہیں ملی۔“

”آپ کا بھائی یہاں سے کافی دور ہے لیکن مجھے اُمّید ہے کہ اب تک میرا ایلچی اس کے پاس پہنچ چکا ہو گا۔“

شکنتلا نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ”بھگوان کے لیے بتایئے وہ کہاں ہے؟“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کو اسی دن بتا دیا ہوتا لیکن ساتھ کے کمرے سے کوئی عورت جھانک رہی تھی اور میں یہ بات صرف آپ تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔“

”وہ گلاب چند کی بہن ہو گی۔ تشریف رکھیے میں ابھی آتی ہوں۔“ شکنتلا یہ کہہ کر باہر نکل گئی اور عبدالواحد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد شکنتلا واپس آئی اور اس نے عبدالواحد کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔ میں نے نوکرانیوں کو دوسری طرف بھیج دیا ہے۔“

عبدالواحد نے کہا۔ ”آپ نے صرف ایک جے کرشن دیکھا ہے لیکن اس ملک میں اس وقت ہزاروں جے کرشن موجود ہیں اور اب اس ملک کی زمین چاروں اطراف سے سمٹ کر یہاں سے سینکڑوں میل دور ایک مقام پر جمع ہو رہے ہیں۔ اس اُمّید پر کہ ان کی متحدہ قوّت زمانے کے سیلاب کا رُخ پھیر سکے گی اور وہ اس ملک میں مساوات کا جھنڈا بلند کرنے والوں کو شکست دینے کے بعد انسانوں کی بستیوں کو ایک بار پھر بھیڑیوں کی شکار گاہیں بنا سکیں گے۔ آپ اس مقام کا نام سن کر پریشان ضرور ہوں گی لیکن یقین ہے کہ اگر آپ خود بھی رنبیر کی جگہ ہوتیں تو یہی کریں۔ جس دن جے کرشن کے آدمی رنبیر کا تعاقب کر رہے تھے، ایک نوجوان نے اس کی جان بچائی تھی۔ آپ نے رام ناتھ کی سرگزشت سُنی ہو گی۔“

شکنتلا نے کہا۔ ”مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ اس نے بھائی کی جان بچائی تھی۔ وہ اس محل میں بھائی کے ساتھ قیام کے دوران بے حد مغموم رہا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اچانک کہیں چلا گیا اور اس کے بعد اس کا پتہ نہیں چلا۔“

"میں آپ کو اس کی سرگزشت سناتا ہوں۔ اس کے بعد آپ یہ فیصلہ کر سکیں گی کہ آپ کے بھائی کو اس کی مدد کے لیے جانا کس قدر ضروری تھا۔"

"سنائیے!"

عبدالواحد نے مختصر طور پر رام ناتھ کی زندگی کے حالات سنا دیے۔ شکنتلا کچھ دیر سر جھکائے سوچتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "آپ کو یقین ہے کہ وہاں میرے بھائی کو کوئی خطرہ نہیں؟"

"ایک سپاہی کا کوئی کام خطرے سے خالی نہیں ہوتا لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر رنبیر کو کوئی خطرہ پیش آیا تو وہاں اس کے بہت سے مددگار موجود ہیں۔"

شکنتلا نے کہا۔ "اگر اس پر سومنات کے دیوتا کا عتاب نازل ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے پناہ نہیں دے سکے گی۔ وہ دیوتاؤں کا دیوتا ہے۔ آپ کو اس کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ اس کا غصّہ پہاڑوں کو بھسم کر سکتا ہے۔

سمندروں کو ریگستان بنا سکتا ہے۔ بھگوان کے لیے اسے واپس بلا لیجیے۔“

عبدالواحد نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”سومنات مندر میں ان بھاری پتھروں کے سوا کچھ نہیں جنہیں سنگ تراشوں کی محنت نے عجیب و غریب شکلوں میں بدل دیا ہے۔ کبھی یہ پتھر پہاڑوں میں بکھرے ہوئے ہوتے تھے اور اب تیشے کی کرامت نے انہیں مندروں کی زینت بنا دیا ہے۔ ایک پتھر دریا کے کنارے پڑا ہوا ہے۔ دوسرا آپ کے محل کی دیوار میں لگا ہوا ہے۔ تیسرا پتھر آپ کے گاؤں کی مورتی بن گیا ہے۔ اگر دریا کے کنارے پڑے ہوئے پتھر کو تراش کر مندر میں رکھ دیا جائے اور مندر کے بُت کو اُٹھا کر آپ کے محل کی دیوار میں لگا دیا جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ذرا اطمینان سے سوچیے کہ سومنات کے دروازے کی سیڑھی اور سومنات کے مندر کی مورتی کے پتھر میں کیا فرق ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اگر کسی سنگ تراش کی مرضی ہوتی تو سیڑھی کے پتھر کو تراش کر مندر کی مورتی بنا دیتا اور دوسرے پتھر کو سیڑھی میں لگا دیتا۔ اگر آپ ان دو پتھروں کو توڑ کر ان کے ٹکڑے غور سے دیکھیں تو آپ کو

کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔"

شکنتلا اپنے تصوّرات کی دنیا میں ایک خوفناک زلزلے کے جھٹکے محسوس کر رہی تھی۔ اس کی حالت اس پرندے کی سی تھی جو آندھی میں اپنے نشیمن کے بکھرتے ہوئے تنکوں کے ساتھ چمٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "نہیں نہیں۔ یوں نہ کہیے۔ آپ میرے محسن ہیں لیکن سومنات ہمارا دیوتا ہے۔"

عبدالواحد نے کہا "ہر انسان اپنے توہمات کی دنیا سے باہر نکلتے ہوئے تکلیف محسوس کرتا ہے۔ کبھی میں بھی آپ کی طرح تھا۔ مجھے بھی ان مورتیوں سے محبت تھی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ پتھر کے ان تراشے ہوئے ٹکڑوں کی آڑ میں ہوشیار انسانوں کا ایک گروہ ہمیشہ سادہ دل، کمزور اور بے بس انسانوں کا شکار کھیلتا رہا ہے۔ اونچی ذات کے لوگ ان مورتیوں کی عظمت اور ہیبت کا ڈھنڈورا اس لیے پیٹتے ہیں کہ ایسا کرنے سے انہیں نیچ ذات انسانوں پر برتری حاصل ہوتی ہے۔ اچھوت رذیل ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ سماج کی تراشی ہوئی مورتیوں کے سامنے

آنسو، خون اور پسینہ پیش کرتا رہے۔ برہمن پوتر ہے اس لیے اُسے حق ہے کہ وہ ان پتھروں کے نام پر ملک کی تمام دولت سمیٹ کر اپنے مندروں میں جمع کر لے۔ ان بُتوں نے انسان اور انسان کے درمیان نفرت اور حقارت کے پردے کھڑے کیے ہوئے ہیں۔ ان کا ٹوٹنا ضروری ہے۔ ان پر سونے کے غلاف چڑھانے، انہیں ہیروں اور موتیوں سے سجانے اور ان کے لیے عظیم الشان مندر تعمیر کرنے کے باوجود اونچی ذات کے انسانوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ نیچ ذات کے انسانوں کو قدرت کے ہر انعام سے محروم کر دیں۔ کیا یہ مذاق نہیں کہ بھگوان نے پہلے اونچی ذات کے انسانوں کو بنایا، پھر اچھوتوں کو پیدا کیا اور پھر ان پتھروں کو بنایا تاکہ وہ انہیں تراش کر مورتیاں بنائیں اور بھگوان کو خوش کرنے کے لیے ان کے سامنے اچھوت کا بلیدان پیش کریں۔ کیا ان بتوں کا ٹوٹنا ضروری نہیں جو برہمن کے بھجن سن کر خوش ہوتے ہیں لیکن شودر کی شاہ رگ سے خون کی دھار ان کے پاؤں دھونے کے بعد بھی انہیں متاثر نہیں کر سکتی۔ کیا ان بتوں میں اس خالق کا تصوّر سما سکتا ہے جس کے حکم سے چاند، سورج اور ستارے گردش کرتے ہیں، جو مٹی سے پھُول پیدا کرتا

ہے۔ جس نے چھوت اور اچھوت کو ایک سا جسم ایک سی آنکھیں اور ایک سا دل و دماغ عطا کیا ہے۔ کیا اس کے سورج کی روشنی ان کے گھر تک نہیں پہنچتی؟ اس کے بادل شودر کی کھیتی پر نہیں برستے۔ کیا جو بیج شودر کے ہاتھوں زمین میں بویا جاتا ہے، وہ درخت نہیں بنتا؟ پھر اس سماج میں صرف شودر ہی مظلوم نہیں۔ یہاں ہر طاقتور مظلوم کا گلا گھونٹتا ہے۔ جو دیوتا ایک برہمن یا کھشتری کو شودر پر ظلم کرنے کی اجازت دیتے ہیں، وہ انہیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے سے منع نہیں کر سکتے۔

جب انسانوں کے تراشے ہوئے بُت ٹوٹ جائیں گے اور انسان اپنے خالق کے سامنے سر جھکا دے گا تو اس ملک کے برہمن، کھشتری، ویش اور شودر ایک ہی سطح پر نظر آئیں گے۔ اچھائی اور برائی کی تمیز خون سے نہیں، بلکہ اعمال سے کی جائے گی۔ نحیف اور لاغر انسانوں پر اپنا بوجھ لادنے والے نہیں بلکہ ان کا بوجھ اٹھانے والے قابلِ عزّت سمجھے جائیں گے۔ اب ان دیوتاؤں کا زمانہ ختم ہو گیا ہے جن کی بدولت اس ملک میں صرف ظلم کا بول بالا ہوا تھا۔ اب قانون کے ترازو کا پلڑا صرف برہمن کی طرف نہیں

جھکے گا۔ اب جے کرشن جیسے لوگ مجرموں کے کٹہرے میں نظر آئیں گے۔"

شکنتلا نے عاجز سی ہو کر کہا۔ "میں آپ سے بحث نہیں کر سکتی لیکن آپ مجھے اپنے دیوتاؤں سے بد ظن کرنے پر کیوں مُصر ہیں؟"

"اس لیے کہ آپ رنبیر کی بہن ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ زندگی میں آپ کے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔"

شکنتلا کے جسم پر اچانک کپکپی طاری ہو گئی اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "تو کیا وہ مسلمان ہو چکا ہے؟"

"نہیں۔ اس نے ابھی مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا لیکن میں اس کے دل کا حال جانتا ہوں اور اس کا دل اسلام کی صداقت پر ایمان لا چکا ہے لیکن ابھی تک وہ اس بات کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری ایک بہن کی محبت ہے۔ اسے اس بات کا اندیشہ تھا مسلمان ہو جانے کے بعد آپ سے دوبارہ ملنے کے امکانات کہیں ہمیشہ کے

لیے ختم نہ ہو جائیں۔ وہ اس نئی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے آپ کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ میری ان باتوں سے پریشان نہ ہوں۔ کم از کم آپ کو اپنے بھائی کے متعلق یہ یقین ضرور ہونا چاہیے کہ وہ کسی خوف یا لالچ کے باعث اپنا دھرم چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔"

شکنتلا نے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرا بھائی جو راستہ اختیار کرے گا مجھے اس پر چلنا پڑے گا۔ میں اس کے پیچھے آگ میں کودنے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔"

عبدالواحد نے کہا۔ "اسلام اندھی تقلید نہیں سکھاتا۔ یہ زندگی کا ایک اصول ہے جس پر ایمان لانے سے پہلے اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔ پھر شاید آپ کو محسوس ہو کہ آپ مجبوری کی حالت میں نہیں بلکہ خوشی سے اپنے بھائی کا ساتھ دے رہی ہیں۔ لیکن اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ آپ بھی شاید میری باتوں سے اُکتا گئی ہوں۔"

شکنتلا نے کہا۔ "نہیں، میں سُننا چاہتی ہوں۔ ابھی بارش نہیں تھمی۔ آپ

صبح چلے جائیں۔"

عبدالواحد نے مختصراً اسلام کے ابتدائی اصول، پیغمبر اسلام کی زندگی ان زندگی کے حالات اور کفر و اسلام کی جنگوں کے واقعات بیان کیے۔ اس کی تقریر کے دوران شکنتلا یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دل کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو رہا ہے۔ عبدالواحد کی گفتگو کے اختتام پر اس نے سوال کیا۔ "کیا سلطان خود بھی اس زمانے کے مسلمانوں کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے؟"

عبدالواحد نے جواب دیا۔ "وہ لوگ انسانیت کا بہترین نمونے تھے اور سلطان کو ان کے ساتھ کوئی نسبت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی فتوحات اسلام کے ان مبلّغوں کے لیے راستہ صاف کر دیں گی جن میں ہم اس زمانے کی جھلک دیکھ سکیں گے۔ سلطان نے قلعوں کو فتح کیا ہے لیکن یہ لوگ انسانوں کے دلوں کو مسخّر کریں گے۔ شمالی ہند کے علاقوں میں وہ درویش خصلت انسان پہنچ چکے ہیں جن کی نگاہوں کی قوّتِ تسخیر محمود کی تلوار سے کہیں زیادہ ہے۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پیر عبد الواحد نے کہا۔ ”مجھے اب اجازت دیجیے۔ میں علی الصبح یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں دو ہفتوں کے اندر اندر اپنا دورہ ختم کر کے غزنی کا رہا ہوں۔ وہاں شاید مجھے کچھ مدّت ٹھہرنا پڑے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں سے مجھے کسی اور طرف بھیج دیا جائے لیکن میری غیر حاضری میں آپ کو اپنے بھائی کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قنوج میں میرا قائم قام آپ کو برابر رنبیر کا پتہ دیتا رہے کا۔ جب رنبیر آئے گا تو اسے میرا سلام کہہ دیں۔“

شکنتلا کے چہرے پر اچانک اداسی چھا گئی۔ اس نے مغموم آواز میں کہا۔ ”اگر آپ کو غزنی سے کسی اور جگہ بھیج دیا گیا تو بھی آپ بھائی سے ملنے کے لیے تشریف لایا کریں گے؟“

”اگر موقع ملا تو میں ضرور آؤں گا۔ اب آپ آرام کریں۔“ عبد الواحد یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

شکنتلا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”پوچھیے!“

شکنتلا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”آشا کون ہے؟“

عبدالواحد مبہوت سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

شکنتلا نے دوبارہ کہا۔ ”معاف کیجیے۔ شاید یہ گستاخی کی بات ہو لیکن اس دن جب آپ نے مجھے دیکھا تھا تو آپ کے منہ سے آشا کا لفظ نکل گیا تھا۔“

عبدالواحد نے گردن جھکاتے ہوئے مغموم آواز میں کہا۔ ”ابھی آپ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھیں۔ جب آپ کا بھائی آئے گا تو وہ آپ کو آشا کے متعلق بہت کچھ بتا سکے گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔“

شکنتلا عبدالواحد کو سیڑھیوں تک پہنچانے کے لیے باہر نکلی۔ شمبھوناتھ انتہائی اضطراب کی حالت میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد شکنتلا اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ ”یہ آشا کون ہے؟ اس نے میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا؟“ اور بستر پر لیٹ کر دیر تک سوچتی رہی۔ بالآخر اُسے نیند آ گئی، گہری اور میٹھی نیند اور پھر جب

وہ بیدار ہوئی تو صبح ہو چکی تھی۔ وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکلی۔ ایک نوکرانی برآمدے میں صفائی کر رہی تھی۔

شکنتلا نے کہا "کیا مہمان جا چکے ہیں؟"

"وہ تو پچھلے پہر ہی روانہ ہو گئے تھے۔" نوکرانی نے جواب دیا۔ یہ سن کر شکنتلا کا دل بیٹھ گیا۔

رام ناتھ کا سفر

رنبیر کے گاؤں سے رخصت ہونے کے بعد رام ناتھ کی منزلِ مقصود سومنات تھی۔ چند دِن کے سفر کے بعد وہ ایک شام دریائے چمبل کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوا۔ گاؤں کے چوپال میں چند آدمی اسے دیکھتے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نو عمر لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ رام ناتھ نے گھوڑے سے اُتر کر گاؤں کے چودھری کے متعلق پوچھا۔ نو عمر لڑکے نے جواب دیا۔ ”مہاراج! وہ سردار کا حکم ملتے ہی آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گئے تھے۔ گاؤں میں صرف پندرہ بیس آدمی رہ گئے ہیں اور ان میں سے کوئی شکار

میں حصّہ لینے کے قابل نہیں۔"

رام ناتھ نے کہا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ میں ایک مسافر ہوں۔"

لڑکے نے کہا۔ "آپ کی سیوا ہمارا فرض ہے۔ میں چودھری کا لڑکا ہوں۔ آیئے بیٹھیے۔"

رام ناتھ ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ چودھری کا لڑکا گھوڑے کو ایک آدمی کے سپرد کرکے اس کے سامنے بیٹھا اور باتوں باتوں میں رام ناتھ کو معلوم ہوا کہ انہل واڑہ کا مہاراجہ مقامی راجہ کی دعوت پر شیر کے شکار کے لیے آیا ہوا ہے اور علاقے کے سردار اسے شکار میں مدد دینے کے لیے یہاں سے تھوڑی دور جنگل میں میں اپنے اپنے آدمی جمع کر رہے ہیں۔

رام ناتھ علی الصبح اس گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ کوئی تیس کوس ایک گھنے جنگل میں چلنے کے بعد اُسے چند ہاتھی نظر آئے جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے۔ شکاری ان ہاتھیوں پر سوار تھے اور ان کے پیچھے پیادہ آدمی نیزے اور بھالے سنبھالے کھڑے تھے۔ ایک نوجوان نے

رام ناتھ کو اشارے سے روکا اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”آپ انہل واڑہ کے مہاراج کے آدمی ہیں؟“

”نہیں۔“ رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”میں ایک مسافر ہوں۔“

”تو یہیں ٹھہرو! اس طرف سے کسی کو آگے جانے کی اجازت نہیں۔“

”تو میں دوسری طرف سے نکل جاتا ہوں۔“

نوجوان نے برہم ہو کر کہا۔ ”میں کہتا ہوں کہ آگے نہیں جا سکتے۔ دائیں، بائیں اور سامنے کی سمتوں سے ہمارے آدمی شکار کو گھیر کر لا رہے ہیں۔ تمہارے ہی فائدے کی بات کرتا ہوں۔ فوراً واپس چلے جاؤ۔ گھوڑے کو یہاں کھڑا کرنے کی اجازت نہیں۔“

دور سے آدمیوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ رام ناتھ پر تھوڑی دیر کے لیے شکار سیکھنے کی خواہش غالب آگئی اور اس نے گھوڑے سے اتر کر نوجوان سے کہا۔ ”مجھے شکار دیکھنے کا شوق ہے۔ اگر اجازت ہو تو آپ کے کھڑا ہو جاؤں۔“

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ”تم پیچھے کسی درخت پر چڑھ کر تماشا دیکھو۔“
رام ناتھ کا چہرہ غصّے سے تمتما اٹھا لیکن اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔
”وقت آنے پر آپ مجھے بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکیں گے۔“

نوجوان نے کہا۔ ”اگر میری بات سے تمہیں رنج پہنچا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ نیزے اور ڈھال کے بغیر تمہارا یہاں کھڑا ہونا درست نہیں لیکن اس کے باوجود اگر تم بہادری دکھانا چاہتے ہو تم میں منع نہیں کرتا۔ گھوڑے کو ذرا پیچھے کسی درخت کے ساتھ باندھ آؤ۔“

”آپ اطمینان رکھیے میری تلوار لکڑی کی نہیں۔“ یہ کہہ کر رام ناتھ اپنا گھوڑا پیچھے لے گیا اور اسے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے ساتھ باندھ شکاریوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

۲

شکار کو گھیر کر لانے والے آدمیوں کی چیخ و پکار زیادہ قریب سنائی دے

رہی تھی۔ شکاری خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گیدڑ خرگوش اور بھیڑیے بدحواسی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

رام ناتھ سے آگے تھوڑی دور انہل واڑہ کا مہاراجہ بھیم دیو ایک ہاتھی کے سنہری ہودج میں کھڑا اِدھر اُدھر جھانک رہا تھا۔ ایک تجربہ کار شکاری اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ مہاراجہ ایک خوش وضع اور قوی ہیکل آدمی تھا۔ اس کے ہاتھی کے ماتھے پر موتیوں کی جھالر اور گلے میں سونے کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ پاؤں میں سونے ایک بھاری کڑے چمک رہے تھے۔

اچانک دو چیتے نمودار ہوئے اور شکاریوں نے انہیں دونوں طرف سے ہانک کر راجہ کے سامنے لانے کی کوشش کی لیکن ایک چیتے نے اچانک جست لگائی اور ایک شکاری کے جسم پر اپنے پنجوں کے نشان چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ دوسرے چیتے کو راجہ بھیم دیو نے بھالا مارا۔ چیتے نے زخمی ہو کر ایک پلٹا کھایا پھر غضبناک ہو کر جست لگائی اور راجہ کے فیل بان کے سینے میں پنجے گاڑ دیے۔ بدحواس ہاتھی نے اپنی سونڈ گھمائی اور فیل بان اور چیتا

دونوں اس کی لپیٹ میں آکر نیچے گر پڑے۔ مہاراجہ کے ساتھی نے چیتے کو بھالا مار کر فیل بان کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن بد حواس ہاتھی چند قدم آگے نکل گیا۔ اتنی دیر میں دوسرے شکاریوں کے سامنے چند اور شیر اور چیتے آگئے اور وہ فیل بان کا خیال کرنے کی بجائے اپنی اپنی جان بچانے کی فکر کرنے لگے۔ رام ناتھ نے بھاگ کر چیتے پر حملہ کیا۔ اس کی تلوار پوری قوّت سے چیتے کی کھوپڑی پڑ لگی اور وہ دو تین پلٹیاں کھا کر بے حسی و حرکت لیٹ گیا لیکن فیل بان بھی اس کے ساتھ ہی اپنا سفر حیات ختم کر چکا تھا۔ اتنی دیر میں دوسرے شکاری دو شیر مار چکے تھے۔ چند درندے شکاریوں کی صفیں چیر کر آگے نکل گئے اور باقی جنگل میں چھپ گئے۔ راجہ بھیم دیو کا ہاتھی کوئی چالیس پچاس قدم دور دور جا کر رُکا۔ اس کے محافظ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک سردار کا فیل بان اپنے ہاتھی سے اُتر کر راجہ کے ہاتھی کو قابو میں کرنے کے لیے بڑھا لیکن ابھی کچھ دور ہی تھا کہ تین شیر بیک وقت جنگل سے نمودار ہوئے۔ دو شیروں نے راجہ کے پیادہ محافظوں پر حملہ کر دیا اور آن کی آن میں دو آدمیوں کو پھاڑ ڈالا۔ تیسرے شیر نے جست لگائی اور راجہ کے ہاتھی کی گردن پر سوار

ہو گیا۔ راجہ نے برچھا مار کر شیر کو نیچے گرا دیا لیکن ایک ہاتھی جو پہلے ہی بد حواس تھا چنگھاڑتا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔ رام ناتھ نے یہ دیکھ کر ایک گرے ہوئے شکاری کا نیزہ اور ڈھال اُٹھائی اور تیزی راجہ کے ہاتھی کے پیچھے دوڑنے لگا۔ جب بد حواس ہاتھی ایک درخت کے نیچے سے گزرنے لگا تو راجہ نے ایک جھکی ہوئی شاخ کے ساتھ لٹک کر اپنی جان بچائی لیکن اس کا ساتھی خبر دار ہونے سے قبل درخت کے ایک مضبوط تنے کی زد میں آ گیا اور ہودج تنے سے ٹکرا کر شکاری سمیت زمین پر گر پڑا۔ ہاتھی آگے نکل گیا۔ شکاری کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور اسے دوبارہ گردن اٹھانے کی ہمّت نہ ہوئی۔ راجہ ابھی تک بے بسی کی حالت میں درخت پر ہی لٹک رہا تھا کہ اچانک ایک چیتا جو کسی شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو کر پاس کی جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا ایک دم جست لگا کر اس درخت کے اس تنے پر پہنچ گیا جہاں سے وہ راجہ پر آسانی نے حملہ کر سکتا تھا لیکن ارد گرد آدمیوں کی چیخ و پکار نے اُسے بد حواس کر دیا اور وہ راجہ کی بجائے نیچے دیکھنے گا۔ راجہ نے درخت سے اُترنا زیادہ خطرناک سمجھ کر اپنی ٹانگیں اوپر کر لیں اور شاخ پر جم کر بیٹھتے ہوئے نیام سے تلوار نکال لی۔ اچانک چیتے

نے گردن اٹھائی۔ راجہ اُسے حملے کے لیے تیار دیکھ کر سراسیمہ ہو گیا اور چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو مدد کے لیے بُلانے گا۔

رام ناتھ جھاڑیوں میں سے بھاگتا ہوا درخت کی طرف بڑھا۔ تین اور شکاری چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ اتنے میں راجہ بلند آواز میں چلّایا۔ ”ہوشیار! اوپر سے چیتا حملہ کرنے والا ہے۔“

رام ناتھ نے فوراً اوپر دیکھا تو چیتا اس پر حملے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ڈھال پھینک دی اور دونوں ہاتھوں میں نیزہ سنبھال کر چیتے کی زد میں کھڑا ہو گیا۔ چیتے نے ایک خوفناک گرج کے ساتھ نیچے چھلانگ لگا دی۔ رام ناتھ نے گھٹنوں کے بل ہو کر نیزہ زمین سے لگا دیا اور نوک چیتے کے سامنے کر دی۔ خوش قسمتی سے چیتا سیدھا نیزے پر گرا۔ اس کی نوک چیتے کی گردن اور سینے کو چیرتی ہوئی کمر کے قریب جا نکلی۔ چیتے کے بوجھ کے باعث نیزہ درمیان سے ٹوٹ گیا لیکن رام ناتھ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی تلوار نکال لی اور اتنی دیر میں دوسرے شکاری بھی وہاں پہنچ گئے۔

چیتا زمین پر اچھل اچھل کر پلٹنیاں کھا رہا تھا۔ شکاریوں نے آن کی آن میں اسے اپنے نیزوں سے چھلنی کر دیا۔ تھوڑی دیر میں مقامی راجہ اور کئی سردار وہاں جمع ہو چکے تھے۔

۳

مہاراجہ بھیم دیو درخت سے اُترا۔ لوگوں نے بُلند آواز سے "مہاراج کی جے ہو" کا نعرہ بلند کیا لیکن بھیم دیو کسی اور کی طرف توجہ دینے کی بجائے اپنی آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھتا ہوا سیدھا رام ناتھ کی طرف بڑھا اور کچھ کہے بغیر اپنے گلے سے موتیوں کی بیش قیمت مالا اُتار کر اس کے گلے میں ڈال دی۔ چند آدمیوں نے مل کر ہودج کے نیچے دبے ہوئے شکاری کو نکالا لیکن وہ زندگی کی دلچسپیوں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکا تھا۔ بھیم دیو نے آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے اپنے میزبان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرا بہترین شکاری مارا جا چکا ہے اور میں اس کے عوض آپ کا بہترین شکاری اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

میزبان نے جواب دیا۔ "مہاراج کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں سمجھتا ہوں

کہ یہ نوجوان آپ کے ساتھ آیا ہے۔“

بھیم دیو نے کہا۔ ”اگر یہ میرے ساتھ ہوتا تو آپ اسے میرے بہترین ہاتھی پر سوار دیکھتے۔“

”تو پھر شاید یہ اجین کے مہاراج کے ساتھ آیا ہو۔“

رام ناتھ نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”نہیں مہاراج! میں کسی کے ساتھ نہیں آیا۔ میں ایک مسافر ہوں اور محض اتفاق تھا کہ میں اس طرف آ نِکلا۔“
بھیم سنگھ نے سوال کیا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

”قنوج سے مہاراج!“

”اور کہاں جا رہے تھے؟“

”مہاراج! میں سومنات کی یاترا کے لیے جا رہا ہوں۔ وہاں میں نے ایک منّت مانی تھی۔“

”آج تم ہمارے مہمان ہو۔“

”مہاراج کی خواہش میری خوشی ہے۔“

بھیم دیو شکار ختم کرنے کا حکم دے کر اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹ آیا۔ اگلے دن رام ناتھ رُخصت لینے کے لیے حاضر ہوا تو مہاراجہ نے اُسے یاترا کے بعد انہل واڑہ آنے کی دعوت دی اور کہا۔ ”اگر تم ہماری فوج کی ملازمت پسند کرو تو ہمیں بہت خوشی ہو گی۔“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”میں وعدہ نہیں کرتا لیکن شاید میرے حالات مجھے کسی دن آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے مجبور کر سکیں۔“

”ہم تمہارا انتظار کریں گے اور ہم نے تمہیں سومنات پہنچانے کا انتظام بھی کر دیا ہے۔“

”نہیں مہاراج! مجھے وہاں جانے کے لیے کسی خاص انتظام کی ضرورت نہیں۔“

”ہماری خواہش ہے کہ تم ہمارے ایک دوست کی حیثیت سے ہاتھی پر سوار ہو کر جاؤ۔ ایک فیل بان کے علاوہ چار نوکر تمہارے ساتھ جائیں گے

اور وہاں پہنچ کر تمہیں یہ کہنے کی اجازت ہو گی کہ میں انہل واڑہ کے تیس بڑے سرداروں میں سے ایک ہوں۔ ہم تمہیں وہاں ایک بہت بڑی جاگیر دینے کا فیصلہ کا چکے ہیں۔ یہ انعام نہیں بلکہ تمہاری بہادری کا خراج ہے۔"

رام ناتھ جیسے خواب کی حالت میں یہ الفاظ سُن رہا تھا۔ تشکّر اور احسان مندی کے اظہار کے لیے اس کے پاس الفاظ نہ تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھی پر سوار ہو کر اپنی منزل کا رُخ کر رہا تھا۔ چار سوار اس کے ہمراہ تھے۔ یہ اس کے پُرانے خوابوں کی تعبیر تھی۔ وہ دل ہی دل میں محسوس کر رہا تھا کہ زندگی میں میرے اور رنبیر کے راستے مختلف ہیں۔ روپ وتی کو پا لینے کے بعد میری زندگی میں کوئی خلا باقی ن رہے گا۔ مجھے ہندوستان سماج اور محمود غزنوی کے حملوں سے کوئی سروکار نہیں ہو گا۔ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی کہ پتھر کی مورتیاں ٹوٹتی ہیں یا سلامت رہتی ہیں۔ روپ وتی کو حاصل کرنے کے بعد مجھے ایک جائے پناہ کی ضرورت تھی اور وہ مجھے مل گئی ہے۔ اب میں ایک بے خانماں

مسافر کی حیثیت سے نہیں بلکہ انہل واڑہ کے ایک بااثر سردار کی حیثیت سے وہاں جاؤں گا۔ سومنات کے پروہت کو یہ ہاتھی دان کرتے کے بعد مجھے آزادی کے ساتھ مندر میں گھومنے پھرنے کی اجازت مل جائے گی۔ پھر موتیوں کی یہ بیش قیمت مالا پروہت کی نذر کرکے میں روپ وتی کو آزاد کرا سکوں گا۔ اگر ممکن نہ ہوا تو میں کسی اور طریقے سے اسے مندر سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ انہل واڑہ میں اسے جاننے والا کوئی نہیں ہو گا۔ روپ وتی کو حاصل کرنے کے بعد میری زندگی کی تمام خواہشات پوری ہو جائیں گی۔

۴

سومنات بیک وقت ایک قلعہ، ایک مندر اور ایک مکتب تھا۔ کاٹھیاواڑ کے ساحل پر دریائے سرسوتی سے کوئی تین میل دور ایک بلند فصیل تھی اور اس فصیل کے اندر سومنات کے محافظ سپاہیوں کی قیام گاہیں تھیں۔ اس سے آگے سمندر کی طرف یاتریوں کے لیے مہمان خانے اور نوکروں اور خدمتگاروں کی رہائش کے کمرے تھے۔ ان کے بعد ان عالی شان

محلّات کا ایک سلسلہ شروع ہوتا تھا جو ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں نے یاترا کے دوران میں اپنی رہائش کے لیے بنوائے تھے۔ مندر کے پجاریوں اور برہمنوں کے مکانات ان محلّات سے ملحق تھے۔ پھر ایک کشادہ گزر گاہ دکھائی دیتی تھی جو پانی کی سطح سے چند گز بلند تھی۔ اس گزر گاہ کے دائیں بائیں اونچے درجے کے پجاریوں کے محلّات تھے جو شان و شوکت کے لحاظ سے ان محلّات سے کم نہ تھے جو ملک کے بڑے بڑے راجاؤں نے اپنے لیے تعمیر کیے تھے۔ یہ گزر گاہ دائیں ہاتھ سومنات کے اس بڑے پروہت کے رفیع الشّان محل کے ساتھ ساتھ گزرتی ہوئی سومنات کے مندر کے آہنی دروازے پر ختم ہوتی تھی۔

مندر کی تیرہ منزلہ عمارت مخروطی شکل میں گہرے پانی میں کھڑی تھی اور اس کی چھت پر چودہ سنہری کلس دور دور تک دکھائی دیتے تھے۔ قلعے کی طرف سے دو اور گزر گاہیں مندر کے شمالی اور جنوبی دروازوں تک پہنچتی تھیں۔ مغرب کی جانب ایک کشادہ چبوترہ تھا جس کے آگے پتھر کی سیڑھیاں پانی میں غائب ہو جاتی تھیں۔ مندر کا درمیانی کمرہ چھپن ستونوں

پر کھڑا تھا اور اس وسیع کمرے کے درمیان ایک گول چبوترے پر وہ بُت نصب تھا جس کی قوّت اور ہیبت کی داستانیں اطرافِ عالم میں مشہور تھیں[4]۔ یہ بت چبوترے سے پانچ ہاتھ اونچا اور دو ہاتھ چبوترے کے اندر

---

[4] ہندوؤں کی روایت کے مطابق چاند کے دیوتا سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا اور جرم کی تلافی کے لیے اسے مہادیو کے لنگ کی یہ مورتی بنانی پڑی۔ ہندی زبان میں سوم کے معنی چاند اور ناتھ کے معنی آقا ہیں۔ چنانچہ سومنات کا مطلب "چاند کا آقا" ہے۔ سومنات کے عقیدت مندوں کے اعتقاد کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی ان چاند کے طلوع اور غروب کے باعث سمندر میں مدّوجزر پیدا ہوتا تھا۔ جب سمندر کی لہر کنارے کی طرف بڑھتی تو سومنات کا بُت پانی میں غائب ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد مندر اپنی اصلی حالت پر آجاتا تو یہ بت پانی کی آغوش سے دوبارہ نمودار ہو جاتا تھا۔ سومنات کے پجاری اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے تھے کہ چاند سومنات کے بت کی خدمت پر معمور ہے۔

بعض مسلمانوں کے نزدیک سومنات وہی بت تھا جسے منات کے نام سے کفّار نے مکّہ میں نصب کر رکھا تھا۔ ظہورِ اسلام کے ساتھ جب اس بُت کے پجاریوں نے خطرہ محسوس کیا تو انہوں نے اسے کعبہ سے اُٹھا کر کاٹھیاواڑ پہنچا دیا۔ اسے ساحل کے قریب نصب کر کے مشہور کر دیا کہ یہ سمندر سے نمودار ہوا ہے اور اس کا نام منات کے بجائے سومنات رکھ دیا۔ لیکن اس خیال آرائی کی وجہ سومنات اور منات کی لفظی مناسبت کے سوا کچھ نہیں۔ تاریخ سے یہی

تھا۔ اس کے سطح بیش قیمت جواہرات سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چھت کے درمیان میں سونے کی زنجیر کے ساتھ مورتی کے اوپر ایک تاج لٹکایا گیا تھا جو ہیروں اور موتیوں سے مرصّع تھا۔ چھت اور دیواریں اور ستون بھی رنگارنگ کے جواہرات سے مزیّن تھے۔ روشنی کے لیے چھت کے ساتھ بیش قیمت ہیروں کے فانوس لٹکے ہوئے تھے اور کمرے کے دروازوں کے پردوں میں بھی موتی، ہیرے، لال اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ سومنات کے بت کے ارد گرد سونے اور چاندی کی کئی اور مورتیاں نصب تھیں جو یہ ظاہر کرتی تھیں کہ باقی تمام دیوتا اس دیوتا کے خدمت گزار ہیں۔ وہ گھنٹی جو اس بت کی پوجا کے اوقات میں بجائی جاتی تھی، سونے کی دو سو من وزنی زنجیر کے ساتھ لٹکائی گئی تھی۔

ہندوؤں کے نزدیک سومنات کا بُت زندگی اور موت پر قادر تھا۔ یہ

معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل عرب جن بُتوں کی پوجا کیا کرتے تھے وہ انسان کی شکل پر بنائے گئے تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے شعر و ادب سے بھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ عربوں میں لنگ کی پوجا کا رواج تھا۔

انسانوں کو خوشی اور غم عطا کرتا تھا۔ موت کے بعد انسانوں کی روحیں اس بُت کے گرد جمع ہوتی تھیں اور وہ انہیں نئے جنم دیتا تھا۔

اس مندر میں یاتریوں کا اس قدر ہجوم رہتا تھا کہ قریباً ایک ہزار برہمن انہیں پوجا پاٹ کے طریقے سمجھانے پر مقرر تھے۔ سینکڑوں آدمی یاتریوں کی خدمت پر مامور تھے۔ سینکڑوں رقاص اور گویّے ہر وقت مندر کے دروازوں پر موجود رہتے تھے۔ ملک کے طول و عرض سے عالی نسب لڑکیاں یہاں رقص اور موسیقی سیکھنے کے لیے آتی تھیں۔ ان میں سے صرف بہترین ناچنے اور گانے والی دوشیزاؤں [۵] کو سومنات کے بُت کے سامنے اپنے کمالات دکھانے کا موقع دیا جاتا تھا۔ ایسی لڑکیوں کو ملک کے ہر حصّے میں نہایت عزّت و احترام سے دیکھا جاتا تھا اور امرا کے لڑکے انہیں اپنی دلہن بنانے کے خواہش مند رہتے تھے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں ایسی تھیں جو سومنات کی داسیاں کہلاتی تھیں۔ ان میں سے اکثر وہ تھیں جن کے والدین انہیں پیدائش سے پہلے ہی سومنات کی بھینٹ کر

---

[۵] بعض روایات کے مطابق سومنات کے مندر میں رقص کرنے والی لڑکیوں کی تعداد پانچ سو تھی۔

چھوڑتے تھے اور بعض ایسی یتیم اور لاوارث ہوتی تھیں جنہیں با اثر لوگ سومنات کے مندر پہنچا دیتے تھے۔ یہ لڑکیاں مندر کے پجاریوں اور برہمنوں کی سیوا کرتی تھیں اور پروہت کی مرضی کے بغیر نہیں مندر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ رقص اور موسیقی کی تربیت دینے کے بعد انہیں مندر کے ان اسرار و رموز سے آگاہ کیا جاتا تھا جن کا برہمنوں کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔

سومنات کی مورتی کو غسل دینے کے لیے ہزاروں آدمی ہر روز گنگا جل مہیا کرنے پر متعیّن تھے۔ اسی طرح نوکروں کی ایک جماعت سینکڑوں کوس دور کشمیر کی وادیوں سے سومنات کے دیوتا کے لیے پھولوں کے ہار مہیّا کرتی تھی۔ مندر اس قدر بڑا تھا کہ اس کے اَن گنت کمروں اور کوٹھڑیوں میں اس کا بے شمار عملہ آسانی سے سما سکتا تھا۔ مندر سے ایک طرف سمندر کے کنارے کے ساتھ ساتھ ان تارک الدّنیا سادھوؤں، بھگتوں اور سنیاسیوں کی کوٹھڑیاں تھیں جو اولاد کے خواہشمند کی حاجت روائی پر مامور تھے۔ یہ لوگ لباس پہننے کی بجائے اپنے جسم پر صرف راکھ

مل لیناہی کافی سمجھتے تھے۔

سومنات کی دولت و ثروت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں دس ہزار دیہات اس کی جاگیر تھے۔ ہندوستان کے راجے اور مہاراجے یا ان کے سفیر ہر سال اس مندر کی اہم رسومات میں حصّہ لینے آتے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نذرانے پیش کرتے۔ اس کے علاوہ اولاد کے خواہش مند بھی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں بڑے بڑے نذرانے لے کر آتے تھے۔

سومنات کی شہرت صرف ہندوستان تک ہی محدود نہ تھی۔ مشرق و مغرب کے کئی ممالک کے تجارتی جہاز پانی اور رسد حاصل کرنے کے لیے سومنات کی بندر گاہ پر کھڑے ہوتے گئے۔ ان جہازوں کے توہم پرست ملّاحوں نے سومنات کی شہرت دور دور تک پہنچا دی تھی۔ وہ سومنات کو سمندر کا دیوتا سمجھتے اور اپنے سفر کی کامیابی کے صلے میں یہاں نذرانے پیش کرتے تھے۔ ہندوستان کے ساحل کے آس پاس اگر کوئی جہاز غرق ہو جاتا تو یہ مشہور ہو جاتا کہ سومنات کا دیوتا اس کے ملّاحوں سے ناراض

ہو گیا تھا اور اگر کوئی سفینہ بخیریت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا تو ملّاحوں سے دیوتا خوش تھا۔

سومنات کے قلعے اور مندر سے باہر دریائے سرسوتی کے کنارے ایک پر رونق شہر آباد تھا اور ایک اہم تجارتی مرکز ہونے کے باعث یہاں کے باشندے کافی متموّل تھے۔

نرملا اور رُوپ وتی

گوالیار میں جے کرشن کی بیوی کا بڑا بھائی سردار شیام لال ایک راست گو اور غیّور راجپوت تھا۔ اسے جے کرپشن کی خود پسندی، ریاکاری اور ابن الوقتی سے نفرت تھی اور کئی موقعوں پر وہ بے جھجک اس کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ اس لیے جے کرشن عام طور پر اس سے دور رہنا پسند کرتا تھا لیکن اپنے گاؤں پر حملے کی اطلاع پا کر اسے مجبوراً گوالیار کا رُخ کرنا پڑا۔ راستے میں یہ خیال اُسے بُری طرح پریشان کر رہا تھا کہ جب شیام لال کو معلوم ہو گا کہ میں اس کی بہن اور بھانجی کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا ہوں تو وہ کیا کہے گا۔ لیکن اس نے یہ سوچا کہ مجھے جاتے ہی اپنے گاؤں پر حملے کا

ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ شیام لال سے وقتی طور پر جان چھڑانے کے لیے یہ بہانہ کافی نہیں، وہ کہے گا جب مسلمان قنوج اور باری کی طرف بڑھ رہے ہیں تو تم یہاں کیوں آئے ہو۔ چنانچہ سرحد عبور کرنے سے پہلے اس نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے واپس جا کر راجہ کی فوج میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اگر راجہ کو فتح ہوئی تو مجھے شیام لال کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی اور اگر اسے شکست ہوئی تو میں گوالیار پہنچ کر شیام لال سے کہہ سکوں گا کہ گاؤں میں جو کچھ ہوا وہ میری غیر حاضری میں ہوا ہے اور راجہ کی شکست کے بعد اپنی بیوی اور نرملا کو رنبیر کی قید سے چھڑانا میرے بس کی بات نہیں۔ اتفاق سے راستے میں اسی ملاقات سرحد کے چند ایسے سرداروں سے ہو گئی جو پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ راجہ کی مدد کے لیے باری جا رہے تھے۔ جے کرشن بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس کے نوکروں میں سے صرف پیارے لال اس کے ہمراہ تھا۔

قنوج اور باری میں سلطان محمود کی فتوحات کے بعد جے کرشن کو اپنی جان

بچانے کے لیے شکست خوردہ فوج کے ان دستوں کا ساتھ دینا پڑا جو راجہ گنڈا کو اپنا آخری سہارا سمجھ کر کالنجر کا رُخ کر رہے تھے۔ کالنجر کی سرحد میں داخل ہوتے ہی جے کرشن نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگ میں حصّہ لینے کی بجائے گوالیار چل دیا۔ راستے میں اسے پڑوس کے کئی راجوں اور سرداروں کی افواج دکھائی دیں جو راجہ گنڈا کی مدد کے لیے جا رہی تھیں۔ راجہ گنڈا کی دفاعی تیّاریوں کے متعلّق اس نے جو کچھ سنا وہ بہت حوصلہ افزا تھا۔ چنانچہ وہ پھر ایک بار تذبذب میں پڑ گیا۔

ایک شام اُسے گوالیار کی سرحد سے چند منازل دور ایک لشکر کا پڑاؤ نظر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ گوالیار کی فوج ہے جو یہاں کے حکمران کی قیادت میں راجہ گنڈا کی مدد کے لیے جا رہی ہے۔ جے کرشن کو راہِ فرار نظر نہ آئی اور وہ مجبوراً اس لشکر میں شامل ہو گیا۔ سردار شیام لال اور اس کے خاندان کے کئی آدمی بھی اس فوج کے ساتھ تھے، جے کرشن نے انھیں اپنے گاؤں کے حالات بتا دیے۔

راجہ کالنجر کا راجہ میدان چھوڑ کر بھاگا تو جے کرشن شیام لال کے ساتھ

گوالیار پہنچ گیا۔ چند دن کے بعد شیام لال نے اپنے ایک وفادار نوکر کو نرملا
کی ماں کا پتہ لگانے کے لیے بھیجا۔ وہ یہ خبر لے کر آیا کہ نرملا کی ماں مر چکی
ہے اور نرملا ابھی تک رنبیر کے گھر میں ہے۔ شیام لال نے بذاتِ خود رنبیر
کے پاس جانے کا فیصلہ کیا لیکن اس کی روانگی سے قبل رنبیر کا نوکر شمبھو
ناتھ نرملا کو لے کر پہنچ گیا۔

نرملا کی آمد کے بعد جے کرشن کو اپنے مستقبل کی فکر ہوئی۔ ہر ابن الوقت
کی طرح وہ بھی پرلے درجے کا دور اندیش تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں میں
ایک فاتح کی حیثیت سے واپس جانے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ اگر وہ
گوالیار کو محفوظ سمجھتا تو اپنی بیٹی کی خاطر کسمپرسی کی حالت میں بھی وہاں
رہنا گوارا کر لیتا لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ راجہ گنڈا کی شکست کے بعد وسطی ہند
کی قوّتِ مدافعت ختم ہو چکی ہے اور سلطان محمود جب دوبارہ اس طرف
آئے گا تو گوالیار کی فوج اس کا راستہ نہیں روک سکے گی۔ پھر رنبیر ہر قیمت
پر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرے گا اور اس صورت میں گوالیار کے
سردار اور شاید گوالیار کا راجہ بھی مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے

کے لیے اسے گرفتار کر کے رنبیر کے حوالے کر دے۔ رنبیر کے انتقام کا خوف اسے سوتے جاگتے پریشان رکھتا تھا۔ اسے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جو رنبیر اور مسلمانوں کی دسترس سے دور ہو۔ کئی دن کے غور و فکر کے بعد سومنات اس کی جائے پناہ تھی۔ وہاں جنوب اور مغرب کے ان گنت راجے اپنی افواج کو جمع کر رہے تھے اور پروہت فوجی تجربہ رکھنے والوں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھ رہے تھے۔ جے کرشن نے سوچا سومنات کے پجاری کو خوش کرنے کے بعد میرے لیے پڑوس کے کسی راجہ کا مصاحب بن جانا مشکل نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ نرملا سومنات کے مندر میں نسوانی کمالات حاصل کر سکے گی جن کی بدولت معمولی لڑکیاں بھی شاہی محلّات میں پہنچ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سومنات مسلمانوں کے حملوں کی زد سے بہت دور تھا اور وہاں رنبیر جیسے دشمنوں کے پہنچنے کی توقع نہ تھی۔

شیام لال کا گوالیار کے دربار میں کافی اثر و رسوخ تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ جے کرشن کو راجہ کی فوج میں کوئی موزوں عہدہ مل جائے۔ جے

کرشن چند چند دن شیام لال پر اپنا ارادہ ظاہر کرنے سے ہچکچاتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ نرملا کو ان کے ساتھ بھیجنے سے انکار نہ کر دے۔ چنانچہ اس نے ایک بہانہ تلاش کیا اور شیام لال سے کہا۔ ”میں نے شیو جی سے منّت مانی تھی کہ اگر نرملا مجھے دوبارہ مل گئی تو میں اس کے ساتھ سومنات کے مندر کی یاترا کے لیے جاؤں گا۔“ نرملا نے بھی سومنات کی یاترا کے لیے اپنے باپ کا ساتھ دینے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ شیام لال نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

اتفاق سے گوالیار کے چند یاتری سومنات جا رہے تھے۔ جے کرشن اور نرملا تنہا سفر کرنے کی بجائے ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔

۲

یاتریوں کے مختصر سے قافلے کے ساتھ کئی دن سفر کرنے کے بعد جے کرشن اور نرملا ایک دن تیسرے پہر ایک چھوٹے سے شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کے لوگوں سے دھرم شالہ کا راستہ پوچھنے کے بعد باقاعدہ ایک کشادہ بازار میں سے گزرتا ہوا اس طرف چل دیا۔ جے کرشن اور

نرملا سب سے آگے تھے۔ ایک چوک کے قریب پہنچ کر انہیں لوگوں کی چیخ و پکار سُنائی دی۔ جے کرشن نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو روکا اور خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھا۔ لوگ سراسیمگی کی حالت میں شور مچاتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ جے کرشن انسان نے چند آدمیوں کو روک کر ان کی بدحواسی کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ سب "دوڑو بھاگو، آگیا، آگیا" کہتے ہوئے اِدھر اُدھر نکل گئے، چوک تک پہنچتے پہنچتے جے کرشن بذاتِ خود اس قدر بدحواس ہو گیا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے کی ہمّت نہ تھی۔ اس نے گھوڑے سے جھک کر ایک آدمی کا بازو پکڑ لیا اور چلّا کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کون آگیا؟ تم بھاگ کیوں رہے ہو؟" بدحواس آدمی نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر جے کرشن کے دائیں ہاتھ ایک تنگ گلی کی طرف اشارہ کیا اور وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ گلی کی طرف دیکھتے ہی ایک ثانیہ کے لیے جے کرشن سہم گیا۔ ایک مست ہاتھی سونڈ اُٹھائے تیزی سے بھاگا چلا آرہا تھا۔ آن کی آن میں جے کرشن کے سر پر آگیا۔ جے کرشن نے یک لخت گھوڑے کی باگ موڑ لی اور بائیں ہاتھ کی گلی میں داخل ہو گیا۔ ہاتھی جے کرشن کا پیچھا کرنے کی بجائے

کشادہ بازار کی طرف مُڑ گیا۔ قافلے کے آدمی اس صورتِ حال سے بے خبر چوک سے کچھ دور کھڑے تھے۔ نرملا بھی چند ثانیے وہاں کھڑی رہی۔ پھر جلدی سے گھوڑا دوڑا کر چوک میں پہنچ گئی تاکہ کسی فوری خطرے میں اپنے باپ کا ساتھ دے سکے۔ ہاتھی پر اس کی نگاہ اس وقت پڑی جب وہ تنگ گلی سے نکل کر کشادہ بازار میں اس کے سامنے آ چکا تھا۔ جے کرشن نے چلّانے کی کوشش کی لیکن آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ نرملا نے کترا کر اپنے باپ کے پاس گلی میں گھسنے کی کوشش کی لیکن گھوڑا خوفزدہ ہو کر اچھلا اور نرملا نیچے گِر پڑی۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھا۔ نرملا میں اُٹھ کر اپنے آپ کو بچانے کی ہمّت نہ تھی لیکن خوش قسمتی سے قافلے کی چیخ و پکار نے ہاتھی کو نرملا کی طرف متوجّہ ہونے کا موقع نہ دیا اور وہ سیدھا آگے نکل گیا۔ چند یاتری گھوڑوں پر سوار تھے، اِدھر اُدھر بھاگ گئے اور باقی آس پاس کی گلیوں میں چھپ گئے۔

تھوڑی دیر بعد نرملا کے گرد کئی آدمی جمع ہو چکے تھے۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور جے کرشن گھوڑے سے اُتر کر بے ہوش نرملا کو ہوش

میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنے میں سواروں کی ایک ٹولی وہاں آ گئی۔ ایک معمّر اور خوش پوش آدمی نے اپنے ساتھیوں کو روکا۔ لوگ اسے دیکھتے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ خوش پوش آدمی حادثے کی تفصیلات سننے کے بعد گھوڑے سے اُتر کر تیزی سے آگے بڑھا۔ شہر کے لوگ اس کے سامنے سے راستہ چھوڑ کر ہٹ گئے۔

نرملا ہوش میں آ چکی تھی۔ جے کرشن اسے بیٹھنے کے لیے اپنے بازوؤں کا سہارا دے رہا تھا اور شہر کا ایک آدمی اپنی پگڑی پھاڑ کر اس کے ماتھے پر پٹّی باندھ رہا تھا۔ خوش پوش آدمی نے قریب آ کر پوچھا۔ "تمھیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔"

نرملا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پٹّی باندھنے والا آدمی جلدی سے اُٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مہاراج! بھگوان کی دِیا سے ان کی جان بچ گئی ہے۔ ورنہ ہاتھی کا پاؤں ذرا اس طرف پڑ جاتا تو ان کی خیر نہ تھی۔ ان کا گھوڑا سیخ پا ہو گیا تھا۔"

خوش پوش آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سوال کیا۔ "ہاتھی نے کسی اور کو تو

نقصان نہیں پہنچایا؟"

ایک آدمی نے جواب دیا۔ "مہاراج! پچھلی گلی میں ایک آدمی اس کے پاؤں تلے کچلا گیا ہے۔"

"بڑا افسوس ہوا۔ دیکھو! اگر اس کا کوئی وارث ہو تو اسے ہمارے پاس لے آؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ نرملا کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کا گھر کہاں ہے؟"

نرملا کی بجائے جے کرشن نے جواب دیا "ہم قنوج سے آئے ہیں اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس ملک کے ہاتھی شہروں اور جنگلوں میں تمیز نہیں کرتے۔"

اس نے جے کرشن کی طنز سے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا "مجھے اس حادثے کا بہت افسوس ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کی دیوی کے۔۔۔"

"میں اس کا باپ ہوں۔۔۔" جے کرشن نے جلدی سے یہ کہہ کر اس کا

فقرہ پورا کر دیا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”سومنات۔“

”تو ہماری ایک ہی منزل ہے۔ سومنات تک آپ میرے مہمان ہیں۔“

جے کرشن اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کا مخاطب کوئی بڑی حیثیت کا آدمی ہے۔ وہ ہر موقع سے فائدہ اُٹھانے کا قائل تھا۔ تاہم نرملا کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔ ”آپ کا شکریہ۔ میری بیٹی شاید چند دن گھوڑے پر سواری کے قابل نہ ہوسکے۔“

”آپ تسلّی رکھیں۔ ان کے لیے گھوڑے سے زیادہ آرام دہ سواری کا انتظام کر دیا جائے گا۔“ یہ کہہ کر عمر رسیدہ آدمی نے اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ”تم انہیں پڑاؤ میں پہنچانے کا انتظام کرو۔ ہم ہاتھی کا پتا لگا کے آتے ہیں۔“

”یہ کون ہیں؟“ جے کرشن نے عمر رسیدہ آدمی کے جاتے ہی سپاہی سے

سوال کیا۔

سپاہی نے جواب دیا۔ ”یہ مہاراج رگھو ناتھ ہیں۔ انہل واڑہ کے مہاراج کے چچا۔“

جے کرشن نے اچانک محسوس کیا کہ اس کے لیے کامیابیوں اور کامرانیوں کے راستے کھل گئے ہیں۔ سپاہی سے باتوں باتوں میں جے کرشن کو معلوم ہوا کہ رگھو ناتھ انہل واڑہ کے حکمران کی حیثیت سے سالانہ خراج کے علاوہ بیس ہاتھیوں کا نذرانہ لے کر سومنات جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد چار آدمی نرملا کو ایک پالکی پر ڈال کر رگھو ناتھ کے پڑاؤ کی طرف لے گئے۔ جاتی دفعہ جے کرشن نے اپنے ساتھی یاتریوں کی طرف دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھا کیونکہ اب وہ انہل واڑہ کے مہاراجہ بھیم دیو کے چچا کا مہمان تھا۔

پڑاؤ میں اسے رات گزارنے کے لیے ایک علیحدہ خیمہ دیا گیا۔ نرملا کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ رگھو ناتھ کے خاص طبیب نے اسے دیکھنے

کے بعد جے کرشن کو یہ تسلّی دی کہ تمہاری بیٹی کو پالکی میں سفر کرنے سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

رات کے وقت جے کرشن انتہائی جوش و خروش کے عالم میں رگھوناتھ سے کہہ رہا تھا۔ ”میرا گھر بار لُٹ چکا ہے۔ میرے وطن کے بڑے بڑے سردار دشمن کی غلامی کا طوق پہن چکے ہیں لیکن میں نے یہ ذلّت گوارا نہیں کی۔ انہوں نے مجھے بڑے بڑے لالچ دیے لیکن مجھے اگر محمود کی اطاعت کے صلہ میں قنوج کا تخت بھی مل جاتا تو بھی میں انکار کر دیتا۔ میرے لیے کسی غیرت مند راجپوت کے گھوڑوں کی رکھوالی اس تاج و تخت سے زیادہ قابلِ فخر ہے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ دشمن کو اپنے دیس سے نکالنے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دوں۔ اس وقت میں چاہتا ہوں کہ نرملا کو سومنات کی حفاظت میں چھوڑ کر آس پاس کے تمام راجوں اور مہاراجوں کو بیدار کروں۔“ اور رگھوناتھ اسے تسلّی دے رہا تھا۔ ”ہمیں آپ جیسے آدمیوں کی بہت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ملک کی بہت بڑی خدمت کر سکیں

گے۔ انہل واڑہ سومنات کا دروازہ ہے اور میری کوشش یہ ہو گی کہ واپسی پر آپ کو وہاں لے چلوں۔ مہاراج آپ جیسے آدمیوں کی قدر کرتے ہیں۔"

اگلے دن جے کرشن رگھوناتھ کے ہمراہ سومنات روانہ ہو گیا۔ نرملا ایک پالکی میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ رگھوناتھ کی ہمدردی رفتہ رفتہ دلچسپی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ وہ ہر روز کئی بار کبھی اپنے طبیب اور کبھی جے کرشن سے اس کے متعلق پوچھتا اور جب قافلہ کسی جگہ قیام کرتا تو وہ طبیب کے ساتھ خود بھی نرملا کے خیمے میں چلا جاتا۔ جے کرشن اس عزّت افزائی پر پھولے نہیں سماتا لیکن نرملا اس کے ساتھ عام طور پر بے توجہی سے پیش آتی۔

منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے نرملا کی حالت بہتر ہو چکی تھی۔ اس کے سر کا زخم مندمل ہو رہا تھا لیکن بازو کا جوڑ ہل جانے کے باعث اسے چند دن اور آرام کی ضرورت تھی۔ سومنات کی چار دیواری میں داخل ہونے کے بعد جے کرشن اور اس کی بیٹی رگھوناتھ کے مہمان تھے۔ ہندوستان کے کئی اور

حکمرانوں کی طرح انہل واڑہ کے راجہ نے بھی سومنات کی چار دیواری کے اندر اپنے لیے ایک خوبصورت محل تعمیر کیا ہوا تھا۔ رگھوناتھ نے اسی محل میں قیام کیا اور اس کے چند کمرے جے کرشن اور نرملا کو دے دیے۔ رگھوناتھ کی عنایات پر جس قدر جے کرشن خوش تھا اسی قدر نرملا پریشان تھی اور وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف اس سے دور رہنا پسند کرتی تھی۔

رگھوناتھ نے دو ہفتے وہاں قیام کیا۔ اس عرصہ میں نرملا اور اس کی بدولت جے کرشن کے ساتھ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ نرملا کی تیمارداری کے بہانے صبح و شام اس کے کمرے میں چلا جاتا اور نرملا ہر بار اسے یہ یقین دلانے کو کوشش کرتی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ نرملا کو رقص اور موسیقی کی بجائے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور رگھوناتھ نے پروہت سے مل کر مندر کے ایک مشہور و معروف پنڈت کی خدمات حاصل کر لیں۔ رگھوناتھ کی دلچسپی کے باعث نرملا ایک عام لڑکی کی بجائے ان عالی نسب شہزادیوں کی ہم مرتبہ خیال کی جانے لگی جو مندر میں تعلیم و تربیت

حاصل کرنے آئی ہوئی تھیں۔

جے کرشن رگھوناتھ کی دعوت پر اس کے ساتھ انہل واڑہ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ رگھوناتھ کو اپنے حال پر مہربان دیکھ کر وہ نہ صرف اپنے بلکہ نرملا کے متعلّق بھی بہت پُر امید تھا۔

دو ہفتوں کے بعد رخصت ہوتے وقت اس نے نرملا سے کہا۔ ”بیٹی میری زندگی کی آخری خواہش یہ ہے کہ تم کسی سلطنت کی رانی بنو۔ اگر مجھے تمہارے مستقبل کی فکر نہ ہوتی تو میں تمہیں یہاں چھوڑ کر رگھوناتھ کے ساتھ نہ جاتا۔“

نرملا نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ ”پِتا جی! مجھے رانی بننے کا شوق نہیں۔ میں دنیا تیاگ کر مہا دیو کی داسی بننا چاہتی ہوں۔ میں اسی جگہ خوش رہوں گی۔“

جے کرشن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! تمہیں اپنے باپ کی بے بسی پر آنسو نہیں بہانے چاہئیں۔ میں اس حالت میں بھی

تمہارے لیے خوشیوں کے محل تعمیر کر سکتا ہوں۔“

۳

روپ وتی انتہائی بے چینی سے غروبِ آفتاب کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے رقص کی تعلیم دینے والے پجاریوں نے ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد خوشخبری سنائی تھی کہ آج تم دیوتا کے سامنے اپنے جوہر دکھا سکو گی۔ اس دن کے لیے وہ اور ہر روز کئی گھنٹے ناچ کی مشق کیا کرتی تھی۔ رقص و موسیقی کو سومنات کی پوجا کی رسومات میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی چنانچہ نوجوان اور حسین لڑکیوں کو ان فنون کی تربیت دینے کے لیے بہترین استاد مقرر تھے۔

اونچے گھرانوں کی لڑکیوں کو جو اپنی مرضی سے یہاں آتی تھیں اور جن کا قیام عارضی ہوتا تھا چند ماہ کی محنت کے بعد سومنات کی مورتی کے سامنے بھجن گانے کی اجازت مل جاتی تھی۔ ان کے والدین اس کامیابی کی خوشی میں ان کے اُستادوں اور مندر کے پروہت کو گراں بہا نذرانے پیش کرتے تھے۔ پھر ایسی لڑکیوں سے شادی کرنے کے خواہشمند ان کے

والدین کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے پجاریوں کی خدمات حاصل کرتے تھے اور کامیابی کی حالت میں پجاریوں کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ ایسی لڑکیوں کو جلد از جلد فارغ التحصیل کیا جائے اور نئ لڑکیوں کے لئے جگہ پیدا کی جائے۔

لیکن لاوارث یا ایسی لڑکیوں کی حالت ان سے مختلف نہ تھیں جنہیں ان کے وارث سومنات کی بھینٹ کر جاتے۔ یہ مندر کی داسیاں کہلاتی تھیں اور تعلیم و تربیت کے طویل اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد ان پر مندر کے ایسے ایسے اسرار منکشف ہوتے تھے جن کا مندر سے باہر کسی کو علم نہ تھا۔ معمولی شکل وصورت اور ادنیٰ ذہانت کی داسیوں کو یہ مراحل عبور کرنے سے پہلے ہی مندر سے چھٹی مل جاتی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی زیادہ خوش قسمت ہوتی تو اسے کوئی شادی کا خواہش مند مل جاتا ورنہ یہ اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے عام طور پر مندر سے فارغ التحصیل ہونے والی عالی نسب لڑکیوں کی مصاحب بن کر ان کے ساتھ چلی جاتیں۔ اس بات کا پورا خیال رکھا جاتا تھا کہ مندر کے رازہائے سربستہ کا

انہیں کوئی علم نہ ہو اور وہ اپنے دلوں پر سومنات کی ہیبت اور عظمت کا ایک دائمی اثر لے کر جائیں لیکن ان میں سے کسی کی بد قسمتی سے ایک بار مندر کے تاریک گوشوں تک پہنچا دیتی تو مندر کے پجاریوں کے سوا اس کی زندگی اور موت کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا۔

مندر کی چار دیواری میں داخل ہونے کے بعد روپ وتی کچھ عرصہ بے حد اداس اور مغموم رہی۔ رام ناتھ کا تصوّر اسے بے چین رکھتا تھا۔ اس کے دلکش نغمے ہر وقت اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ لیکن یہ سب باتیں اس کے نزدیک پاپ تھیں۔ وہ سومنات کی داسی بن چکی تھی اور رات کی تنہائیوں میں رو رو کر اپنے دیوتا سے صبر اور ہمّت کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کے دل کے زخم بھرتے گئے۔ اس کی تمام خواہشیں اور امنگیں مندر کی چار دیواری میں سمٹ کر وہ گئیں اور زندگی کے حسین تصوّرات ماضی کے دھندلکوں میں ڈوب گئے۔

اس کی آواز میں بلا کی دلکشی تھی اور موسیقی کے اُستادوں کو اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا معترف ہونے میں دیر نہ لگی۔ اس کے یہ حسین

چہرے اور جسمانی اعضاء کے تناسب نے رقص کی تعلیم دینے والے اُستادوں کو بھی جلد ہی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایک دن ایک تجربہ کار استاد نے اس سے کہا۔ ”روپ وتی! تم جس طرح گا سکتی ہو اگر اسی طرح ناچ بھی سکو تو کسی دن مندر کی دیوی کا تاج تمہارے سر پر ہو گا۔“

اس نے جواب دیا۔ ”مندر کی دیوی کا تاج میرے تصوّرات سے بہت بُلند ہے مہاراج! میں صرف ایک بار اپنے دیوتا کی مورتی کے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد میرے دل میں کوئی خواہش باقی نہ رہے گی۔“

”وہ دن دور نہیں جب تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ عام لڑکیاں جو کچھ برسوں میں سیکھتی ہیں تم مہینوں میں سیکھ جاؤ گی، صرف محنت کی ضرورت ہے۔“

”میں محنت کروں گی۔“ روپ وتی نے پُر اُمّید ہو کر جواب دیا۔ اس کے بعد روپ وتی صبح شام ناچ کی مشق کیا کرتی تھی۔ اس کے پاؤں شل ہو جاتے۔ اس کا بند بند درد کرنے لگتا لیکن وہ مشق جاری رکھتی۔ کبھی کبھی وہ

نڈھال ہو کر گر پڑتی اور استاد اُسے آرام کا مشورہ دیتے لیکن اس فن میں کمال حاصل کرنے کا ولولہ جسمانی کلفتوں کے احساس پر غالب آ جاتا اور وہ اُٹھ کر دوبارہ رقص میں شریک ہو جاتی۔ کبھی کبھی وہ خواب دیکھتی کہ وہ سومنات کی مورتی کے سامنے رقص کر رہی ہے اور مہا دیو کئی دیوتاؤں کے ساتھ آکاش سے اتر کر اسے دیکھ رہے ہیں۔ میرے دیوتا میرے دیوتا کہتے ہوئے مہا دیو کے پاؤں میں ِگر جاتی۔ مہا دیو اسے اٹھاتے اور اپنے ساتھ اڑائے ہوئے اس رنگین دنیا میں لے جاتے جہاں سدا بہار پھول مہکتے تھے۔ آبشاریں اور ندیاں نہ ختم ہونے والے راگ الاپتی تھیں۔ ایسے سپنوں سے بیدار ہونے کے بعد وہ دیر تک حسین تصوّرات میں کھوئی رہتی۔ شدید جسمانی ریاضت کے باعث روپ وتی کا جسم قدرے دُبلا ہو چکا تھا لیکن اس کے حسن میں غایت درجہ کا نکھار اور اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ کشش پیدا ہو چکی تھی۔

۴

غروبِ آفتاب کے بعد مندر کی گھنٹی اور ناقوس کی آواز کے ساتھ روپ

وتی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وہ رقص کرنے والی لڑکیوں کی ایک ٹولی میں اس جگہ کھڑی تھی جہاں ایک دروازہ اس وسیع کمرے میں کھلتا تھا جس کے درمیان سومنات کا بُت نصب تھا۔ رقص کرنے والی لڑکیوں کی چند اور ٹولیاں اِدھر اُدھر پردوں کے پیچھے کھڑی تھیں۔

گھنٹیوں اور ناقوس کی صدائیں بلند ہوئیں۔ برہمنوں نے بھجن گانے شروع کیے اور اس کے بعد رقص کرنے والی لڑکیوں کی مختلف لڑکیاں باری باری اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ آخر میں اس ٹولی کی باری آئی جس میں روپ وتی رقص کے لیے بے چین کھڑی تھی۔ دیوتا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک ثانیہ کے لیے روپ وتی کے حواس گم ہو گئے۔ ہیروں اور موتیوں سے سجے ہوئے فانوس میں کافوری شمعوں کی تیز روشنی، چھت، دیواروں، ستونوں اور دروازوں کے پردوں میں جڑے ہوئے رنگارنگ جواہرات سے منعکس ہو کر نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ سومنات کا بُت جن بیش قیمت ہیروں سے مزیّن تھا وہ ستاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ برہمن دیواروں کے ساتھ کھڑے تھے اور ان سے

آگے سومنات کے بُت کے چاروں طرف ان دیوتاؤں کی سونے اور چاندی کی مورتیاں تھیں جنہیں سومنات کا دربان سمجھا جاتا تھا۔

رقص شروع ہوا اور گھنگھروؤں کی چھنا چھن اور پردوں کی اوٹ سے سازوں کی آواز نے روپ وتی کے رگ وپے میں بجلی کی لہر دوڑا دی۔ وہ ناچ رہی تھی اور باقی تمام لڑکیوں کے مقابلے میں نو مشق ہونے کے باوجود تماشائیوں کی نگاہیں اس کی طرف مرکوز ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی تمام دھڑکنیں سمٹ کر اس کے وجود میں آگئی ہیں۔ ہر ٹولی کی لڑکیاں ایک ایک کر کے سومنات کے بُت کے سامنے آتیں اور تھوڑی دیر اپنے کمال کا مظاہرہ کر کے بغل کے کمروں میں غائب جو جاتیں تھیں۔ جب روپ وتی کی باری آئی تو وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر ہو کر کافی دیر ناچتی رہی لیکن تماشائی اس قدر محو تھے کہ انہیں وقت کا احساس نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم کا رواں رواں ناچ رہا ہے۔ اتنے میں سمندر کی طرف کھلنے والے دروازے سے پروہت نمودار ہوا۔ چند ثانیے روپ وتی کا رقص دیکھنے کے بعد اس نے ہاتھ بلند کیا اور یک لخت

تمام ساز خاموش ہو گئے۔ روپ وتی گھبرا کر بھاگتی ہوئی پردے کے پیچھے روپوش ہو گئی۔

پروہت نے کہا۔ "چندر ما سمندر کے دیوتا کو جگا چکا ہے۔ اب صرف سومنات کی دیوی کا ناچ ہو گا۔"

پردوں کی اوٹ سے مختلف سازوں کی صدائیں ایک بار پھر بلند ہونے لگیں اور تمام لڑکیاں مختلف دروازوں سے نکل کر دوبارہ مورتی کے سامنے جمع ہو گئیں اور فرش پر بیٹھ کر اپنے بازو ہوا میں لہرانے لگیں۔ ایک حسین و جمیل عورت جس کے سر پر ہیروں کا تاج جگمگا رہا تھا، نمودار ہوئی اور ناچتی ہوئی سومنات کے بت کے سامنے آ گئی۔ اس کا نام کامنی تھا لیکن لوگ اسے سومنات کی دیوی کہتے تھے۔ کامنی کا رقص عبودیت کے جذبات کے اظہار کی بجائے جسم کی پیاس کا مظاہرہ تھا۔ وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح پیچ و خم کھا رہی تھی۔ اس کے بازو ناگ کی طرح لہرا رہے تھے۔ اپنے پجاریوں کے جسم کو راحتیں بخشنے والے دیوتا کے سامنے وہ ایک مجسّم التجا تھی۔

مندر میں ناقوس اور گھنٹیوں کی صدائیں زیادہ بلند ہونے لگیں۔ پجاریوں اور رقص کرنے والی لڑکیوں نے بُلند آواز میں بھجن گانا شروع کر دیا۔ گھنٹیوں کی صدائیں جوں جوں بُلند ہو رہی تھیں۔ کامنی کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی رگوں میں خون کی بجائے بجلیاں دوڑ رہی ہیں۔ پھر مندر سے باہر سمندر کا شور سنائی دیا اور اُٹھتی ہوئی لہر کا پانی کمرے کے اندر جمع ہونے لگا۔ جب اس کمرے میں پانی بڑھنے لگا تو رقاصائیں اور پجاری "مہادیو کی جے" کے نعرے لگاتے ہوئے مندر کے بالائی حصّوں کا رُخ کر رہے تھے۔ اب ان کی جگہ چاند کا دیوتا اپنا فرض ادا کرتا تھا۔ سومنات کا بُت آہستہ آہستہ پانی میں ڈوب رہا تھا۔ پوجا کی رسومات مکمل ہو چکی تھیں اور بیماریوں کے نعروں کے جواب میں ہزاروں لوگ جو مندر سے باہر تھے "مہادیو کی جے" کے نعرے لگا رہے تھے۔

۵

سومنات کے بُت کے سامنے اپنے رقص کے کمالات پیش کر کے روپ

وتی نے فنِ رقص کے اُستادوں کے علاوہ بڑے پروہت کو بھی اپنامہربان بنالیا تھا۔ اسے عام لڑکیوں کے ساتھ رہنے کی بجائے اب پروہت کے محل کے ساتھ اس عالیشان عمارت میں ایک علیحدہ کمرہ مل گیا تھا، جہاں اُونچی حیثیت کی داسیاں دیتی تھیں۔ اس عمارت کی بالائی منزل میں کامنی رہتی تھی۔ مندر اور پروہت کے محل کی طرف ان کی آمد و رفت کے راستے عام گزر گاہوں سے مختلف تھے اور اُسے کامنی اور اس کے ساتھ رہنے والی لڑکیوں کو خاص خاص موقعوں کے سوابہت کم دیکھنے کاموقع ملتا تھا۔ مندر کے اندر اور باہر کامنی کی حیثیت ایک ملکہ کی سی تھی اور کسی داسی یا پجاری کو اس کے ساتھ بے تکلّف ہونے کی جرأت نہ تھی۔ مندر میں مشہور تھا کہ جو خوش قسمت لڑکی سومنات کی دیوی کا تاج پہنتی ہیں وہ چند مہینوں کے اندر اندر کسی نامعلوم راستے سے مہادیو کے چرنوں میں جا پہنچتی ہے اور اس دنیا کے انسان اُسے پھر کبھی نہیں دیکھتے۔ اس کے بعد دیوی کا تاج کسی اور خوش نصیب لڑکی کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا تھا کہ ایک داسی مندر کی دیوی کا تاج پہننے کے چند ہفتے یا چند دن بعد ہی غائب ہو جاتی لیکن کامنی کے متعلّق مندر کی لڑکیاں حیران

تھیں کہ اسے مندر کی دیوی کا تاج پہنے تین برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک مہا دیو نے اسے اپنے چرنوں میں جگہ نہیں دی۔ بعض لڑکیاں سرگوشی میں ایک دوسری سے کہا کرتی تھیں کہ کامنی سے کوئی پاپ ہوا ہے۔ اسی لیے مہا دیو اسے اپنے پاس نہیں بلاتے لیکن اکثریت کی رائے یہ تھی کہ جب تک کامنی جیسی حسین اور باکمال عورت اس کی جگہ لینے کے لیے موجود نہیں ہو گی مہا دیو اسے اپنے پاس نہیں بلائیں گے۔ روپ وتی کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ شاید ان میں کوئی کامنی کی جگہ لینے میں کامیاب ہو جائے۔ عام لڑکیوں کی جائے رہائش سے اس عالیشان عمارت میں منتقل ہونے کے بعد روپ وتی ناچ کی مشق کرنے میں اور زیادہ دلچسپی لیا کرتی تھی۔

ایک دن علی الصبح حسبِ معمول اپنے کمرے میں ناچ رہی تھی کہ کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ کچھ دیر وہ اپنے رقص میں محو رہی لیکن پھر اچانک دروازے پر اس کی نگاہ پڑی تو وہاں مندر کے پروہت کو دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔ پروہت سانولے رنگ اور درمیانے قد کا قوی ہیکل

انسان تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی لیکن اس کے چہرے سے عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اس کے بھاری چہرے کی ہیبت میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔ آنکھیں کافی بڑی تھیں اور گھنی بھنویں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ روپ وتی نے اپنے حواس پر قابو پانے کے بعد جھک کر اس کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

پروہت نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت اچھا ناچتی ہو۔“

روپ وتی نے اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر آنکھیں جھکا لیں۔ پروہت نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ ”اگر تمہارا شوق اسی طرح رہا تو تم بہت کچھ سیکھ جاؤ گی۔ ہم کامنی سے کہیں گے کہ وہ تمہارا خاص خیال رکھے۔“

پروہت کچھ اور کہے بغیر باہر نکل گیا۔ روپ وتی اپنے دل پر مسرّت کی دھڑکنیں محسوس کر رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد وہ اس عمارت سے کچھ دور ایک اور عالیشان عمارت کا رُخ کر رہی تھی۔ اس محل کی دوسری منزل پر پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی کی

نسوانی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں۔ روپ وتی!“

روپ وتی اندر داخل ہوئی۔ نرملا اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ روپ وتی کو دیکھ کر انگڑائی لینے کے بعد اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تم ابھی تک سو رہی ہو۔ اب تو سورج بھی نکل آیا ہے۔“ روپ وتی نے کہا۔

نرملا نے جواب دیا۔ ”سو نہیں رہی، یونہی لیٹی ہوئی تھی۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بیٹھ جاؤ۔ اسے تمہاری تو سانس پھولی ہوئی ہے، خیر تو ہے؟“

روپ وتی اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی۔ ”آج ایک عجیب بات ہوتی ہے۔ میں ابھی تک ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے میں نے سپنا دیکھا ہے۔ میں اپنے کمرے میں ناچ رہی تھی کہ اچانک کیا دیکھتی ہوں کہ وہاں پروہت جی کھڑے ہیں۔ پھر مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ انہوں نے کہا تم بہت اچھا ناچتی ہو، ہم کامنی دیوی سے کہیں گے کہ وہ تمہارا خیال

رکھے۔ بس اتنی سی بات کہہ کر وہ چلے گئے۔"

نرملا نے کہا۔ "میں نے پہلے دن ہی تمہارا ناچ دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ تم کسی دن مندر کی دیوی ہو گی۔ اب تو تم یہ نہیں کہو گی کہ میں نے تم سے مذاق کیا تھا تم بہت خُوش قسمت ہو روپ وتی۔"

"لیکن میں ڈرتی ہوں۔"

"کس بات سے؟"

"میں سوچتی ہوں کہ مہادیو مجھے اپنے چرنوں میں کیسے جگہ دیں گے۔ کامنی کا ناچ دیکھ کر مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں ویسی بن سکتی ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ کامنی دیوی نے تمہارے متعلّق کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا، کس سے کہا تھا۔"

"میں کل ان کے درشن کے لیے گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ روپ وتی کسی دن مجھ سے بہتر ہو جائے گی۔"

"کامنی دیوی بہت رحم دل ہے۔ لیکن میں اس قابل نہیں۔"

"تم نے کبھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے؟"

"کیا ہے میرے چہرے میں؟"

"تم بہت سندر ہو روپ وتی!""تم سے زیادہ سندر نہیں ہوں۔"

"تم بہت بھولی ہو۔" نرملا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

نرملا اور روپ وتی کو ایک دوسرے سے متعارف ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ صرف تین ماہ قبل نرملا نے اسے پہلی بار رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک دن وہ اپنے استاد سے سبق لے کر آرہی تھی کہ اسے داسیوں کی قیام گاہ کے ایک کمرے میں کسی کے ہولے ہولے سروں میں گانے کی آواز آئی۔ یہ میٹھی اور دلکش آواز اس کے کانوں کو بھلی معلوم ہوئی اور وہ دیر تک دروازے کے قریب کھڑی سنتی رہی پھر اس نے قدرے جرأت سے کام لیا اور کمرے ان کے اندر چلی گئی۔ گانے

والی روپ وتی تھی۔

نرملا نے کہا۔ ”معاف کیجیے، آپ کی آواز مجھے زبردستی اندر کھینچ لائی ہے۔“

”آیئے تشریف لایئے۔“ روپ وتی نے خندہ پیشانی سے کہا۔

”نہیں میں پھر آؤں گی۔ اب مجھے اپنا سبق یاد کرنا ہے۔“

”ضرور آیئے۔“

نرملا دروازے کے قریب پہنچ کر رُکی اور مُڑ کر روپ وتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”چند دن ہوئے میں نے آپ کو ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی میرا ارادہ تھا کہ آپ سے ملوں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ کسی دِن مندر کی دیوی کا تاج آپ کے سر پر ہو گا۔“

”آپ مذاق کرتی ہیں۔“

”نہیں میں مذاق نہیں کرتی۔“

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد چند اور ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کی بے تکلّف سہیلیاں بن چکی تھیں۔ نرملا ابھی تک انہل واڑہ کے راجہ کے محل میں رہتی تھی۔ عام طور پر وہ خود روپ وتی کے پاس جایا کرتی تھی۔ لیکن جب کبھی وہ ایک دو دن تک نہ آتی تو روپ وتی اس کے پاس پہنچ جاتی۔

۶

ایک دن روپ وتی نرملا سے ملاقات کے بعد محل سے نیچے اُتر رہی تھی کہ نچلی منزل سے کسی کے گانے کی آواز سُنائی دی۔ اس نے قدرے آہستہ سے چند قدم اُٹھائے اور پھر بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔ کسی خیال سے اس کا سارا جسم لرز اُٹھا۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ اس کی سانس ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ یہ راگ اس نے کئی بار سنا تھا، کئی بار گایا تھا۔ کبھی اس کی تانیں اس کی چھوٹی سی معصوم دنیا کو سرمستی سے لبریز کر دیا کرتی تھیں لیکن اب وہ مسرت کی بجائے خوف اور اضطراب محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی نچلی منزل میں جا

پہنچی لیکن اب اس میں آگے بڑھنے کی ہمّت نہ رہی۔ چند ثانیے توقّف کے بعد وہ ڈرتی، جھجکتی اور لرزتی ہوئی اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں سے گانے کی آواز آ رہی تھی اور کمرے کے نیم دروازے کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔ کئی بار اس نے کمرے کے اندر جانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کواڑ کو چھونے کے بعد خود بخود پیچھے ہٹ جاتے۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھنا چاہا لیکن اچانک بر آمدے سے آخری سرے سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ گھبراہٹ میں پھر سیڑھی کی طرف لوٹ آئی اور نیچے اترنے کی بجائے بھاگتی ہوئی دوبارہ نرملا کے کمرے میں جا پہنچی۔

"کیا ہوا؟" نرملا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ۔۔۔۔وہ کون ہے؟" روپ وتی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"کس کے متعلّق پوچھ رہی ہو تم۔ اری کہیں بھُوت تو نہیں دیکھ لیا تم نے؟" "نچلی منزل میں کوئی گا رہا ہے۔ وہ کون ہے؟"

”اس نے تمہیں کچھ کہا ہے؟“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں اس کی آواز سن کر ڈر گئی تھی۔“

”بیٹھ جاؤ۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تمہارا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ نیچے گانے والا کوئی بھوت نہیں ایک انسان ہے اور وہ خوفناک بھی معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا ہے۔“

”وہ کون ہے، آپ اسے جانتی ہیں، وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“

”وہ انہل واڑہ کے راجہ کا آدمی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک بہادر سپاہی ہے اور یہاں پہنچتے ہی اس نے فوج میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کر لیا ہے۔“

”تمہیں یقین ہے کہ وہ انہل واڑہ کے راجہ کا آدمی ہے؟“

”اگر وہ راجہ کا آدمی نہ ہوتا تو اس محل میں اسے ٹھہرنے کی اجازت نہ ملتی۔“

”لیکن وہ تو۔۔۔۔“ روپ وتی اتنا کہہ کر اچانک خاموش ہو گئی۔

”وہ کیا!“ نرملا نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ کوئی دنیا کا بہت ہی ستایا ہو انسان ہے۔“

”ہاں! اس کی آواز میں بہت درد ہے۔ اسے جب بھی موقع ملتا ہے گانے لگتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ رات کے تیسرے پہر گانا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن میں تمہاری پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکی۔ سچ کہو تمہارے ساتھ اس نے کوئی گستاخی تو نہیں کی؟“

”نہیں، میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔“

”تو پھر اس قدر پریشان کیوں ہو؟“

روپ وتی لاجواب ہو کر بولی۔ ”میں اس کی درد بھری آواز سُن کر چلتے چلتے ٹھہر گئی اور پھر جیسے میں سپنے کی حالت میں دیکھ رہی تھی کہ مہا دیو.جی مجھے ملامت کر رہے ہیں۔ مجھے کسی مرد کی آواز بھی پسند نہیں کرنی چاہیے۔“

”تم بہت بھولی ہو۔“

”کبھی کبھی میں پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگتی ہوں۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔“

روپ وتی کمرے سے باہر آئی تو گانے والے کا راگ ختم ہو چکا تھا۔ وہ نچلی منزل میں پہنچی تو ایک آدمی سیڑھی کے قریب برآمدے میں کھڑا باہر جھانک رہا تھا۔ اس کا چہرہ ستون کی اوٹ میں تھا۔ لیکن عین اس وقت جب روپ وتی وہاں سے گزر کر پانچ چھ سیڑھیاں نیچے اُتر گئی تو وہ آدمی جلدی سے اس کے پیچھے اترنے لگا۔ روپ وتی نے اچانک مُڑ کر دیکھا اور ایک لمحے کے لیے سکتہ میں رہ گئی۔ یہ وہی نوجوان تھا جسے وہ چاہتی تھی۔ رام ناتھ اپنے خیال میں آگے نکل گیا لیکن اچانک اس کے پاؤں رُک گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

”روپا! روپا!“ اس کے جسم اور روح کی پکار بے اختیار اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں اور پھر ان کے درمیان آنسوؤں کے پردے حائل ہونے لگے۔

”روپا! میں کئی دن سے یہاں بھٹک رہا ہوں، اس امید پر کہ تم اچانک کہیں مل جاؤ گی۔ میں کسی کو تمہارا نام بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ بھگوان نے میری پکار سُن لی اور تمہیں یہاں بھیج دیا۔ اب میں تمہیں اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔“

”بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔“ روپ وتی نے انتہائی اضطراب کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

رام ناتھ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ روپا! میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

اور روپ وتی کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چل دی۔ چند ثانیے بعد وہ رام ناتھ کے کمرے میں کھڑی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”روپا! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اس سومنات کے مندر کی دیواریں ہمارے درمیان حائل نہیں ہو سکیں گی۔“

اس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ ”بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ تمہیں

یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔ ہمارے درمیان آگ کا ایک پہاڑ کھڑا ہے۔ اسے عبور کرنے کی کوشش میں ہم دونوں بھسم ہو جائیں گے۔ میں مہا دیو کی داسی بن چکی ہوں۔ اس کی دنیا سے میرا کوئی تعلّق نہیں۔ میں تمہارے لیے مر چکی ہوں۔"

"پگلی! تم سمجھتی ہو کہ وہ پتھر کی مورتی تمہیں مجھ سے چھین لے گی۔"

"بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔"

"نادان کہیں کی۔" رام ناتھ نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ یکلخت ایک طرف ہٹ گئی اور غصّے سے کانپتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اس کے بعد تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔"

"میں سومنات کے بُت کے سامنے کھڑا ہو کر چلّاؤں گا کہ تم میری ہو۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" روپ وتی نے یہ کہ کر دروازہ کھولا اور بھاگتی ہوئی

باہر نکل گئی۔ رام ناتھ انتہائی بے بسی کی حالت میں کھڑا تھا۔ اس مسافر کی طرح جس کی تمام پونجی لٹ چکی ہو۔

رنبیر اور رام ناتھ

رام ناتھ کے سامنے مایوسی کی تاریک گھٹاؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ زندگی اب اس کے لیے صبح وشام کے بے کیف تسلسل کا نام تھی۔ وہ دلکش نغمے جو اسے روپ وتی کی محبت نے سکھائے تھے، اب اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ اس فریب میں مبتلا رہنا چاہتا تھا کہ روپ وتی اس سے ہمیشہ کے لیے جدا نہیں ہو گی۔ وہ علی الصبح اٹھتا اور مندر کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا۔ عام لوگوں کو خاص خاص موقعوں کے سوا اس خندق کا پُل عبور کرنے کی اجازت نہ تھی جو مندر کے ساتھ چند ملحقہ عمارات کو قلعے کے وسیع احاطہ سے جدا کرتی تھی۔ پہریدار ہر

آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے تھے۔

رام ناتھ پنڈتوں، سادھوؤں، داسیوں اور ادنیٰ حیثیت کے ملازموں کو پُلوں پر آتے جاتے دیکھتا لیکن روپ وتی اسے کہیں نظر نہ آتی۔ پھر مایوسی کی حالت میں فوج کی تربیت گاہوں میں چلا جاتا۔ ابتدائی چند دنوں میں اس نے نیزہ بازی اور تیغ زنی کے مقابلوں میں کافی نام پیدا کر لیا تھا لیکن روپ وتی سے ملاقات کے بعد اس پر ایک ذہنی اور جسمانی جمود طاری ہو چکا تھا اور جب فوج کے افسر اسے کسی مقابلے میں شرکت کی دعوت دیتے تو وہ علالت کا بہانہ کر دیتا۔

ایک شام وہ اپنی قیام گاہ سے نکلا اور ٹہلتا ہوا خندق کے پُل کے قریب جا پہنچا۔ اسے خندق کے دوسرے کنارے روپ وتی دکھائی دی۔ وہ نرملا کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی پُل کی طرف آ رہی تھی۔ رام ناتھ کا دل دھڑکنے لگا۔ روپ وتی پُل کے قریب پہنچ کر رک گئی لیکن نرملا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچ کر پُل کے اوپر لے آئی۔ نصف سے زیادہ پل عبور کرنے کے بعد اچانک روپ وتی کی نگاہ رام ناتھ پر پڑی۔ وہ رُکی اور بدحواسی کی

حالت میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ نرملا کچھ دیر پریشانی کی حالت میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر اپنی قیام گاہ کی طرف بڑھی۔

رام ناتھ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا اور چند ثانیے توقف کے بعد نرملا کے پیچھے ہو لیا اور جلد ہی اس کے قریب پہنچ کر ملتجی آواز میں بولا۔ ”دیوی ٹھہریے۔“

وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”معاف کیجیے۔ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”پوچھیے!“ نرملا نے ملائمت سے جواب دیا۔

”میں اس لڑکی کے متعلّق پوچھنا چاہتا ہوں جو ابھی آپ کے ساتھ آ رہی تھی۔“

نرملا کو مندر کی ہونے والی دیوی کے لیے لڑکی کا لفظ کچھ ناگوار محسوس ہوا اور اس نے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ آپ کوئی اور بات کریں، میں یہ بتا دینا

ضروری سمجھتی ہوں کہ وہ عام لڑکی نہیں۔ وہ بہت جلد مندر کی دیوی بننے والی ہے۔"

رام ناتھ کا دل بیٹھ گیا اور اس نے قدرے محتاط ہو کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے وہ آپ کی سہیلی ہے۔ ایک دن میں نے اسے محل میں دیکھا تھا۔ شاید وہ آپ سے ملنے آئی تھی۔"

نرملا نے کہا۔ "تو اس دن اس کی پریشانی کی وجہ آپ تھے اور آج بھی شاید وہ آپ کو دیکھ کر واپس چلی گئی ہے۔ دیکھیے! اگر آپ زندگی سے تنگ نہیں آئے تو دوبارہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کریں۔ یہ مہا دیو کا مندر ہے، انہل واڑہ کا بازار نہیں۔"

رام ناتھ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ سینے میں گھُٹ کر رہ گئے۔

۲

رات کو رام ناتھ دیر تک بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی اُمّید کا آخری چراغ بجھ چکا تھا۔ اس کے سینے میں محبت کے نغمے خاموش ہو

چکے تھے۔ زندگی میں اب کوئی دلکشی باقی نہ تھی۔ روپ وتی اس سے ہمیشہ کے لیے چھن چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور وہ بھی صرف نفرت کے لیے۔ روپ وتی نے اس کی محبت کے پھول مسل دیے تھے اور اب وہ اس کی آنکھوں میں ایک خار بن کر کھٹکنا چاہتا تھا۔ پھر وہ سوچتا کیا میں اس سے نفرت کر سکتا ہوں، اور کیا میری نفرت کا اظہار اسے متاثر کر سکتا ہے۔ نہیں، میرے دل کی آگ صرف مجھے جلا سکتی ہے۔ وہ مجھے نہیں دیکھے گی، وہ مجھے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ میرے اور اس کے درمیان مندر کی بند دیواریں حائل ہیں۔ وہ مندر کی دیوی بننے والی ہے۔ راجے اور رانیاں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوا کریں گے۔ وہ میری طرف کیسے دیکھے گی۔ دیوتاؤں کا خوف اس کے اور میرے درمیان حائل رہے گا۔ پھر وہ کسی دن مہا دیو کے چرنوں میں پہنچ جائے گی۔ کیسے اور کیوں؟ اس کے ان کو سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایک ذہنی تبدیلی کے باوجود جس کا پس منظر خیالات کے نشو و ارتقا کے بجائے صرف چند حادثات تھے۔ وہ اس طلسم کی گہرائیوں تک نگاہ دوڑانے سے قاصر تھا جو سومنات کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے تھا۔

دیر تک سوچنے کے بعد وہ اس حقیقت کا اعتراف کر رہا تھا کہ روپ وتی کی سنگدلی اور بے وفائی کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا۔ میں پتھر کے بتوں کی عظمت سے انکار کر سکتا ہوں لیکن اس انکار سے حقیقت نہیں بدل سکتی کہ روپ وتی کو وہ مجھ سے چھین چکے ہیں اور میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں کسی سلطنت کا راجہ بن کر بھی سومنات کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا۔ مندر کے پروہت کے حکم سے اس ملک کے لاکھوں انسان میرا گوشت نوچنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میں اس دن اپنے آپ کو کِس قدر خوش قسمت سمجھتا تھا کہ جب انہل واڑہ کے راجہ نے مجھے ہیروں کی مالا اور ہاتھی عطا کیا تھا۔ سومنات کے مندر کا رُخ کرتے ہوئے میں یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میرے قدموں میں ہے۔ روپ وتی مجھ پر فخر کرے گی۔ لیکن اب میں کیا ہوں۔ ایک ایسا انسان جو زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ اس دن مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ اسے ہیروں کی مالا پیش کرنے کا موقع نہ ملا لیکن اگر میں یہ مالا پیش بھی کر دیتا تو وہ شاید قہقہہ لگا کر کہتی کہ ایسے پتھر ہر روز میرے قدموں پر نچھاور کئے جاتے ہیں۔ روپ وتی کے مقابلے میں کمتری کے احساس نے اس کی بے بسی اور تلخی میں اضافہ کر دیا۔ وہ بھاگنا چاہتا

تھا۔ سومنات سے کہیں دور، جہاں روپا کی یاد اسے پریشان نہ کر سکے لیکن دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ روپ وتی جو سومنات کی دیوی بننے والی ہے، ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھن چکی ہے لیکن وہ دیہاتی لڑکی جو دریا کے کنارے میرے گیت گایا کرتی تھی، ہمیشہ میرا پیچھا کرتی رہے گی، اس کی مسکراہٹ ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتی رہیں گی۔ میری روح کائنات کی بھیانک وسعتوں میں ہمیشہ اسے پکارتی رہے گی۔ ”روپا! روپا!“ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ ”میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔“

صبح ہو گئی۔ وہ اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ لیے محل سے باہر نکلا، مندر کی طرف ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر قلعے کی چہل پہل دیکھتا ہوا اس طرف نکل گیا جہاں گھوڑوں کے اصطبل تھے۔ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مُڑ کر دیکھا اور بے اختیار ”رنبیر رنبیر!“ کہتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔ رنبیر ایک عام سپاہی کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے آپ کو رام ناتھ کی گرفت سے چھڑاتے

ہوئے کہا۔ ''یہاں ہمارا ایک دوسرے سے بے تکلف ملنا ٹھیک نہیں۔''

رام ناتھ نے کہا۔ ''تم بہت اچھے وقت پر ملے ورنہ میں کہیں جا رہا تھا۔ کب آئے تم؟''

رنبیر نے جواب دیا۔ ''میں کئی دن سے یہاں ہوں لیکن قلعے کی فوج میں پرسوں بھرتی ہوا تھا۔ اس سے قبل میں شہر میں تھا۔ تم کہاں جا رہے تھے؟''

''مجھے معلوم نہیں، شاید میں کچھ عرصہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد تمہارے گاؤں پہنچ جاتا۔''

''تم بہت مغموم معلوم ہوتے ہو۔ روپ وتی کا کچھ پتہ چلا۔''

''وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھن چکی ہے۔ کاش! میں یہاں نہ آتا۔''

''کیا ہوا اُسے۔ مجھے تمام واقعات سناؤ۔''

رام ناتھ نے اپنی ملاقات کے حالات بیان کر دیے۔ اس کی آنکھوں میں

آنسو چھلک رہے تھے۔

رنبیر نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”تمھیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“
رام ناتھ نے کہا۔ ”تم نہیں جانتے رنبیر! مندر کی دیوی بننے کی بعد اسے دنیا کی کوئی طاقت واپس نہیں لا سکتی۔“

”مجھے یقین ہے کہ تمھاری محبّت دنیا کی ہر طاقت کو شکست دے گی۔“

رام ناتھ ایک بار پھر تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے رنبیر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تُم سے بُہت کچھ کہنا ہے۔“

رنبیر اس کے ساتھ چل دیا۔

۳

نرملا محل کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہی تھی۔ اچانک اُسے رام ناتھ اور رنبیر اوپر آتے ہوئے دکھائی دیے اور وہ انہیں راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ رنبیر گردن جھکائے رام ناتھ کے ساتھ باتیں

کرتا آرہا تھا۔ اس لیے وہ نرملا کو نہ دیکھ سکا۔ نرملا نے پہلے تو اس کی طرف بے توجہی سے دیکھا لیکن دوسری نظر میں دیکھتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جب ان کے درمیان صرف دو زینوں کا فاصلہ رہ گیا تو رنبیر نے اچانک گردن اُٹھائی اور نرملا کو دیکھ کر وہیں ٹھٹک گیا۔ رام ناتھ چند زینے اوپر چڑھ گیا لیکن یہ دونوں سکتے کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسی میں زبان ہلانے یا آنکھیں جھپکانے کی سکت نہ تھی۔ انہیں اپنے دلوں کی دھڑکنیں محسوس ہونے لگیں۔ نرملا کے چہرے پر سُرخ و سپید لہریں دوڑنے لگیں۔ رنبیر نے رام ناتھ کی طرف دیکھا جو چند زینے اوپر کھڑا پریشان ہو کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ نرملا وہیں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ جب وہ دونوں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو نرملا نیچے اُترنے کی بجائے زینے پر چڑھنے لگی۔ ہر قدم پر اس کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ رنبیر دوسری منزل کے برآمدے میں آکر رُکا اور اس نے رام ناتھ سے سوال کیا۔ ”تم جانتے ہو وہ کون ہے؟“

رام ناتھ نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اسی محل میں رہتی ہے۔ ایک نوکر نے مجھے بتایا تھا کہ انہل واڑہ کے راجہ اس کے باپ کا دوست ہے لیکن تم اسے دیکھ کر اس قدر بدحواس کیوں ہو گئے تھے۔“

رنبیر نے کہا۔ ”یہ وہی ہے، جے کرشن کی بیٹی۔ تم نے اسے ہمارے محل میں نہیں دیکھا؟“

”نہیں، وہاں مجھے اس کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔“

”اس کا باپ بھی یہیں رہتا ہے؟“

رام ناتھ اس سوال کا جواب دینا چاہتا تھا لیکن نرملا کو اوپر آتے دیکھ کر چُپ ہو گیا۔ سیڑھی کے موڑ پر پہنچ کر نرملا نے ایک ثانیہ کے لیے رُک کر اُن کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

رنبیر نے کہا۔ ”میں اس کے باپ کے متعلق پوچھ رہا تھا۔“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”میں اس کے باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ یہاں نہیں۔ اس لڑکی کے پاس چند نوکروں اور نوکرانیوں کے سوا کوئی نہیں۔ ایک نوکرانی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ٹھہری ہوئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو دیکھ کر وہ کیا خیال کرے گی۔ اگر وہ چاہے تو آپ کے لیے بہت سے خطرات پیدا کر سکتی ہے۔ یہاں فوج میں انہل واڑہ کے کئی دستے ہیں۔ اگر وہ انہیں حکم دے تو وہ فوراً اس محل کا محاصرہ کر لیں گے۔ مندر کے بڑے پروہت تک بھی اس کی رسائی ہے۔“ رنبیر نے کہا۔ ”اگر اس کا باپ یہاں نہیں ہے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں، تاہم جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں اس کے لیے احتیاط برتنا ضروری ہے۔ تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔“ رنبیر رام ناتھ کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر واپس مڑا اور تیزی سے سیڑھی پر چڑھنے لگا۔

نرملا اپنے کمرے کے قریب پہنچ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ رنبیر سیڑھی سے نمودار ہوا تو اس کا چہرہ ایک بار پھر تمتما اُٹھا۔ رنبیر آگے بڑھا تو

وہ جھجکتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی۔ رنبیر تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔ نرملا ایک ثانیہ کے لیے دروازے سے باہر جھانکنے کے بعد پیچھے ہٹ گئی۔ رنبیر کمرے میں داخل ہوا اور ان سے جھکی جھکی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نرملا مُسکرائی اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔

رنبیر نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”معاف کیجیے۔ میں آپ کو پریشان کرنے نہیں آیا۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ کو مجھ سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔“

نرملا نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ ”آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن میں اب بھی تمہارے باپ کا دشمن ہوں۔“

وہ بولی۔ ”دنیا میں اگر کسی انسان کو اچھا دوست نہ ملے تو اچھا دشمن مل جانا بھی غنیمت ہے۔ آپ یقین رکھیں کہ جب آپ کی تلوار میرے پِتا کی

گردن پر ہو گی تو میں آپ سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔"

"اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو بھول سکتا ہوں تو آپ غلطی پر ہیں۔"

"کیا آپ مجھے یہی بتانے آئے ہیں؟" نرملا کی خوبصورت آنکھیں پھر ایک بار آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

رنبیر نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے سینے میں انتقام کی آگ سرد ہو کر رہ گئی۔ چند لمحات کے لیے وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے ایک ایسی لڑکی کھڑی تھی جس کی مسکراہٹ ماضی کی تمام تلخیوں کا مداوا بن سکتی تھی۔ جس کے آنسو بغض و عناد کی اس سیاہی کو دھو سکتے تھے جو اس کی زندگی کے دامن پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں میٹھی اور دلکش آواز گونج رہی تھی جو اسے ایک نئی زندگی کا پیغام دے چکی تھی۔ وہ ان ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سازِ حیات کے ٹوٹے ہوئے تار جوڑ سکتے تھے۔ نرملا اپنی رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کی داستانِ حیات کا ایک نیا ورق اُلٹ رہی تھی۔ چند لمحات کے لیے وہ سب

کچھ بھول جانا چاہتا تھا لیکن اچانک اس کا سارا جسم کپکپا اُٹھا۔ ”میں کیا سوچ رہا ہوں۔“ اس نے اپنے دل سے سوال کیا اور بوڑھے باپ کا خون اور نوجوان بہن کے آنسو ان کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

نرملا نے پھر کہا۔ ”آپ مجھے یہی بتانے آئے تھے کہ آپ میرے باپ کو نہیں معاف کر سکتے؟“

رنبیر نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ اُمّید نہ تھی کہ آپ یہاں ہوں گی۔ میں یہاں اپنی بہن کی تلاش میں آیا ہوں۔“

نرملا نے کہا۔ ”میں بھی آپ کی بہن کو تلاش کر چکی ہوں۔ شکنتلا نام کی یہاں تین لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی قنوج کی نہیں۔ میں بڑے پروہت اور پجاریوں سے پوچھ چکی ہیں۔“

”میں اس ہمدردی کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں لیکن آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ وہ یہاں ہو گی۔“

”آپ کا گاؤں چھوڑنے کے بعد میں بھگوان سے صرف یہ دعا مانگا کرتی تھی کہ آپ کی بہن آپ کو مل جائے۔ میں نے اسے گوالیار میں بھی تلاش کیا تھا لیکن آپ مایوس نہ ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے ضرور ملے گی۔ اس دنیا میں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی ہو جاتی ہیں جن کا انسان کو گمان تک نہیں ہوتا۔ یہ بات میرے تصوّر میں بھی نہ تھی کہ میں آپ کو دوبارہ دیکھ سکوں گی۔ اب بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ میرے سامنے کھڑے ہیں۔“

رنبیر پھر ایک بار محسوس کرنے لگا کہ اس کے پاؤں زمیں پر نہیں ہیں۔ اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے پوری قوّت سے چلّانا چاہتا تھا۔ ”تم جے کرشن کی بیٹی ہونے کے باوجود تم میری ہو۔“ وہ گرنے کو تھا کہ ایک بار گرنے کے بعد وہ پھر نہیں اُٹھ سکے گا لیکن جذبات کی دوسری رو اسی شدّت سے اس کا جذبۂ مدافعانہ بیدار کر رہی تھی۔ وہ اپنے دل سے پوچھ رہا تھا۔ ”کیا تم جے کرشن کو معاف کر سکتے ہو۔ کیا تم اپنی بہن اور اپنے باپ کو بھلا سکتے ہو؟“

”تشریف رکھیے۔“ نرملا نے ملائمت سے کہا۔

”نہیں نہیں، مجھے معاف کیجیے۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

نرملا نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے بازو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھگوان کے کھیل ہیں اور اس کی مرضی کے بغیر ہم دونوں بے بس ہیں۔“

لیکن رنبیر اچانک پیچھے ہٹا، مُڑا اور آنکھ جھپکنے میں باہر نکل گیا۔

”رنبیر!“ پیچھے سے نرملا کی آواز سنائی دی اور اس نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کے پاؤں میں بھاری زنجیریں ڈال دی ہیں لیکن اس میں پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی جرأت نہ تھی۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کے باوجود اس کی رفتار ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ دو لڑکیاں سیڑھی سے اوپر چڑھ رہی تھیں۔ رنبیر کو اندھا دھند نیچے اُترتا دیکھ کر وہ بدحواس ہو کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ رام ناتھ نچلی منزل میں سیڑھی کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیا ہوا رنبیر! تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟“

"کچھ نہیں۔" رنبیر نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ رام ناتھ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے کو اپنی سرگزشت سنا رہے تھے۔ روپ وتی کے متعلق چند باتیں پوچھنے کے بعد رنبیر نے کہا۔ "میں اب اس قلعے سے باہر جا رہا ہوں۔ جب واپس آؤں گا تو تمہیں یہ بتا سکوں گا کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ روپ وتی کو اب بہت بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے۔ اُسے یہاں سے نکالنا ضروری ہے۔"

"کیسا خطرہ؟"

"تم نے نہیں سُنا کہ جو لڑکی مندر کی دیوی یا سب سے بڑی رقاصہ بنتی ہے وہ کسی رات اچانک غائب ہو جاتی ہے۔"

"ہاں میں نے بھی سنا ہے اور میں اس بات پر حیران ہوں کہ وہ جیتے جی مہا دیو کے چرنوں میں کیسے پہنچ جاتی ہے۔"

رنبیر نے کہا۔ ”اگر ہمیں اس بات کا علم ہو گیا کہ سمندر کی موجودہ دیوی کس رات غائب ہو گی تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے کہ وہ مہا دیو کے چرنوں میں کس طرح پہنچ جاتی ہے۔“

”یہ بات تو آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکی۔ ایک رات اچانک مندر کی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں اور لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مندر کی دیوی مہا دیو کے چرنوں میاں پہنچ چکی ہے۔ اگلی شام مندر میں جشن منایا جاتا ہے اور دیوی کا تاج کسی اور کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے۔“

رنبیر نے کہا۔ ”میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہمیشہ اس رات کے منتظر رہتے ہیں جنہوں نے دیویوں کو مہا دیو کے چرنوں تک پہنچتے دیکھا ہے۔ میں ایک ایسی دیوی کے متعلق سن چکا ہوں جو چار سال قبل مہا دیو کے چرنوں تک پہنچتے پہنچتے واپس آگئی تھی۔ اگر مندر کے پروہت کو اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے تو سومنات کا تمام لشکر اس کی تلاش میں نکل آئے گا۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”میں کچھ نہیں سمجھا۔ بھگوان کے لیے مجھے صاف صاف

بتائیے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔"

رنبیر نے کہا۔ "مندر کی دیوی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بڑے پروہت کو خوش رکھنا ہے۔ جب پروہت کا جی اُچاٹ ہو جاتا ہے تو وہ اُسے کسی اور دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔"

رام ناتھ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ اسے مار دیا جاتا ہے۔"

رنبیر نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں اُسے مندر سے دور سمندر کی سطح پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جہاں آدم خور مچھلیاں ہر وقت نئے شکار کی تلاش میں رہتی ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔ آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔"

"یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے یہ باتیں تمہارا دل دکھانے کے لیے نہیں کیں۔

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ روپ وتی اس افسوس ناک انجام سے بچ جائے۔ اب میں جاتا ہوں۔"

رنبیر کھڑا ہو گیا۔ رام ناتھ نے پوچھا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟" رنبیر نے جواب دیا۔ "شہر سے باہر دریا کے کنارے ایک سادھو رہتا ہے، اس کا نام بھگوان داس ہے۔ اگر تم کسی وقت میری ضرورت محسوس کرو تو اس کے پاس آ جانا۔ شہر کے لوگ اُسے جانتے ہیں اور تمہیں تلاش میں دقّت نہیں ہو گی۔"

۴

رنبیر کی ملاقات سے دوسرے دن نرملا مندر میں اپنے استاد سے سبق لے کر واپس آ رہی تھی تو محل کے دروازے پر ایک نوکرانی نے بتایا کہ ابھی آپ کے پِتا جی آئے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

نرملا کے لیے پِتا کی آمد غیر متوقع تھی۔ اس کے پِتا نے چند دن پہلے صرف یہ پیغام بھیجا تھا کہ رگھو ناتھ کی کوششوں سے اسے انہل واڑہ کے راجہ نے

ایک بڑی جاگیر عطا کر دی ہے اور وہ اس کے انتظام میں مصروف ہے۔ اس لیے تین چار مہینے تک سومنات نہیں آسکے گا۔

وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ جے کرشن اُسے دیکھتے ہی اُٹھا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''بیٹی! تمہارا چہرہ اس قدر مُرجھایا ہوا کیوں ہے؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں پِتا جی! بیٹھیے۔''

جے کرشن نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا رنگ بہت زرد ہو گیا ہے بیٹی!''

نرملا نے دوسری کرسی پر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ ''پِتا جی! میں آپ کو ہمیشہ بیمار نظر آتی ہوں۔''

''میں تمہارے لیے ایک خوشخبری لایا ہوں بیٹی!'' ''کیسی پِتا جی؟''

جے کرشن نے اُٹھ کر نرملا کے پلنگ پر رکھی ہوئی آبنوس کی ایک صندوقچی اُٹھائی اور اس کی گود میں رکھ دی۔

"اس میں کیا ہے پِتا جی؟" نرملا نے دریافت کیا۔

"کھول کر دیکھ لو۔"

نرملا نے صندوقچی کا ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا تو اس میں جواہرات کے زیور جگمگا رہے تھے۔ وہ جواب طلب نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

جے کرشن نے کہا۔ "بیٹی یہ تمام زیور تمہارے ہیں۔"

نرملا کی حیرانی خوف اور اضطراب میں تبدیل ہونے لگی۔

جے کرشن نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ "تم بہت خوش قسمت ہو بیٹی۔ رگھوناتھ تو بڑے بڑے راجوں کے خاندانوں کی لڑکیوں کو ٹھکرا کر تمہیں منتخب کیا ہے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

نرملا کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ جے کرشن اس کے سامنے رگھوناتھ کی شخصیت، اس کی دولت، اس کے محل کی شان و شوکت اور راجہ کے دربار میں اس کے اثر و رسوخ کی تعریف کر رہا تھا لیکن نرملا جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دل سے کہہ رہی تھی۔ "کیا میرے سپنوں کی

تعبیر یہی تھی؟ کیا میں نے اسی آندھی کے لیے چراغ روشن کیے تھے۔ کیا قدرت کے نامعلوم ہاتھ ہمیں صرف اس لیے مختلف سمتوں سے گھیر گھار کر ایک دوسرے کے قریب لاتے رہے ہیں کہ ہم اچانک ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں۔ کل میرے لیے رنبیر نئی اُمّیدوں کا پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ مجھے پریشانی کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پھر آئے گا۔ وہ بار بار آئے گا۔ اگر یہ نہ آیا تو قدرت مجھے اس کے پاس لے جائے گی لیکن کیا یہ سب کچھ ایک وہم تھا؟"

جے کرشن رگھوناتھ کی تعریفوں کے پُل باندھ رہا تھا۔ نرملا کا دم گھُٹ رہا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُٹھ کر بھاگ جائے لیکن اس میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔

بالآخر جے کرشن نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں پروہت جی سے مل آؤں۔ تمھیں لے جانے کے لیے ان کی اجازت ضروری ہے۔"

وہ باہر نکل گیا اور نرملا کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔

وہ دیر تک غم میں ڈوبی رہی۔

۵

رام ناتھ علی الصبح قلعے سے باہر نکل کر شہر پہنچا اور وہاں سے بھگوان داس کا پتہ پوچھتا ہوا دریا کے کنارے ایک باغ میں داخل ہوا۔ بھگوان داس جس کا اصلی نام اس کے چند عقیدت مندوں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا، ایک برگد کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ چند آدمی اس کے گرد جمع تھے۔

"میں بھگوان داس سے ملنا چاہتا ہوں۔" رام ناتھ نے آگے بڑھ کر کہا۔

بھگوان داس نے گردن اُوپر اُٹھائی اور رام ناتھ کو سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد کہا۔ "بھگوان داس میرا نام ہے۔ کہیے۔"

رام ناتھ نے کہا۔ "میں رنبیر کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس نے مجھے اس جگہ کا پتہ دیا تھا۔"

بھگوان داس نے اس کی طرف دوبارہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کا نام؟" "میرا نام رام ناتھ ہے۔"

بھگوان داس نے کہا۔ ”رنبیر اس وقت یہاں نہیں۔ ممکن ہے وہ تھوڑی دیر تک یہاں آجائے لیکن یہ ضروری نہیں۔“

”وہ اس وقت کہاں ہو گا، میں اس سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔“

بھگوان داس نے عربی زبان میں اپنے ایک ساتھی کو کچھ سمجھایا اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے رام ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”آپ اس کے ساتھ جائیں۔“

رام ناتھ اس کے ہمراہ چل دیا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ بالآخر رام ناتھ نے اپنے رہنما سے دریافت کیا۔ ”رنبیر کہاں گیا ہے؟“

”وہ آپ کو بندرگاہ پر ملے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

رام ناتھ نے باقی راستہ اس سے کوئی بات نہ کی۔

بندرگاہ سومنات کے شہر کا ایک پُررونق حصّہ تھی۔ بڑی بڑی دکانوں میں دور دراز کے ممالک کی مصنوعات فروخت ہوتی تھیں۔ سمندر کے کنارے دور دور تک تاجروں اور ماہی گیروں کی کشتیاں دکھائی دیتی

تھیں۔ ساحل سے ذرا فاصلے پر گہرے پانی میں پانچ جہاز کھڑے تھے۔ کشتیاں کسی جہاز سے تجارتی مال اُتارنے اور کسی پر لادنے میں مصروف تھے۔ ان جہازوں سے آگے حدِّ نگاہ تک کئی اور جہازوں اور کشتیوں کے بادبان نظر آرہے تھے۔

رام ناتھ لوگوں کے ہجوم میں رُک رُک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن اس کے ہمراہی نے کہا۔ ”وہ آپ کو یہاں نہیں ملے گا۔ میرے ساتھ آیئے۔“

رام ناتھ پھر اس کے پیچھے ہولیا۔ سمندر کے کنارے کنارے تھوڑی دور جاکر اس کا ساتھی ایک کشتی کے پاس رُکا اور عربی زبان میں ملّاحوں کو کچھ سمجھانے کے بعد کشتی میں سوار ہو گیا۔ رام ناتھ نے اس کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر بعد یہ کشتی گہرے پانی میں ایک جہاز کی طرف روانہ ہو گئی۔ جہاز کے قریب پہنچ کر رام ناتھ کے رہنما نے جہاز کے ملّاحوں کو دیکھ کر انہیں بلند آواز سے عربی میں کچھ کہا۔ جہاز کا ایک ملّاح اس سے چند باتیں کر کے جہاز میں کہیں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نمودار ہوا تو

رنبیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ رنبیر کا اشارہ پا کر ملّاحوں نے فوراً رسّیوں کی سیڑھی نیچے لٹکا دی۔

رام ناتھ کے رہنما نے کہا۔ ”آپ اوپر جائیں، ہم یہیں انتظار کریں گے۔“

رام ناتھ سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھ گیا اور جہاز پر پاؤں رکھتے ہی رنبیر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں صبح سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔“

”خیر تو ہے؟“ رنبیر نے پوچھا۔

”رام ناتھ جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ معاً اس کی توجّہ ایک خوش پوش آدمی کی طرف مبذول ہو گئی جو جہاز کے دوسرے کونے سے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ جسم کے لحاظ سے اس کا چہرہ کچھ پتلا تھا۔ کشادہ پیشانی تیکھے نقوش اور چمکدار آنکھوں سے ذہانت اور شجاعت ٹپکتی تھی۔ اس کی چال میں غایت درجہ کی خود اعتمادی تھی۔ ملّاح اُسے دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔

رنبیر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”یہ میرا دوست رام ناتھ ہے۔

میں آپ سے ان کا ذکر کر چکا ہوں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے رام ناتھ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا: ”میرا نام سلمان ہے۔“

”یہ اس جہاز کے کپتان ہیں۔“ رنبیر نے کہا۔

مصافحہ کرتے وقت رام ناتھ کی انگلیاں اس کی آہنی گرفت میں بھنچ کر رہ گئیں۔ رنبیر نے رام ناتھ کو تذبذب میں دیکھ کر کہا۔ ”آپ یہاں بے تکلّفی سے باتیں کر سکتے ہیں۔“

سلمان نے ملّاحوں کو ہاتھ سے ارشاد کیا اور وہ آن کی آن میں اِدھر اُدھر چلے گئے۔

رام ناتھ نے کہا۔ ”میں آپ کو یہ خبر دینے آیا ہوں کہ جے کرشن آ گیا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ رنبیر نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”وہ اسی محل میں اپنی بیٹی کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔“

رنبیر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”تو اُسے میرے متعلّق معلوم ہو گیا ہو گا۔“

”نہیں مجھے یقین ہے کہ نرملا اس سے آپ کا ذکر نہیں کرے گی۔“

”کیوں؟“

”میں اس سے مل چکا ہوں۔ وہ رات کے وقت میرے کمرے میں آئی تھی اور اس نے رو رو کر مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس کے پاس آپ کا آخری پیغام پہنچا دوں۔ وہ کل اپنے باپ کے ساتھ چلی جائے گی لیکن جانے سے پہلے وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے؟“

”تو اسے ابھی تک اس بات کا یقین ہے کہ اس کے آنسو اس کے باپ کے پاپ دھو سکیں گے۔“

”میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ آپ کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔“

رنبیر کا ارادہ ایک بار پھر متزلزل ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے بس کی بات نہیں رام ناتھ! میں یہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ وہ جے کرشن کی بیٹی ہے اور میں موہن چند کا اور شکنتلا کا بھائی ہوں۔ میں اپنے خاندان کی غیرت ایک لڑکی کے آنسوؤں کی بھینٹ نہیں کر سکتا۔ میں وہاں چلوں گا لیکن جے کرشن کی بیٹی سے ملنے کے لیے اور یہ اس سے میری آخری ملاقات ہو گی۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”لیکن میں آپ کو جے کرشن کے سامنے نہیں جانے دوں گا۔“

رنبیر نے رام ناتھ کی بات پر توجّہ نہ دی اور سلمان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں رات کے وقت سمندر کے راستے مندر میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ کیونکہ قلعے کا دروازہ بند ہو گا اور باہر آنے کے لیے بھی مجھے یہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا، اس کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

سلمان نے رنبیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر میں انکار کر دوں تو؟“

”تو میں ابھی رام ناتھ کے ساتھ وہاں چلا جاؤں گا۔ جے کرشن سے نپٹنا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔“

”لیکن آپ اگر اس سے انتقام لینے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو بھی وہاں سے بچ نکالنا آسان نہیں ہو گا۔“

”مجھے اس بات کی پروا نہیں۔“

سلمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں، لیکن میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

رام ناتھ نے رنبیر سے کہا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

”نہیں تم ابھی واپس چلے جاؤ۔ میں سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میرے لیے بہترین موقع وہ ہو گا جب مندر کے لوگ پوجا پاٹ میں مشغول ہوں گے۔ تم محل کے دروازے پر میرا انتظار کرنا اور نرملا کو میرے متعلّق کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”میں شام تک محل سے باہر رہوں گا۔“

وہاں سے رخصت ہوتے وقت جب رام ناتھ نے مصافحے کے لیے سلمان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا۔ ”ہم دوبارہ ملیں گے۔ میں آپ کے دوست کی زبانی آپ کی سرگزشت سن چکا ہوں۔ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“

رام ناتھ پُر امّید ہو کر اس کی جانب دیکھتا رہا۔ سلمان تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ”اگر تم کسی طرح اس لڑکی کو مندر سے نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہ جہاز تمہاری جائے پناہ ہو گا۔“

رام ناتھ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کب تک یہاں ہیں؟“

”جب تک مجھے یہ اُمّید رہے گی کہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

اچانک رام ناتھ کے دل میں ایک اور خیال آیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے مایوسی کا اندھیرا چھا گیا۔ اس نے کہا ”مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ اپنی مرضی سے مندر چھوڑنے پر تیار ہو جائے گی۔“

سلمان نے کہا۔ ”جب وہ مندر کی دیوی بنے گی تو تم اس کے خیالات میں بہت بڑی تبدیلی پاؤ گے۔ اس رات وہ چلّا چلّا کر تمہیں مدد کے لیے پکار رہی ہو گی۔“

رام ناتھ کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے ملتجی آواز میں کہا۔ ”میں نے اس قسم کی باتیں پہلے بھی سنیں ہیں لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ آپ کی صورت دیکھ کر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔ بھگوان کے لیے مجھے بتائیے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔“

”وہی جو گزشتہ صدیوں میں بے شمار لڑکیوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ابھی تک ایک عورت مالابار میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ چار سال پہلے وہ بھی اس مندر کی دیوی تھی۔ پھر جب مندر کے پروہت کی طبیعت اس سے بھر گئی تو اسے مہا دیو کے پاس پہنچانے کے بہانے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ رام ناتھ نے سراپا التجا بن کر کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ روپ وتی کا یہ انجام نہیں ہو گا۔ بھگوان نے آپ کو اس کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔“

”میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے آپ کی مدد کرنے کی ہمّت دے۔“

٦

کافی رات گزر چکی تھی۔ جے کرشن نرملا کے کمرے میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا لیکن نرملا کی توجہ کہیں اور تھی۔ وہ رنبیر کے متعلق پوچھنے کے لیے صبح سے شام تک کئی بار نچلی منزل میں رام ناتھ کے کمرے میں جا چکی تھی لیکن وہ وہاں موجود نہ تھا۔ اب وہ ایک بار پھر قسمت آزمانا چاہتی تھی لیکن جے کرشن رگھو ناتھ کا ذکر چھیڑ چکا تھا اور اس کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ نرملا نے سوچا رام ناتھ کے نہ آئے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ رنبیر اسے ابھی تک نہیں ملا۔ یا پھر بہت دیر بعد ملا ہو گا اور وہ رات کے وقت قلعے کے دروازے بند پا کر واپس چلے گئے ہوں گے۔ اب وہ علی الصبح قلعے کے دروازے کے کھلتے ہی وہاں پہنچ جائیں گے لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی خیال آیا کہ ممکن ہے وہ صبح دیر سے پہنچیں اور اسے اپنے پِتا کے ساتھ انہیں دیکھے بغیر روانہ ہونا پڑے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنا سفر ملتوی کرنے کے بہانے سوچنے لگی لیکن کسی بھی فیصلہ کن اقدام کے لیے رنبیر کے ساتھ اس کی ملاقات ضروری تھی۔ رنبیر کے دل میں اپنے لیے تھوڑی سی جگہ پا کر وہ طوفان کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ لیکن رنبیر سے مایوس

ہونے کے بعد اس کے لیے خوشی اور غم دونوں الفاظ بے معنی تھے۔ رنبیر اس کا آخری سہارا تھا اور یہ سہارا ٹوٹ جانے کے بعد مستقبل کی تمام امیدیں اور آرزوئیں ختم ہو جاتی تھیں۔

کچھ دیر بعد نرملا نے آنکھیں بند کر کے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ''پِتاجی! میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔'' جے کرشن نے پریشان ہو کر کہا۔ ''اوہو! تمہیں نیند آ رہی ہے۔ مجھے باتوں میں یہ خیال نہیں رہا کہ تم گزشتہ رات بھی بہت کم سوئی تھی اور کل تو ہمیں سویرے اٹھنا ہے۔ اچھا میں جاتا ہوں۔''

نرملا نے اس کے ساتھ اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''چلیے میں آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔''

''نہیں نہیں بیٹی تم لیٹ جاؤ۔'' یہ کہہ کر جے کرشن بر آمدے سے ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نرملا نے اپنے کمرے کا چراغ بجھایا اور دبے پاؤں کمرے سے نکل کر زینے کی طرف چل دی۔ زینے پر پاؤں رکھتے ہی اسے چند قدم نیچے پہرے دار

دکھائی دیا جو ہاتھ میں مشعل لیے رام ناتھ سے باتیں کر رہا تھا۔ نرملا رام ناتھ سے رنبیر کے بارے میں دریافت کرنے کے لیے بے قرار تھی لیکن پہرے داری کی موجودگی میں اُسے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں کھڑی لیکن جب پہریدار اپنی جگہ سے نہ ہلا تو وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی اور پہرے دار کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔

جے کرشن نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ پگڑی اتار کر ایک کھونٹی سے لٹکائی اور بستر پر لیٹ گیا۔ بالکنی کی طرف کھلنے والے دروازے سے سمندر کی خوشگوار ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ جے کرشن کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر بالکنی کی طرف چلا گیا۔ اس کے دائیں اور بائیں کونوں کے چند کمروں کے سوا باقی تمام کمروں کی بالکنیاں ایک تنگ گیلری کے درمیان آپس میں ملی ہوئی تھیں۔

جے کرشن تر و تازہ ہوا میں چند سانس لے کر واپس مڑنے کو تھا کہ اسے نرملا کے کمرے کی بالکنی کے قریب کوئی متحرک سایہ دکھائی دیا۔ ”کون ہے؟“ جے کرشن نے پوچھا۔

"میں پہرے دار ہوں۔" کسی نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

جے کرشن نے دوبارہ کہا۔ "پہریدار کو اس وقت سیڑھیوں کا خیال کرنا چاہیے، یہاں تمہارا کیا کام ہے۔ تم بہت۔۔۔۔۔۔"

جے کرشن اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ پہرے دار نے آگے بڑھ کر اپنا خنجر اس کے سینے پر رکھ دیا اور کہا۔ "خاموش رہو!"

جے کرشن خوف سے لرزتا ہوا ایک قدم پیچھے ہٹا لیکن اجنبی نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں لے گیا۔

"تم کون ہو؟" جے کرشن نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں رنبیر ہوں، موہن چند کا بیٹا اور شکنتلا کا بھائی۔" یہ کہتے ہی رنبیر نے اسے دھکا دے کر بستر پر گرا دیا۔

جے کرشن سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رنبیر نے کہا۔ ”اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو میرے سوال کا جواب دو۔ شکنتلا کہاں ہے؟“

جے کرشن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“

”میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں۔ میں مہادیو کی قسم کھاتا ہوں۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ مجھے معاف کردو۔“

رنبیر نے دوبارہ خنجر اس کے سینے پر رکھ دیا اور کہا۔ ”میں تمہیں آخری بار موقع دیتا ہوں۔“

”نہیں، نہیں، مجھ پر رحم کرو۔ تمہاری بہن کا مجھے کوئی علم نہیں۔ تمہارے گاؤں کے لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ میں نے اسے بہت تلاش کیا تھا۔ میں نے اس کا سراغ لگانے والے کے لیے انعام مقرر کیا تھا اور اپنی بیٹی کے ساتھ تمہارا سلوک دیکھنے کے بعد میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اگر وہ کہیں مل سکے تو میں اسے لے کر خود

تمہارے پاس پہنچوں اور تمہارے پاؤں پر سر رکھ کر تم سے معافی مانگوں۔"

"اور تم سمجھتے تھے کہ اس طرح میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ تمہیں۔۔۔ جس کے ہاتھ میرے باپ کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔"

نرملا اپنے کمرے سے ان کی باتیں سن کر بالکنی کے راستے بھاگتی ہوئی جے کرشن کے کمرے میں داخل ہوئی اور رنبیر اُسے دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ رنبیر کے سامنے کھڑی ہوگئی اور گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ آپ کی فتح کا دن ہے۔ آپ رُک کیوں گئے۔ آپ کے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں، میں آپ سے رحم کی درخواست نہیں کروں گی۔"

جے کرشن اُٹھ کر بے اختیار آگے بڑھا اور رنبیر کے پاؤں پر گِر پڑا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر دِیا کرو۔ مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے کیے کی سزا بھگت چکا ہوں۔"

رنبیر نے نرملا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ مجھے بزدل کہہ سکتی ہیں۔ آپ

میری کمزوری کا مذاق اڑا سکتی ہیں۔"

نرملا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ رنبیر نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن جے کرشن نے اس کے پاؤں مضبوطی سے تھام رکھے تھے۔ رنبیر نے جھک کر اس کا ہاتھ پیچھے جھٹک دیا۔ پھر دوسری ٹانگ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کے بعد دروازے کی طرف ہٹ گیا۔ نرملا نے اپنے باپ کا بازو پکڑ کے اسے اٹھانے کہ کوشش کی لیکن جے کرشن نے گھٹنوں کے بل ہو کر ہاتھ جوڑ دیے۔

رنبیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نرملا نے جے کرشن کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا۔ جے کرشن کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ نرملا چند ثانیے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ بارہا اس کے جی میں آئی کہ وہ بھاگ کر رنبیر کا دامن پکڑ لے لیکن شرم و ندامت کے ناقابلِ برداشت احساس نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ پھر وہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی لیکن جے کرشن کو اس سے آنکھ ملانے کی ہمّت نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس کی نفرت اور حقارت رحم میں تبدیل ہونے لگی۔

"پِتاجی!" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

جے کرشن نے گردن اُوپر اٹھائی اور کچھ کہے بغیر اپنی باہیں کھول دیں۔ نرملا نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔

"پِتاجی! آپ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "دنیا میں اب میرا کوئی دشمن نہیں بیٹی! میں اب صرف تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

نرملا پھوٹ کر رونے لگی۔ "پِتاجی! میرا خیال تھا کہ میں صبح آپ کے ہمراہ نہ جاؤں لیکن اب میں آپ کو پریشان نہیں کروں گی۔ ہم علی الصبح روانہ ہو جائیں گے۔"

جے کرشن پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اچانک اس کے دل میں کوئی خیال آیا اور اس کی مردہ رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ اس نے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ رنبیر یہاں کیسے آیا اور اسے یہ کیسے

معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب میں تمہارے کمرے میں تھا، وہ بالکنی میں چھپ کر ہماری باتیں سن رہا ہو گا۔ اب قلعے کے دروازے بند ہیں، مجھے یقین نہیں کہ وہ صبح تک باہر نکل سکے۔"

نرملا اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی اور بدحواس ہو کر کہنے لگی۔ "نہیں نہیں پِتا جی! آپ ایسا نہ سوچیے۔ اگر اب آپ کے دل میں اس کے لیے کوئی بُرا خیال پیدا ہوا تو آپ مجھے ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھیں گے۔"

جے کرشن نے نرملا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا اور کہا۔ "بیٹی! تم اطمینان رکھو، اب مجھے اس کا پیچھا کرنے کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ لیکن اس کا سومنات کے مندر کے آس پاس رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ مسلمانوں کا جاسوس بن کر وہ مندر کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"پِتا جی! وہ صرف اپنی بہن کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے دوبارہ یہاں نہیں دیکھیں گے لیکن میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہیں کہ اگر آپ نے اسے پکڑوانے کی کوشش کی تو میں اس محل کی چھت سے چھلانگ لگا دوں گی۔ اب آپ اسے ہمیشہ کے لیے بھول

جائیں۔“

جے کرشن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔ ”تمہیں معلوم تھا کہ رنبیر یہاں ہے؟“

نرملا نے جواب دیا۔ ”ہاں! وہ آتے ہی مجھ سے ملا تھا اور میں نے اسے بتایا تھا کہ تمہاری بہن یہاں نہیں ہے۔“

”لیکن تم نے مجھے خبر دار کیوں نہ کیا؟“

”پِتا جی! مجھے یقین تھا کہ وہ موقع ملنے پر بھی آپ پر ہاتھ نہیں اُٹھائے گا لیکن اگر آپ کا بس چلے تو آپ اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

جے کرشن خاموش ہو گیا۔

جب رنبیر جے کرشن کے کمرے سے باہر نکلا تو رام ناتھ دروازے کے قریب اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے زینے کی طرف بڑھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ محل سے باہر نکل گئے اور رام ناتھ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین تھا کہ آپ نرملا کے باپ پر

ہاتھ نہیں اُٹھا سکیں گے۔"

رنبیر نے کہا۔ "اب کشتی والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں چند دن تک تمہارے پاس نہیں آ سکوں گا۔ جے کرشن جیسے لوگوں کی نیّت بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ تمہیں اگر میری ضرورت پڑے تو میرا ٹھکانا وہی ہے۔"

مندر کی دیوی

روپ وتی ناچ کی مشق کرنے کے بعد اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا دل مسرّت سے اُچھل رہا تھا۔ آج پروہت اور مندر کے چیدہ چیدہ پجاریوں نے اس کا ناچ دیکھا تھا۔ یہ رسم تھی کہ جب ناچ ختم ہونے پر آتا تھا تو کامنی مندر کی دیوی کی حیثیت سے تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتی تھی لیکن آج جب کامنی کی باری آئی تو وہ غیر حاضر تھی اور پروہت نے اس کی جگہ روپ وتی کو ناچ کا موقع دیا تھا۔

ناچ کے اختتام پر جب پروہت اور پجاری وہاں سے چلے گئے تو روپ وتی

کے استاد نے اس سے کہا۔ ”آج پروہت جی تم بہت خوش تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کامنی کے بعد تمہیں مندر کی دیوی بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“
اس کے بعد داسیوں نے روپ وتی کو اپنے جھُرمٹ میں لے لیا اور اُسے مبارکباد دینے لگیں۔ اپنی سہیلیوں سے پیچھا چھڑانے کے بعد وہ ایک فاتحانہ شان سے باہر نکلی لیکن اس کی مسکراہٹ اضطراب کے بغیر نہ تھیں۔ کبھی اسے کامنی کا خیال آتا اور اُسے اس بات کا افسوس ہوتا کہ کسی دن وہ ہمیشہ کے لیے اس کی نگاہوں سے روپوش ہو جائے گی اور کبھی رام ناتھ کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی اور وہ اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کرنے لگتی۔

اپنے کمرے سے تھوڑی دور وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ رام ناتھ ایک پجاری کے لباس میں کھڑا تھا۔ وہ ایک ثانیہ کھڑی رہی، پھر کترا کر آگے نکل گئی۔ لیکن چند قدم چلنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ کانپتی کانپتی اور لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کمرے کا دروازہ بند کرتی، رام ناتھ دہلیز کے اندر پاؤں

رکھ چکا تھا۔

"بھگوان کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔" روپ وتی نے پیچھے ہٹتے ہوئے ملتجی آواز میں کہا۔

رام ناتھ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں زندگی سے ہاتھ دھو چکا ہوں۔ اگر تم چاہو تو پہرے داروں کو بلا لو۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"اپنے دل سے پوچھو۔" رام ناتھ نے یہ کہتے ہوئے کنڈی چڑھا دی۔

"رام ناتھ ہوش کرو۔ تم آگ سے کھیل رہے ہو۔"

"یہ کھیل تمہیں نے تو سکھایا تھا۔ گھبراؤ نہیں روپا! میں تم سے صرف ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں۔"

"بھگوان کے لیے یہاں سے نکل جاؤ۔"

"نہیں میں اپنی بات ختم کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

”میں تمہاری ہر بات کا جواب دے چکی ہوں۔“

”نہیں کئی باتیں ایسی ہیں جن کا جواب تم نہیں دے سکتیں۔ تم مجھے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتیں کہ مندر کی دیویاں جیتے جی مہا دیو کے چرنوں میں کیسے پہنچ جاتی ہیں۔“

”ایسی باتیں سوچنا پاپ ہے۔“

”نہیں، یہ کہنا پاپ نہیں کہ سمندر کی دیویاں مہا دیو کے چرنوں کی بجائے آدم خور مچھلوں کے پیٹ میں جاتی ہیں۔ یہ کہنا بھی پاپ نہیں کہ وہ پروہت کے گناہوں کی گٹھڑیوں کا بوجھ اپنے سر پر لاد کر مندر سے باہر نکلتی ہیں اور یہ کہنا بھی پاپ نہیں کہ مندر میں کامنی کی جگہ لینے کے بعد تمہارے لیے زندگی کا ہر لمحہ موت سے زیادہ بھیانک ہو گا۔“

”ایسی باتیں نہ کرو رام ناتھ۔ بھگوان سے ڈرو۔“

رام ناتھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے روپ وتی کو آواز دی۔ روپ وتی نے سراسیمگی کی حالت میں رام ناتھ کا

ہاتھ پکڑ لیا اور سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ بھگوان کے لیے پلنگ کے نیچے چھُپ جاؤ۔ جلدی کرو۔ یہ شاید کامنی ہے۔ مندر کی دیوی۔"

باہر سے آواز آئی۔ "روپ وتی روپ وتی۔ دروازہ کھولو!"

روپ وتی نے رام ناتھ کو پوری قوّت سے پلنگ کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جی کھولتی ہوں۔"

رام ناتھ پلنگ کے نیچے چھُپ گیا اور روپ وتی نے دروازہ کھول دیا۔ کامنی اندر داخل ہوئی۔ کامنی نے بید کے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تم کسی سے باتیں کر رہی ہو۔"

"میں، میں کبھی کبھی اپنے آپ سے باتیں کیا کرتی ہوں۔" روپ وتی نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ "آج آپ ناچ کے لیے نہیں آئیں۔ میں ارادہ کر رہی تھی کہ آپ خیریت پوچھنے آؤں۔" کامنی نے مغموم لہجے میں کہا۔ "آج میں تم سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو جاؤں گی۔ میں تمہارے پاس ایک التجا لے کر آئی ہوں۔ دروازہ بند کر دو۔"

روپ وتی نے دروازہ بند کر دیا۔ کامنی نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔
"میری ماں کنٹھ کوٹ میں رہتی ہے۔ وہ ہر تیسرے مہینے مجھے دیکھنے آیا کرتی تھی۔ اب اگلے مہینے اسے یہاں آنا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میری غیر حاضری میں تم اسے یہ محسوس نہ ہونے دو کہ یہاں اس کا کوئی نہیں۔"

"آپ کی کی ماتا کی سیوا میرا دھرم ہے۔ لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ آج رات آپ یہاں سے جا رہی ہیں۔ کیا پروہت نے آپ پر وہ راز ظاہر کر دیا ہے جو آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوا۔"

"پروہت کے بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھ پر یہ راز کئی دن پہلے ظاہر ہو چکا تھا۔ آج جب اس نے مجھے ناچ میں حصّہ لینے سے روک دیا تھا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں میرے دن ختم ہو چکے ہیں۔"

"کئی دن پہلے؟ وہ کس طرح؟ بھگوان کے لیے مجھے بتایئے۔"

کامنی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ایسی باتیں مت پوچھو، میں تمہیں کچھ نہیں بتا

سکتی۔"

کامنی باہر نکل گئی اور روپ وتی نے دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔ رام ناتھ پلنگ سے باہر نکل آیا اور کہا۔ "میں تمہیں اب پریشان نہیں کروں گا۔ اگر تم پر کوئی نازک وقت آیا تو یہ یاد رکھنا کہ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہاری حفاظت کروں گا۔"

"اس وقت میرے لیے سب سے بڑا خطرہ تم ہو۔ بھگوان کے لیے جاؤ، ورنہ میں اس کمرے سے چلی جاتی ہوں۔"

"ہم بہت جلد ایک دوسرے سے ملیں گے۔" رام ناتھ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ روپ وتی دوزانو ہو کر انتہائی عاجزی سے دعا کرنے لگی۔ "بھگوان رام ناتھ کو معاف کر دو۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔" پھر اس جے کانوں میں کوئی دلکش نغمہ گونجنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

روپ وتی کے کمرے سے نکلنے کے بعد رام ناتھ نے اپنی قیام گاہ کا رُخ کیا۔

رقص اور موسیقی کے اُستادوں کے سوا عام پجاری مندر کے اس حصّے میں بہت کم آتے تھے اور رام ناتھ کو خطرہ تھا کہ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ تم کون ہو تو میں کیا جواب دوں گا۔ آتی دفعہ بھی اس نے خطرہ محسوس کیا تھا لیکن اس وقت اس کے دل کی کیفیت مختلف تھی۔ وہ روپ وتی تک پہنچنے کے لیے بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اب اس کے دل میں ایک نئی امید کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں کسی طرح رنبیر اور سلمان کو تمام حالات سے باخبر کر دوں۔ داسیوں کی قیام گاہ سے نکلنے کے بعد اسے اپنے راستے میں جگہ جگہ پجاری اور پنڈت نظر آئے لیکن اسے ایک پجاری کے لباس میں دیکھ کر کسی نے توجّہ نہ کی۔

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا لباس تبدیل کیا۔ پجاری کے لباس کی گٹھری بنا کر بغل میں دبائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ زینے کے قریب پہنچ کر اس نے گٹھری ایک خالی کمرے میں پھینک دی اور نیچے اتر گیا۔

محل سے باہر نکلتے ہی اس نے قلعے کی افواج کے سیناپتی کے دفتر کا رُخ کیا۔ سیناپتی رام ناتھ پر بہت مہربان تھا۔ اس نے اطلاع پاتے ہی اسے ملاقات کے لیے بلا لیا۔ رام ناتھ نے سیناپتی سے کہا۔ ”مہاراج! میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔“

”کیسی درخواست؟“

”مہاراج! میں انہل واڑہ جانا چاہتا ہوں۔“

”واپس کب آؤ گے؟“ ”یہاں آنے سے پہلے مجھے مہاراجہ نے جاگیر عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تم ہماری فوج میں نہیں رہنا چاہتے۔“

”مہاراج! جب میری ضرورت پڑے گی میں بن بلائے آجاؤں گا۔“

سیناپتی نے کہا۔ ”تم ایک اچھے سپاہی ہو اور مجھے تمہارے جانے کا دُکھ ہو گا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ انہل واڑہ کے مہاراجہ کے پاس جانے میں جو فائدے ہیں تم ان سے محروم ہو جاؤ۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”مجھے جاگیر کا لالچ نہیں۔“میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کسی دن محمود نے سومنات کا رُخ کیا تو انہل واڑہ ہمارا سب سے بڑا مورچہ ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہاں جا کر قوم کے نوجوانوں کو بیدار کروں۔“

سیناپتی نے اُٹھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں خوشی سے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ گھوڑے پر سوار ہو کر ملک سے باہر نکلا لیکن انہل واڑہ کی بجائے اس کی منزل بھگوان داس کی قیام گاہ تھی۔

۲

اگلی رات کے تیسرے پہر مندر میں ناقوس اور گھنٹیوں کی صدائیں اور پجاریوں کے بھجن اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ مندر کی دیوی مہا دیو کے چرنوں میں پہنچ چکی ہے۔

روپ وتی رات کے تیسرے پہر مندر میں ناقوس اور گھنٹیوں کے شور سے

جاگ اُٹھا اور دیر تک بے حس و حرکت اپنے بستر پر پڑی رہی۔ رات کے وقت کمرے میں گھٹن سی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ مندر کے مختلف گوشوں سے ناقوس اور گھنٹوں کے علاوہ اسے پجاریوں کے بھجن بھی سنائی دے رہے تھے۔ پجاریوں کا ایک گروہ بھجن گاتا ہوا اس کے کمرے کے قریب آ گیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ کمرے کی کھڑکی اور دروازے کے سامنے کئی پجاریوں مشعلیں اٹھائے کھڑے ہیں۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

ایک پجاری ہاتھ میں مشعل لیے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے بعد دو اور پجاری اندر آ گئے۔ وہ ان کی تعظیم کے لیے اُٹھی۔ ایک پجاری نے اس پر گنگا جل چھڑکا۔ دوسرے نے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا تیسرے نے کمرے میں عطر چھڑک دیا اور کمرے کی فضا مہک اُٹھی۔ پھر وہ ”مہا دیو کی جے“ کے نعرے لگاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد دو عمر رسیدہ عورتیں کمرے میں داخل ہوئیں اور روپ وتی کے بازو پکڑ کر باہر لے گئیں۔۔۔۔ راستے میں پجاری قطاریں باندھے

کھڑے تھے۔ جب وہ صحن سے گزر رہی تھی تو وُہ جھُک جھُک کر اس کے پاؤں چھو رہے تھے۔ روپ وتی کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ وہ اپنا ماضی بھول چکی تھی اور مستقبل سے بے پروا تھی۔ اس کے سامنے صرف حال تھا، مسرّت کے قہقہوں اور خوشی کے نغموں سے لبریز۔ اب وہ ایک گاؤں کی بھولی بھالی لڑکی نہ تھی، جس نے ایک معمولی حیثیت کے نوجوان کے لیے محبّت کے گیت گائے تھے بلکہ وہ ایک رانی تھی۔ مہادیو کی داسی کو اپنی عظمت کا پورا پورا احساس تھا۔ صحن سے گزرنے کے بعد وہ ایک کشادہ زینے کے راستے بالائی منزل میں داخل ہوئی۔ کھلی چھت پر سنگِ مرمر کا فرش بنا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ برآمدے کے پیچھے چند کمرے تھے جن کے دریچے سمندر کی طرف کھلتے تھے۔ دائیں ہاتھ ایک بارہ دری تھی، جس کے ستونوں پر سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ داسیاں جو اس کی رہنمائی کر رہی تھیں، اسے ایک کشادہ کمرے میں لے گئیں۔ کمرے کی سنہری چھت کے ساتھ جواہرات سے مرصع فانوس لٹک رہے تھے۔ آبنوس کے فرش پر ہاتھی دانت کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دروازوں اور دریچوں پر زرتار پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں کے

ساتھ ساگوان کی لکڑی کے تختے اس صفائی سے لگے ہوئے تھے کہ ان کے جوڑ تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قدِآدم آئینے تھے۔ سونے اور چاندی کی چند کرسیوں کے درمیان ایک خوبصورت پلنگ تھا جو مخمل کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ داسیاں روپ وتی کو کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔

روپ وتی کچھ دیر حیرت و استعجاب کے عالم میں کمرے کا ساز و سامان دیکھتی رہی۔ پھر اس نے یکے بعد دیگرے برابر والے دو کمروں کا جائزہ لیا۔ ان کمروں میں زیادہ تر کپڑوں کے صندوق اور آرائش کا سامان تھا۔ وہ واپس آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے سامنے دیوار میں ایک شگاف پیدا ہو رہا ہے اور وہ بدحواسی کے عالم میں اُٹھ کھڑی ہو گئی۔ شگاف بڑھتے بڑھتے ایک دروازے کے برابر ہو گیا۔ وہ بھاگنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ کسی کی آواز آئی۔ ”گھبراؤ نہیں۔“

ایک ثانیہ کے بعد وہ مندر کے بڑے پروہت کو دیکھ رہی تھی۔ پروہت اطمینان سے آگے بڑھا۔ روپ وتی نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں کو ہاتھ

لگایا اور ادب سے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

”تم ڈر گئی تھیں۔“ پروہت نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

روپ وتی کا سارا جسم لرز اُٹھا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”مہاراج! مجھے معلوم نہ تھا کہ دیوار میں کوئی دروازہ بھی ہے۔“

”یہ ہمارے محل کا راستہ ہے۔ اب تو تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟“ روپ وتی نے ایک نظر پروہت کی طرف دیکھا اور اسے ایک بار پھر خوف سا محسوس ہونے لگا۔ پروہت نے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ”تم بہت خوش قسمت ہو۔ آج رات تم وہ تاج پہنو گی جس کی تمنّا اس ملک کی تمام شہزادیاں کرتی ہیں۔“

”یہ سب آپ کی دِیا ہے مہاراج!“

”نہیں یہ دیوتاؤں کی کرپا ہے۔“

روپ وتی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”مہاراج! اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں ایک

سوال پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"مندر کی دیوی مہادیو کے چرنوں میں کیسے پہنچ جاتی ہے۔"

پروہت نے جواب دیا۔ "یہ سوال پوچھنا پاپ ہے۔ جب دیوتاؤں کی مرضی ہو گی تو تمہیں خود بخود اس سوال کا جواب معلوم ہو جائے گا۔ شاید آج رات تم وہ باتیں سمجھنے لگ جاؤ جو دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ دن تمہارے آرام کا دن ہے۔"

پروہت اسی راستے واپس چلا گیا اور روپ وتی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گی۔ دیر تک وہ یہ محسوس کرتی رہی کہ وہ مہیب اور پر اسرار آنکھیں اسے کمرے کی چھت اور دیواریں سے جھانک رہی ہیں۔

طلوعِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد مندر کا پروہت کی غیر متوقع پریشانی کا سامنا کر رہا تھا۔ پانچ پجاری جو کامنی کو کشتی پر بٹھا کر دیوتا کے چرنوں میں پہنچانے گئے تھے، ابھی تک لاپتہ تھے۔ دوپہر کے قریب سمندر سے

تھوڑی دور ایک پجاری کی لاش ملی تو اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ کشتی ڈوب چکی ہے اور کامنی کے ساتھ باقی پجاری بھی آدم خور مچھلیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ شام کے وقت عمر رسیدہ داسیاں جو مندر کی دیوی کی خدمت پر مامور تھیں روپ وتی کو نہلانے اور اس کے جسم پر خوشبوئیں ملنے کے بعد اسے نیا لباس پہنا رہیں تھیں۔ پروہت دیوار کے خفیہ راستے کی بجائے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ گیارہ چیدہ چیدہ پجاری تھے۔ ایک پجاری سونے کا طشت اٹھائے ہوئے تھا جس میں مندر کی دیوی کے تاج کے علاوہ بیش قیمت زیورات رکھے ہوئے تھے۔ پروہت کے اشارے سے داسیوں نے روپ وتی کو زیورات سے لاد دیا۔ اس کے بعد پروہت نے دونوں ہاتھوں سے تاج اُٹھایا اور روپ وتی کے سر پر رکھ دیا۔ ایک پجاری نے ناقوس بجایا اور آن کی آن میں مندر کے ہر گوشے سے ناقوس اور گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پجاری اور پروہت بھجن گاتے ہوئے واپس چلے گئے اور روپ وتی کے پاس صرف دو داسیاں رہ گئیں۔

ایک داسی نے آئینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آگے بڑھ کر دیکھیے، آپ مہارانی معلوم ہوتی ہیں۔“

روپ وتی جھجکتی ہوئی آئینے کی طرف بڑھی۔ آئینے میں آج اُسے اپنی صورت بالکل نئی نظر آ رہی تھی۔ ایک داسی نے کہا۔ ”اب آپ آرام کریں۔ جب آپ کی باری آئے گی تو ہم آپ کو لے جائیں گی۔“

داسیاں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ روپ وتی کرسی گھسیٹ کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔

۳

رات کے وقت مندر کا پروہت، داسیاں اور چیدہ چیدہ پجاری دم بخود ہو کر سومنات کے سامنے نئی دیوی کا رقص دیکھ رہے تھے۔ جب اُٹھتی ہوئی لہر کا پانی کمرے میں پہنچ گیا تو روپ وتی کا ناچ ختم ہوا۔ پجاری ”مہا دیو کی جے“ کے نعرے بلند کرنے لگے اور مندر میں ناقوس اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں وسیع کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ اُٹھتی ہوئی لہر آہستہ آہستہ

سومنات کے بُت کو اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔ مندر کی طرح قلعے میں بھی ہزاروں انسان "مہادیو کی جے" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

ناچ سے فارغ ہوتے ہی روپ وتی نے دو عمر رسیدہ داسیوں کی رہنمائی میں اپنی قیام گاہ کا رُخ کیا۔ داسیاں اُسے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلی گئیں۔ روپ وتی کچھ دیر ایک آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر فانوس کی روشنی میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل مسرّت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد اس نے اپنا بھاری تاج اُٹھا کر سونے کی تپائی پر رکھ دیا۔ پھر وہ ایک دریچے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ سخت ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کے باوجود اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ اس کے پاس کوئی نہ تھا اور اسے شدّت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی اگر میں پروہت سے درخواست کروں تو وہ ساتھ کے خالی کمرے میں میری کسی سہیلی کو رہنے کی اجازت دے دے گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس سے پہلے کامنی اس جبکہ تنہا رہتی تھی۔ ممکن ہے مندر کی دیوی کے لیے تنہا رہنا ضروری ہو۔

اچانک اسے کمرے کی دیوار میں کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی اور وہ مُڑ کر اس طرف دیکھنے لگی۔ دیوار میں خفیہ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پروہت نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تر و تازہ پھولوں کے ہار تھے۔ روپ وتی آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھونے کے لیے جھُکی۔ پروہت نے کچھ کہے بغیر اس کے گلے میں ہار ڈال دیے۔ روپ وتی کے سامنے ایک بار پھر دو مہیب اور پراسرار آنکھیں ناچنے لگیں۔ "میرے ساتھ آؤ!" پروہت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کہاں مہاراج؟"

"آج میں تمھیں وہ راز بتاؤں گا جو میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔" پروہت یہ کہتے ہوئے خفیہ دروازے کی طرف بڑھا۔

روپ وتی ایک لمحہ کھڑی رہی اور پھر اس کے پیچھے چل پڑی۔ دروازے سے آگے ایک زینہ قندیلوں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ زینے سے اُتر کر وہ ایک تنگ راستہ پر چلتے رہے۔ یہ راستہ سمندر کے کنارے ایک بلند چبوترے پر ختم ہو گیا۔ اس چبوترے کی سیڑھیاں پانی میں اُترتی تھیں۔

پروہت نے چبوترے کے کنارے کھڑے ہو کر کہا۔ ”اب تھوڑی دیر میں سمندر کا پانی اُترنا شروع ہو جائے گا۔ وہ دیکھو پانی آٹھویں سیڑھی سے اوپر آچکا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مندر میں مہادیو کی مورتی اب پانی میں چھپ چکی ہے۔ آؤ ابھی تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔“

روپ وتی قدرے مطمئن ہو کر پروہت کے پیچھے چل دی۔ اس کا ضمیر اس بات پر ملامت کر رہا تھا کہ جب پروہت نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو وہ ڈر کیوں گئی تھی۔ کچھ دور سمندر کے کنارے کنارے چلنے کے بعد وہ دائیں ہاتھ کشادہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ پھر وہ ایک کھلے صحن میں داخل ہوئے چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلا ہوا تھا۔ صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ باغیچہ میں کھلے ہوئے رنگ رنگ کے پھُول مسکرا رہے تھے۔ صحن کے درمیان ایک سنگِ مرمر کا تالاب تھا اور تالاب سے کچھ دور آگے روپ وتی اپنے سامنے ایک عالیشان محل دیکھ رہی تھی۔ محل میں داخل ہونے کے بعد وہ حیران تھی کہ وہاں کوئی نوکر یا پہرے دار نہ تھا۔ اس کے باوجود محل کا گوشہ گوشہ روشن تھا۔ پروہت کے پیچھے ایک کشادہ

زینہ پر پڑھنے کے بعد وہ ایک نہایت شاندار کمرے میں میں داخل ہوئی۔ اس کمرے کی آرائش و زیبائش دیکھ کر اسے اپنا کمرہ اس کمرے کے مقابلے میں ہیچ نظر آرہا تھا۔ کمرے کے درمیان مہا دیو کا سونے کا بُت نصب تھا اور اس کے ارد گرد داسیوں کے چاندی کے بُت رقص کرتے دکھائے گئے تھے۔

پروہت نے زرتار پردہ ہٹا کر بغل کے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور روپ وتی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ روپ وتی اندر چلی گئی۔ کمرہ تیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے جو روپ وتی نے نہیں دیکھے تھے۔ ایک طرف ایک کشادہ پلنگ بچھا ہوا تھا۔ پروہت نے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ روپ وتی!“

”جی۔۔۔۔جی میں یہ گستاخی نہیں کر سکتی۔“

”کیسی گستاخی! تم مندر کی دیوی ہو اور میں تمہاری سیوا کے لیے ہوں۔“ پروہت نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور کنڈی چڑھا دی۔ روپ وتی نے اچانک یہ محسوس کیا کہ اس کے سامنے مندر کا پروہت نہیں بلکہ ایک

اور انسان کھڑا ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کا جسم لرز رہا تھا۔ پروہت نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیے اور اس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں کی گرفت میں لے کر اُوپر اٹھایا اور کہا۔ "میری طرف دیکھو روپ وتی۔ میں مہادیو ہوں۔"

روپ وتی کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور اس تاریکی میں سے پروہت کی ان گنت نگاہیں ناچتی دکھائی دینے لگیں، زیادہ پراسرار، زیادہ مہیب، تھوڑی دیر کے لیے اس کے جسم کا خون منجمد ہو گیا۔

"ڈرو نہیں روپ وتی۔ ڈرو نہیں۔" پروہت نے یہ کہہ کر پنا ہاتھ روپ وتی کی کمر میں ڈال دیا۔ اچانک روپ وتی کی مُردہ رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ کسی نے دہکتے ہوئے انگارے اس کے جسم پر رکھ دیئے ہیں۔ مندر کی دیوی اور مہادیو کی پجارن ہونے کے باوجود وہ ایک عورت تھی۔ وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ پروہت کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔ پروہت آگے بڑھا، لیکن کسی نے دروازے کو دھکا دیا اور وہ گھبرا کے اس طرف دیکھنے لگا۔ روپ وتی نے دونوں ہاتھوں

سے سونے کا پھول دان اُٹھایا اور آگے بڑھ کر پروہت کے سر پر دے مارا۔ پروہت چکرا کر گر پڑا اور ساتھ ہی کوئی زیادہ شدّت سے دروازے کو دھکے دینے لگا۔ روپ وتی نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے تین پجاری کھڑے تھے۔ روپ وتی چلاّئی۔ "میں نے اُسے مار دیا ہے۔ میں نے مندر کے پروہت کو مار دیا ہے۔ وہ پاپی تھا۔"

ایک پجاری نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔ "آہستہ بولو روپ وتی! میں رام ناتھ ہوں۔" اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رام ناتھ کے دو ساتھی اندر آئے۔ ان میں سے ایک رنبیر اور دوسری کامنی تھی۔ رنبیر نے پروہت کے قریب جا کر اس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ زندہ ہے۔" کامنی نے خنجر نکال کر پروہت پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن رنبیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

"رام ناتھ! رام ناتھ!" روپ وتی نے نحیف آواز میں کہا اور پھر اچانک اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔

”روپ وتی! اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔“ کامنی نے کہا۔

”روپ وتی کے کانوں کو اس کی آواز مانوس معلوم ہوئی اور وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اچانک بولی۔ ”کامنی! کامنی تم!“

”ڈرو نہیں روپا! میں زندہ ہوں۔“

روپ وتی ایک ثانیہ سکتے میں رہی۔ پھر رام ناتھ کو چھوڑ کر کامنی سے لپٹ گئی۔ رنبیر نے کہا۔ ”اب ہمیں جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

کامنی نے جواب دیا۔ ”اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ صبح تک پروہت کے محل میں کوئی نہیں آئے گا۔“ تھوڑی دیر بعد چاروں پروہت کے محل سے نکلے اور سمندر کے کنارے کنارے چبوترے پر سے گزرتے ہوئے ایک جگہ ٹھہر گئے۔ کنارے سے تھوڑے فاصلے پر ایک کشتی کھڑی تھی۔ ملّاحوں نے انہیں دیکھ کر کشتی سیڑھیوں سے لگا دی اور وہ کشتی پر بیٹھ گئے۔ روپ وتی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ وہ رام ناتھ سے پوچھ رہی تھی کہ تم وہاں کیسے پہنچے۔ اس کے جواب میں رام ناتھ اسے

سمجھایا رہا تھا۔ ”یہ سب کامنی دیوی کی مہربانی ہے۔ اگر یہ ہمارا ساتھ نہ دیتیں تو ہم مندر میں تمہیں کبھی نہ تلاش کر سکتے۔“ پھر وہ کامنی کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے بتایا کہ رام ناتھ اور اس ایک کے ساتھیوں نے اسے آدم خور مچھلیوں کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔

جوں جوں کشتی مندر کے دور جا رہی تھی، روپ وتی کا خوف کم ہو رہا تھا۔ اس نے رام ناتھ سے دریافت کیا ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

رام ناتھ نے مغرب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ جہاز ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اس پر سوار ہو کر ہم یہاں سے کوسوں دور کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے۔“

”لیکن اس ملک میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں پروہت کے آدمی ہمارا پیچھا نہیں کریں گے۔ اگر وہ مر گیا تو مندر میں مجھے نہ پا کر وہ سمجھ جائیں گے کہ اُسے میں نے مارا ہے۔“

رنبیر نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اُسے دیکھا تھا وہ مرا نہیں۔

اس کی نبض چل رہی تھی۔ اگر وہ ہوش میں ہوتا اور ہم میں سے کسی کو پہچان لیتا تو ہم یقیناً اسے مار دیتے۔ صبح جب اسے پجاری اسے کمرے سے باہر نکالیں گے تو وہ تمہارا نام لینے کی بجائے اپنے زخمی ہونے کے بارے میں کوئی بہانہ پیش کرے گا۔"

کامنی بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ وہ کیا کرے گا۔ وہ اپنی بدنامی کے ڈر سے صرف ان پجاریوں کو تمہاری تلاش کا حکم دے گا جو مندر کے ہر راز سے واقف ہیں۔ پھر وہ یہ اعلان کرے گا کہ میری طرح تم بھی مہا دیو کے چرنوں میں پہنچ چکی ہو۔ اس کے بعد شہر اور آس پاس کے علاقے میں شاید خفیہ طور پر تمہاری تلاش جاری رہے۔"

تھوڑی دیر بعد روپ وتی اور کامنی آپس میں باتیں کر رہی تھیں اور رام ناتھ رنبیر کو سمجھا رہا تھا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں اور کامنی تمہارے گاؤں چلیں تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔ سومنات کے آس پاس رہنا تمہارے لیے خطرناک ہے۔"

"نہیں میں یہاں رہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر تمہیں میری مدد کی

ضرورت ہوتی تو میں یقیناً تمہارا ساتھ دیتا۔ سلمان تمہیں کسی محفوظ جگہ اُتار دے گا۔ اس کے بعد تم سیدھے قنوج کا رُخ کرو۔ تمہارے لیے میرے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہو گی۔ میں گھر جانے کے لیے اس دن کا انتظار کروں گا جب سلطان محمود کی فوجیں سومنات کے قلعے پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ چکی ہو گی۔ میں اپنی آنکھوں سے اس مندر کی تباہی دیکھنا چاہتا ہوں جس کی بنیاد ظلم پر رکھی گئی ہے۔ ظلم کے ایوانوں کی بنیادیں کھودنے کے سوا اب میری زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ شکنتلا کے بغیر میرے لیے گھر اور ویرانے میں کوئی فرق نہیں۔"

کشتی جہاز کے قریب پہنچی تو سلمان جو اپنے ملاحوں کے ساتھ تختے پر کھڑا تھا بلند آواز میں بولا۔ "تم نے بہت دیر لگائی۔ اس لڑکی کا پتہ چلا؟"

رنبیر نے جواب دیا۔ "ہم اسے لے آئے ہیں۔ اسے مندر سے نکالنے میں ہمیں کوئی دقّت پیش نہیں آئی۔ کسی کو خبر تک نہیں ہوئی۔"

اتنے میں کشتی جہاز کے ساتھ آ گئی اور وہ رسی کی سیڑھی کے ذریعے جہاز پر چڑھنے لگے۔ رام ناتھ روپ وتی کو ہاتھ کے سہارے اوپر چڑھا رہا تھا۔

کشتی کے تین ملّاح جہاز پر آ گئے اور باقی چار وہیں رہے۔ سلمان نے رنبیر سے کہا۔ ”اب باتوں کا وقت نہیں، ہمیں صبح کی روشنی سے پہلے یہاں سے کافی دور نکل جانا چاہیے۔ تم نے اپنے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟“

رنبیر نے جواب دیا۔ ”میں واپس عبد اللہ کے پاس جا رہا ہوں۔“

سلمان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا خدا حافظ! انشاء اللہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے ملیں گے۔“

رنبیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے مندر کے قیدیوں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“

سلمان نے جواب دیا۔ ”آپ ان کی فکر نہ کریں، انہیں کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے گا جو سومنات کے پجاریوں کی پہنچ سے دور ہو۔“

روپ وتی نے دبی زبان میں کامنی سے پوچھا۔ ”قیدی کون ہیں؟“

کامنی نے جواب دیا۔ ”مجھے کشتی پر بٹھا کر لانے والوں میں سے تین پجاری زندہ گرفتار کر لیے گئے تھے۔“

سلمان سے مصافحہ کرنے کے بعد رنبیر نے رام ناتھ سے ہاتھ ملایا۔ رام ناتھ کی آنکھیں تشکّر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ سلمان نے جہاز کے بادبان کھولنے کا حکم دیا اور رنبیر رسیوں کی سیڑھی سے نیچے اُتر کر کشتی میں آ گیا اور کشتی واپس ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جہاز روانہ ہو گیا۔ رام ناتھ، روپ وتی اور کامنی کچھ دیر کے جنگلے کے ساتھ کھڑے دیکھتے رہے، پھر کامنی نیند کا بہانہ کر کے وہاں سے روپ وتی اِدھر اُدھر دیکھ کر "رام ناتھ! رام ناتھ!" کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "رام ناتھ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔" رام ناتھ نے کہا۔ "روپا! تم نے جو دیکھا ہے وہ ایک بھیانک سپنا تھا۔ اسے بھول جاؤ۔ آج کے بعد ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھیں گے۔ ہم ایک بار پھر اپنی اجڑی ہوئی دنیا کو نغموں اور قہقہوں سے بھر دیں گے۔ روپ وتی! آج ہم نے نیا جنم لیا ہے۔ چلو اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ جہاز کے کپتان نے تمہارے اور کامنی کے لیے اپنا کمرہ خالی کر دیا ہے۔"

روپ وتی اس کے ساتھ چل پڑی لیکن چند قدم اٹھانے کے بعد وہ اچانک رُک گئی۔ ''ٹھہرو رام ناتھ!'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گلے سے جواہرات کا ہار اتارا۔ پھر ہاتھوں، پاؤں اور کانوں کے تمام زیور اُتار کر یکے بعد دیگرے سمندر میں پھینکنے لگی۔ آن کی آن میں روپ وتی نے ایک انگوٹھی کے سوا جو بُری طرح اس کی انگلی میں پھنسی ہوئی تھی، تمام زیورات سمندر کی نظر کر دیے۔ رام ناتھ نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا اور اسے کھول کر موتیوں کی مالا جو اسے انہل واڑہ کے راجہ نے انعام میں دی تھی روپ وتی کے گلے میں ڈال دی۔

۴

پروہت نے رات کے تیسرے پہر ہوش میں آکر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر میں درد کی ٹیس اُٹھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے دوبارہ اپنا سر فرش پر رکھ دیا اور لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک رات کے واقعات کی یاد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں دوڑ گئی۔ وہ اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی

طرف بڑھا۔ نقّاہت کے باعث اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ دروازہ بند پا کر وہ اپنے نوکروں کو آوازیں دینے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ صبح تک محل کے اس حصّے میں کسی پجاری یا نوکر کو پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے سہلاتا ہوا بستر پر آبیٹھا۔ اسے یقین تھا کہ مندر میں کوئی اس کے خلاف روپ وتی کی پکار نہیں سنے گا۔ روپ وتی کا قلعے میں پہنچ جانا اس کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتا تھا لیکن اسے یہ اطمینان تھا کہ پہریدار اُسے مندر کے احاطے سے نکلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کے سر پر چوٹ لگنے سے پہلے کوئی دروازے کو دھکّے دے رہا تھا لیکن وہ کون ہو سکتا تھا۔ شاید یہ میرا وہم ہو۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا سوچتا رہا۔ بالآخر وہ بستر پر لیٹ گیا لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔

طلوعِ آفتاب کے بعد ایک پجارن اس سے ناشتے کے لیے پوچھنے آئی۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی دیکھ کر اس نے کسی نوکر کو آواز دی۔ پروہت بستر سے اُٹھا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ پجارن نے باہر سے کنڈی

کھول دیا۔ پروہت اپنے کمرے سے باہر نکلا اور پجارن سے کوئی بات کیے بغیر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا روپ وتی کی قیام گاہ کی طرف چل دیا۔ روپ وتی کے کمرے سے باہر اس کی خدمت گزار عورتیں حیران اور پریشان کھڑی تھیں۔

"روپ وتی کہاں ہے؟" پروہت نے پوچھا۔

ایک عورت نے جواب دیا۔ "وہ یہاں نہیں ہے مہاراج! ہم صبح سے اُسے تلاش کر رہی ہیں۔"

پروہت کچھ کہے بغیر واپس مڑا۔ قریباً ایک ساعت کے بعد مندر کے چیدہ چیدہ پجاری خاموشی سے روپ وتی کو تلاش کر رہے تھے۔

اگلی صبح لوگ یہ خوشخبری سن رہے تھے کہ مندر کی نئی دیوی بھی مہادیو کے چرنوں میں پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا لیکن لوگ اسے روپ وتی کا کمال سمجھتے تھے اور ہر جگہ اس کے حسن و جمال اور روحانی برتری کی تعریفیں ہو رہی تھی۔ لیکن پروہت کے نزدیک یہ حادثہ ایک

خوفناک انقلاب کی تمہید تھا۔ اس کے جانبازوں کا ایک گروہ بدستور روپ وتی کی تلاش میں تھا۔

۵

رنبیر روپ وتی کو کامنی اور رام ناتھ کے ساتھ سلمان کے جہاز پہنچانے کے بعد عبداللہ کے پاس پہنچے تو سورج نکل چکا تھا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ کے باعث اس کا جسم تھکاوٹ سے چور تھا۔ اس نے عبد اللہ کو مندر کے واقعات سنانے کے بعد کھانا کھایا اور ایک کوٹھڑی کے اندر جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دوپہر کے وقت وہ بیدار ہوا اور آنکھیں ملتا ہوا کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔

عبداللہ ایک درخت کے نیچے دھونی رمائے بیٹھا ایک اجنبی کے ساتھ باتیں کر رہو تھا۔ اس نے رنبیر کو دیکھتے ہی آواز دی۔ ”ادھر آؤ رنبیر! تمہارے لیے ایک خوش خبری آئی ہے۔“

رنبیر کا دل دھڑکنے لگا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کیسی خبر؟"

"تمہاری بہن مل گئی ہے!"

رنبیر کو اچانک اپنی دنیا کی مغموم فضاؤں میں مسرّت کے نغمے سنائی دینے لگے۔

"کب؟ کہاں؟ آپ کو کس نے بتایا؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

عبداللہ نے اجنبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے عبدالواحد نے بھیجا ہے۔"

اجنبی کھڑا ہو گیا اور رنبیر نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ "کہاں ہے میری بہن؟"

"وہ آپ کے گھر پہنچ چکی ہے۔"

رنبیر کے چند اور سوالات کے جواب میں اجنبی نے شکنتلا کی سرگزشت

سنا دی۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ عبداللہ نے اُٹھ کر رنبیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

رنبیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے کلمۂ توحید پڑھتے ہوئے عبداللہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ”میں مدّت سے اسلام کی صداقت پر ایمان لا چکا ہوں اور آج آپ کے سامنے اس بات کا اعادہ کرتا ہوں۔ خدا سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے ہمّت و استقامت عطا کرے اور میرے لیے ایک نیا نام بھی تجویز کیجیے۔“

عبداللہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری صورت دیکھنے کے بعد مجھے تمہارا نام تجویز کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں نے تمہارے لیے یوسف کا نام پسند کیا ہے۔ اب تم اپنی بہن کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گے۔ وہ دیکھو تمہارا گھوڑا کھڑا ہے۔

رنبیر کو چند قدم کے فاصلے پر ایک گھوڑا دکھائی دیا جس پر زین کسی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”لیکن آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب تک سومنات فتح نہیں ہو گا میں

یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "عبدالواحد کے مکتوب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابھی کچھ مدّت اس طرف سلطان کی پیش قدمی کا کوئی امکان نہیں۔ سومنات کے متعلق تم تمام معلومات حاصل کر چکے ہو، اس لیے اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ تمھاری بہن ہر صبح و شام تمھاری راہ دیکھتی ہے۔ میں نے ان کی زبانی عبدالواحد کا پیغام سنتے ہی تمھارا گھوڑا تیار کرا دیا تھا لیکن تم سو رہے تھے۔"

تھوڑی دیر کے بعد رنبیر اپنے گھر کا رُخ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے شکنتلا کی مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔

٦

اگلے روز روپ وتی گہری نیند سے بیدار ہوئی تو کامنی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

"بہت دیر تک سوئی ہو تم۔" کامنی نے کہا۔

”وہ کہاں ہے؟“ روپ وتی نے سوال کیا۔

”رام ناتھ آیا تھا اور تمہیں سوتے دیکھ کر جہاز کے کپتان کے پاس چلا گیا ہے۔“

”اب تو کوئی خطرہ نہیں ہمیں؟“ روپ وتی نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، اب ہم بہت دُور آ چکے ہیں۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”میں اب بھی محسوس کر رہی ہوں کہ میں نے ایک بھیانک سپنا دیکھا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ سومنات کے مندر میں ایسی باتیں ہو سکتی ہیں۔“

کامنی نے جواب دیا۔ ”بھگوان کا شکر کرو کہ تم بچ کر آ گئی ہو۔“

روپ وتی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”کامنی میں ایک بات پوچھتی ہوں۔ جب تم مجھ سے آخری بار ملی تھیں تو تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ تم اپنے انجام سے بے خبر نہیں ہو۔ کیا پروہت نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تمہارا وقت آ چکا ہے۔“

”ہاں میرے اصرار پر اس نے مجھے بتادیا تھا اور اگر وہ نہ بتاتا تو بھی میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ مندر میں میری زندگی ختم ہونے والی ہے۔“

”تمہیں اس نے یہ بھی بتادیا تھا کہ تم سمندر میں پھینک دی جاؤ گی؟“

”نہیں۔ مجھے اس نے یہی بتایا تھا کہ میں مہا دیو کے چرنوں میں جا رہی ہوں۔“

”اور تمہیں اس بات کو یقین تھا؟“

”نہیں، لیکن اپنے دل کو فریب دینے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”کامنی جب میں تمہاری صورت دیکھتی ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی سنگدل سے سنگدل انسان بھی تمہاری جان لے کر خوش ہو سکتا ہے۔“

کامنی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

”روپ وتی! پروہت کے پاپ چھپانے کے لیے میرا بلیدان ضروری تھا۔ کاش یہ لوگ مجھے نہ بچاتے۔ اُس کے گناہوں کی گٹھڑی اٹھا کر میرے لیے زندگی ہر لمحہ موت سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔“ کامنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

روپ وتی نے اس کا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا۔ ”کامنی میری نگاہوں میں تم ایک دیوی ہو۔“

”دیوی!“ کامنی نے اپنے ہونٹوں پر ایک کرب انگیز مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں نہیں۔ میں دیوی نہیں ہوں۔ اگر میں دیوی ہوتی تو وہ رات جب اس نے میری آبرو پر ہاتھ ڈالا تھا، میری زندگی کی آخری رات ہوتی۔ اس رات وہ بھولی بھالی لڑکی جو مہا دیو کی پجارن بننا چاہتی تھی مر چکی تھی اور وہ کامنی جسے مندر کے پجاریوں نے اگلی صبح دیکھا تھا وہ ایک ایسی عورت تھی جو اپنے ہر پاپ کی قیمت وصول کرنا چاہتی تھی۔ جسے صرف اس امید نے زندہ رہنے پر آمادہ کر دیا تھا کہ وہ ہیروں اور موتیوں میں تولی جائے گی اور راجے اور رانیاں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں

گے۔"

"کامنی تم نے اپنی ایک بہن کو تباہی سے بچایا ہے۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں دے سکتی۔"

کامنی نے کہا۔ "میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں اُس سے اپنا انتقام لینے گئی تھی۔ اگر رنبیر میرا ہاتھ نہ روکتا تو میرا خنجر اس کے سینے میں اُتر چکا تھا۔ روپ وتی میں دنیا میں کسی کو منہ دِکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اب زندگی کا ہر لمحہ میرے لیے موت سے زیادہ بھیانک ہے۔"

روپ وتی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم ہمارے ساتھ چلو گی کامنی میں ساری عمر تمہاری سیوا کروں گی۔"

"نہیں میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گی۔" کامنی نے روپ وتی کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "میرا راستہ تم سے الگ ہے۔"

روپ وتی نے پریشان ہو کر کہا۔ "لیکن کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"اس سوال کا جواب میں نے ابھی نہیں سوچا۔"

باقی سارا دن کامنی بے حد مغموم رہی۔ شام کے قریب وہ روپ وتی کے ساتھ سمندر کا منظر دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ رام ناتھ کافی دیر ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ روپ وتی محسوس کر رہی تھی کہ کامنی کی طبیعت رفتہ رفتہ سنبھل رہی ہے۔ رام ناتھ چلا گیا اور وہ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئیں۔ صبح کے وقت جب روپ وتی کی آنکھ کھلی تو کامنی وہاں نہ تھی۔ اس نے سمجھا شاید باہر سمندر کا نظّارہ کر رہی ہو گی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ اس کی تلاش میں نکلی، لیکن کامنی کا کہیں پتہ نہ چلا۔ سلمان کے پوچھنے پر دو ملّاحوں نے بیان کیا۔ ”کافی رات گئے ہم نے اسے جہاز پر ٹہلتے دیکھا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اندر میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر ہوا خوری کے لیے آئی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جہاز کے دوسرے حصّہ کی طرف چلی گئی اور اس کے بعد ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نیچے اپنے کمرے میں جا چکی ہے۔“

سلمان کے حکم سے ملّاحوں نے جہاز کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن کامنی کہیں نہ تھی۔ سلمان اور اس کے ساتھیوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ سومنات کی دیوی سمندر کے آغوش میں پناہ لے چکی ہے۔

مفرور

چند دن بعد سلمان نے رام ناتھ اور روپ وتی کو رات کے تیسرے پہر خلیج کے ساحل پر اتار دیا اور وہ ریت پر بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنے لگے۔ جہاز پر سفر کے آخری دن روپ وتی کی طبیعت ناساز رہی تھی لیکن اس نے رام ناتھ کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ رام ناتھ جب بھی اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار دیکھ کر تشویش کا اظہار کرتا تو وہ اسے یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ یہ سمندر کی ہوا کا اثر ہے۔ جہاز سے اترتے ہی میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی لیکن ساحل پر پہنچ کر رام ناتھ نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت پہلے سے زیادہ مضمحل ہے۔ روپ وتی کچھ دیر اس کے قریب بیٹھ

کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر ایک جمائی لینے کے بعد زمین پر لیٹ گئی۔

رام ناتھ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”کیوں روپ وتی! کیا بات ہے؟“

روپ وتی نے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں یونہی لیٹ گئی ہوں۔ رات جہاز پر مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔“

رام ناتھ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں تو بخار ہو رہا ہے۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”نہیں، مجھے بخار نہیں۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ مجھے صرف تھوڑی آرام کی ضرورت ہے۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”سلمان کہتا تھا کہ اس جگہ آس پاس ماہی گیروں کی کئی بستیاں ہیں۔ ہم صبح ہوتے ہی کسی بستی میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں تم اچھی طرح آرام بھی کر سکو گی۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”نہیں نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم اس علاقے سے

فوراً نکل جائیں۔"

طلوعِ سحر کے ساتھ انہیں کوئی دو کوس کے فاصلے پر ایک بستی کے آثار دکھائی دیے۔ وہ اس طرف چل دیے۔ بستی سے کوئی آدھ کوس کے فاصلے پر روپ وتی زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے کہا۔ "مجھے ذرا دم لینے دو رام ناتھ! میں تھک گئی ہوں۔"

رام ناتھ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ روپ وتی اپنے گلے سے موتیوں کی مالا اُتارتے ہوئے کہنے لگی۔ "رام ناتھ اسے چھپا کر اپنے پاس رکھ لو، اسے پہن کر میرا بستی میں جانا ٹھیک نہیں۔"

رام ناتھ نے روپ وتی کے ہاتھ سے مالا لی اور قمیص کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔ تھوڑی دیر آرام کر کے وہ پھر اُٹھ کر رام ناتھ کے ساتھ چل پڑی۔ لیکن بستی تک پہنچتے پہنچتے وہ بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔

ماہی گیروں کی بستی پچاس ساٹھ جھونپڑیوں پر مشتمل تھی۔ بستی کا چوہدری رام ناتھ کو اونچی ذات کا آدمی سمجھ کر اپنے گھر لے گیا۔ روپ وتی باقی تمام

دن اور اگلی رات بخار میں مبتلا رہی۔ رام ناتھ کو اس بستی کے ماہی گیروں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں سے آٹھ کوس کے فاصلے پر ایک بہت بڑا قصبہ ہے اور وہاں اچھے وید موجود ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن اس نے بستی میں ٹھہرنے کی بجائے روپ وتی کو وہاں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ بستی کے چوہدری نے چار نوجوان بلائے اور وہ روپ وتی کی کھاٹ اُٹھا کر رام ناتھ کے ہمراہ چل دیے۔

دوپہر کے قریب یہ لوگ قصبہ میں پہنچ گئے۔ رام ناتھ سیدھا وہاں کے مشہور ترین طبیب کے پاس پہنچا۔ طبیب نے ان کے آرام کے لیے اپنے گھر کا ایک کمرہ خالی کر دیا۔

رام ناتھ کے پاس سونے کے جو چند سکے تھے وہ اس نے وید کو پیش کر دیے۔ لیکن تین دن کے علاج کے بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ روپ وتی کی حالت بدستور خراب ہو رہی ہے۔ وہ پھر کسی اور طبیب کا پتا لگانے کی غرض سے مقامی سردار پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ آج کل انہل واڑہ کا شاہی وید مندھیر آیا ہوا ہے۔ اگر تم وہاں پہنچ سکو تو مریضہ کی جانچ سکتی

ہے لیکن اس سے علاج کرانا معمولی آدمی کا کام نہیں۔ وہ صرف سونے کی چمک دیکھ کر بات کرتا ہے۔

رام ناتھ نے پہلی بار انہل واڑہ کے راجہ سے اپنے ذاتی تعلقات جتانے کی ضرورت محسوس کی اور اس نے سردار کے سامنے راجہ کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کا واقعہ بیان کر دیا۔ سردار اس قدر مغلوب ہوا کہ اس نے روپ وتی کو مندھیر پہنچانے کے لیے اپنا خوبصورت رَتھ اور بہترین بیل پیش کر دیے۔ اگلے دن رام ناتھ اور روپ وتی رَتھ پر سوار ہو کر مندھیر روانہ ہو گئے۔

۲

انہل واڑہ کے شاہی طبیب منوراج کا آبائی گھر مندھیر ہی میں تھا اور وہ ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چند دنوں کے لیے انہل واڑہ سے مندھیر آیا کرتا تھا۔ یہاں صرف چند امرا ایسے تھے جو اس سے علاج کرا سکتے تھے۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ راجہ نے اسے ایک بہت بڑی جاگیر دے رکھی تھی لیکن اس کے باوجود وہ پرلے درجے کا لالچی تھا۔ عوام میں

اس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ مریض کی شکل دیکھتے کی ہی اس کی امارت یا غربت کا اندازہ کرلیتا ہے۔ مندھیر میں راجہ کا چچا ٹھاکر رگھوناتھ اس کا سرپرست تھا اور وہ کسی بیماری کے بغیر بھی اُسے طرح طرح کی دوائیں کھلاتا رہتا تھا۔

ایک صبح منوراج بستر سے اُٹھ کر پوجا پاٹ کر رہا تھا کہ اس کے نوکر اطلاع دی۔ ”ایک نوجوان آپ سے ملنے پر بضد ہے۔“

منوراج نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ؟“

”مہاراج! مجھے معلوم نہیں۔ وہ کوئی اجنبی ہے۔“

”تم جانتے ہو کہ اس وقت ہم کسی سے نہیں ملا کرتے۔“

”مہاراج! میں نے اسے بہت سمجھایا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ میں آپ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اس نے پو پھٹنے سے پہلے ہی دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ ہمارے مہاراج عام لوگوں کو منہ نہیں لگاتے لیکن وہ کہتا ہے کہ میں منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار

ہوں۔"

منوراج نے کہا۔ "اچھا بلاؤ اُسے۔"

نوکر باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان کو لے کر آیا۔ یہ رام ناتھ تھا۔ منوراج کو اس کے چہرے پر امارت کی بجائے تھکاوٹ، پریشانی اور بے بسی کے آثار دکھائی دیے۔ رام ناتھ کے کپڑے بھی کافی میلے ہو چکے تھے۔ شاہی طبیب کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ رام ناتھ کی طرف توجہ دینے کی بجائے اپنے نوکر پر برس پڑا۔ "تم۔۔۔ تم بالکل گدھے ہو۔ میں نے تمہیں کیا کہا تھا۔"

رام ناتھ نے کہا۔ "مہاراج! میں بہت دور سے آپ کا نام سن کر آیا ہوں۔ جلدی کیجیے میرے ساتھ چلیے۔"

منوراج نے غصّے سے کانپتے ہوئے کہا۔ "جس اُلّو نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے وہ میرے نوکر سے بھی زیادہ بے وقوف ہو گا۔"

رام ناتھ نے اپنے جیب میں ہاتھ ڈال کر موتیوں اور ہیروں کی مالا نکالی اور

منوراج کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مہاراج! لیکن اگر مجھے ایک بھکاری سمجھتے ہیں تو اسے بھی اپنے پاس رکھ لیجیے۔“
منوراج تھوڑی دیر کے لیے دم بخود رہ گیا۔ پھر مالا کو ایک سرے سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم نے کہاں سے لی ہے؟“

”یہ چوری کا مال نہیں مہاراج!“

منوراج نے نوکر کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گیا۔ پھر وہ مالا کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر رام ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مریض کہاں ہے؟“

”مہاراج! وہ دھرم شالہ میں ہے۔“

”دھرم شالہ میں!“

”جی ہاں! ہم آدھی رات کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ اس لیے وہیں ٹھہرنا پڑا۔“

”آپ کو سیدھا میرے پاس آنا چاہیے تھا۔“

”مہاراج، لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ صبح سے پہلے کسی سے نہیں ملتے۔“

منوراج نے کہا۔ ”یہ پہلا موقع ہو گا کہ میں کسی کو دھرم شالہ میں دیکھنے جاؤں گا۔ تم فوراً واپس جاؤ اور دروازے پر میرا انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“

”مہاراج! جلدی کیجیے، مریضہ کی حالت بہت خراب ہے۔“ رام ناتھ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور منوراج دوبارہ مالا کو دیکھنے لگا۔

منوراج کی بیوی نے عقب کے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کس سے باتیں کر رہے تھے؟“

منوراج نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مالا کو ایک سرے سے پکڑ کر اس کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ دیکھو!“

بیوی کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر مالا شوہر کے ہاتھ سے لے لی۔

منوراج نے کہا۔ ”اگر یہ نقلی نہیں تو اس کی قیمت کوئی راجہ ہی ادا کر سکتا ہے۔“ ”آپ نے کہاں سے لی ہے!“

”یہ مجھے ایک معمولی سا آدمی دے گیا ہے۔ وہ مجھے کسی کے علاج کے لیے بُلانے آیا تھا۔“

بیوی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ کوئی راجہ آپ کے پاس بھیس بدل کر آیا ہو۔“

منوراج نے کہا۔ ”انہل واڑہ سے ہیروں کا بہت بڑا تاجر ٹھاکر رگھوناتھ کی دلہن کے لیے زیورات لے کر آیا ہوا ہے۔ وہ مالا کو دیکھتے ہی اس کی قیمت بتادے گا۔“

”تو پھر جلدی اس کے پاس جائیے۔“

”میں پہلے مریض کو دیکھ آؤں، پھر اسے یہیں بُلالوں گا۔“

لیکن بیوی ایسے معاملات میں انتظار کرنے کی قائل نہ تھی۔ جونہی منوراج گھر سے نکلا اس نے ایک نوکر کو بُلایا اور اسے حکم دیا کہ ”فوراً ٹھاکر رگھو

ناتھ کے مہمان خانے سے انہل واڑہ کے جوہری کو بُلا لاؤ۔" ٹھاکر رگھو ناتھ کا محل زیادہ دور نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں نوکر جوہری کو لے آیا۔ منوراج کی بیوی نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُسے مالا دکھائی تو اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ مالا آپ کے ہاتھ کیسے آئی؟"

"کیوں کیا بات ہے؟" منوراج کی بیوی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"آپ کو معلوم نہیں کہ یہ مالا راجہ کیا ہے؟"

"مہاراجہ کی؟"

"جی ہاں! یہ انہیں میں نے ہی بنا کر دی تھی۔ اس میں دو ہیرے ایسے ہیں جو دس سال سے میرے پاس تھے۔ مہاراجہ وید جی پر بہت مہربان معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن وید جی نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ وہ اتنا بڑا انعام حاصل کر چکے ہیں۔"

منوراج کی بیوی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "یہ مالا انہیں راجہ نے نہیں بلکہ ایک اور آدمی نے دی ہے۔" "وہ کون ہے؟"

”ہمیں معلوم نہیں۔ وہ ابھی ابھی انہیں کسی مریض کے علاج کے بلانے آیا تھا۔“

جوہری نے کہا۔ ”آپ کو یقین ہے کہ وہ چور نہیں تھا۔“

”میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔“

”تو پھر اچھی طرح سوچ لیجیے کہیں وید جی کی بدنامی نہ ہو۔“

منوراج کی بیوی نے کہا۔ ”شاید نوکر کو معلوم ہو کہ وہ کون تھا۔ ٹھہریے میں اسے بلاتی ہوں۔“ اور وہ دروازے کی طرف جا کر نوکر کو آوازیں دینے لگی۔

نوکر اندر آیا تو جوہری نے اس سے سوال کیا۔ ”تمہیں معلوم ہے وید جی کس کے علاج کے لیے گئے ہیں؟“

”جی وہ دھرم شالہ کی طرف گئے ہیں۔ جو آدمی انہیں بلانے کے لیے آیا تھا وہ کہتا تھا کہ مریض دھرم شالہ میں ہے۔“

جوہری نے منوراج کی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”وید جی مجھ پر بہت مہربان ہیں لیکن میں راجہ کا نمک کھاتا ہوں۔ ایسی بات چھپانا میرے لیے بہت مشکل ہے اور وید جی کو بدنامی سے بچانے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ چور کو بھاگنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ابھی ٹھاکر جی کے پاس جاتا ہوں۔ آپ کا فائدہ بھی اسی میں ہے۔ وہ آدمی جس نے یہ مالا چُرائی ہے کوئی معمولی چور نہیں ہو گا۔ آپ اپنے نوکر کو دھرم شالہ بھیج دیں تاکہ جب تک ٹھاکر جی کے سپاہی چور کو گرفتار کرنے کے لیے نہیں پہنچتے وہ اس کا خیال رکھے۔“

منوراج کی بیوی نے ملتجی آواز میں کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ ہم بے قصور ہیں۔ ہمیں بدنامی سے بچانا آپ کا کام ہے!“

جوہری نے جواب دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر چور پکڑا گیا تو مہاراجہ وید جی کو بڑے سے بڑے انعام کا حقدار سمجھیں گے۔

۳

روپ وتی کی نبض دیکھنے کے بعد منوراج نے رام ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"یہ آپ کی بیوی ہے؟"

رام ناتھ نے جواب دیا۔ "جی۔۔۔۔جی ہاں!" اور روپ وتی نے بستر پر لیٹے لیٹے رام ناتھ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

روپ وتی کی بیماری کے متعلق چند باتیں پوچھنے کے بعد منوراج نے کہا۔ "آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کا علاج میں گھر پر ہو لیکن آج انہیں تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔ میں ابھی جا کر نوکر کے ہاتھ دوا بھجواتا ہوں۔ اگر کل تک انہیں کچھ فائدہ ہو گیا تو میں انہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ شام کو میں انہیں پھر دیکھنے آؤں گا۔ ممکن ہے میں دوپہر کے وقت بھی آ جاؤں۔"

رام ناتھ نے التجا کی۔ "ضرور آیئے۔ اب مجھے صرف آپ کا آسرا ہے۔"

”آپ فکر نہ کریں، میں انہیں اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔“

منوراج دھرم شالہ سے باہر نکلا تو اسے تھوڑی دور اپنا نوکر آتا ہوا دکھائی دیا۔ نوکر کے چہرے پر بدحواسی کے آثار دیکھ کر منوراج کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ رُک کر انتظار کرنے لگا۔ نوکر اس کے قریب پہنچا۔ منوراج نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے مالا کے بارے میں انہل واڑہ کے جوہری کی معلومات بیان کر دیں۔

تھوڑی دیر کے لیے منوراج کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”ہم دروازے پر سپاہیوں کا انتظار کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ چور نہیں لیکن وہ مالا اگر راجہ کی ہے تو ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم کسی بات میں دخل نہ دیں۔“

منوراج کو دھرم شالہ کے دروازے پر کھڑا دیکھ کو بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ یہ بات اس کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ تھوڑی دیر بعد ٹھاکر کے سپاہی نظر آئے تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے آگے بڑھا اور

سپاہیوں کے افسر سے کہنے لگا۔ ”اوّل تو وہ مجھے چور معلوم نہیں ہوتا۔ اگر وہ چور ہے تو بھی میں نہیں چاہتا کہ سارے شہر میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ میں ایک چور کی بیوی کے علاج کے لیے دھرم شالہ میں آیا تھا۔ ٹھاکر جی بھی میری بدنامی پسند نہیں کریں گے۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ میں اسے کسی بہانے سے باہر لے آؤں اور جب ہم گلی میں پہنچیں تو آپ اسے گرفتار کر لیں۔

سپاہیوں کے افسر نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور منوراج دھرم شالہ کے اندر چلا گیا۔ جب وہ رام ناتھ کے کمرے میں داخل ہوا تو رام ناتھ روپ وتی کا سر دبا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ ”آپ واپس آ گئے مہاراج۔“

”ہاں! آپ میرے ساتھ چلیں۔ دوا کے استعمال کے بارے میں آپ کو بُہت سی باتیں سمجھانی ہیں۔“

رام ناتھ نے سے پریشان ہو کر روپ وتی کی طرف دیکھنے لگا۔ روپ وتی نے نحیف سی آواز میں کہا۔ ”جایئے میری فکر نہ کیجیے۔“

رام ناتھ منوراج کے ساتھ دھرم شالہ سے باہر آ گیا۔ جب یہ دونوں ایک کھلے میدان سے گزر کر تنگ گلی میں داخل ہوئے تو ٹھاکر کے سپاہیوں نے اچانک رام ناتھ کو گھیرے میں لے لیا۔ رام ناتھ تھوڑی دیر چیخنے چلّانے اور قوّت آزمائی کرنے کے بعد آن دس آدمیوں کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ منوراج اتنی دیر میں تیس چالیس قدم آگے جا چکا تھا۔ رام ناتھ چلّا رہا تھا۔ ''مجھے چھوڑ دو! بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو میں راجہ کا دوست ہوں۔'' اور سپاہی قہقہے لگا رہے تھے۔

۴

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ ایک عالی شان محل کے کشادہ کمرے میں ٹھاکر رگھو ناتھ کے سامنے کھڑا تھا۔ منوراج اور انہل واڑہ کا جوہری ٹھاکر کے دائیں بائیں کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ فوج کے چند سپاہی اور افسر رام ناتھ کے ارد گرد کھڑے تھے۔

رگھو ناتھ نے رام ناتھ کو مالا دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ مالا تم نے کہاں سے لی ہے؟''

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”مہاراج! یہ مجھے مہاراجہ نے دی تھی۔“

”ہمارے مہاراجہ نے؟“

”جی ہاں!“

”کب؟“

”مہاراج! اس سوال کا جواب آپ مہاراجہ سے پوچھ لیتے تو آپ کے سپاہیوں کو مجھے گرفتار کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ مالا مجھے مہاراجہ نے اس دن دی تھی جب جنگل میں شیر کا شکار کھیل رہے تھے اور میں نے انہیں موت کے منہ سے نکالا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنا ہاتھی بھی دیا تھا۔“

رگھو ناتھ اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فوج کا افسر رام ناتھ کے پیچھے کھڑا تھا، آگے بڑھا اور اس نے غور سے رام ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! میں شکار میں مہاراجہ کے ساتھ تھا۔ یہ وہی ہیں۔ اگر میں انہیں پہلے دیکھ لیتا تو سپاہی ایسی غلطی نہ کرتے۔“

رگھو ناتھ نے پریشانی کی حالت میں جوہری اور منوراج کی طرف دیکھا اور

پھر اچانک آگے بڑھ کر مالا رام ناتھ کے گلے میں ڈال دی۔ منوراج اور جوہری بد حواسی کی حالت میں کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ رام ناتھ نے مالا اتارے ہوئے کہا۔ ”نہیں مہاراج! میں یہ مالا وید جی کو دے چکا ہوں اور دی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ آپ اگر مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہیں تو وید جی سے کہیے کہ وہ مریضہ کی جان بچانے کی کوشش کریں۔“

”مریضہ تمہاری بیوی ہے؟“

”جی۔۔۔۔جی ہاں وہ میری بیوی ہے۔“

رگھو ناتھ نے کہا۔ ”اب تم دھرم شالہ میں نہیں رہ سکتے۔ آج سے تم میرے مہمان ہو۔ میرے آدمی تمہارے ہمراہ جاکر تمہاری بیوی کو یہاں اُٹھالائیں گے اور وید جی اس کے علاج کے لیے یہیں ٹھہریں گے۔ یہ مالا اپنے پاس رکھو، ہم وید جی کو اس کی قیمت ادا کریں گے۔“

منوراج اپنا کھسیانہ پن چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھا اور اس

نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مہاراج! میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ بھگوان جانتا ہے میری خواہش یہی تھی کہ جب ان کی بیوی تندرست ہو جائے تو یہ مالا انہیں واپس کر دوں۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ یہ اتنی قیمتی چیز کہیں کھو نہ بیٹھیں۔ سیٹھ جی کی غلطی کے باعث انہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔“

جوہری نے ہاتھ باندھے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مالا انہیں مہاراج نے خود دی ہے۔“

رام ناتھ نے مالا منوراج کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں مہاراج! مالا اب آپ کی ہے۔ میں ان کی جان بچانے کے بدلے میں دنیا کے تمام خزانے آپ کے قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہوں۔“

”مجھے زیادہ نادم نہ کیجیے۔“ منوراج نے یہ کہتے ہوئے مالا رام ناتھ کے ہاتھ سے لے کر زبردستی اس کے گلے میں ڈال دی۔ ٹھاکر رگھو ناتھ کے چار نوکر رام ناتھ کے ساتھ دھرم شالہ کی طرف گئے اور تھوڑی دیر بعد روپ وتی کو پالکی میں بٹھا کر اس کے محل میں لے آئے۔ رگھو ناتھ نے اپنے

وسیع محل کا ایک حصّہ رام ناتھ کے سپرد کر دیا۔ روپ وتی قریباً ایک ہفتہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی رہی۔ شہر کے معزز گھرانوں کی عورتیں محض ٹھاکر کو خوش کرنے روپ وتی کی تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھیں۔ رام ناتھ نے احتیاط کے طور پر روپ کا نام بدل کر ساوتری رکھ دیا تھا لیکن اس کے باوجود عورتوں کی آمد و رفت کے باعث وہ ہر اس بات سے فکر مند رہتا کہ اگر کسی نے روپ وتی کو پہچان لیا تو کیا ہو گا۔

دوسرے ہفتے روپ وتی کا بخار اُتر گیا لیکن وہ اس قدر لاغر ہو چکی تھی کہ اس کی صورت پہچاننا بھی مشکل تھا۔ ٹھاکر کی دو نوکرانیاں روپ وتی کی خدمت پر مامور تھیں۔ تیسرے ہفتے روپ وتی نوکرانی کا سہارا لے کر چند قدم چلنے پھرنے کے قابل ہو چکی تھی۔ اس عرصہ میں رام ناتھ کئی بار ٹھاکر سے یہ درخواست کر چکا تھا کہ اسے محل سے باہر کسی مکان میں رہنے کی اجازت دی جائے لیکن ٹھاکر رگھو ناتھ ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ جب تک تمہاری بیوی بالکل تندرست نہیں ہو جاتی تم میرے مہمان ہو۔

محل کے نوکروں کی زبانی رام ناتھ کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ٹھاکر کی

شادی ہونے والی ہے اور دور دراز سے سینکڑوں مہمان اس تقریب میں حصّہ لینے کے لیے جمع ہوں گے۔ وہ روپ وتی کو ان کی نگاہوں سے دور رکھنے کے لیے شادی سے پہلے محل خالی کر دینا ضروری سمجھتا تھا لیکن روپ وتی ابھی تک ایک لمبے سفر کے قابل نہ تھی۔ شاہی طبیب منوراج اس کی حالت کے متعلق ٹھاکر اور رام ناتھ کے سامنے اطمینان کا اظہار کرنے کے بعد واپس انہل واڑہ جا چکا تھا لیکن اس نے سختی سے اس بات کی تاکید کی تھی کہ مریضہ کو چند ہفتے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ مندھیر میں منوراج کا ایک شاگرد اپنے استاد کی ہدایات کے مطابق ہر روز اسے دیکھنے کے لیے آیا کرتا تھا۔

ایک دن اس نے ٹھاکر کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ ”مہاراج! میری بیوی اب بالکل ٹھیک ہے اور میں آپ کے احسان کا بدلا عمر بھر نہیں دے سکوں گا لیکن میں ایک بار پھر آپ کی خدمت میں یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ مجھے محل سے باہر کسی مکان میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ اگلے ہفتے آپ کے سینکڑوں مہمان اس محل میں جمع ہو جائیں گے۔ میں

نے شہر میں ایک مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔ اس لیے آپ مجھے اپنی خوشی سے وہاں رہنے کی اجازت دے دیں۔“

رگھوناتھ نے جواب دیا۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کوئی مہمان تم سے زیادہ عزیز نہیں ہو گا۔ پھر بھی میں تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں یہاں ٹھہرانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن میں تمہیں کسی معمولی مکان میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ شہر کی دوسری طرف میرا ایک مکان خالی پڑا ہے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میری شادی کے موقع پر اس محل میں مہمانوں کی بھیڑ تمہیں پریشان کرے گی تو تم وہاں چلے جاؤ۔ میں نے راجہ کو بھی تمہارے متعلق اطلاع بھیج دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ میری شادی پر یہاں آئیں گے تو سب سے پہلے تمہارے متعلق پوچھیں گے۔ وہ انہل واڑہ سے کنتھ کوٹ چلے گئے ہیں ورنہ اب تک تمہارے پاس ان کا ایلچی آ چکا ہوتا۔

اگلے دن رام ناتھ اور روپ وتی محل چھوڑ کر رگھوناتھ کی ایک پرانی حویلی گئے۔ رگھوناتھ کے نوکر یہاں بھی ان کی خدمت کے لیے موجود تھے۔

محل سے ایک عمر رسیدہ خادمہ بھی جسے روپ وتی کے ساتھ بہت اُنس ہو چکا تھا، ان کے ساتھ آئی تھی۔ اس حویلی کے پاس ہی ایک اور عالیشان مکان تھا۔ رام ناتھ اور روپ وتی کو نوکروں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ مکان اس شخص کا ہے جس کی لڑکی سے ٹھاکر رگھو ناتھ کی شادی ہونے والی ہے اور اسے حال ہی میں اس علاقے میں جاگیر ملی ہے۔

۵

ایک دن روپ وتی اپنی عمر رسیدہ نوکرانی کے ساتھ کوٹھے کی چھت پر کھڑی ٹھاکر رگھو ناتھ کی بارات دیکھ رہی تھی۔ راجہ ٹھاکر اور شاہی گھرانے کے چند اور افراد ہاتھیوں پر اور ان کے پیچھے بڑے بڑے سردار اور عہدیدار گھوڑوں پر سوار تھے۔ ٹھاکر نے شادی کے موقع پر جمع ہونے والے بھانڈوں اور مسخروں کو راجہ کی آمد سے پہلے ہی انعامات سے کر رخصت دیا تھا۔ تاہم ڈھول پیٹنے اور شہنائیاں بجانے والوں کی ایک پوری فوج بارات کے ہمراہ تھی۔

جب برات آگے نکل گئی تو روپ وتی جو اپنے مکان کی چھت پر کھڑی

کھڑی تھک گئی تھی نیچے آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھی خادمہ بھی نیچے اتر آئی اور اس نے روپ وتی کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”یہ اچھی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ بھگوان کی سوگند وہ چاند کا ٹکڑا ہے اور ٹھاکر کی عمر اس کے باپ سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا اور اس نے روپ وتی کو دیکھتے ہی کہا۔ ”تمہاری طبیعت کیسی ہے روپا؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”چھت پر کھڑی برات دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھی۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”میں ایک بہت اچھی خبر لایا ہوں۔ مہاراج مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد جب بارات واپس چلی جائے گی تو ٹھاکر کے محل میں ان کا دربار لگے گا اور جس شخص کو سب سے پہلے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا جائے گا، وہ میں ہوں۔ میں ذرا دیر سے آؤں تو گھبرا نہ جانا۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”رام ناتھ مجھے ڈر لگتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم یہاں سے فوراً روانہ ہو جائیں، اب میں سفر کر سکتی ہوں،۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو روپ وتی! اب میں راجہ بھیم دیو کی پناہ میں ہوں۔ اب اگر پروہت بھی یہاں آجائے تو وہ اپنی رسوائی کے خوف سے تمہارے متعلق زبان نہیں کھول سکے گا۔“

روپ وتی نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”تو تمہارا مطلب ہے کہ ہم یہیں رہیں گے۔“

”نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں۔۔۔۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں چند دن اور آرام مل جائے۔ پھر تم جانتی ہو کہ راجہ کے مہمانوں کی حیثیت سے ہمارے لیے سفر کرنا بہت آسان ہو گا۔“

رام ناتھ یہ کہہ کر چلا گیا اور روپ وتی خیالات کی دنیا میں کھو گئی۔ وہ چند دن سے محسوس کر رہی تھی کہ نئے مکان میں منتقل ہونے کے بعد رام ناتھ گردو پیش کے خطرات سے بے پرواہوتا جارہا ہے اور ٹھاکر کی دوستی

آہستہ آہستہ اس کے دل میں یہ احساس پیدا کر رہی ہے کہ وہ دنیا میں بے یار و مدد گار نہیں۔ شہر کے لوگ انہیں شوہر اور بیوی سمجھتے تھے۔ رام ناتھ کو گزشتہ واقعات نے مذہب اور سماج کی ہر رسم سے باغی کر دیا تھا۔ اس نے روپ وتی کو سومنات کے پروہت کے ہاتھوں سے چھینا تھا۔ اس نے دیوتاؤں اور ان کے پجاریوں کا مذاق اڑایا تھا اور اب ان تمام واقعات کے بعد روپ وتی کے ساتھ شادی رچانے کے لیے وہ کسی پنڈت کی خدمات حاصل کرنا مضحکہ خیز سمجھتا تھا۔ لیکن روپ وتی سومنات کے پجاریوں اور پروہت سے نفرت اور حقارت کے باوجود سماج کے آئین کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ نہ ہو سکی۔ وہ مرد اور عورت کے ایسے تعلقات کا تصوّر کرنے کے لیے بھی تیّار نہ تھی جو مذہب اور سماج کی رسوم سے کلیتاً آزاد ہوں۔ اپنے مذہب کے بارے میں اس کے دل میں گوناگوں خیالات کا ایک طوفان موجزن تھا لیکن یہ طوفان صرف سومنات کے مندر کے چند پجاریوں اور پروہت کی بدعنوانیوں کے خلاف تھا۔ اسے پجاریوں سے نفرت تھی لیکن دیوتاؤں کا خوف اب بھی اس کے دل پر حاوی تھا۔ اس نے دلائل سے زیادہ اپنے آنسوؤں سے رام ناتھ کو نہ ماننے

پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شوہر اور بیوی کا ناطہ جوڑنے کے لیے سماج کی رسوم کی پابندی کریں گے اور اس مقصد کے لیے خطرے کی حدود سے باہر نکل جانا ضروری تھا۔ اس کے لیے قنوج میں رنبیر کا گاؤں ایک ایسا قلعہ تھا جہاں وہ کسی خطرے کے بغیر اپنی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ روپ وتی رام ناتھ سے کہا کرتی تھی۔ ”جب ہم وہاں پہنچیں گے تو مجھے یہ کہتے ہوئے کبھی ڈر محسوس نہیں ہو گا کہ میں سومنات کے مندر سے بھاگ کر آئی ہوں۔ سومنات کا کوئی پجاری مسلمانوں کے خوف سے ہمارا پیچھا نہیں کرے گا۔ رنبیر خوشی سے اپنے محل کے قریب ہمیں جھونپڑی بنانے کی اجازت دے دے گا۔ پھر جب تم کھیتوں میں کام کیا کرو گے تو میں تمہارے لیے کھانا لے کر آیا کروں گی۔ تم گایا کرو گے اور میں اطمینان سے بیٹھ کر سُنا کروں گی۔“

کبھی کبھی رام ناتھ بھی اس کے ساتھ مستقبل کے تصورات میں کھو جاتا لیکن بعض اوقات اس کے جذبۂ خود پسندی کو ٹھیس لگتی اور وہ کہتا۔ ”نہیں روپا، تم ایک کسان یا چرواہے کی بیوی بننے کے لیے پیدا نہیں

ہوئیں۔ میں رنبیر کے محل کے پاس تمہارے لیے ایک جھونپڑا نہیں بلکہ ایک عالیشان محل تعمیر کروں گا۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ میری تلوار راجوں اور مہاراجوں سے خراج وصول کرے گی۔ جب تک میرے پہلو میں ایک سپاہی کا دل ہے میرے لیے شہرت اور کامیابی کے راستے کھلے رہیں گے۔ انہل واڑہ کے مہاراجہ نے اپنی مالا اتار کر میرے گلے میں ڈالی تھی۔ قنوج کے گورنر نے مجھے دوست بنایا۔ سلطان محمود نے میری بہادری کا اعتراف کیا تھا۔ اگر مجھے یہاں تمہارے متعلق اطمینان ہوتا تو میں سیدھا راجہ کے دربار میں چلا جاتا اور پھر تم دیکھتیں کی کہ بڑے بڑے سرداروں کی بہو بیٹیاں تمہیں پرنام کرنے آتی ہیں۔" رام ناتھ کے منہ سے ایسی باتیں سُن کر روپ وتی کا دل بیٹھ جاتا اور وہ گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ جلد از جلد قنوج پہنچ جائے۔ بخار اتر جانے کے بعد وہ ہر روز یہ کہا کرتی۔ "میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اب سفر کر سکتی ہوں۔ ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ بھگوان کے لیے جلدی یہاں سے نکل چلو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" لیکن وید جی نے یہ کہا ہوا تھا کہ مریضہ ابھی سفر کرنے کے قابل نہیں۔

اسے چند ہفتے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے رام ناتھ سفر کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

٦

آدھی رات ہونے کو تھی لیکن رام ناتھ واپس نہ آیا۔ روپ وتی انتہائی پریشانی کی حالت میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بوڑھی نوکرانی دیر تک اس سے باتیں کرنے بعد اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔ رام ناتھ کا اتنی دیر گھر سے باہر رہنا خلافِ معمول تھا اور جوں جوں رات زیادہ ہو رہی تھی، روپ وتی کی ناراضگی خوف میں تبدیل ہو رہی تھی۔ بالآخر اسے صحن میں رام ناتھ کی آواز سنائی دی اور اس کا دل مسرت سے اچھلنے لگا۔ وہ کرسی سے اٹھی اور دروازے میں کھڑی ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ رام ناتھ چوکیدار سے باتیں کرتا ہوں آرہا تھا۔ اچانک اس نے دروازے میں روپ وتی کو دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی تک جاگ رہی ہو روپا؟“

روپ وتی نے پیچھے ہٹ کر اپنے بستر پر بیٹھے ہوئے شکایت کے لہجے میں

کہا۔ ”آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ مجھے نیند آ گئی ہو گی۔“

رام ناتھ نے اس کی شکایت پر توجہ دینے کی بجائے اپنی کمر سے زری کی پیٹی کھول کو تلوار اتار دی اور روپ وتی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو روپ وتی! یہ مجھے مہاراجہ نے دی ہے۔“

تلوار کی نیام سنہری تھی اور اس کا دستہ ہیروں سے مزیّن تھا۔ روپ وتی نے کہا۔ ”بھگوان کا شکر ہے کہ ایسی خوبصورت چیز نے تمھیں گھر آنے کا راستہ نہیں بھلا دیا؟“

رام ناتھ نے دروازہ بند کر دیا اور آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں اتنی دیر پریشان رکھا۔ مہاراج کا حکم تھا کہ میں رات کے وقت ان کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ اس کے بعد وہ دیر تک میرا گانا سُنتے رہے اور مجھے اپنی مرضی کے خلاف ان کے پاس بیٹھنا پڑا۔ میں تمہارے لیے ایک بہت اچھی خبر لایا ہوں۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”میرے لیے سب سے اچھی خبر یہی ہو سکتی ہے کہ ہم

کل یہاں سے چلے جائیں۔"

رام ناتھ نے کہا۔ "نہیں روپ وتی! اب ہمیں در در کی ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں گی۔ آج سے میں سردار رام ناتھ ہوں۔ راجہ نے بھرے دربار میں یہ اعلان کیا ہے کہ آج سے تمہارے دوست میرے دوست اور تمہارے دشمن میرے دشمن ہوں گے۔ مہاراجہ نے مجھے آٹھ پورے گاؤں جاگیر میں دیے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" روپ وتی نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "بھگوان کے لیے یہاں رہنے کا خیال دل سے نکال دو۔"

رام ناتھ نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "روپ وتی! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے یہاں کوئی خطرہ نظر آتا تو میں انہل واڑہ کی سلطنت کو بھی ٹھکرا دیتا لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم قنوج کی نسبت اس جگہ کم محفوظ نہیں۔ یہ ہمارا وہم تھا کہ سومنات کے پجاری ہماری تلاش کر رہے ہیں۔ آج ٹھاکر کے دو پجاریوں سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ سومنات کی نئی دیوی پہلی رات ہی دیوتا کے چرنوں میں

پہنچ گئی تھی اور اگلے دن پروہت نے دیوی کا تاج ایک اور لڑکی کے سر پر رکھ دیا تھا۔ پروہت مرا نہیں زندہ ہے۔ پجاری کہتے تھے کہ گزشتہ دِنوں رات کے وقت سیڑھی پر سے پھسل جانے کے باعث پروہت کے سر پر زخم آ گیا تھا۔ مہاراجہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پجاری نے تمہارے فوراً غائب ہو جانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مہادیو نئی دیوی پر بہت مہربان تھے۔"

روپ وتی نے کہا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں لیکن تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ پجاری درپردہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔"

"نہیں روپ وتی! پجاری جس مقصد سے یہاں آئے ہیں وہ بھی مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ ٹھاکر جی نے مجھے بتایا تھا کہ سومنات کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی کا خطرہ آئے دن بڑھ رہا ہے اور پروہت نے ان پجاریوں کو مہاراجہ سے مشورہ کرنے بھیجا ہے۔ اب تمہاری تلاش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے اگر کوئی پجاری تمہیں پہچان بھی

لے تو وہ یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ تم روپ وتی ہو۔ اگر تم خود بھی برسرِ عام شور مچاؤ تو وہ یہ کہیں گے یہ کوئی دیوانی ہے۔ وہ روپ وتی جو مندر کی دیوی تھی، زمین پر نہیں آکاش میں رہتی ہے۔"

روپ وتی نے کہا۔ "فرض کرو اس شہر میں مجھے کوئی ایسی لڑکی مل جائے جس نے مجھے مندر میں دیکھا ہو تو کیا ہو گا؟"

رام ناتھ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔ اوّل تو ایسی تمام لڑکیاں یہ سن چکی ہوں گی کہ مندر کی روپ وتی کسی اور دنیا میں جا چکی ہے۔ پھر تم ان سے یہ کہو گی کہ میرا نام روپ وتی نہیں ساوتری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ تمہارے متعلق پروہت اور پجاریوں کے بیانات جھٹلانے کی بجائے یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گی کہ روپ وتی اور ساوتری ایک ہی صورت کی لڑکیاں ہیں۔" روپ وتی نے کہا۔ "لیکن اگر یہ بات پروہت تک پہنچ جائے کہ اس شہر میں روپ وتی کی شکل کی ایک اور لڑکی ہے تو دنیا کی کون سی طاقت ہے جو مجھے اس کے انتقام سے بچا سکے گی؟ راجہ اور ٹھاکر کے لیے اس کا معمولی اشارہ بھی حکم کے برابر ہو گا اور پیشتر اس کے کہ

میری آواز میرے ہونٹوں سے باہر نکلے میرا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ اور اس بات کا علم تک نہیں ہو گا کہ پروہت نے اپنا پاپ چھپانے کے لیے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بے شک راجہ اور ٹھاکر تم پر مہربان ہیں لیکن پروہت کے ماتھے پر بل دیکھ کر انہیں ہمارے بارے میں یہ پوچھنے کی بھی جرأت نہیں ہو گی کہ ہم نے کیا جرم کیا ہے۔"

نام ناتھ نے کہا۔ "روپ وتی تم ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ ہم سومنات سے کوسوں دور ہیں۔ میں انہل واڑہ کی سلطنت میں ایک سردار کی حیثیت رکھتا ہوں۔ راجہ بھیم مجھے صفائی کا موقع دیے بغیر تمہیں پروہت کے حوالے نہیں کرے گا اور پروہت اگر بیوقوف نہیں تو اپنی بدنامی کے ڈر سے مجھ سے الجھنا پسند نہیں کرے گا۔"

روپ وتی نے مایوسی کے انداز میں کہا۔ "مندر میں مجھے کبھی موت کا ڈر محسوس نہیں ہوا تھا لیکن تمہاری دنیا میں آنے کے بعد موت کا تصوّر میرے لیے بہت بھیانک ہے۔ اس میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اب میرے دیوتا تم ہو۔"

رام ناتھ نے اپنی کرسی آگے گھسیٹ لی اور روپ وتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بغیر میری زندگی بے معنی تھی۔ اب میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ سب اس لیے ہے۔ میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔ راجہ انہل واڑہ کے آس پاس مجھے جاگیر دینا چاہتا تھا لیکن نے یہ بہانا کیا کہ مجھے شکار کا شوق ہے۔ اس لیے مجھے مشرقی سرحد کے جنگلات کے پاس آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ راجہ نے میری یہ درخواست خوشی سے مان لی ہے اور مجھے سرحد کے پاس آٹھ گاؤں عطا کر دیے ہیں۔ ان بستیوں سے آگے وسیع جنگل ہے جہاں کہیں کہیں نیچ ذات کے چرواہے رہتے ہیں۔ میں اس جنگل کا جو حصّہ آباد کروں گا وہ بھی میری جاگیر ہو گا۔ راجہ نے چند برس قبل شکار کے دنوں میں اپنے قیام کے لیے دریا کے کنارے ایک مکان بنوایا تھا۔ اب وہاں سرحدی بستیوں کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ رہتا ہے۔ میں نے اس علاقے کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ وہاں پہنچتے ہی یہ مکان خالی کر دیا جائے گا۔ سپاہیوں کے لیے مجھے جھونپڑیاں ڈالنی پڑیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مقام سومنات کے پجاریوں کی پہنچ سے بہت دور ہو گا اور ہم وہاں

آزادی سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ میں کسی برہمن کو پکڑ لاؤں گا اور ہم چُپ چاپ شادی کی رسمیں پوری کر لیں گے۔ جنگل میں جو لوگ رہتے ہیں وہ زیادہ تر بھیل ہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ سرحد کی بستیوں میں چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے آجاتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے اگر میں ان لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی بجائے اچھا سلوک کروں تو یہ امن پسند ثابت ہو سکتے ہیں۔ تمہاری صحت ذرا ٹھیک ہو جائے تو چند دن کے لیے وہاں جاؤں گا اور ضروری انتظامات کے بعد تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جاؤں گا۔ میں تمہارے یہاں چند ہفتے اور ٹھہرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ بیماری کے باعث تمہاری صورت اس درجہ بدل چکی ہے کہ تمہیں دیکھ کر کسی کو اس بات کا شک نہیں ہو سکتا کہ تم ہی روپ وتی ہو۔"

روپ وتی نے کہا۔ "لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ تم نے قنوج جانے کا ارادہ کیوں بدل دیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم ایک عام آدمی کی بجائے ایک سردار بننا چاہتے ہو لیکن کیا رنبیر اور قنوج کے گورنر کی دوستی تمہارے کسی کام نہ آتی۔ کیا وہاں ہم اپنے گزارے

کے لیے صرف چند کھیت حاصل کر لینے کے بعد زیادہ خوش نہ ہوتے؟“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”روپ وتی! اگر میں قنوج کے مستقبل سے مطمئن ہوتا تو راجہ کی بڑی سے بڑی جاگیر ٹھکرا کر بھی وہاں چلا جاتا لیکن قنوج اور اس کی ہمسایہ سلطنتوں کے لیے ابھی تک یہ خطرہ موجود ہے کہ محمود کی فوجیں کسی دن واپس چلی جائیں گی اور وہاں کے ہندو ان لوگوں پر ٹوٹ پڑیں گے جن پر مسلمانوں سے دوستی کے کا الزام ہو گا۔ ان حالات میں رنبیر جیسے لوگوں کی جانیں خطرے میں ہوں گی۔ اگر میں تنہا ہوتا تو رنبیر کے پاس رہنا پسند کرتا لیکن تمہارے لیے میں ایسے تمام خطروں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ تمہاری تسلّی کے لیے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں قنوج کے حالات سے باخبر رہوں گا اور جونہی اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ وہاں ہمارا مستقبل محفوظ ہے ہم وہاں چلے جائیں گے۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تم سومنات پر مسلمانوں کے حملے کے خطرے کے باوجود اس علاقے کو محفوظ سمجھتے ہو۔“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔“

روپ وتی نے پوچھا۔ ”کیا راجہ کے جاگیر دار ہوتے ہوئے تم مسلمانوں کے خلاف اس کا ساتھ نہیں دو گے؟“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”نہیں یہ جاگیر میں نے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا وعدہ کر کے حاصل نہیں کی بلکہ راجہ کی جان بچانے کا صلہ ہے۔ مجبوری کی حالت میں، میں ہر وقت سرحد عبور کر کے قنوج یا کسی اور ریاست میں پناہ لے سکوں گا۔ مجھے امید ہے کہ راجہ کے دوش بدوش کھڑا ہو کر بھی میں اپنی تلوار مسلمانوں کے خلاف نہیں اٹھا سکوں گا۔ لیکن تمہیں ابھی ایسی باتیں سوچ کر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ سرِ دست سرحد کے علاقے قنوج سے کم محفوظ نہیں۔ اچھا تم آرام کرو۔“ رام ناتھ اُٹھ کر برابر کے کمرے کی طرف بڑھا لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر اسے کوئی خیال آیا اور اس نے مُڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”روپ وتی ٹھاکر کی دلہن کو تمام بڑے بڑے سرداروں کی بیویوں نے تحائف پیش کیے ہیں۔ اب چونکہ یہ مشہور ہو چکا ہے کہ تم

میری بیوی ہو اور ٹھاکر کے مجھ پر احسانات بھی ہیں اس لیے تمہیں ٹھاکر کی دلہن کو کوئی بہت قیمتی تحفہ پیش کرنا چاہیے۔ انہل واڑہ کا جوہری ابھی تک یہیں ہے۔ میں اس سے مل چکا ہوں، اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر انہل واڑہ سے کنگن کا ایک خوبصورت جوڑا منگا دے گا اور قیمت بعد میں وصول کرے گا۔ ٹھاکر کا دل رکھنے کے لیے میں نے اسے یہ کہہ دیا کہ میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ تندرست ہوتے ہی ٹھاکرانی کو پرنام کرنے کے لیے حاضر ہو گی۔"

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ دوسرے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا لیکن روپ وتی بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ان دیکھی قوت رام ناتھ کو اس کے ہاتھوں سے چھین کر کہیں دور لے جا رہی ہے۔ اس کے دل سے بار بار یہ آواز نکل رہی تھی۔ "رام ناتھ! تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔"

ے

اگلے دن مہاراجہ بھیم دیو نے اپنی راجدھانی کی طرف کوچ کیا، روانہ

ہونے سے پہلے اس نے ٹھاکر رگھو ناتھ کو ہدایت کی کہ رام ناتھ کو اس کی جاگیر میں آباد کرنے کے لیے ہر ممکن مدد دی جائے۔ روپ وتی کو یقین ہو چکا تھا کہ رام ناتھ قنوج نہیں جائے گا۔ چنانچہ اب وہ کسی تاخیر کے بغیر سرحد پر اپنے نئے گھر میں منتقل ہونے پر بضد تھی۔ وہ صبح شام رام ناتھ سے کہا کرتی تھی۔ "میں اب سفر کر سکتی ہوں۔ اس لیے ہمیں فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے۔" لیکن رام ناتھ ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ ابھی تم کمزور ہو۔ اگر راستے میں دوبارہ بیمار ہوئیں تو اس دور افتادہ مقام پر اچھے طبیب کی خدمات حاصل کرنا ممکن نہ ہو گا۔

ٹھاکر رگھو ناتھ کی شادی سے چار دن بعد روپ وتی کا اصرار شدید ہو گیا اور رام ناتھ مجبور ہو کر کہنے لگا۔ "اچھا تو میں کل اپنی جاگیر دیکھنے چلا جاؤں گا اور پانچ چھ روز میں ضروری انتظامات کرنے کے بعد واپس آ کر تمہیں اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا۔ اس وقت میں تمہاری حالت اور بھی اچھی ہو جائے گی۔"

اگلی صبح چھ سوار جنہیں ٹھاکر نے رام ناتھ کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ حویلی

سے باہر کھڑے تھے اور رام ناتھ صحن میں روپ وتی سے رُخصت ہو رہا تھا۔ ”رام ناتھ دیر نہ لگانا۔“ روپ وتی نے سراپا التجا بن کر کہا۔

رام ناتھ نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ اگر جوہری میری غیر حاضری میں کنگن لے آئے تو خادمہ کو ساتھ لے کر ٹھاکر کے گھر چلی جانا۔ میں شہر کے دکاندار کو کپڑوں کے لیے کہہ آیا ہوں۔ وہ ایک بہترین جوڑا ٹھاکر کی بیوی کے لیے اور دوسرا تمہارے لیے پہنچا دے گا۔ ابھی جب میں ٹھاکر کے پاس گیا تھا تو انہوں نے تمہارے متعلق پوچھا تھا۔ میں نے بتایا کہ اب تمہاری صحت بہت اچھی ہے اور تم ایک دو دن میں ٹھاکرانی کو پرنام کرنے آؤ گی۔“

روپ وتی نے کہا۔ ”جلد آنا۔ میں بہت ڈرتی ہوں۔“

”تم ٹھاکر کے گھر جانے سے ڈرتی ہو۔ اب تو اس کے مہمان بھی جا چکے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے کوئی خدشہ نہیں۔ صرف تمہاری فکر ہے۔ اب تم

سردار بن چکے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ کوئی تمہیں میرے ہاتھوں سے چھین نہ لے۔"

"روپ وتی! مجھے صرف موت تمہارے ہاتھوں سے چھین سکتی ہے۔"
"ایسی باتیں نہ کرو۔" روپ وتی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "میں پگلی ہوں۔ جاؤ تمہارے ساتھی باہر انتظار کر رہے ہیں۔"

رام ناتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ روپ وتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ رام ناتھ نے ایک ثانیہ کے لیے مُڑ کر روپ وتی کو دیکھا اور پھر تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد روپ وتی حویلی سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سُن رہی تھی۔

جان پہچان

دو دن بعد روپ وتی اپنی خادمہ کے ہمراہ رگھوناتھ کے محل میں داخل ہوئی۔ خادمہ ایک چاندی کی طشتری اٹھائے ہوئے تھی جس کے اوپر ایک ریشمی کپڑا پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر کی ایک خادمہ جو ان کی رہنمائی کر رہی تھی، انہیں ایک کمرے کے سامنے ٹھہرا کر چلی گئی۔ چند لمحات کے بعد اس نے واپس آ کر روپ وتی کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ رپ وتی اپنی خادمہ کے ہاتھ سے طشتری لے کر اندر چلی گئی۔

ٹھاکر کی بیوی ایک کشادہ چوکی پر بیٹھی تھی، جو مخمل کے گدیلیوں اور زر

تار جھالروں سے آراستہ تھی۔ روپ وتی ایک ہاتھ سے طشتری سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر جھکی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا پاؤں چھونے لگی۔ ٹھاکرانی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا تو اس نے جلدی سے اپنے دونوں گھٹنے فرش پر ٹیک دیے اور ادب سے ست جھکاتے ہوئے طشتری آگے کر دی۔ ٹھاکر کی بیوی نے رومال اٹھا کر اس کا تحفہ دیکھے بغیر طشتری اس کے ہاتھ سے لے لی اور اپنے قریب رکھ لی۔

روپ وتی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹھاکر کی بیوی نے پہلی بار اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم! تم یہاں!“ روپ وتی نے گردن اُٹھائی اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے سامنے نرملا کھڑی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی اور ایک کرسی پر گر پڑی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھا رہی تھی۔ چند لمحات کے لیے نرملا کو بھی اپنے گرد و پیش کا ہوش نہ رہا۔ وہ سکتے کے عالم میں اپنی سہیلی کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے بارے میں سومنات کے پجاریوں نے چند دن قبل یہ اطلاع دی تھی کہ وہ دیوتا کے چرنوں میں پہنچ

چکی ہے۔ آہستہ آہستہ روپ وتی کا مُرجھایا ہوا چہرہ اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس لڑکی سے مختلف دکھائی دینے لگیں جس کے وجود میں اس نے زندگی کی تمام دلفریبیاں، سرمستیاں اور رعنائیاں دیکھی تھیں۔

روپ وتی کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آہستہ آہستہ زندگی کے آثار نمودار ہو رہے تھے لیکن خوف کے باعث اس کے چہرے میں جو تغیّر آ چکا تھا وہ نرملا کی سراسیمگی دور کرنے کے لیے کافی تھا۔

ہوش میں آتے ہی روپ وتی کی قوّت مدافعت بیدار ہو گئی۔ اس نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ ”معاف کیجیے، میں بہت بیمار رہی ہوں۔ مجھے چکر آ گیا تھا۔“

نرملا نے کہا۔ ”آپ کو ایسی حالت میں تکلیف نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”میرا خیال تھا کہ میں اب ٹھیک ہو گئی ہوں۔“

نرملا نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ ”میں آپ کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

”جی میرا نام ساوتری ہے۔“

”آپ کی کوئی بہن سومنات کے مندر میں تو نہیں تھی؟“

”جی نہیں۔“

”سومنات کے مندر میں ایک لڑکی کی شکل بالکل آپ جیسی تھی۔ آپ کو دیکھ کر یوں معلوم ہوا جیسے وہ لڑکی روپ بدل کر یہاں آگئی ہے۔“

روپ وتی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایک ہی صورت کی دو لڑکیاں دیکھ کر گھبرانے کی کیا بات تھی؟“

نرملا نے جواب دیا۔ ”بات دراصل یہ تھی کی وہ لڑکی مندر کی دیوی بنتے ہی دیوتا کے پاس پہنچ گئی تھی۔ مجھے وہ بہت یاد آیا کرتی ہے۔“

”اور آپ نے یہ سمجھا کہ آپ کی یاد نے اُسے میرے روپ میں آپ کے پاس پہنچا دیا ہے۔“

”نہیں۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔“

روپ وتی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو مجھے دیکھ کر

آپ نہیں ڈریں گی نا؟"

"نہیں۔ لیکن آپ وعدہ کریں کہ تندرست ہونے کے بعد آپ مجھ سے ملنے آیا کریں گی۔"

روپ وتی نے جواب دیا۔ "ضرور آیا کروں گی۔"

نرملا نے قدرے بے توجہی سے طشتری پر سے کپڑا اٹھایا۔ طشتری میں زری کی ساڑھی کے اور چاندی کی ایک ڈبیا رکھی تھی۔ اس نے ڈبیہ کھولی اور کنگن نکال کر دیکھنے لگی۔

"بہن! تم نے بہت تکلیف کی۔" نرملا نے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ آپ ایک غریب بہن کا تحفہ نہیں ٹھکرائیں گی۔"

نرملا نے کنگن دوبارہ ڈبیہ میں رکھ دیے اور کہا۔ "آپ یقین کریں کہ میں اسے بہترین تحفہ سمجھتی ہوں۔ مجھے زیور پہننے کا شوق نہیں، لیکن آپ کا یہ تحفہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔"

۲

روپ وتی رخصت ہونے کے لیے اجازت لینے کا ارادہ کر رہی تھی کہ بغل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ٹھاکر اندر داخل ہوا۔ روپ وتی جلدی سے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ارے ساوتری! تم کب آئیں؟“ ٹھاکر نے پوچھا۔

”مہاراج! میں ابھی آئی ہوں۔“

”اب تمہاری صحت اچھی معلوم ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ نرملا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”یہ ہمارے نئے جاگیر دار کی دھرم پتنی ہیں۔ ان کے پتی نے اپنی جان پر کھیل کر ہمارے مہاراجہ کی جان بچائی تھی۔“

روپ وتی کے چہرے پر دوبارہ پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس نے نرملا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”اب مجھے اجازت دیجیے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

نرملا نے جواب دیا۔ ”بہت اچھا۔ آپ جا کر آرام کریں، لیکن دوبارہ ملنے کا

وعدہ نہ بھولیں۔"

روپ وتی نے ٹھاکر اور ٹھکرانی کو پرنام کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ٹھاکر نرملا کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نرملا نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "جب میں سومنات میں تھی تو اس محل میں ایک نوجوان رہتا تھا۔ ایک سپاہی نے مجھے اس کے متعلق بتایا تھا کہ اس نے راجہ کو چیتے کے حملے سے بچایا ہے۔"

ٹھاکر نے کہا۔ "یہ وہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راجہ نے اسے سومنات جانے کے لیے اپنا ہاتھی دیا تھا اور وہاں ہمارے محل میں ہی رہا تھا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"رام ناتھ!" "آپ اس لڑکی کا نام جانتے ہیں؟"

"ہاں! اس کا نام ساوتری ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے اس کا گھر کہاں ہے؟"

ٹھاکر نے جواب دیا۔ ”رام ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سومنات آنے سے پہلے اپنی بیوی کو اس کے باپ کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ ساوتری کا باپ کالنجر کی سرحد پر کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ جب مسلمانوں کی فوج گوالیار فتح کرنے کے بعد کالنجر کی طرف بڑھی تو ساوتری کا باپ سرحدی فوج کے چند دستوں کے ساتھ اپنے علاقے کی حفاظت کرتا ہوا مارا گیا۔ ساوتری کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ باپ کی موت کے بعد اس نے ایک وفادار نوکر کو ساتھ لیا اور رام ناتھ کی تلاش میں نکل پڑی۔ اتفاق سے انہیں یاتریوں کا ایک قافلہ مل گیا اور یہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ادھر رام ناتھ کالنجر کے حالات سنتے ہی ساوتری کا پتہ لگانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ ممکن تھا کہ رام ناتھ کالنجر کی خاک چھانتا رہتا اور ساوتری سومنات میں اسے تلاش کرتی پھرتی لیکن بھگوان نے ان پر دِیا کی اور سومنات سے تیس چالیس کوس اِدھر ہی ان کا ملاپ ہو گیا۔ رام ناتھ نے واپس سومنات جانے کی بجائے انہل واڑہ پہنچنے کا ارادہ کیا لیکن راستے میں اس کی بیوی بیمار ہو گئی۔ جب وہ یہاں پہنچے تو ساوتری کی حالت بہت خراب تھی۔ اس لیے میں نے انہیں اپنے پاس ٹھہرا لیا۔“

یہ افسانہ رام ناتھ نے ٹھاکر اور شہر کے دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے چھپنے کے لیے تراشا تھا۔ لیکن ٹھاکر سے چند اور باتیں معلوم کرنے کے بعد نرملا کے شکوک پھر تازہ ہو گئے۔ اس پر یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ رام ناتھ وہی نوجوان ہے جسے اس نے سومنات میں دیکھا تھا لیکن روپ وتی کے متعلق وہ جس قدر سوچتی تھی اسی قدر اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ٹھاکر نے پوچھا۔ ”تم کیا سوچ رہی ہو؟“

نرملا نے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں۔ میں اس بات پر حیران ہوں کہ ساوتری کی شکل بالکل اس لڑکی جیسی ہے جسے میں نے سومنات کے مندر میں دیکھا تھا۔“

ٹھاکر نے کہا۔ ”اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔ دنیا میں کئی انسانوں کی صورتیں آپس میں ملتی ہیں۔“

نرملا نے کہا۔ ”لیکن میں تو اس لڑکی کو دیکھ کر ڈر سی گئی تھی۔ آپ نے پجاریوں کی زبانی اس لڑکی کے بارے میں سُنا ہو گا جو سومنات کی دیوی کا تاج پہنتے ہی دیوتاؤں کے پاس پہنچ گئی تھی۔ میں نے ساوتری کو دیکھا تو

یوں معلوم ہوا کہ مندر کی دیوی ایک نئے روپ میں یہاں آگئی ہے۔ لیکن جب اس سے بات چیت ہوئی تو میرا ڈر جاتا رہا اور میں نے محسوس کیا کہ روپ وتی جو مندر کی دیوی بنی تھی اس لڑکی سے بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ پھر بھی میں اس قدر بدحواس تھی کہ اس لڑکی کو اپنی طرف سے کوئی تحفہ نہ دے سکی۔ وہ میرے لیے بہت قیمتی تحفہ لائی ہے۔ یہ دیکھیے۔" نرملا نے چاندی کی ڈبیہ اُٹھائی اور کھول کر ٹھاکر کے سامنے کر دی۔

ٹھاکر نے ڈبیہ سے کنگن نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "واقعی یہ بہت اچھے ہیں۔ افسوس ہے کہ ساوتری ہمارے گھر سے خالی ہاتھ گئی ہے۔"

نرملا نے کہا۔ "میرا ارادہ ہے کہ میں خود اس کے پاس جاؤں اور اپنی طرف سے اسے ایک ہار پیش کروں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہو گا۔ ہمارے مہاراج رام ناتھ پر بہت مہربان ہیں اور ہمیں اس کی بیوی کی عزّت کرنی چاہیے۔ اس کا گھر تمہارے پِتا جی کے مکان کے قریب ہے۔۔۔ تم جب چاہو پالکی میں بیٹھ کر وہاں چلی جاؤ۔"

”تو میں کل ضرور جاؤں گی۔ میرا ارادہ ہے کہ وہاں سے پِتا جی کو بھی دیکھتی آؤں۔“ ”بہت اچھا۔“ ٹھاکر یہ کہتے ہوئے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دن کے تیسرے پہر نرملا کی آنکھ کھلی تو ایک خادمہ نے کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے ٹھاکر جی آپ کو دیکھنے آئے تھے لیکن آپ گہری نیند سو رہی تھیں اور انہوں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ ٹھاکر کی کو اطلاع ملی ہے کہ سومنات کے پروہت جی راجہ سے ملنے انہل واڑہ جا رہے ہیں۔ کل رات وہ یہاں ٹھہریں گے آج وہ یہاں سے پندرہ بیس کوس دور کسی سردار کے پاس ٹھہر گئے ہیں۔ ٹھاکر جی ان کے سواگت کے لیے گئے ہیں۔ وہ رات پروہت جی کے پاس رہیں گے اور کل دوپہر تک انہیں ساتھ لے کر واپس آ جائیں گے۔“

۳

اگلی صبح روپ وتی جب اپنے مکان کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ خادمہ بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"ٹھاکر جی کی بیوی آئی ہیں۔"

ایک ثانیہ کے لیے روپ وتی کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور لرزتی کانپتی اور ڈگمگاتی ہوئی اس کے استقبال کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔ اتنی دیر میں نرملا برآمدے میں آچکی تھی۔

نرملا نے کہا۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "آیئے تشریف رکھیے۔"

"میں آپ کو پریشان نہیں کروں گی۔" نرملا نے اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

روپ وتی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میں آپ کو دیکھ کر پریشان ہو گئی ہوں۔ تشریف رکھیے۔"

نرملا نے روپ وتی کی خادمہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "تم جاؤ اور یہ دروازہ بند کر دو۔ میں ان نے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

خادمہ نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا تو روپ وتی نے اور زیادہ سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تنہائی کے لیے پچھلا کمرہ زیادہ موزوں ہو گا۔“

”چلیے!“

روپ وتی اور نرملا عقب کے کمرے میں چلی گئیں۔ یہ نسبتاً تاریک تھا۔ نرملا اور روپ وتی آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ نرملا خاموشی سے روپ وتی کی طرف دیکھ رہی تھی اور روپ وتی کا دل دھڑک رہا تھا۔ بالآخر نرملا نے اپنے گلے سے ایک ہار اتارتے ہوئے کہا۔ ”میں کل آپ کو یہ تحفہ دینا بھول گئی تھی، لیجیے!“

”نہیں! یہ آپ کے گلے میں زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔“

”میرے پاس اور بہت سے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میری شادی ہی زیورات سے ہوئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نرملا نے روپ روتی کے گلے میں ہار ڈال دیا۔

چند لمحات دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں پھر

نرملا نے کہا۔ ”آپ کو شاید معلوم نہ ہو میں کافی مدّت سومنات کے مندر میں رہ چکی ہوں۔ آج مجھے پتہ چلا کہ آپ کے پتی اسی محل میں ٹھہرے تھے جہاں میں رہتی تھی۔“

روپ وتی محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو رہی ہے۔ نرملا نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کے پتی کو دیکھا ہے۔ وہاں ان کا ایک دوست بھی تھا۔ اس کا نام رنبیر تھا۔“

روپ وتی نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں، میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں کبھی سومنات نہیں گئی۔ میں کالنجر سے اُن کی تلاش میں آئی تھی۔ ہمارا قافلہ ابھی سومنات سے کئی کوس دور ہی تھی کہ وہ مل گئے۔ میں بیمار تھی، اس لیے وہ مجھے یہاں لے آئے۔“

نرملا نے کہا۔ ”میں نے تو یہ نہیں کہا کہ آپ وہاں گئی تھیں، لیکن میرا خیال تھا کہ شاید آپ کے پتی نے کبھی آپ سے رنبیر کا ذکر کیا ہو۔ میں اس کے متعلق بہت کچھ جاننا چاہتی ہوں۔“

روپ وتی نے ڈوبتے ہوئے دل کو سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تک انہوں نے میرے سامنے اس نام کے کسی دوست کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب وہ آئیں گے تو میں ان سے ضرور پوچھوں گی۔“

”نہیں نہیں، آپ انہیں یہ نہ بتائیں کہ میں نے رنبیر کے بارے میں پوچھا ہے، بھگوان کے لیے ایسا نہ کیجیے۔“

”اچھا نہیں پوچھوں گی۔“

”آپ کے پتی کب واپس آئیں گے؟“

”وہ سات دن کا وعدہ کر کے گئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ جلد آ جائیں گے۔“

نرملا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اب میں جاتی ہوں۔“

روپ وتی ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک بہت بڑی مصیبت ٹل گئی ہے۔ نرملا دو قدم اُٹھانے کے بعد اچانک رُک

گئی اور روپ وتی کی طرف دیکھنے لگی۔ روپ وتی ایک بار پھر اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگی۔

نرملا بولی۔ ”آج باقی دن میرا گھر رہنا ضروری ہے، ورنہ میں شام تک آپ سے باتیں کرتی۔ آپ کیوں نہیں آتیں میرے ساتھ۔ چلے آپ یہاں اکیلی کیا کریں گی۔ ہم دونوں پالکی میں بیٹھ جائیں گی، آج ہمارے گھر سومنات کے بڑے پروہت جی آرہے ہیں۔ میں انہیں کہوں گی کہ آپ کی صحت کے لیے پراتنا کریں۔ چلیے!“

روپ وتی کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے ”نہیں نہیں“ کی آواز نکلی اور وہ ایک بے جان شے کی طرح فرش پر گر پڑی۔

نرملا ایک ثانیہ کے لیے مبہوت سی ہو کر رہ گئی اور پھر بھاگتی ہوئی برآمدے میں گئی اور خادمہ کو آوازیں دینے لگی۔

تھوڑی دیر بعد جب روپ وتی کو ہوش آیا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور نرملا اس کے سرہانے بیٹھی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔ بوڑھی

خادمہ کے علاوہ چار عورتیں جن میں دو نرملا کے ساتھ آئی تھیں اور باقی حویلی کے نوکروں کی بیویاں تھیں، اس کے گرد کھڑی تھیں۔

روپ وتی نے نرملا کے چہرے پر اپنی نظری گاڑ دیں۔ نرملا کو ان خاموش نگاہوں میں اس بے گناہ مجرم کی فریاد سنائی دی جس کے سر پر جلّاد کی تلوار چمک رہی ہو۔ اس نے باقی عورتوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”انہیں کمزوری کے باعث چکّر آ گیا تھا، اب تم میں سے کسی کو یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔“

روپ وتی نے ہاتھ کے اشارے سے نرملا کی تائید کی اور تمام عورتیں باہر نکل گئیں۔ پھر اس نے اچانک اُٹھ کر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”اب آپ کیا کرنا چاہتی ہیں۔“

نرملا کے رہے سہے شکوک دور ہو چکے تھے۔ اس نے کہا۔ ”روپ وتی! تمہیں مجھ سے اس قدر خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

روپ وتی کی نگاہیں ایک بار پھر نرملا کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ چند

لمحات کے بعد اس نے بے اختیار آگے جھک کر نرملا کے پاؤں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”نرملا! میں اپنے لیے نہیں رام ناتھ کے لیے رحم کی بھیک مانگتی ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی پاپ ہوا ہے تو اس کی سزا رام ناتھ کو نہیں ملنی چاہیے۔ بھگوان کے لیے مجھے پروہت کے حوالے کرنے کی بجائے اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو اور مجھ سے کوئی پاپ بھی تو نہیں ہوا۔ تم یہ نہیں کہو گی کہ ایک عورت کے لیے اپنی عزّت بچانا پاپ ہے۔“

روپ وتی سسکیاں لے رہی تھی۔ نرملا نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”میری بہن! میں تمہارے لیے اپنی جان تک قربان کر دوں گی لیکن مجھے بتاؤ تو سہی، یہ کیا راز ہے؟“

روپ وتی نے کہا۔ ”یہ نہ پوچھو نرملا! بھگوان کے لیے یہ نہ پوچھو۔ تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آئے گا۔ سچائی کا چہرہ تمہارے لیے اس قدر بھیانک ہو گا کہ تم میری بوٹیاں نوچنے کے لیے تیار ہو جاؤ گی۔ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا ہے اُسے تمہارے کان برداشت نہیں کر سکیں گے۔ تم مجھے پگلی کہو گی۔ تم میری دشمن بن جاؤ گی۔“

”تمہیں بھگوان کی سوگند، مجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ اگر تمام دنیا تمہیں جھوٹی کہے تو بھی مجھے تمہاری بات پر اعتبار ہو گا۔“

روپ وتی نے نرملا کر چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے اپنی سرگزشت شروع کر دی۔ روپ وتی کی سرگزشت کے اختتام پر اُسے بار بار تسلیاں دینے کے بعد جو نرملا اس کے گھر سے نکلی تو اس کے خیالات کی دنیا میں تلاطم آ چکا تھا۔ سومنات کے متعلق محبّت اور عبودیت کے جذبات جو اس کی مغموم زندگی کا آخری سہارا تھے، نفرت اور حقارت میں تبدیل ہو چکے تھے۔ بوڑھے ٹھاکر کے ساتھ شادی کرنے کے بعد زندگی کی آرزوؤں اور مسرتوں سے کنارہ کش ہو چکی تھی۔ اپنے باپ کی خواہشات پر قربان ہوتے ہوئے اسے اگر کوئی اطمینان تھا تو یہ کہ میری اس قربانی سے دیوتا خوش ہوں گے۔ میری زندگی کے اداس لمحات اُن کی یاد سے معمور ہوں گے۔ میں ان پنڈتوں اور پروہتوں کی سیوا کروں گی۔۔۔ جو دن رات دیوتاؤں کی یاد میں مگن رہتے ہیں۔ میں ٹھاکر کی دولت سے غریبوں اور

ناداروں کی مدد کروں گی۔ دیوتا مجھ پر خوش ہوں گے اور موت کے بعد میرا جنم اس جنم سے بہتر ہو گا۔ لیکن روپ وتی کی سرگزشت سننے کے بعد اس کے حسین تصوّرات کی دنیا بھی ویران ہو چکی تھی۔ اس کا حال اور مستقبل ایک لق و دق میدان تھا اور ماضی کی طرف لوٹنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو اپنی ساری پونجی کھو بیٹھنے کے بعد راستہ بھی بھول چکا ہو۔

محل کے باہر ہزاروں آدمی سومنات کے پروہت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ نرملا کی پالکی دیکھ کر وہ راستے سے اِدھر اُدھر ہٹ گئے اور پالکی محل میں پہنچ گئی۔ نرملا پالکی سے باہر نکلی تو بہت سی عورتوں نے اسے اپنے جھرمٹ میں لے لیا اور یہ پوچھنے کے لیے بے قرار تھیں کہ پروہت جی کب پہنچیں گے۔ لیکن نرملا انہیں کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی بالائی منزل کے ایک کمرے میں چلی گئی۔ تنہائی اور بے بسی کے شدید احساس کے باعث اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمڈ آیا۔

وہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ ”رنبیر! تم اپنی بہن کی خاطر دنیا کی تمام خوشیاں قربان کر سکتے ہو۔ تم ایک دوست کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈال سکتے تھے۔ تم نے میرے پِتا کو اپنے باپ کا قاتل سمجھتے ہوئے اس وقت معاف کر دیا جب تمہارا خنجر اس کی گردن پر تھا۔ تم کامنی اور روپ وتی کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل سکتے تھے۔ لیکن تمہاری نگاہیں میرے دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکیں۔ تمہیں میری التجائیں اور میرے آنسو متاثر نہ کر سکے۔ تمہیں یہ کبھی معلوم نہ ہو گا کہ اب صرف تمہاری یاد میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔ کاش تم میرے آنسو دیکھ سکتے۔ میری آہیں سن سکتے۔ کاش! تمہیں معلوم ہوتا کہ میں روپ وتی سے کہیں زیادہ بے بس اور مجبور ہوں ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کھانے کے لیے پوچھا۔ لیکن نرملا نے کہا۔ ”آج مجھے بھوک نہیں۔“ تھوڑی دیر بعد ایک اور خادمہ آئی اور اس نے کہا کہ شہر کے چند معزز گھرانوں کی عورتیں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہیں لیکن نرملا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آج میرے سر میں درد ہے۔

خادمہ نے کہا۔ ”اگر آپ حکم دیں تو وید کو بلا بھیجوں۔“

نرملا نے برہم ہو کر کہا۔ ”نہیں۔ مجھے وید کی ضرورت نہیں، تم جاؤ اور سب نوکرانیوں سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے کمرے میں نہ آئے۔“

۴

غروبِ آفتاب کے قریب محل سے باہر سومنات کی جے اور پروہت کی جے کے نعرے سنائی دیے۔ نرملا اپنی کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ محل کی چار دیواری سے باہر ایک کشادہ میدان میں انسانوں کے ہجوم سے کچھ دور اُسے پچاس سواروں کا ایک دستہ دکھائی دیا۔ ان سواروں کے پیچھے پندرہ بیس ہاتھیوں کی ایک قطار تھی۔ سب سے اگلے ہاتھی کا سنہری ہودج سورج کی آخری شعاعوں سے چمک رہا تھا۔

محل کے دروازے سے تھوڑے فاصلے پر سواروں کا دستہ ایک طرف ہٹ گیا اور لوگ دیوانہ وار نعرے لگاتے ہوئے سب سے اگلے ہاتھی کی طرف

بڑھنے لگے۔ اس ہاتھی کا ماتھا موتیوں اور ہیروں میں چھپا ہوا تھا۔ گلے میں سونے کی بھاری زنجیر تھی جس کے ساتھ گھنٹی لگی ہوئی تھی اور سنہری ہودج کے کناروں کے نیچے موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ ہودج میں سومنات کا پروہت براجمان تھا۔ باقی ہاتھیوں پر سومنات کے پجاری تھے اور ان سے پیچھے سواروں کا ایک اور دستہ دکھائی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پروہت ٹھاکر رگھوناتھ کے ساتھ محل میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے چند پجاری اور شہر کے معززین تھے۔ صحن میں جمع ہونے والی عورتیں آگے بڑھ بڑھ کر اس کے پاؤں چھونے لگیں۔

"دھوکا، جھوٹ، فریب۔" نرملا کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے اور وہ دوبارہ اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

عورتوں کا جوش و خروش ختم ہوا تو ٹھاکر نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو خاموش کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "پروہت جی مہاراج بہت تھکے ہوئے ہیں۔ انہیں صبح سویرے یہاں سے کوچ کرنا ہے، اس لیے اب انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ مہاراجہ سے ملاقات کے بعد واپسی

پر آپ یہاں دو تین دن ٹھہریں گے اور آپ سب کو ان کی سیوا کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس لیے اب آپ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔"

نرملا دیر تک کرسی پر بیٹھی رہی۔ کمرے میں تاریکی چھا رہی تھی۔ ایک خادمہ اس کے کمرے میں آئی اور اس نے چراغ روشن کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے دن کے وقت کچھ نہیں کھایا، اگر اجازت ہو تو آپ کا کھانا لے آؤں؟"

نرملا نے جواب دیا۔ "ہاں لے آؤ۔ ٹھہرو! ٹھاکر جی نے میرے متعلّق تو کسی سے نہیں پوچھا؟"

"جی نہیں! وہ ابھی تک اوپر نہیں آئے۔ وہ مہمانوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔"

"سارے مہمان یہیں ٹھہریں گے؟"

"جی نہیں۔ صرف پروہت جی اور چند پجاری یہاں ٹھہریں گے۔ باقی سب مہمان خانے چلے گئے ہیں۔"

”اچھا اب تم کھانا لے آؤ۔“

تھوڑی دیر بعد نوکرانی کھانا لے آئی۔ نرملا چند نوالے کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھی رہی۔ پھر یکا یک اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے اٹھی اور برابر کے کمرے میں جا کر ایک پلنگ پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹھاکر کمرے میں داخل ہوا اور شکایت کے لہجے میں بولا۔ ”نرملا! تمہیں پروہت جی کے سواگت کے لیے نیچے ضرور آنا چاہیے تھا۔“

”میرے سر میں درد تھا۔“ نرملا نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر اتنے آدمیوں کے سامنے جاتے ہوئے مجھے کچھ جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔“

شہر کے آدمیوں کو میں نے اسی وقت بھیج دیا تھا۔ اب پروہت جی کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں تنہا ہوں گے۔ صرف میں نے تمہارے پِتا جی کو روک لیا ہے۔ پروہت جی کے پاؤں چھونا تمہارا فرض ہے۔ انہوں نے خود تمہارے متعلّق پوچھا تھا۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

ٹھاکر نرملا کے جواب کا انتظار کیے بغیر نکل گیا۔ پروہت کو کھانا کھلانے کے بعد ٹھاکر پھر آیا اور نرملا کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چل پڑی۔ نچلی منزل کے روشن کمروں میں چند موٹے تازے پجاری جن کے سر منڈے ہوئے تھے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور ٹھاکر کے نوکر ان کی سیوا کے لیے دروازوں کے سامنے کھڑے تھے۔ پروہت کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے نرملا کے دل میں نفرت اور حقارت کا طوفان اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ پروہت ایک زر نگار چوکی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ جے کرشن اس کے سامنے ایک کرسی پر ادب سے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نرملا چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑی رہی پھر اس نے ٹھاکر کی پریشانی میں مزید اضافہ کرنے کے لیے پروہت کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اپنے باپ کے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ جے کرشن اس کا بازو پکڑ کر جلدی سے اٹھا اور اسے پروہت کی طرف دھکیلتے ہوئے لونا۔ ”پروہت جی مہاراج کے پاؤں چھوؤ۔ راجے اور مہاراجے سب ان کے دروازے کے بھکاری ہیں۔“

نرملا نے مجبوری اور بے بسی کی حالت میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ پروہت کے پاؤں پر رکھ دیے اور پروہت نے بے پروائی سے ایک ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”سکھی رہو بیٹی!“

نرملا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹھاکر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”آج ان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔“

پروہت نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھئے ٹھاکر جی! تم بھی بیٹھ جاؤ بیٹی!“

نرملا پیچھے ہٹ کر اپنے باپ کے قریب بیٹھ گئی اور ٹھاکر اس کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر نے کہا۔ ”مہاراج! نرملا ہر روز آپ کو یاد کیا کرتی تھی۔“

پروہت نے نرملا کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آج تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیں دیکھ کر ڈر گئی ہے۔“

ٹھاکر نے جواب دیا۔ ”مہاراج! کبھی کبھی دیوتاؤں کا پریم پجاریوں کے

دل میں خوف بھی پیدا کر دیتا ہے اور نرملا تو بات بات پر خوفزدہ ہو جایا کرتی ہے۔ پرسوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ ہمارے جاگیر دار بیوی عرصے سے بیمار تھی۔ پرسوں وہ نرملا کے لیے شادی کا تحفہ لے کر آئی۔ جب میں نے نہیں دیکھا تو ان کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ میں نے۔۔۔۔"

نرملا نے انتہائی خوف اور اضطراب کی حالت میں ٹھاکر کی طرف دیکھا اور گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے کہا۔ "اس وقت مہاراج کو آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ انہیں۔۔۔"

پروہت نے اطمینان سے کہا۔ "نہیں ٹھاکر جی کو اپنی بات ختم کرنے دو۔"

نرملا کا دل بیٹھ گیا۔ ٹھاکر نے کہا۔ "میں نے ان سے پوچھا آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟ کہنے لگیں جو لڑکی مجھ سے ابھی مل کر گئی ہے اس کی شکل سومنات کے مندر کی اس دیوی سے ملتی ہے جو پہلی رات ہی دیوتا کے چرنوں میں پہنچ جانے کے باعث ملک بھر میں شہرت حاصل کر چکی ہے۔"

پروہت پر سکتہ طاری ہو چکا تھا لیکن نرملا کے سوا اس کے دل کی صحیح کیفیت کا کسی کو علم نہ تھا۔ ٹھاکر نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! دینا میں انسانوں کی شکلیں آپس میں ملتی ہیں اور دیکھنے والا اکثر دھوکا کھا جاتا ہے لیکن نرملا کو تو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ مندر کی دیوی ہے اور ایک نئے روپ میں اُسے دیکھنے آئی ہے۔ پھر میں نے سمجھایا کہ اس لڑکی کا نام روپ وتی نہیں، ساوتری ہے اور وہ سومنات سے نہیں بلکہ کالنجر سے آئی ہے تو بڑی مشکل سے ان کی غلط فہمی دور ہوئی۔“

جے کرشن نے اچانک پروہت کی طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کیا ہوا مہاراج۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

پروہت کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے نحیف آواز میں کہا۔ ”میں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیا کہہ رہے تھے۔ یہی کہ کسی لڑکی کی شکل روپ وتی سے ملتی ہے؟“

”نہیں مہاراج! نرملا کو شک ہوا تھا اور یہ ڈر گئی تھی۔“

"ٹھیک ہے۔ نرملا نے روپ وتی کو سومنات میں دیکھا ہوگا لیکن اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔ کئی صورتیں آپس میں ملتی ہیں۔" "ہاں مہاراج! جب میں نے اسے سمجھایا تو خود ہی مان گئی کہ یہ لڑکی روپ وتی سے مختلف ہے۔"

"اور وہ لڑکی یہیں رہتی ہے۔"

"ہاں مہاراج!"

"اپنے پتی کے ساتھ!"

"ہاں مہاراج! لیکن آج کل اس کا شوہر مشرقی سرحد پر اپنی جاگیر دیکھنے گیا ہوا ہے۔ لڑکی چونکہ بیماری کے باعث سفر کرنے کے قابل نہ تھی، اس لیے وہ اسے یہیں چھوڑ گیا ہے۔"

"کب بیاہ ہوا تھا ان کا؟"

"اس بات کا مجھے صحیح علم نہیں لیکن اس لڑکی کا پتی یہ کہتا تھا کہ سومنات کی یاترا پر جانے سے پہلے شادی کر کے آیا تھا۔"

"تو وہ اس شہر کا رہنے والا نہیں؟"

"نہیں مہاراج! وہ قنوج کا باشندہ ہے۔ جب وہ سومنات کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں اُسے ہمارے مہاراجہ شکار کھیلتے ہوئے مل گئے تھے۔ اس نے مہاراج کی جان بچائی تھی۔ مہاراج اس کی بہت عزّت کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ایسے آدمی کی عزّت کرنی چاہیے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"رام ناتھ!"

"نرملا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی خطرے کو سر پر دیکھ کر اس کی مدافعانہ قوّتیں بیدار ہو چکی تھیں۔ اس نے کہا۔ "مہاراج! ٹھاکر جی مجھ پر ہنستے ہیں لیکن اگر آپ اس لڑکی کو دیکھیں تو معمولی فرق کے سوا وہ آپ کو روپ وتی نظر دکھائی دے گی۔ وہ معمولی فرق بھی دور سے نہیں نزدیک سے دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ ٹھہرتے تو میں صبح ہوتے ہی اُسے بلا لیتی۔"

پروہت نے ایک کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمیں دیکھنے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ تم جانتے ہیں کہ دنیا میں صرف ایک ہی روپ وتی تھی۔ اب تم جا کر آرام کرو۔ جے کرشن تم بھی جاؤ۔ ٹھاکر جی آپ ذرا ٹھہریں۔"

۵

نرملا کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ پروہت ٹھاکر سے کیا باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ٹھاکر کو وہاں سے نکالنے کے لیے اسے ایک ہی تدبیر نظر آئی۔ اس نے کرسی سے اُٹھ کر دو تین قدم اٹھائے اور پھر اچانک اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے فرش پر بیٹھ گئی۔ ٹھاکر گھبرا کر اٹھا اور جے کرشن نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا بیٹی؟"

"مجھے چکّر آ گیا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" نرملا نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ٹھاکر بھی گھبرایا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے نرملا کا دوسرا بازو پکڑتے ہوئے پروہت کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں انہیں اوپر پہنچا کر ابھی آتا ہوں۔"

پروہت نے جواب دیا۔ ”ہاں! ہاں! جائیے اور دیکھیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم ان کے لیے مہادیو سے پراتنا کریں گے۔“

نرملا ایک طرف ٹھاکر اور دوسری طرف جے کرشن کا سہارا لیے کمرے سے باہر نکلی۔ اپنی چال سے وہ انہیں اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس پر بے ہوشی طاری ہو رہی ہے لیکن سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر وہ سنبھلنے کی کوشش کرنے لگی۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد جے کرشن نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ ”ٹھاکر جی! میں اسے اوپر لے جاتا ہوں، آپ کسی وید کو بُلائیں۔“ ”میں ابھی بلاتا ہوں۔“ ٹھاکر یہ کہہ کر نیچے اُتر گیا۔

نرملا اچانک اپنے باپ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ”پِتا جی، جلدی اوپر چلیے۔ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔“

جے کرشن انتہائی بدحواسی کی حالت میں بڑی مشکل سے اس کی رفتار کا ساتھ دے رہا تھا۔ نرملا اسے ایک کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”پِتا جی مجھے ابھی اپنے ساتھ گھر لے چلیں۔ میری زندگی اور

موت کا سوال ہے۔ بھگوان کے لیے ٹھاکر جی کو اوپر بلا لائیں۔ آپ ان سے کہیں کہ وید کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ مجھ کئی بار اس قسم کا درد ہوا ہے اور اس کی دوا ہمارے گھر میں موجود ہے۔ لیکن نوکر شاید اسے تلاش نہ کر سکیں۔ آپ کو خواہ کوئی بہانہ کرنا پڑے لیکن مجھے اپنے ساتھ ضرور لے جائیں ورنہ کل آپ میری لاش دیکھیں گے۔"

"لیکن بیٹی! مجھے بتاؤ تو سہی۔۔۔"

نرملا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "بھگوان کے لیے اس وقت آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ مجھے یقین ہے کہ باہر نکل کر میں آپ کی تسلّی کر سکوں گی۔ بھگوان کے لیے جایئے!"

جے کرشن کی پریشانی اب اضطراب میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف چلنے لگا۔ برآمدے میں جگہ جگہ چراغ روشن تھے۔ جے کرشن سیڑھیوں سے ابھی چند قدم دور ہی تھا کہ اسے ٹھاکر دکھائی دیا۔

”آپ کہاں جارہے ہیں؟“ ٹھاکر نے سوال کیا۔

”میں آپ کو بُلانے جارہا تھا۔ نرملا کی حالت اب بہتر ہورہی ہے۔“

ٹھاکر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے وید کو لانے کے لیے آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ ابھی آجائے گا۔“ جے کرشن نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ آدمی کو واپس بلالیں۔ نرملا کو پہلے بھی کئی بار یہ تکلیف ہو چکی ہے۔ میں نے ایک سنیاسی سے اس کے لیے دوالی تھی۔ اس دوا سے اسے فوراً نیند آجایا کرتی ہے۔ مجھے نرملا نے بتایا ہے کہ اس دوا کی چند گولیاں گھر میں کہیں سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔“

ٹھاکر نے کہا۔ ”تو آپ فوراً گھر جاکر دوا لے آئیں۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ مجھے آنے جانے اور پھر دور تلاش کرنے میں بہت دیر لگ جائے گی۔ نرملا کہتی ہے کہ اس نے دوا کسی صندوق میں رکھی ہوئی ہے۔ اب معلوم نہیں وہ کون سا صندوق ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ نرملا کو وہاں لے جاؤں۔ اس وقت اس کی

حالت کچھ ٹھیک ہے لیکن ایک دو گھڑیاں گزرنے کے بعد اسے پھر دورہ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسے فوراً گھر پہنچا دیا جائے۔ اگر دوا مل گئی تو کھاتے ہی اسے نیند آ جائے گی۔ ورنہ وید کی کا گھر ہمارے گھر سے نزدیک ہے میں اسے وہاں بلا لوں گا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ پروہت جی آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس لیے مجھے اجازت دیں۔"

"آپ کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ نرملا کو تیار کریں۔ میں ابھی پالکی کا انتظام کر دیتا ہوں۔ پروہت جی سے تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد میں خود آپ کے ہاں آ کر اس کا پتہ کروں گا۔"

جے کرشن نے کہا۔ "نہیں آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ اگر ضرورت ہوتی تو میں آپ کو پیغام بھیج دوں گا ورنہ آپ آرام کریں۔"

"اگر اسے آرام آ جائے تو بھی آپ مجھے پتہ دیں۔ اب میں نیچے جا کر پالکی تیار کراتا ہوں۔ آپ نرملا کو نیچے لے آئیں۔"

تھوڑی دیر بعد نرملا پالکی میں سوار ہو کر اپنے گھر کا رُخ کر رہی تھی اور جے کرشن اس کے ساتھ پیدل چل رہا تھا۔

٦

اپنے مکان کی ڈیوڑھی کے قریب جے کرشن نے کہاروں کو روکا اور دروازہ کھلوانے کے لیے آگے بڑھا لیکن نرملا نے کہا۔ ”پِتا جی! ٹھہریے، پالکی کو اندر لے جانے کی ضرورت نہیں میں یہیں اُتروں گی۔“

جے کرشن نے مُڑتے ہوئے کہا۔ ”اچھا بھئی! یہیں اُتار دو اور تم جاؤ۔“

جب کہار نرملا کو اتار کر خالی پالکی اُٹھانے لگے تو جے کرشن نے اپنی جیب سے چند سکے نکال کر ایک کہار کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”انہیں آپس میں بانٹ لینا۔“

کہار تاریکی میں غائب ہو گئے اور نرملا اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ڈیوڑھی سے ذرا دور لے گئی اور کہنے لگی۔ ”پِتا جی! ہمیں اپنے مکان میں داخل ہونے سے پہلے بہت کچھ سوچنا ہے۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”اب صاف بات کرو تم کیا چاہتی ہو؟“

نرملا نے کہا۔ ”پِتا جی! میں آپ کے لیے اپنا بلیدان دے چکی ہوں۔ میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ میں اس کے بدلے میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ لیکن آج میں آپ کے سامنے اپنی جھولی پھیلانے کے لیے مجبور ہوں۔ اپنے لیے نہیں، کسی کے لیے۔ میری ذرا سی غلطی سے دو انسان موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔ آپ انہیں بچا سکتے ہیں، لیکن اگر آپ نے کچھ نہ کیا تو مجھے آپ ان کی چِتا میں کودنے سے نہیں روک سکیں گے۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”تم رام ناتھ اور اس کی بیوی کے متعلّق کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

”ہاں! ساوتری وہی ہے جسے سومنات کے مندر میں روپ وتی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ روپ وتی زندہ ہے؟“

”ہاں! اور اب جب کہ پروہت کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اس شہر میں ہے، وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس وقت وہ ٹھاکر سے اس کے متعلق مشورہ کر رہا ہو گا۔ اب باتوں کا وقت نہیں، ہمیں اس لڑکی کو اس کے گھر سے نکالنا ہے۔ اور ہمیں رام ناتھ کو یہ پیغام دینا ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں روپ وتی کی سرگزشت سن چکی ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر پروہت میرے ساتھ وہی سلوک کرتا جو اس نے روپ وتی کے ساتھ کیا ہے تو آپ سومنات کے مندر کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لیے تیار ہو جاتے۔ روپ وتی دیوتا کے چرنوں میں نہیں بلکہ پروہت سے اپنی عزّت بچا کر یہاں آئی ہے، اور اُسے اس دیوتا نے بچایا ہے جس نے اپنے باپ کے قاتل کی گردن پر تلوار رکھنے کے بعد اسے معاف کر دیا تھا۔ جس نے مجھ سے اپنی بہن کا انتقام لینے کی بجائے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا تھا۔ پِتا جی! آپ کو زندگی میں نیکی کا ایک موقع ملا ہے، اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ میں اسے یہاں لے کرتی ہوں، آپ گھوڑے تیار کرائیں۔ ایک نوکر کو اس کے ہمراہ بھیج دیں اور دوسرے کو رام ناتھ کی طرف روانہ کر دیجیے۔ میں روپ وتی کو بلا لاتی ہوں۔“

"نہیں نہیں!" جے کرشن نے نرملا کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جا سکتیں۔ اس کے نوکر تمہیں پہچان لیں گے اور اگر تم روپ وتی کو نکال بھی لائیں تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں پروہت کے انتقام سے نہیں بچا سکے گی۔"

"پِتا جی! بھگوان کے لیے مجھے نہ روکیے۔ اگر میں روپ وتی کو نہ بچا سکی تو میں ساری دنیا کو بتاؤں گی کہ اسے کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔ میں ٹھاکر اور راجہ کے سامنے پروہت کا جرم ثابت کر دوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ میری بوٹیاں نوچنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، لیکن میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

جے کرشن نے کہا۔ "تم روپ وتی کو کہاں بھیجنا چاہتی ہو؟"

"اس کے لیے قنوج میں رنبیر کے گھر کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ اسے صرف سرحد عبور کرنے کا خطرہ ہو گا!"

جے کرشن نے کہا۔ "میں پیارے لال کو اس کے ساتھ بھیج سکتا ہوں،

لیکن اس وقت اسے گھر سے نکالنا آسان نہیں۔ میں اس کے نوکروں کو دھوکا دینے کے لیے ایک عام سپاہی کا بھیس بدل کر اس کے گھر جانے کے لیے تیار ہوں۔ میں نوکروں سے کہوں گا کہ مجھے رام ناتھ نے ایک ضروری پیغام دے کر بھیجا ہے۔ لیکن اسے یہ کیونکر یقین آئے گا کہ میں اس کی جان بچانے کے لیے آیا ہوں؟"

نرملا نے اپنے ہاتھ سے کنگن اتار کر جے کرشن کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کنگن دکھانے کے بعد آپ جو بات اسے کہیں گے وہ مان جائے گی۔ یہ اسی نے مجھے دیے تھے۔ میں مکان سے باہر کھڑی رہوں گی۔"

جے کرشن نے کنگن لیتے ہوئے کہا۔ "اب تم میرے ساتھ آؤ۔ پہلے ہمارا گھر جانا ضروری ہے۔ بھگوان کرے اب ہمیں تھوڑا سا وقت مل جائے۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف بڑھے۔ جے کرشن نے پہریدار کو آواز دی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ ڈیوڑھی کے اندر مشعل جل رہی تھی۔ جے کرشن نے اندر داخل ہوتے ہی پہرے دار سے پوچھا۔ "پیارے لال کہاں ہے؟"

”جی مہاراج! وہ تو شاید سو گیا ہے۔“

”ابھی سے سو گیا ہے۔ جاؤ اسے جگا کر یہاں بھیجو، اور اس کی جگہ آج تم آرام کرو۔ وہ یہاں پہرا دے گا اور گوبند رام کو بھی یہاں بھیج دو۔“

”بہُت اچھا مہاراج!“ نوکر یہ کہہ کر چلا گیا۔

جے کرشن نرملا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم جلدی سے اندر جا کر اپنے لیے کوئی پرانی اوڑھنی لے آؤ۔“

نرملا بھاگتی ہوئی مکان کے اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سر پر ایک پھٹی پرانی اوڑھنی لیے واپس آئی تو جے کرشن، پیارے لال کے ساتھ اپنے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اپنے سر پر اس کی میلی کچیلی پگڑ لپیٹ رہا تھا۔ دوسرا نوکر گوبند رام حیرت زدہ ہو کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”چلیے پِتا جی! بہت دیر ہو گئی ہے۔“ نرملا نے بے قرار سی ہو کر کہا۔

جے کرشن نے نوکروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہے ہیں۔ تم تین گھوڑے تیار کرو اور ایک لمبے سفر کے لیے

تیار ہو جاؤ۔ باقی نوکروں کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ کہاں جا رہے ہو۔ اگر اصطبل کی طرف کوئی نوکر ہو تو اسے دوسری طرف بھیج دینا۔" جے کرشن، نرملا کے ہمراہ باہر نکل گیا اور نوکر انتہائی بدحواسی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

پیارے لال جے کشن کے پرانے نوکروں میں واحد آدمی تھا جس نے مصائب کے زمانے میں اس کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے باقی ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ وطن کی یاد اسے ستایا کرتی تھی لیکن رنبیر کا خوف اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ رنبیر کے گاؤں سے کچھ دور اس کے بھائی اور دوسرے رشتہ دار رہتے تھے۔ اور وہ اس اُمّید ہر جے کرشن کا ساتھ دے رہا تھا کہ کسی دن وہ دوبارہ اپنے علاقے پر قبضہ کر لے گا اور اس کے لیے اپنے گاؤں جانے کا راستہ کھُل جائے گا۔

گوبند رام، گوالیار میں نرملا کے ماموں کے ہاں ملازمت تھا اور نرملا اسے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

مددگار

روپ وتی اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور کہا۔ ”آپ ابھی تک نہیں سوئیں؟“

روپ وتی نے جواب دیا۔ ”مجھے نیند نہیں آتی۔“

”دیا بجھادوں؟“

”نہیں نہیں! میں خود بجھالوں گی۔“

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

”نہیں! تم جا کر سو جاؤ!“

خادمہ ساتھ کے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد روپ وتی اس کے خرّاٹے سن رہی تھی۔ وہ دیر تک بستر پر پڑی رہی۔ پھر اچانک اسے باہر صحن میں کسی کی آواز سنائی دی اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ چوکیدار کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے سے کان لگا کر سننے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔

”کون ہے؟“ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ جاگ رہی ہیں دیوی؟“ یہ چوکیدار کی آواز تھی۔

”ہاں، کیا بات ہے؟“

چوکیدار نے کہا۔ ”باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ میں سردار رام ناتھ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“

روپ وتی جلدی سے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکل آئی۔ ”آدمی

ان کا پیغام لے کے آیا ہے اور تم نے اسے باہر روک دیا ہے؟"

"اس وقت کسی کو اندر بلانے کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔"

"وہ اکیلا ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ سردار کا پیغام صرف آپ کے لیے ہے۔"

"اچھا اسے لے آؤ اور دیکھو ہوشیار رہنا۔"

"آپ فکر نہ کریں!"

چوکیدار یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ روپ وتی برآمدے کے ستون کے پاس کھڑی تھی۔ جب وہ قریب پہنچے تو وہ پیچھے ہٹ کر دروازے کے سامنے روشنی میں کھڑی ہو گئی۔

اجنبی نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "مجھے سردار رام ناتھ نے بھیجا ہے۔ میں آپ کے لیے ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔ شہر سے چند کوس دور میرے

گھوڑے نے دم گر کر دم توڑ دیا ورنہ میں شام سے پہلے یہاں پہنچ جاتا۔“

”وہ کب آئیں گے۔“

”وہ جلد آجائیں گے۔“

”اور پیغام کیا بھیجا ہے انہوں نے؟“

اجنبی نے چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کسی کے سامنے بات کرنے کی اجازت نہیں۔“

روپ وتی کے اشارے سے چوکیدار ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا اور اجنبی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنی جیب سے دو کنگن نکالے اور روپ وتی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لیجیے!“

یہ انہوں نے بھیجے ہیں؟“

اجنبی نے کہا۔ ”آپ اندر دیے کے قریب جاکر انہیں غور سے دیکھیں، پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کس نے بھیجے ہیں۔“

روپ وتی نے کنگن لے لیے اور انہیں دیکھتی ہوئی کمرے میں دیے کے قریب پہنچی۔ ایک ثانیہ کے لیے اس کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ اجنبی آگے بڑھ کر دروازے میں جا کھڑا ہوا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں جے کرشن ہوں، نرملا کا باپ۔ نرملا نے مجھے یہ نشانی اس لیے دی تھی کہ شاید تم مجھ پر اعتبار نہ کرو، نرملا اس حویلی کے پیچھے کھڑی ہے۔ وہ اس لیے اندر نہیں آئی کہ تمہارے نوکر اسے پہچان لیں گے۔ اگر تم اپنی اور رام ناتھ کی جان بچانا چاہتی ہو تو میرے کہنے پر عمل کرو۔ ورنہ تمہارے ساتھ میری اور نرملا کی بھی خیر نہیں۔ پروہت کو معلوم ہو چکا ہے کہ تم روپ وتی ہو اور شاید تھوڑی دیر میں اس کے سپاہی اس حویلی کا محاصرہ کر لیں۔ اب سوچنے کا وقت نہیں، میں تمہیں یہاں سے نکالنے کا انتظام کر چکا ہوں۔

''لیکن رام ناتھ!'' روپ وتی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

جے کرشن نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''اگر تم یہاں سے نکل گئیں تو ممکن ہے کہ میں رام ناتھ کی جان بچا سکوں۔ ورنہ تمہاری گرفتاری کے

متعلّق سن کر وہ بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اب جلدی یہاں سے نکلو۔ صرف اپنا زیور لے لو۔ راستے میں کام آئے گا اور دیکھو تمہارے پہرے دار کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم باہر جارہی ہو۔ میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ تمہارے اصطبل میں گھوڑا تو ہوگا؟"

"ہاں! اصطبل میں تو ایک کی بجائے تین گھوڑے موجود ہیں۔"

"تو تم میرے ساتھ چلو اور پہرے دار سے کہو کہ مجھے واپس جانے کے لیے گھوڑے کی ضرورت ہے۔ جب وہ اصطبل کی طرف جائے گا تو تمہیں باہر نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ تم کمرے میں جاچکی ہو۔ حویلی کے پیچھے تمہیں نرملا ملے گی۔ تم اس کے ہمراہ گھر پہنچ جاؤ۔ میں گھوڑا لے کر وہاں آجاؤں گا۔ پہرے دار کسی اور نوکر کو جگانے کی کوشش کرے تو اسے منع کر دینا۔"

روپ وتی نے کنگن جے کرشن کو واپس دے دیے اور ایک صندوق سے اپنے زیورات اور سونے کے سکّوں کی ایک تھیلی نکالنے کے بعد جے کرشن کے ساتھ باہر نکل آئی۔ چوکیدار ڈیوڑھی سے باہر صحن میں کھڑا

تھا۔ روپ وتی نے اسے کہا۔ ”دیکھو انہیں ابھی واپس جانا ہے۔ اس لیے اصطبل سے ایک گھوڑے پر زین ڈال کر ان کے لیے لے آؤ۔ کسی اور کو ان کے آنے جانے کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں بہترین گھوڑا دینا ورنہ سردار خفا ہوں گے اور دیکھو دوسرے نوکروں کو جگانے کی ضرورت نہیں۔“

روپ وتی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی اور پہرے دار نے اصطبل کا رُخ کیا۔ جب پہرے دار آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو روپ وتی بھاگتی ہوئی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔ جے کرشن نے جلدی سے کنڈی کھولی اور بھاری کواڑ کھینچ کر روپ وتی کو باہر نکال دیا۔ اس کے بعد اس نے پھر اسی طرح کواڑ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

۲

تھوڑی دیر بعد حویلی کے نیچے روپ وتی نرملا کے ساتھ جے کرشن کے مکان کا رُخ کر رہی تھی۔ نرملا اس کی تسلّی کے لیے کہہ رہی تھی۔ ”وہ نوکر جسے میں تمہارے ساتھ بھیج رہی ہوں، بہت وفادار ہے۔ اس نے ساری

عمر گوالیار میں میرے ماموں کے ہاں گزاری ہے۔ میں اسے وہاں سے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ پِتا جی رام ناتھ کو خبر دار کرنے کے لیے دوسرا نوکر بھیج دیں گے۔ بھگوان تمہاری مدد کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رام ناتھ تمہیں آ ملے گا۔ تم رات بھر سفر کرنا اور دن کے وقت کسی جنگل میں آرام کر لینا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری صحت ٹھیک نہیں۔ اگر کہیں ٹھہرنے کی ضرورت پڑے تو شہروں کی بجائے کسی چھوٹی بستی میں قیام کرنا۔ سرحد میں داخل ہونے کے بعد تمہیں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

روپ وتی نے تشکّر کے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "نرملا تم دیوی ہو۔ بھگوان کے لیے تم رام ناتھ کو ضرور خبر دار کر دینا۔"

"تم فکر نہ کرو!"

روپ وتی نے کہا۔ "نرملا! مجھے رام ناتھ تمہارے دل کا حال بتا چکا ہے۔ تم رنبیر کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہو؟"

"ہاں! اسے صرف یہ بتا دینا کہ نرملا جس سے تم نفرت کرتے تھے، مر چکی

ہے۔"

مکان کے قریب پہنچ کر انہیں پیچھے سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور وہ مُڑ کر دیکھنے لگیں۔ جے کرشن نے گھوڑا روک کر اُترتے ہوئے کہا۔ "روپ وتی! تم اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ نرملا تم اس کے پاس ٹھہرو، میں ابھی گوبند رام کو لے کر آتا ہوں۔ مجھے پیارے لال پر اعتبار ہے لیکن اسے ان سب باتوں کا علم نہیں ہونا چاہیے۔" جے کرشن بھاگتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ روپ وتی گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد گوبند رام اور جے کرشن آ گئے۔ گوبند رام ایک گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے تھا۔

جے کرشن نے کہا۔ "گوبند رام! تمہاری منزل قنوج کا وہ گاؤں ہے جو کبھی میرا تھا۔ اس دیوی کی عزّت کے دشمن اس کا پیچھا کریں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تم جلد سرحد عبور کر جاؤ۔"

نرملا نے کہا۔ "پِتا جی! میں اس دیوی کو سب سمجھا چکی ہوں۔ اس لیے آپ انہیں اجازت دیں۔" پھر وہ گوبند رام کی طرف متوجہ ہوئی۔ "چچا گوبند!

اس کی عزّت کو میری عزّت اور اس کی جان کو میری جان سمجھنا۔“

اچانک جے کرشن کے دل میں کوئی خیال آیا اور اس نے آگے بڑھ کر روپ وتی سے کہا۔ ”تم اپنے پتی کے لیے کوئی ایسی نشانی دے سکتی ہو جسے دیکھ کر وہ میرے ایلچی کی باتوں پر یقین کرلے؟“

”ہاں! وہ میری انگوٹھی پہچان لیں گے۔ روپ وتی نے یہ کہہ کر اپنی انگوٹھی اتار دی اور جے کرشن کے ہاتھ میں دے دی۔

۳

تھوڑی دیر بعد روپ وتی اور گوبند رام رات کی تاریک میں روپوش ہو گئے۔ جے کرشن نرملا کے ساتھ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو وہاں پیارے لال دو گھوڑوں کی باگیں پکڑے پریشان کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”مہاراج! گوبند کہاں گیا ہے؟“

”میں نے اسے کسی کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔“ جے کرشن نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ”میں نے دو گھوڑوں کی ٹاپ سنی ہے۔ اس کے

ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

"ہاں! اس کے ساتھ ایک اور آدمی گیا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم سردار رام ناتھ کو جانتے ہو؟"

"وہ جنہیں سرحد پر جاگیر ملی ہے؟"

"ہاں!"

"میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"وہ اپنی جاگیر دیکھنے گئے ہیں اور میں تمہیں ان کے پاس بھیج رہا ہوں۔ تم سیدھے مشرق کی طرف جاؤ۔ جب دیو نگر پہنچو گے تو وہاں سے پندرہ کوس آگے دریا کے کنارے جو بستیاں ہیں، وہ رام ناتھ کی جاگیر میں ہیں۔"

پیارے لال نے کہا۔ "جی میں اُسے تلاش کر لوں گا۔ اس علاقے میں نیا جاگیر دار کافی مشہور ہو چکا ہو گا۔"

"یہ لو۔" جے کرشن نے پیارے لال کے ہاتھ میں روپ وتی کی انگوٹھی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ اُسے دینا اور میری طرف سے کہنا کہ جس لڑکی نے تمہیں یہ انگوٹھی بھیجی ہے وہ قنوج روانہ ہو چکی ہے۔ اس لیے تم شہر واپس جانے کی بجائے قنوج میں اپنے دوست کے پاس پہنچ جاؤ۔"

نرملا نے کہا۔ "نہیں پِتا جی! اس کی تسلّی کے لیے یہ کافی نہیں ہو گا۔ میں اسے ایک خط لکھ دیتی ہوں۔"

"اپنی طرف سے؟"

"میں اپنا نام نہیں لکھوں گی لیکن وہ سمجھ جائے گا کہ میں کون ہوں؟"

"لیکن اگر تمہارا خط پکڑا گیا تو؟"

"اگر پکڑا بھی گیا تو اس لڑکی کے دشمن ٹھاکر کے سامنے میرے منہ سے یہ سننا پسند نہیں کریں گے کہ میں نے یہ خط کیوں لکھا ہے۔"

جے کرشن نے بے بس سا ہو کر کہا۔ "نرملا! جو جی میں آئے کرو۔ آج میری عقل کام نہیں کرتی۔ تم نے مجھے ایک ایسی دلدل میں دھکیل دیا

ہے جہاں سے باہر نکلنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"نہیں پِتا جی! آج میں آپ کو آکاش کی بلندیوں پر دیکھ رہی ہوں۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کریں، میں ابھی آتی ہوں اور دیکھئے اب اپنا لباس پہن لیجیے۔"

نرملا مکان کے اندر چلی گئی۔ جے کرشن نے پیارے لال کے ساتھ دوبارہ اپنا لباس تبدیل کیا اور ڈیوڑھی سے باہر نکل کر صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پیارے لال کے قریب آ کر کہا۔ "تم دروازے کی کنڈی لگا دو اور اگر کوئی باہر سے دستک دے تو دروازہ کھولنے سے پہلے گھوڑے اصطبل کی طرف ہانک دینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

۴

نرملا ایک کمرے میں بیٹھی خط لکھ رہی تھی۔ خادمہ نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے تینوں صندوق دیکھ چکی ہوں، مجھے کوئی دوا نہیں ملی۔"

نرملانے کہا۔ ”شاید میں نے پِتاجی کے صندوق میں رکھ دی ہو۔ تم سو جاؤ، میں اُٹھ کر خود تلاش کرتی ہوں۔“

خادمہ چلی گئی اور اس سے تھوڑی دیر بعد کے کرشن کمرے میں داخل ہوا۔ نرملانے کہا۔ ”پِتاجی! میں خط لکھ چکی ہوں۔ دیکھیے!“

جے کرشن نے آگے بڑھ کر خط اُٹھالیا اور چراغ کی روشنی میں کھڑے ہو کر پڑھنے لگا۔ نرملا کے خط کا مضمون یہ تھا: ”بھیّارام ناتھ! جب تم پوچھو گے کہ میں کون ہوں اور کس کی بیٹی ہوں تو تمہاری تسلی ہو جائے گی کہ میں جو کچھ لکھ رہی ہوں جھوٹ نہیں۔ روپ وتی کا بھید کھُل گیا ہے۔ اس میں کچھ میری غلطی تھی، وہ دشمن جس کے قبضے سے تم نے اسے نکالا تھا، اس شہر میں اسے تلاش کر رہا ہے۔ روپ وتی کہتی تھی کہ رنبیر نے اسے بہن کہا تھا۔ میں اسے رنبیر کی طرف روانہ کر رہی ہوں۔ اس لیے تم بھی وہاں پہنچ جاؤ۔ واپس آئے تو تمہاری جان خطرے میں ہے۔ ایلچی ہمارا پرانا نوکر ہے اور میں اس کے ہاتھ خط کے علاوہ روپ وتی کی ایک نشانی بھی بھیج رہی ہوں۔

تمہاری ایک بہن۔“

جے کرشن نے جھنجلا کر نرملا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر تم خط کے نیچے اپنا نام پتا بھی لکھ دیتیں تو اس سے کیا فرق پڑتا۔“

”کچھ نہیں۔“ نرملا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”پِتا جی! اگر میں اپنا نام بھی لکھ دوں اور یہ خط پکڑا بھی جائے تو بھی ٹھاکر کے سامنے میری شکایت کرنے سے پہلے پروہت کو یہ ماننا پڑے گا کہ ساوتری روپ وتی ہے اور اس نے اس کے بارے میں جو مشہور کیا ہے وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے تھا اور یہ بات ایسی ہے جو پروہت کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ پیارے لال اس خط کو حفاظت سے پہنچا دے گا۔ آپ صرف اس سے انعام کا وعدہ کر دیں۔“

جے کرشن نے لاجواب سا ہو کر کہا۔ ”چلو اب جلدی کرو!“

وہ دونوں ڈیوڑھی میں آئے۔ جے کرشن نے پیارے لال کو خط دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو پیارے لال! جب تم واپس آؤ گے تو میں تمہاری دونوں

مٹھیاں سونے سے بھر دوں گا۔ یہ خط رام ناتھ کے سوا کسی کو نہ دکھانا۔"

نرملا نے کہا۔ "اور میں ٹھاکر سے کچھ زمین بھی دِلوا دوں گی تا کہ تم اطمینان سے اپنی زندگی بسر کر سکو۔ رام ناتھ اگر تم سے میرا اور پِتا جی کا نام پوچھے تو بتا دینا۔"

جے کرشن نے کہا۔ "لیکن یہ خط نام ناتھ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں آ گیا تو میں تمہاری کھال اتروا دوں گا۔ اب شہر سے جلدی باہر نکل جاؤ۔"

پیارے لال نے دروازہ کھولا اور گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ "مہاراج دوسرے گھوڑے پر کون جائے گا؟"

جے کرشن نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "دوسرا گھوڑا یہیں رہے گا۔ بھگوان کے لیے اب جاؤ۔"

پیارے لال باہر نکل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ جے کرشن نے مشعل اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "نرملا! اب تم اندر جاؤ، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ مجھے آتے ہی کسی کو ٹھاکر کے پاس یہ پیغام دے کر بھیج دینا چاہیے تھا کہ تمہاری

دوا مل گئی ہے اور تم آرام سے سو رہی ہو۔ اب میں یہ گھوڑا اصطبل میں چھوڑ کر کسی کو وہاں بھیجتا ہوں، لیکن سو نہ جانا۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"آپ مجھ سے صبح تک بات کر سکتے ہیں۔"

اندر جا کر تھوڑی دیر بعد نرملا ایک کمرے میں بیٹھی جے کرشن کا انتظار کر رہی تھی۔ گزشتہ ذہنی اور جسمانی کوفت کے بعد اب اُسے سکون و اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ جے کرشن کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر تشویش اور اضطراب کے آثار دیکھ کر نرملا نے کہا۔ "پِتا جی! بھگوان کو خوش کرنے کے بعد آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔" جے کرشن نے نڈھال سا ہو کر اس کے قریب کرسی بیٹھے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے خواب کی حالت میں کیا ہے۔ معلوم نہیں پروہت جی اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔"

"وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ صبح تک روپ وتی کوسوں دور جا چکی ہو گی اور بھگوان کرے کہ پیارے لال رام ناتھ کو بروقت باخبر کر دے۔"

جے کرشن نے کہا۔ ”میں اب ان کے متعلق نہیں، تمہارے متعلّق سوچ رہا ہوں۔ پروہت کو جب معلوم ہو گا کہ روپ وتی غائب ہو چکی ہے تو وہ یقیناً تم پر شک کرے گا اور اس کا انتقام بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”میں اس سے نہیں ڈرتی۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ روپ وتی کو سرحد عبور کرنے کے لیے وقت مل جائے۔ پِتا جی! کیا آپ کو محسوس نہیں ہوا کہ اس سارے کام میں بھگوان نے آپ کی مدد کی ہے۔“

جے کرشن نے تلملا کر جواب دیا۔ ”اگر بھگوان میرے حال پر اسی طرح مہربان رہا تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میں میرے لیے سانس لینے کے لیے کوئی جگہ نہیں رہے گی۔“

نرملا کوشش کے باوجود اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔

۵

باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور جے کرشن نے فوراً گھبرا کر کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”کون ہے؟“

ایک نوکر نے جواب دیا۔ ”مہاراج! ٹھاکر جی تشریف لائے ہیں۔“

جے کرشن نے نرملا کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ فوراً کرسی سے اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ”کہاں ہیں ٹھاکر جی؟“ جے کرشن نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

نوکروں کی بجائے ٹھاکر نے کمرے میں پاؤں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”دیکھیے مجھے خود آنا پڑا۔ نرملا کیسی ہے؟“

”اب سو گئی ہے۔ ہمیں دوا تلاش کرنے میں بہت دیر لگی۔ میں نے ابھی آپ کی طرف نوکر بھیجا ہے وہ شاید آپ کو نہیں ملا۔“

”نہیں، میں بہت پریشان تھا میں فوراً یہاں آنا چاہتا تھا لیکن پروہت جی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔“

”تشریف رکھیے۔“

”نہیں، نرملا کی نیند خراب ہو گی۔ میں اب واپس جاتا ہوں۔ آپ بھی آرام کریں۔“

"تھوڑی دیر بیٹھیے۔ نرملا پر صبح تک دوائی کا اثر رہے گا۔ اب اگر اس کے پاس کوئی ڈھول بھی پیٹے تو اس کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ یہ دوا بہت اچھی ہے۔"

"بھگوان کا شکر ہے کہ آپ کو دوا مل گئی۔" ٹھاکر نے اطمینان سے کرسی ہر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جے کرشن نے کہا۔ "پروہت جی مجھے کچھ پریشان نظر آتے تھے۔ آپ سے کوئی بات تو نہیں کہی انہوں نے؟"

ٹھاکر نے جواب دیا۔ "پروہت جی سومنات کی حفاظت کے بارے میں راجہ سے مشورہ کرنے جا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محمود سومنات پر ضرور حملہ کرے گا اور دیوتاؤں کی مرضی بھی یہی ہے کہ اس کے سپاہیوں کی لاشیں سومنات کی دیواروں کے سامنے روندی جائیں، پروہت جی کی خواہش ہے کہ اگلے مہینے تمام راجے سومنات میں جمع ہو کر یہ حلف اٹھائیں کہ خطرے کے وقت اپنے لشکر کے ساتھ سومنات کی حفاظت کے لیے جمع ہو جائیں گے۔ ہمارے مہاراج نے انہیں یہ مشورہ دیا

تھا کہ انہل واڑہ کی فوج کو سومنات میں جمع ہونے کی بجائے کاٹھیاواڑ کی سرحدوں کی حفاظت کرنی چاہیے لیکن پروہت جی کو اطمینان نہیں کہ انہل واڑہ کی فوج حملہ آوروں کو کاٹھیاواڑ کی سرحدوں پر روک سکے گی۔ اس لیے اب وہ خود مہاراج سے بات چیت کرنے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں مَیں بھی ان کی ساتھ جانا ضروری سمجھتا ہوں۔"

جے کرشن نے پوچھا۔ "آپ کی کیا رائے ہے؟"

ٹھاکر نے جواب دیا۔ "میری رائے بھی یہی ہے کہ جنوب کے تمام راجے سومنات کی حفاظت کے لیے جمع ہو جائیں اور ہم اپنی سرحدوں پر ڈٹ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دشمن کو سرحد پر روک سکیں گے لیکن اگر ہم اسے بھی روک سکے تو پیچھے ہٹتے ہوئے قدم قدم پر اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس طرح سومنات تک پہنچتے پہنچتے دشمن کی بیشتر قوّت زائل ہو چکی ہو گی اور ہمارا وہ لشکر جو سومنات کی حفاظت کے لیے جمع ہو گا، آسانی سے اسے تباہ کر سکے گا۔ یہاں تک کہ دشمن کا ایک آدمی بھی ہمارے دیوتاؤں کے عذاب سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ مجھ سے باتیں کرنے کے بعد

پروہت جی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ انہل واڑہ جانے پہلے شِو جی کے مندر کے پجاریوں سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ محل میں آرام کرنے کی بجائے مندر میں تشریف لے گئے ہیں۔"

"اس وقت؟"

"ہاں! میں بھی انہیں وہاں پہنچا کر آیا ہوں، پروہت جی رَتھ پر سوار ہونے کی بجائے مندر تک پیدل گئے ہوں گے۔ وہ تو دیوتا ہیں۔ نیند اور تھکاوٹ کا ان پر کیا اثر ہو سکتا ہے لیکن بعض پجاریوں کا برا حال تھا۔ بے چارے چلتے ہوئے اونگھ رہے تھے۔"

جے کرشن نے پوچھا۔ "وہ سب پروہت جی کے ساتھ گئے ہیں۔"

"نہیں، صرف سات یا آٹھ پجاری اور ان کے اپنے چند سپاہی۔"

"آپ نے ان کی سیوا کے لیے اپنے سپاہی کیوں نہیں بھیج دیے۔"

"میں تو یہی چاہتا تھا لیکن پروہت جی کہتے تھے کہ ان کے مندر میں جانے کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ مندر کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے

مجھے بھی رخصت کر دیا تھا۔ کہتے تھے کہ تم نرملا کی خبر لو۔ ہم باقی رات یہیں گزاریں گے۔"

"انہیں معلوم ہے کہ نرملا میرے ساتھ آگئی ہے؟"

"نہیں، میں نے سوچا کہ وہ پریشان ہوں گے، اس لیے نہیں بتایا۔"

جے کرشن نے کہا۔ "تو آپ یہیں آرام کریں۔ میں آپ کو صبح ہوتے ہی جگادوں گا۔"

"نہیں اب تو صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ مجھے گھر جا کر پروہت جی کا انتظار کرنا چاہیے۔ بھگوان کرے وہ صبح سفر کا ارادہ تبدیل کر دیں، ورنہ میرا برا حال ہو گا۔"

جے کرشن نے کہا۔ "ٹھہریے، میں آپ کے لیے رَتھ تیار کراتا ہوں۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔"

ٹھاکر نے کہا۔ "رَتھ کی ضرورت نہیں، میں آپ کا گھوڑا لے جاتا ہوں۔"

اس گفتگو کے دوران نرملا جو بستر پر آنکھیں بند کیے یہ باتیں سن رہی تھی اپنے دل میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ جے کرشن اور ٹھاکر کے اٹھتے ہی اس نے انگڑائی لی اور ''پانی! پانی!'' کہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''میں ابھی لاتا ہوں بیٹی!'' جے کرشن یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ٹھاکر نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہارا کیا حال ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ یہاں کب تشریف لائے ہیں؟''

''میں ابھی آیا ہوں!'' ٹھاکر یہ کہہ کر نرملا کے بستر کے قریب بیٹھ گیا۔

''آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا۔ مجھے دوا کھاتے ہی نیند آگئی تھی، پِتا کی نے آپ کو پیغام نہیں بھیجا؟''

''نہیں، مجھے ان کا پیغام نہیں مل سکا اور اگر مل بھی جاتا تو بھی میں تمہیں دیکھے بغیر میری تسلّی نہ ہوتی۔ میں صبح سویرے پروہت جی کے ساتھ انہل واڑہ جانے ارادہ کر چکا ہوں۔ وہاں شاید مجھے چند دن ٹھہرنا پڑے۔

اس لیے جانے سے پہلے تمہارے متعلق اطمینان کرنا ضروری تھا۔ اس تکلیف کا باقاعدہ علاج ہونا چاہیے۔ میں واپسی پر منوراج کو لیتا آؤں گا۔"

نرملا نے کہا۔ "نہیں، آپ انہیں تکلیف نہ دیں۔ مجھے اس دوا سے فوراً آرام آجاتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے پروہت اور دوسرے مہمانوں کو پریشانی ہوئی۔"

ٹھاکر نے جواب دیا۔ "نہیں، انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ پروہت جی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم یہاں آگئی ہو۔"

نرملا نے کہا۔ "آپ کو رخصت کرنے کے لیے میرا گھر میں ہونا ضروری ہے۔"

ٹھاکر نے کہا۔ "ہاں! تم پروہت جی کے درشن کر لیتیں تو اچھا ہوتا۔ اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہے تو میں صبح روانہ ہونے سے پہلے تمہارے لیے پالکی بھجوادوں گا۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ پیدل

چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تمھیں تکلیف ہو گی۔"

"عورت کو اپنے پتی کے ساتھ چلنے میں تکلیف نہیں ہوتی۔"

ٹھاکر نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔ شادی کے بعد نرملا کے طرزِ عمل نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شاید اپنی تمام دولت اس کے قدموں پر نچھاور کرنے کے بعد بھی اس کی محبت نہ خرید سکے۔ اس نشے تشکّر کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "تو چلو، میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جے کرشن پانی کا کٹورا اُٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ نرملا نے کٹورا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ٹھاکر نے جے کرشن کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آپ اجازت دیں تو میں نرملا کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"اگر نرملا کی طبیعت ٹھیک ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس وقت۔۔۔؟"

نرملا نے پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ ”پتا جی! ٹھاکر جی صبح پروہت جی کے ساتھ جا رہے ہیں اور انہیں رخصت کرنے کے لیے میرا گھر پہنچنا ضروری ہے۔ تازہ ہوا میں پیدل چلنے سے میری طبیعت اور زیادہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”لیکن یہ عجیب سی بات ہو گی۔ اچھا تمہاری مرضی۔“

تھوڑی دیر بعد ٹھاکر اور نرملا اپنے محل کا رخ کر رہے تھے۔ ٹھاکر تھکاوٹ سے نڈھال ہونے کے باوجود بے حد مسرور تھا۔ جے کرپشن کے مکان کی ڈیوڑھی سے نکلتے ہی اس لئے نرملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ”نرملا! اب مجھے ہر قدم پر تمہارے سہارے کی ضرورت پڑے گی۔“

نرملا نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”آپ کی سیوا میرا فرض ہے۔“ ٹھاکر نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم دیوی ہو نرملا، اور تمہارا یہ پجاری اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ تم اس سے نفرت نہ کرو۔“

نرملا یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے ہاتھ پر کسی نے دھکتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہے۔ وہ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔ ”چلیے!“

ٹھاکر مغموم لہجے میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں نرملا! تمہیں میرے سفید بالوں کے ساتھ پریم نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے صرف رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔

نرملا نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ ”ایسی باتیں نہ کیجیے۔ میں آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ چلیے! آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔“

”نہیں نہیں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ ایک پجاری کو اپنی دیوی سے شکایت کرنے کی جرائت نہیں ہو سکتی۔“ ٹھاکر یہ کہہ کر اس کے ساتھ چل دیا۔

۶

گھر پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ پروہت جو ابھی تک نہیں آئے۔ نرملا نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب وہ بالائی منزل کے ایک کمرے میں داخل

ہوئے ٹھاکر نے کہا۔ ’’نرملا! اب صبح ہونے کو ہے۔ پروہت جی آتے ہی ہوں گے۔ تم لیٹ جاؤ۔ جب وہ آجائیں گے تو میں تمہیں جگا دوں گا۔‘‘

نرملا نے کہا۔ ’’مجھ سے زیادہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ پروہت جی ذرا دیر سے آئیں اور آپ کو تھوڑی دیر آرام کے لیے وقت مل جائے۔ آپ کو سفر کرنا ہے اور میں تو سارا دن سو سکتی ہوں۔‘‘

ٹھاکر تھکاوٹ سے چور ہو چکا تھا۔ اس نے بستر پر لیٹے ہوئے کہا۔ ’’بہت اچھا! میں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔‘‘ نرملا ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ٹھاکر کے خرّاٹے سنائی دے رہے تھے۔ نرملا نے چراغ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے تصوّرات ماضی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ماضی جو رنبیر کے سپنوں سے بھرپور تھا۔ ماضی جہاں اس کی جوانی کے تمام ولولے دم توڑ چکے تھے۔ ماضی جب کی طرف لوٹنا اس کے بس کی بات نہ تھی اور جس نے اسے آہوں اور آنسوؤں کی پونجی دے کر مستقبل کی وسعتوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ نرملا کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اٹھ کر بالکنی کی طرف بڑھی اور اپنی آنکھوں

میں چھلکتے آنسو پونچھنے کے بعد آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ مشرق کے افق سے صبح کا ستارہ نمودار ہو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی اور رات کی تاریکی صبح کے دُھندلکے میں تبدیل ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے محل کی چار دیواری سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور اسے چند سوار دکھائی دیے جو اصطبل سے نکل کر دوسری طرف جا رہے تھے۔ سوار جلد ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ نرملا واپس مُڑنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اسے پروہت جی محل کی طرف آتے دکھائی دیے۔ نرملا جلدی سے کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے ٹھاکر کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”پروہت جی آ گئے ہیں۔“

ٹھاکر ہڑبڑا کر اُٹھا اور اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ ”کہاں ہیں پروہت جی؟“

”وہ نیچے اپنے کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔“

"بھگوان کرے وہ سفر کا ارادہ ملتوی کر دیں۔" ٹھاکر یہ کہہ کر لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

ایک ساعت کے بعد ٹھاکر واپس آیا تو نرملا کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔
"اُف تم ابھی تک بیٹھی ہوتی ہو۔ تمہیں سو جانا چاہیے تھا۔"

"میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

"میں آج نہیں جاؤں گا۔ پروہت جی نے مندھیر جانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مہاراجہ کو یہیں بُلا لیا جائے۔ میں نے ان کا پیغام مہاراجہ کو بھیج دیا ہے۔"

نرملا نے کہا۔ "آپ کو جگانے سے پہلے میں نے محل سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنی تھی میرا خیال ہے کہ چند سوار اصطبل سے نکل کر کہیں گئے ہیں۔"

"ہاں وہ پروہت جی کے محافظ دستے کے آدمی تھے۔ پروہت جی نے انہیں ہمارے پڑوس کے راجوں اور سرداروں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے

کہ وہ ان کے درشن کے لیے یہاں پہنچ جائیں۔ پروہت جی نے مجھ سے ایک عجیب سی بات کہی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ کہتے ہیں کہ ایک خوبصورت لڑکی سومنات کے مندر میں داسی بن کر آئی تھی لیکن پجاریوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کی جاسوس ہے۔ چنانچہ اُسے گرفتار کر لیا گیا لیکن پچھلے دنوں اچانک وہ قید خانے سے بھاگ گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مندر کی حفاظت کرنے والی فوج میں بھی بعض آدمی اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ سومنات کے جاسوس کئی دنوں سے اس کی تلاش میں تھے۔ اب انہیں یہ سراغ ملا ہے کہ وہ لڑکی ہمارے شہر میں کسی کے ہاں چھپی ہوئی ہے۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا۔ تاہم میں نے پروہت جی کی تسلّی کے لیے شہر کی ناکہ بندی کا حکم دے دیا ہے۔ اب میرے سپاہیوں کی مدد سے سومنات کے پجاری ہر گھر کی تلاشی لیں گے۔ اگر وہ لڑکی مل گئی تو پجاری اس کے باقی ساتھیوں کا کھوج لگانے کے لیے اسے سومنات لے جائیں گے۔ سومنات کے مندر

میں دشمنوں کے جاسوسوں کا ہونا بہت خطرناک ہے۔ میں نے شہر میں یہ ڈھنڈورا پٹوانے کا ارادہ کیا ہے کہ اس لڑکی کو تلاش کرنے والے کو بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔ پروہت جی آج دوپہر سے پہلے کسی سے ملاقات نہیں کریں گے۔"

نرملا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ایک بڑھیا کانپتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کو پیرہن جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر ضربوں کے نشان تھے۔ ٹھاکر نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ اس کی پرانی خادمہ تھی جسے اس نے رام ناتھ کے گھر بھیجا تھا۔ بڑھیا سسکیاں لیتی ہوئی ٹھاکر کے پاؤں پر گر پڑی۔ چند نوکرانیاں اور نوکر حیران و پریشان دروازے سے باہر کھڑے تھے۔ ٹھاکر نے بڑھیا کے بازو پکڑ کر اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا تمہیں؟"

"مہاراج! مجھے ڈاکوؤں نے مارا ہے۔ وہ رات کے تیسرے پہر حویلی کی دیوار پھاند کر اندر آئے تھے۔ انہوں نے چوکیدار اور تین نوکریوں کو قتل کر دیا ہے۔ چوتھا نوکر جاں کنی کی حالت میں پڑا ہے۔ پھر انہوں نے

مجھے چوکیدار کی بیوی، اور مالی لڑکی کو پکڑ کر ایک کمرے میں بٹھا دیا اور دو آدمی تلواریں سونت کر ہمارے سر پر کھڑے ہو گئے۔ باقی آدمیوں نے مکان کی تلاشی لینے کے بعد ہم سے پوچھا کہ سردار کی بیوی کہاں ہے؟ تم نے اسے کہاں چھپا دیا ہے؟ مہاراج! ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا وہ کہاں ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ رات کے وقت اپنے کمرے میں تھی اور میں نے اسے حویلی سے باہر جاتے نہیں دیکھا۔ لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ تم جھوٹ بولتی ہو۔ پھر انہوں نے دوبارہ مکان کا کونہ کونہ چھان مارا، لیکن ساوتری وہاں نہیں تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے ہمیں پیٹنا شروع کر دیا۔ چوکیدار کی بیوی اور مالی کی لڑکی نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑالی کہ ان کے گھر حویلی کے دوسرے کونے میں ہیں اور رات کے وقت صرف میں ساوتری کی خدمت میں رہا کرتی ہوں۔ ڈاکوؤں نے ان کی مشکیں کس کر انہیں کمرے کے اندر بند کر دیا اور مجھے حویلی کے پچھواڑے کھیتوں میں لے گئے۔ وہاں ان کے چند ساتھی کھڑے تھے۔ مہاراج! انہوں نے مار مار کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں خوف کے مارے حویلی کی

طرف نہیں گئی اور یہاں تک پہنچتے پہنچتے کئی بار گری ہوں۔"

ٹھاکر نے کہا۔ "میرے شہر میں ایسی جرأت کون کر سکتا ہے۔ تم ان میں سے کسی کو پہچان سکو گی؟"

"نہیں مہاراج! انہوں نے اپنے چہروں پر نقاب ڈال رکھے تھے۔"

"وہ کتنے تھے؟"

"مہاراج! آٹھ آدمیوں نے حویلی پر حملہ کیا تھا اور تین کو میں نے کھیت میں دیکھا تھا۔"

ٹھاکر نے پوچھا۔ "اور سردار رام ناتھ کی بیوی کے متعلق تمہیں کچھ معلوم نہیں۔"

"نہیں مہاراج! مجھے کچھ پتہ نہیں۔ رات کے وقت سونے سے پہلے میں نے اُسے اس کے کمرے میں دیکھا تھا۔"

"اب تم یہیں رہو۔" ٹھاکر یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا اور نوکروں

کو اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا باہر نکل گیا۔

دوپہر کے قریب شہر کے ڈھنڈورچی گلیوں اور کوچوں میں رام ناتھ کے گھر حملہ کرنے والے ڈاکوؤں، اس کی بیوی اور سومنات کے قید خانے سے فرار ہونے والی لڑکی کا پتہ دینے والوں کے لیے انعامات کا اعلان کر رہے تھے۔

۷

دوپہر سے تھوڑی دیر بعد پیارے لال ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوا۔ وہ تھکاوٹ سے نڈھال تھا اور گھوڑا بھی جواب دے چکا تھا۔ گاؤں کے چوپال سے باہر ایک درخت کے نیچے چند آدمی بیٹھے تھے۔ پیارے لال دیہاتی لوگوں سے کام لینا جانتا تھا۔ ذرا سی دیر میں ایک آدمی نے اس کے گھوڑے کے لیے چارے اور پانی کا انتظام کر دیا اور دوسرا اس کے لیے روٹی، مکھّن اور لسّی لے آیا۔ اپنا پیٹ بھر لینے کے بعد پیارے لال تھوڑی دیر سستانے کی غرض سے کھاٹ پر لیٹ گیا۔ ایک دیہاتی نے اس سے سوال کیا۔ ”مہاراج! آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”مہاراج۔ کا لفظ سن کر پیارے لال نے اپنے دل میں ایک گدگدی سی محسوس کی اور کہا۔ ”تم مندھیر کے ٹھاکر جی کو جانتے ہو؟“

”انہیں کون نہیں جانتا مہاراج! آپ ان کے۔۔۔۔“

پیارے لال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو بھئی! تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔“

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ ”مہاراج! آپ کا گھوڑا بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اگر حکم ہو تو اس کی زین اتار دوں؟“

پیارے لال نے گردن اُٹھا کر تحکمانہ انداز میں جواب دیا۔ ”نہیں! ہم ابھی روانہ ہو جائیں گے۔“

ایک اور دیہاتی بولا۔ ”مہاراج! آپ کا گھوڑا بہت خوبصورت ہے۔“

”پیارے لال نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اسے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں پچھلے پہر مندھیر سے نکلا تھا اور اب یہاں پہنچ گیا ہوں۔“ ”اتنی جلدی؟“ دیہاتی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں اور کیا؟"

چند دیہاتی یکے بعد دیگرے اُٹھ کر گھوڑے کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے اس کے کانوں سے لے کر دُم کے بالوں تک کی تعریف شروع کر دی۔ ایک سادہ دل دیہاتی نے پیارے لال سے پوچھا۔ "مہاراج! اس کی قیمت کیا ہو گی؟"

"کیوں! تم اسے خریدنا چاہتے ہو؟" پیارے لال نے اس پر غضب آلود نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

اس نے کھسیانا ہو کر جواب دیا۔ "نہیں مہاراج! میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔"

"ارے نہیں خرید لو۔ اس کی قیمت صرف ایک گاؤں ہے۔"

سادہ دل دیہاتی بدحواسی کی حالت میں اپنے ساتھیوں کے قہقہے سن رہا تھا۔ تھوڑی دور ایک سرپٹ سوار گاؤں کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا اور چند دیہاتی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پیارے لال بھی ان کی دیکھا دیکھی

کھاٹ سے اُتر کر سوار کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں سوار چوپال کے قریب پہنچ گیا لیکن اس نے گھوڑا روکنے کی کوشش نہ کی۔ دیہاتی گھبرا کر اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ سوار ایک بگولے کی طرح آگے نکل گیا۔ پیارے لال پوری قوّت کے ساتھ چلّایا۔ ”مہاراج رام ناتھ! ٹھہرو! ٹھہرو! رام ناتھ! رام ناتھ!“

لیکن رام ناتھ گرد کے بادلوں میں چھپ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پیارے لال اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کا پیچھا کر رہا تھا لیکن رام ناتھ کے گھوڑے کے مقابلے میں اس کے گھوڑے کی رفتار سست تھی۔ وہ اس اُمّید پر چلتا رہا کہ رام ناتھ کسی نہ کسی جگہ دم لینے کے لیے ضرور ٹھہرے گا۔ راستے میں کوئی بستی آتی یا کوئی اور مسافر ملتا تو وہ رام ناتھ کے متعلق پوچھ لیتا۔ اس کے گھوڑے کی رفتار بتدریج کم ہوتی گئی اور تیسرے پہر کے قریب گھوڑا چلتے چلتے رُک گیا۔ پیارے لال نے اسے ایڑ لگائی تو وہ چند چھلانگیں لگانے کے بعد پھر رُک گیا۔ پیارے لال مجبوراً نیچے اُترا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر پیدل چلنے لگا۔ اس علاقے میں دور دور تک

جھاڑیوں اور درختوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پیارے لال شام سے پہلے کسی گاؤں میں پہنچنا ضروری سمجھتا تھا۔ کوئی آدھ کوس چلنے کے بعد اسے گھنی جھاڑیوں کے پیچھے سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور وہ پگڈنڈی سے ہٹ کر ایک درخت کے اوپر چڑھ گیا۔ پندرہ مسلح سوار جن کے نیزے دھوپ میں چمک رہے تھے پوری رفتار سے اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ جلدی نیچے اترا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ آن کی آن میں سوار گرد کے بادل اُڑاتے ہوئے آگے نکل گئے۔ پیارے لال گھوڑے کی باگ پکڑ کر پھر پگڈنڈی پر ہو لیا۔ کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ تھکا ہوا گھوڑا گردن جھکائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ کوئی ایک کوس چلنے کے بعد پیارے لال کو ایک دیہاتی دکھائی دیا جو گدھے پر سوار تھا۔ پیارے لال نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہاں سے اگلا گاؤں کتنی دور ہے؟“

”مہاراج کوئی دو کوس ہو گا۔“

”تم نے راستے میں ایک سوار دیکھا ہے؟“

”میں نے راستے میں کئی سوار دیکھے ہیں مہاراج! ایک ٹولی تو آگے جا چکی ہے۔ شاید آپ نے بھی دیکھی ہو گی۔“

”ہاں وہ کون تھے؟“ ”معلوم نہیں مہاراج! اپنے گاؤں سے نکلتے ہی مجھے اپنے پیچھے ایک فوج دکھائی دی۔ چالیس پچاس، سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے مجھ سے آگے نکل گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہی سپاہی ایک سوار کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ گدھے سے اتر کر میں ڈر کے مارے ایک جھاڑی کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ سپاہیوں نے اس سوار سے ہتھیار ڈال دینے کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک مجھے معلوم نہ ہو کہ تم کس کے حکم سے مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہو میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔“

پیارے لال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ”اس سوار کے گھوڑے کا رنگ مشکی تھا؟“

”جی ہاں!“

”اچھا پھر کیا ہوا؟“

”پھر ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس کی شکل بالکل مندھیر کے مندر کے ایک پجاری سے ملتی تھی جو ہر سال ہمارے گاؤں میں دان لینے آیا کرتا ہے۔ اس نے سوار کو سمجھایا کہ ہم تمہیں گرفتار کرکے مندھیر لے جانا چاہتے ہیں، وہاں جا کر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے کیا جرم کیا ہے۔ لیکن سوار نے کہا میں خود ہی مندھیر جا رہا ہوں۔ تم میرے پیچھے آسکتے ہو۔ اس کے بعد ایک سپاہی آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ ہم سومنات کے سپاہی ہیں اور پروہت جی مہاراج کے حکم سے تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ مندھیر کا ٹھاکر یا انہل واڑہ کا راجہ تمہاری مدد کرے گا۔ سوار نے یہ سنتے ہی تلوار نکال لی اور ان کا گھیرا توڑ کر ایک طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن ایک سپاہی کا نیزہ اس کے گھوڑے کے سر میں لگا اور گھوڑا دو تین بار اُچھلنے کے بعد اپنے سوار سمیت گر پڑا۔ سوار ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ چند سپاہی اس کے سر پر نیزے تان کر کھڑے ہو

گئے۔ اب اس کے سامنے ہار ماننے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ تین چار سپاہی گھوڑوں سے اترے اور انہوں نے رسّے سے اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ میں نے وہاں سے کھسک جانا چاہا۔ لیکن ایک سپاہی نے مجھے دیکھ لیا اور نیزے سے ہانکتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں اس بات کا یقین دلایا کہ میں ایک غریب دھوبی ہوں اور ڈر کے مارے جھاڑی کے پیچھے چھُپ گیا تھا۔ ان میں سے چند آدمی قیدی کر لے کر واپس چلے گئے اور باقی آگے نکل گئے ہیں۔ آپ اسے جانتے ہیں مہاراج؟"

"کسے؟"

"اس سوار کو جسے گرفتار کیا گیا ہے؟"

"نہیں۔" پیارے لال نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔

گھوڑا پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پیارے لال نے مڑ کر دھوبی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بھئی میرے ساتھ ایک سودا کرو گے؟"

”کیسا سودا مہاراج؟“

”اپنے گدھے کے بدلے میرا گھوڑا لے لو۔ اسے کسی دن مندھیر لے آنا۔ تمہیں انعام ملے گا۔ مجھے اگلے گاؤں سے کوئی سواری مل گئی تو میں تمہارا گدھا وہاں چھوڑ دوں گا۔“

دھوبی نے جواب دینے کی بجائے گدھے کی گردن پر ایک ڈنڈا رسید کیا اور آن کی آن میں جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

۸

اگلے دن دوپہر کے وقت نرملا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور پیشانی کے آثار تھے۔ ٹھاکر رگھوناتھ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے نرملا کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پروہت جی نے رام ناتھ کا جرم بتانے سے انکار کر دیا ہے۔“

نرملا نے پوچھا۔ ”آپ رام ناتھ سے ملے ہیں؟“

”نہیں۔ پروہت جی اس سے کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ اس وقت مندر کی چار دیواری میں قید ہے اور دروازے پر پروہت جی کے آدمی پہرا دے رہے ہیں۔ شہر کے کسی اور آدمی کو مندر کے قریب آنے کی اجازت نہیں۔“

نرملا نے کہا۔ ”کیا آپ کو یہ اختیار بھی نہیں کہ اپنے شہر کے ایک آدمی کی گرفتاری کی وجہ پوچھ سکیں؟“

”پروہت جی کے سامنے میرے تمام اختیارات ختم ہو جاتے ہیں۔“

”آپ اس علاقے کے حاکم ہیں، اگر رام ناتھ نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے آپ کی عدالت میں پیش ہو جانا چاہیے اور رام ناتھ ایک عام آدمی نہیں، وہ مہاراجہ کا دوست ہے۔“

”پروہت جی اگر چاہیں تو مجھے بھی گرفتار کر سکتے ہیں۔“

”یونہی کسی جرم کے بغیر!“

”تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ پروہت جی نے رام ناتھ کو کسی جرم کے بغیر

گرفتار کر کیا ہے۔“

نرملا نے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رام ناتھ نے کوئی جرم نہیں کیا اور اگر اس نے کوئی جرم کیا ہے تو وہ ایسا ہے جس کے ظاہر ہو جانے سے پروہت جی کو اپنی بدنامی کا خود ہے۔“

رگھوناتھ نے غصّے میں آ کر کہا۔ ”نرملا بھگوان کے لیے ہوش میں آؤ۔ تمھیں محل کے کسی نوکر کے سامنے بھی ایسی باتیں نہیں کہنی چاہیں۔“

نرملا نے کہا۔ ”مجھ پر خفا ہونے کے بجائے آپ پروہت جی سے یہ پوچھ آئیں کہ مندر کی دیویاں مہا دیو کے چرنوں میں پہنچ کر دوبارہ اس دنیا میں کیسے آ جاتی ہیں؟“

”نرملا! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ بھگوان کے لیے مجھے پریشان نہ کرو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“

نرملا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ جے کرشن دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رگھوناتھ نے بھی کرسی سے اُٹھ کر جے کرشن کا

سواگت کیا اور اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی سوچ رہا تھا کہ آپ کو بلاؤں۔ نرملا بہت پریشان ہے۔ اسے کسی نے پروہت جی مہاراج کے متعلق بہکا دیا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ پروہت جی کے متعلّق اپنے دل میں برا خیال لانا بھی پاپ ہے۔“

جے کرشن نے انجان بن کر کہا۔ ”نرملا! کیا شکایت ہے تمہیں پروہت جی مہاراج کے متعلّق؟“

نرملا نے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں پِتا جی۔ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ اگر پروہت جی رام ناتھ کا کا کوئی جرم ثابت کر سکتے ہیں تو وہ اسے ان کی عدالت میں پیش کرنے سے کیوں گھبراتے ہیں۔“

رگھوناتھ نے تلملا کر کہا۔ ”دیکھو نرملا! میں ایک بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں پروہت جی کے خلاف کچھ نہیں سن سکتا۔“

نرملا کچھ کہے بغیر اُٹھی اور تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رگھوناتھ نے پریشانی کی حالت میں جے کرشن کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ بھگوان جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔“

جے کرشن نے جواب دیا۔ ”آپ کو نرملا کی باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بہت رحمدل ہے۔ جب ہم قنوج میں تھے تو وہاں بھی بدترین مجرموں کی جان بچانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ میں اسے سمجھالوں گا۔“ رگھوناتھ نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اطمینان سے باتیں کریں، میں ذرا نیچے جارہاہوں۔“

رگھوناتھ کمرے سے باہر نکل گیا اور جے کرشن قدرے توقّف کے بعد اُٹھ کر برابر کے کمرے میں داخل ہوا۔ نرملا صحن کی طرف کھلنے والے دریچے کے سامنے کھڑی تھی۔ جے کرشن نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”بیٹی! تم آگ کے ساتھ کھیلنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر ایسی باتیں پروہت کے کانوں تک پہنچ گئیں تو اس کا انتقام بہت خطرناک ہو گا۔ اگر اسے تمام حالات معلوم ہو جائیں تو اس کے آدمی قنوج کی حدود تک روپ وتی کا پیچھا کریں گے۔ تمہیں اگر میرا یا اپنا خیال نہیں تو کم از کم روپ وتی کی خاطر چند

دن کے لیے اپنی زبان قابو میں رکھو۔"

نرملا نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "لیکن پِتا جی! وہ رام ناتھ کو قتل کر دیں گے اور روپ وتی اس کے بغیر کیسے زندہ رہ سکے گی۔"

جے کرشن نے جواب دیا۔ "پروہت اسے قتل نہیں کرے گا جب تک روپ وتی اس کے قبضے میں نہیں آتی، رام ناتھ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ یہ روپ وتی کی خوش قسمتی ہے کہ پروہت کے سپاہی اسے مندھیر اور رام ناتھ کی جاگیر کی ریاستوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ راستے میں پیارے لال کو پکڑ کر اس کی تلاشی لے لیتے تو تمہارا خط ہماری تباہی کے لیے کافی تھا۔ اب بھی مجھے ڈر ہے کہ اگر اسے ہم پر شک ہو گیا تو پیارے لال جیسے نوکروں سے سچی بات اگلوا لینا اس کے لیے مشکل نہ ہو گا۔ تمہیں ٹھاکر جی کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیں۔ ہم رام ناتھ کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے ہیں۔ اب بھگوان ہی اسے بچا سکتا ہے۔ ہمارے بس میں کچھ نہیں رہا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم احتیاط سے کام لو گی۔"

”پِتا جی، میں وعدہ کرتی ہوں۔“ نرملا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

۹

مندھیر میں شِو جی کا مندر اپنی قدامت، وسعت اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے بہت مشہور تھا۔ پتھر کی چار دیواری کے اندر ایک وسیع تالاب کے عین درمیان میں مندر کی پُر شکوہ عمارت کھڑی تھی جس کے سنہری کلس دور دور سے دکھائی دیتے تھے۔ اور جس کے اندر ایک ہزار بُت نصب تھے۔ تالاب کے چاروں کناروں سے مندر تک پہنچنے کے لیے سنگِ مرمر کی گزرگاہیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر روز سینکڑوں آدمی مندر کے تالاب میں اشنان کرنے اور مورتیوں کے سامنے نذرانے پیش کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ملک میں شِو جی کے کئی اور مندروں کے پجاریوں کی طرح اس مندر کے پجاری بھی سومنات کے بڑے پروہت کو اپنا پیشوا مانتے تھے اور اس کی آمدنی کا ایک حصّہ ہر سال سومنات کے مندر کی بھینٹ کیا جاتا تھا۔

گزشتہ دو دن سے یہ مندر سومنات کے پروہت کی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا اور اس کے دروازے تمام یاتریوں کے لیے بند ہو چکے تھے۔ عام پجاریوں کو بھی مندر سے دور رہنے کا حکم مل چکا تھا۔ دروازوں پر سومنات کے سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ سومنات کے پروہت کے ساتھیوں اور مندھیر کے چند پجاریوں کے سوا کسی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ عام لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ رام ناتھ کو ایک قیدی کی حیثیت سے اس مندر کے اندر لایا گیا ہے اور عنقریب سومنات کے خلاف کسی خطرناک سازش کا انکشاف ہونے والا ہے۔

رام ناتھ مندر کے اندر ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اور ایک سپاہی اس کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسا رہا تھا۔ سومنات کا پروہت اور چند پجاری اس کے قریب کھڑے تھے۔ جب رام ناتھ نے آنکھیں بند کر کے گردن ڈھیلی چھوڑ دی تو پروہت نے سپاہی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور رام ناتھ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بتاؤ وہ کہاں ہے؟“

رام ناتھ نے آنکھیں کھولتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری جان لینے کے لیے تمہیں بہانے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے گھر میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اگر وہ میری غیر حاضری میں گھر سے غائب ہو گئی ہے تو تم سے زیادہ اس بات کا کسی اور کو علم نہیں ہو سکتا۔“

ایک پجاری نے کہا۔ ”مہاراج! یہ بہت سخت جان ہے۔ اس کا دماغ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا۔“

”اس کا دماغ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے پروہت نے سپاہی کو اشارہ کیا اور اس نے پھر رام ناتھ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد جب رام ناتھ کے چہرے سے بے ہوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے تو پروہت نے کوڑے مارنے والے سپاہی کو ایک بار پھر روکا اور پانی لانے کے لیے کہا۔ ایک سپاہی نے مندر کے تالاب سے ایک بالٹی میں پانی لا کر رام ناتھ کے قریب رکھ دیا اور کٹورا بھر کر اس کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ رام ناتھ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ پروہت نے سپاہی کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا لے کر

رام ناتھ کے ہونٹوں سے لگایا لیکن ابھی اس نے ایک ہی گھونٹ حلق سے اُتارا تھا کہ پروہت نے کٹورا پیچھے ہٹا کر سارا پانی زمین پر انڈیل دیا اور کہا۔ ”اگر پانی پینا چاہتے ہو تو میرے سوال کا جواب دو۔“

رام ناتھ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اگر میری جگہ تم اس ستون کے ساتھ بندھے ہوئے ہوتے اور میرے ہاتھ میں کٹورا ہوتا تو اب تک شہر کے ہر آدمی کو علم ہو چکا ہوتا کہ روپ وتی کہاں ہے۔“

پروہت نے کہا۔ ”تمہارے لیے یہ آخری موقع ہے۔ اس کے بعد میرے دل میں تمہارے لیے رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔“ رام ناتھ نے توقّف کے بعد جواب دیا۔ ”تم مجھ سے روپ وتی کے متعلق کیوں پوچھتے ہو۔ کامنی کے متعلق کیوں نہیں پوچھتے؟“

پروہت کے چہرے پر اچانک سیاہی پھیل گئی اور اس نے انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کامنی کے متعلّق تم کیا جانتے ہو؟“

”میں اس کے متعلق یہ جانتا ہوں کہ جب تم نے اسے دیوتا کے پاس بھیجا تھا تو وہ راستے سے لوٹ آئی تھی اور اس کے بدلے تمہارے چند پجاری وہاں پہنچ گئے تھے۔ اگر اس کے متعلق کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو تو مندھیر کے ٹھاکر اور انہل واڑہ کے مہاراجہ کے پاس لے چلو۔ بولو خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا تم سومنات کی دیوی کے متعلق یہ بھی نہیں جاننا چاہتے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟“

پروہت کچھ دیر مبہوت کھڑا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا چھین لیا اور بے تحاشا رام ناتھ کو پیٹنا شروع کر دیا۔

”مہاراج! مہاراج!“ ایک پجاری نے کہا۔ ”یہ بے ہوش ہو چکا ہے۔ ہمیں ابھی اسے زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر کامنی بھی روپ وتی کی طرح روپوش ہو چکی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ سومنات میں رام ناتھ کے اور ساتھی بھی ہوں گے۔ اسے قتل کرنے سے پہلے ان کا سراغ لگانا ضروری ہے۔“

پروہت نے کوڑا زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”اب اس کا ایک پل کے لیے

بھی یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ تم اسے فوراً سومنات لے جاؤ۔ اگر یہ راستے
میں کسی سے بات کرنے کی کوشش کرے تو اس کی زبان کاٹ دو۔ میں
روپ وتی کو تلاش کرنے کے بعد واپس آؤں گا۔ جاؤ اب تیاری کرو۔“

بہن اور بھائی

رات کے پچھلے پہر شمبھوناتھ محل کے اندرونی دروازے کے سامنے کشادہ چبوترے پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو اور نوکر چارپائیوں پر لیٹے خرّاٹے لے رہے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور فضا میں کسی قدر تلخی تھی۔ ایک پہریدار بھاگتا ہوا چبوترے کی طرف بڑھا اور اس نے شمبھوناتھ کو جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہا۔ ”چچا شمبھو! اٹھیے، سردار رنبیر آ گئے ہیں۔“

شمبھوناتھ نے ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”کب آئے؟ کہاں ہیں

وہ؟“

پہریدار نے باہر کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر دیکھیے وہ آرہے ہیں۔“

شمبھوناتھ کو صحن میں تھوڑی دور ایک مشعل بردار کے پیچھے محل کے چند نوکروں اور پہریداروں کے درمیان رنبیر دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو جگایا اور سرہانے سے اپنی پگڑی اُٹھا کر جلدی جلدی سر پر لپیٹتا ہوا صحن کی طرف بڑھا۔ پگڑی اس کے سر کی ضرورت سے بہت بڑی تھی۔ چبوترے کی سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے اس کا آخری سرا ابھی تک فرش پر جھاڑو دے رہا تھا۔ پہریدار نے غلطی سے زمین پر گھسٹتے ہوئے سرے پر پاؤں رکھ دیا اور شمبھوناتھ اپنی گردن میں ایک جھٹکا محسوس کرنے کے بعد پگڑی کے بوجھ سے آزاد ہو گیا۔ عام حالات میں وہ محل کے باقی نوکروں کی ایسی گستاخیاں برداشت کرنے کا عادی نہ تھا، لیکن رنبیر کو قریب آتا دیکھ کر وہ پہریدار کو صرف گدھے کے لفظ سے یاد کرنے کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا اور پگڑی وہیں چھوڑ کر بھاگتا ہوا آگے

بڑھا۔

"مہاراج! مہاراج! آپ آ گئے۔ بھگوان نے بڑی کِرپا کی ہے۔ شکنتلا دیوی مدّت سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر رنبیر کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن رنبیر نے جلدی سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

شمبھوناتھ نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! ہم بہت پریشان تھے۔ شکنتلا دیوی صبح و شام آپ کی راہ دیکھا کرتی ہے۔ ابھی آپ کے انتظار میں ان کے کمرے میں چراغ جل رہا ہو گا۔ وہ اس گرمی میں بھی رات کے وقت وہیں سوتی ہے۔۔۔ میں اسے خبر دیتا ہوں مہاراج!"

"نہیں چچا! میں خود اسے جگاؤں گا۔" رنبیر نے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں دوسرے نوکر ایک نوکرانی کو جگا کر دروازہ کھلوا چکے تھے۔ رنبیر اندر داخل ہوا اور اندرونی صحن کو عبور کرنے کے بعد بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنے مکان کے ایک روشن کمرے میں کھڑا تھا۔ اس مسافر کی طرح جو مدّتوں ایک

بے آب و گیارہ صحرا میں بھٹکنے کے بعد اپنی امیدوں کا نخلستان دیکھ رہا ہو۔

شکنتلا اپنے بستر پر سو رہی تھی، اور وہ یوں محسوس کر رہا تھا کہ وقت کی آندھیاں تھم چکی ہیں۔ اس کی ننھی بہن ایک عورت بن چکی تھی، لیکن اس کے چہرے پر ابھی تک ایک بچّے کی معصومیت تھی۔ رنبیر کچھ دیر بستر کے قریب بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں تشکّر کے آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ بالآخر اس نے جھُک کر شکنتلا کی پیشانی پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ''شکنتلا! شکنتلا!''

''کون؟'' شکنتلا نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

''شکنتلا! شکنتلا! میں رنبیر ہوں۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

شکنتلا چند ثانیے سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ رنبیر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ اٹھی اور بے اختیار اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ ''بھیّا! بھیّا!'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ الفاظ کا تلاطم

ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے سسکیوں میں تبدیل ہو کر رہ گیا اور وہ ایک بچّے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اچانک وہ پیچھے ہٹی اور غور سے رنبیر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ رنبیر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"بھیّا! بھیّا! شکنتلا نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ "مجھے بتاؤ کہیں یہ سپنا تو نہیں۔"

رنبیر نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر دوبارہ اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں شکنتلا۔ یہ سپنا نہیں۔ اب ہم ایک دوسرے کے متعلق سپنے نہیں دیکھا کریں گے۔ اب تمہیں اپنے بھائی کے لیے ہر رات دیا جلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

تھوڑی دیر بعد بہن اور بھائی آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے پر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی مسکراہٹیں نچھاور کر رہے تھے۔ شکنتلا نے کہا۔ "بھیّا! میں اپنے سپنوں میں ہمیشہ دیکھا کرتی تھی کہ آپ رات کے وقت آئے ہیں، اس کھڑکی کے راستے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ ”ایک دفعہ میں اس کھڑکی کے راستے آیا تھا لیکن یہاں تمہاری جگہ ایک اور لڑکی تھی۔“

”جے کرشن کی لڑکی۔ میں اس کے متعلّق سُن چکی ہوں۔ اسے ہماری نوکرانی نے بتایا کہ میرے کمرے میں رات کے وقت لکشمی دیوی آیا کرتی ہے چنانچہ وہ بھی میری طرح ساری رات دیپ جلائے رکھتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں بھی کہتی ہیں کہ وہ جے کرشن سے مختلف تھی۔ اس میرے گُم ہو جانے سے بہت دکھ ہوا تھا اور جے کرشن نے صرف اس کے مجبور کرنے پر میری تلاش کے لیے انعام مقرر کیا تھا۔“

زبیر نے کہا۔ ”شکنتلا! اس وقت میں تمہارے متعلّق سُننا چاہتا ہوں۔“

شکنتلا بولی۔ ”نہیں بھیّا۔ اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہوں گے۔ جب آپ سو کر اُٹھیں گے تو میں پہروں آپ کے ساتھ باتیں کر سکوں گی۔ یہاں شاید آپ کو گرمی محسوس ہو، میں اوپر بارہ دری میں آپ کا بستر بچھا دیتی ہوں۔“

رنبیر نے جواب دیا۔ ”اب مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ تمہیں دیکھنے سے تھکاوٹ کا احساس نہیں رہا۔“

”تو میں کچھ کھانا لاتی ہوں۔“ شکنتلا یہ کہہ کر اُٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

رنبیر نے کہا۔ ”شکنتلا! ٹھہرو! کھانے کی ضرورت نہیں۔ کسی نوکر سے کہو، میرے لیے صرف دہی کا ایک کٹورا لے آئے۔ کھانا میں نے راستے میں ایک سردار کے ہاں کھا لیا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد شکنتلا رنبیر کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی اسے اپنی سرگزشت سُنا رہی تھی۔

۲

طلوعِ سحر کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ کئی دِنوں کی مسلسل بے آرامی کے باوجود رنبیر کو نیند یا تھکاوٹ کا احساس تک نہ تھا۔ اچانک اسے دور سے ایک آواز دی اور اس نے شکنتلا کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرتے

ہوئے کہا۔ ”یہ کیسی آواز ہے شکنتلا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گاؤں میں کوئی مسلمان اذان دے رہا ہے۔“

شکنتلا نے غور سے اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ ”ہاں بھیّا! یہاں ایک اجنبی آیا ہوا ہے اور اس کی باتیں سن کر گاؤں کے چند آدمی مسلمان ہو چکے ہیں۔ چچا شمبھو کہتا ہے کہ اس کی زبان میں جادو ہے۔“

”شکنتلا تم آرام کرو میں ذرا باہر جانا چاہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے رنبیر اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

شکنتلا نے قدرے پریشان ہو کر سوال کیا۔ ”بھیّا؟ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں آکر بتاؤں گا شکنتلا!“ رنبیر یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

شکنتلا دیر تک پریشانی کی حالت میں بیٹھی رہی پھر اُٹھ کر اوپر چھت پر جا کر کھلی ہوا میں ٹہلنے لگی۔ آسمان پر بادل چھٹ چکے تھے اور مشرقی افق پر

طلوعِ آفتاب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ کچھ دیر چھت پر ٹہلنے کے بعد شکنتلا تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی نیچے اُتری اور ایک خادمہ کو ناشتہ تیار کرنے کا حکم دے کر پھر اوپر آ گئی۔

"بھیّا کہاں گئے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی۔" وہ بار بار اپنے دل میں یہ سوال دہرا رہی تھی۔ بالآخر وہ بارہ دری کے اندر جا کر سنگِ مرمر کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔

"شکنتلا! شکنتلا!" اسے اچانک رنبیر کی آواز سنائی دی اور وہ اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رنبیر سیڑھیوں سے نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ "بھیّا!" شکنتلا نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "آپ نے بہت دیر لگائی۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ کہاں گئے تھے آپ؟"

رنبیر نے چبوترے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ شکنتلا۔" شکنتلا بیٹھ گئی اور رنبیر کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ رنبیر نے قدرے توقّف جے بعد کہا۔ "شکنتلا! میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔

میں۔۔۔‘‘

رنبیر متذبذب سا ہو کر شکنتلا کی طرف دیکھنے لگا۔

’’ہاں بھیّا کہو! آپ رُک کیوں گئے؟‘‘

’’مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم مجھ سے روٹھ نہ جاؤ۔‘‘

’’بھیّا! میں آپ سے روٹھ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرے لیے اچھائی اور برائی کا معیار آپ کی پسند ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہی نا کہ آپ مسلمان ہو چکے ہیں۔‘‘

’’ہاں، لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟‘‘

’’پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ یہی کہنا چاہتے تھے نا؟‘‘

’’ہاں! میں یہی کہنا چاہتا تھا۔‘‘ رنبیر نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

’’اور آپ اذان سن کر نماز پڑھنے گئے تھے؟‘‘

”ہاں!“

”بھیّا! مجھے آپ سے یہ گلہ رہے گا کہ یہ خبر آپ نے سب سے پہلے مجھے کیوں نہ سنائی۔ مجھے تو اسی دن معلوم ہو گیا تھا جب آپ کے دوست یہاں آئے تھے۔“

”کون عبدالواحد؟“

”ہاں!““لیکن انہیں تو معلوم نہیں کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ میں نے تو اس دن کلمہ پڑھا تھا جب تمہارے گھر پہنچنے کا پیغام ملا تھا۔“

”انہوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی باتیں سننے کے بعد میرا دل گواہی دیتا تھا کہ ان کا کوئی دوست ان کے مذہب سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ ان کا دشمن بھی انہیں قریب سے دیکھنے کے بعد ان کے مذہب سے نفرت نہیں کر سکتا۔“

”اور مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ میری ننھی بہن میری زبان سے اسلام کا نام سن کر میرا منہ نوچنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔ آج نماز کے بعد میں نے

انتہائی عاجزی سے یہ دُعا مانگی تھی کہ خدا تمہیں بھی اسلام قبول کرنے کی توفیق دے۔"

شکنتلا کی آنکھوں میں مسرّت کے آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "بھیّا! آپ کی دُعا قبول ہو چکی ہے۔ میں کئی دنوں سے اسلام کی صداقت پر ایمان لا چکی ہوں اور آج میں گاؤں کی تمام عورتوں کو بلا کر یہ اعلان کر دوں گی کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔"

تھوڑی دیر دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر شکنتلا نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بات پر خفا تو نہیں ہوں گے بھیّا!"

"میں تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتا شکنتلا! مجھے تم پر فخر ہے۔ اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ میری بہن کا ضمیر اس قدر روشن ہے تو میں اتنی مدّت تذبذب کی حالت میں نہ گزارتا۔ میرے لیے دُعا کیا کرو کہ خدا مجھے ہمّت اور استقامت دے۔"

”بھیّا! آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میری تمام دعائیں آپ کے لیے ہوتی ہیں۔ میرے علاوہ اس گاؤں کے کئی لوگ آپ کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔“ رنبیر نے کہا۔ ”آج جب میں نماز کے لیے پہنچا تو جماعت شروع ہو چکی تھی۔ میں پچھلی صف میں کھڑا ہو گیا۔ نماز کے بعد سب لوگوں نے مجھے دیکھا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑے۔ امام نے مجھے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ میں نے ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ میں آج ظہر کی نماز کے بعد گاؤں کے تمام لوگوں کو اسلام کی دعوت دوں گا۔“

شکنتلا نے جواب دیا۔ ”اسلام کے مبلّغ کی بیوی قریباً ہر روز میرے پاس آیا کرتی ہے۔ میں نے بھی اس سے وعدہ کیا تھا کہ جس دن میرا بھائی آ جائے گا میں گاؤں کی تمام عورتوں کے سامنے مسلمان ہونے کا اعلان کروں گی۔“

رنبیر نے کہا۔ ”فرض کرو اگر میں گمراہی کا راستہ نہ چھوڑتا تو۔“

”بھیّا! مجھے یقین تھا کہ آپ اسلام کی روشنی سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔“

”صرف عبدالواحد کی باتوں سے تمہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا؟“

شکنتلا نے جواب دیا۔ ”مجھے صرف اس کی باتوں سے ہی اس بات کا یقین نہیں ہوا تھا بلکہ جے کرشن کی بیٹی کے ساتھ جو سلوک آپ نے کیا تھا وہ بھی مجھے اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ آپ کے خیالات میں ایک بہت بڑا انقلاب آ چکا ہے۔ جب میں نے یہ کہانی اسلام کے مبلّغ کی بیوی کو سُنائی تھی تو اس نے بھی یہ کہا تھا کہ تمہارا بھائی دینِ اسلام سے دور نہیں رہ سکتا۔“

رنبیر نے کہا۔ ”میں نے دین کے ساتھ اپنا نام بھی تبدیل کر لیا ہے اور آج سے تم اپنے بھائی کو رنبیر کی بجائے یوسف کے نام سے پکارا کرو گی۔“

”یوسف! مجھے یہ نام بہت پسند ہے بھیّا۔۔ اور آج سے ہم دونوں ایک دوسرے کو نئے ناموں سے پکارا کریں گے۔“

”ابھی تک میں نے تمہارے لیے کوئی نیا نام نہیں سوچا۔“ ”آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے مبلّغ کی بیوی مجھے زبیدہ کے نام سے پکارا

کرتی ہے اور مجھے یہ نام پسند ہے۔“

شام تک یہ دو نئے نام گاؤں کے ہر بچّے اور بوڑھے کی زبان پر تھے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر گاؤں کے نصف سے زیادہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور مٹّی کے اس چبوترے کی جگہ جہاں آٹھ دس آدمی نماز کے لیے جمع ہوا کرتے تھے ایک مسجد تعمیر ہو رہی تھی۔

رنبیر کے نوکروں میں شمبھو ناتھ نے سبقت کی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ رنبیر اور شکنتلا مسلمان ہو چکے ہیں تو وہ سیدھا اسلام کے مبلّغ کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھنے لگا۔ ”یوسف کا کیا مطلب ہے؟“

مبلّغ نے جواب دیا۔ ”یوسف پیغمبر کا نام ہے۔“

”پیغمبر کون ہوتے ہیں؟“

”خدا اپنے جن بندوں کو انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجتا ہے، انہیں پیغمبر کہا جاتا ہے۔“

”یوسف کے کسی نوکر کا نام آپ کو یاد ہے؟“

”ان کے کسی نوکر کا نام تو مجھے معلوم نہیں لیکن اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”مہاراج! میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے سردار مسلمان ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنا نام بدل کر یوسف رکھ لیا ہے۔ میں بھی مسلمان ہونا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ میرا نام بھی تبدیل کر دیں۔“

”تو آپ مسلمان ہو جائیں پھر کوئی نام سوچ لیا جائے گا۔“

”میں تیار ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد شمبھو ناتھ محل سے واپس آیا اور تمام نوکروں کو جمع کر کے اعلان کہا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور میرا نام ابراہیم ہے۔ ہر شخص اچھی طرح سُن لے اور مجھے کسی نے شمبھو ناتھ کہا تو اس کی خیر نہیں۔

۳

یوسف دن بھر یا تو مسجد کی تعمیر کے کام کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا یا آس پاس کی بستیوں میں جا کر اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ زبیدہ گاؤں کے

مبلغ کی بیوی سے قرآن کا درس لیا کرتی تھی۔ گاؤں کی نو مسلم عورتوں کے لیے اس کے محل کا دروازہ کھلا رہتا اور وہ بھی زبیدہ کے ساتھ قرآن پڑھا کرتی تھیں۔

رات کے وقت سونے سے پہلے بہن اور بھائی دیر تک آپس میں باتیں کرتے تھے، پرانے وقتوں کی باتیں۔ زبیدہ، یوسف کو اپنے مصائب کے دور کی تفصیلات سنایا کرتی تھی اور وہ اس کے سامنے نندنہ کی قید کے زمانے کے مختلف واقعات بیان کیا کرتا تھا۔ یوسف کی اکثر داستانوں میں عبدالواحد کا ذکر ضرور آتا تھا۔ بھائی کی طرف سے بے پناہ محبت اور عقیدت کے اظہار نے عبدالواحد کی شخصیت کو زبیدہ کے لیے اور زیادہ پُر شکوہ بنا دیا تھا۔ آخری ملاقات کے بعد عبدالواحد اس کی آرزوؤں اور اُمّیدوں کا مرکز بن چکا تھا اور مستقبل میں اسی کی دائمی رفاقت کے تصور سے سرشار رہا کرتی تھی۔ لیکن بعض اوقات بھائی کی باتیں سننے کے بعد وہ یوں محسوس کرتی جیسے وہ محض سپنوں کی دنیا میں جی رہی ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتی عبدالواحد سرکشوں کی گردنیں جھکانے، گرے ہوؤں کو سہارا

دینے، مظلوموں کے آنسو پونچھنے اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ وہ میری کسی خوبی سے متاثر نہیں ہوا۔ اگر میری جگہ کوئی اور لڑکی مصیبت میں گرفتار ہوتی تو وہ اسے بھی اپنی توجہ کا مستحق سمجھتا۔۔۔ ایسے خیالات سے اس کا دل تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ پھر وہ پہلی ملاقات کا تصوّر کرتی اور اس کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہونے لگتے۔ ”وہ مجھے دیکھتے ہی تھوڑی دیر کے لیے مبہوت سا کیوں ہو گیا تھا؟ یہ آشا کون ہے؟ اس نے مجھے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیوں کیا تھا؟“

ایک دن یوسف نندنہ کے کسی قیدی کا حال سنا رہا تھا۔ زبیدہ نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ ”بھیّا! عبدالواحد کی بیوی زندہ ہے؟“

یوسف نے جواب دیا۔ ”ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی۔“

زبیدہ نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”پوچھو!“

”یہ آشا کون تھی؟“

یوسف نے حیران ہو کر کہا۔ ”تمہیں آشا کے متعلق کیسے معلوم ہوا۔“

”مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ جب آپ کے دوست نے پہلی بار مجھے دیکھا تو ان کے منہ سے بے اختیار آشا کا لفظ نکل گیا تھا۔ پھر انہوں نے پریشان سا ہو کر کہا تھا کہ تمہاری صورت کسی اور لڑکی سے ملتی ہے اور میری نگاہیں دھوکا کھا گئی تھیں۔ پھر جب وہ یہاں آئے تھے تو میں نے صرف اس خیال سے کہ آشا ان کی بیوی ہو، ان سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ابھی تم اس سوال کا جواب نہ پوچھو۔ جب تمہارا بھائی آئے گا تو وہ تمہیں آشا کے متعلق بہت کچھ بتا سکے گا۔“

یوسف نے پوچھا۔ ”کیا انہوں نے یہ کہا تھا کہ تمہاری صورت آشا سے ملتی ہے؟“

"ہاں!" یوسف نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ "انہوں نے مجھے خود آشا کی کہانی سنائی تھی۔ اور یہ اس قدر دردناک ہے کہ تمہیں سن کر تکلیف ہو گی۔"

"میں ضرور سنوں گی بھیّا!"

"بہت اچھا۔" یوسف نے یہ کہ کر عبدالواحد اور آشا کی داستان شروع کر دی۔ جب وہ اس المناک کہانی کا آخری حصّہ سنا رہا تھا تو زبیدہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ عبدالواحد اب اس کے لیے ایک معمّہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسا انسان تھا جسے اپنی تمام عظمت اور شوکت کے باوجود کسی کی محبت کے سہارے کی ضرورت تھی۔ "کیا میں اس کی آشا بن سکتی ہوں؟" وہ اپنے دل سے بار بار یہ سوال پوچھ رہی تھی۔

بستر پر لیٹنے کے بعد اسے دیر تک نیند نہ آسکی۔ آشا کا لفظ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ پھر وہ سپنوں کی دنیا میں جا چکی تھی۔ وہ آشا تھی اور عبدالواحد کے ساتھ پہاڑوں، ندیوں اور آبشاروں کے دلکش مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد راجہ کے سپاہی اس کا تعاقب کر رہے تھے اور

وہ ایک بلند پہاڑ پر دوڑ رہے تھے۔ وہ تھک گئی تھی۔ عبد الواحد اسے سہارا دے رہا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ان کے سامنے ایک تاریک کھڈ تھی اور آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ پھر راجہ کے سپاہی انہیں پکڑ کی کالی دیوی کے سامنے لا رہے تھے۔ ایک مہیب انسان چھُرا لیے کھڑا تھا۔ وہ چلّا رہی تھی۔ ہمیں چھوڑ دو۔ بھگوان کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔

۴

ایک روز دوپہر کے وقت یوسف ہانپتا ہوا اپنی بہن کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”زبیدہ! زبیدہ!! وہ آ گئے ہیں۔“

”کون؟“ زبیدہ نے چونک کر سوال کیا۔

”عبد الواحد! مجھے ابھی ان کا پیغام ملا ہے۔ وہ غزنی سے قنوج پہنچ گئے ہیں۔ اور میں کل ان کے پاس جا رہا ہوں۔“

زبیدہ کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔ ”آپ واپس کب آئیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

یوسف نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔“

”انہوں نے آپ کو بلایا ہے؟“

”نہیں، انہوں نے اپنے ایلچی کو صرف میرا پتہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ ایلچی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اگر بہت زیادہ مصروف نہ ہوتے تو خود یہاں آتے۔ اب میں انہیں یہاں آنے کی دعوت دینے جا رہا ہوں۔ مجھے ان سے ایک کام بھی ہے۔“

”کیسا کام؟“ زبیدہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

یوسف نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ زبیدہ میں جب بھی تمہارے متعلّق سوچتا ہوں، میرے خیالات اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد عبدالواحد پر مرکوز ہو جاتے ہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس سے بہتر تمہارے مستقبل کا محافظ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم

ایک دوسرے کے لیے قدرت کا بہترین انعام ثابت ہو سکتے ہو۔ میں جانے سے پہلے تم سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔"

زبیدہ نے جواب دینے کی بجائے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

یوسف نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "زبیدہ! تمہیں میرے انتخاب پر اعتراض تو نہیں۔"

زبیدہ کچھ کہئے بغیر اُٹھی اور بھاگتی ہوئی برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ یوسف کچھ دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "زبیدہ! زبیدہ! اِدھر آؤ!"

زبیدہ جھجکتی اور سمٹتی ہوئی دوبارہ اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اس کی نگاہیں زمین میں گڑی جارہی تھیں اور گالوں پر حیا کی سرخ و سپید لہریں رقص کر رہی تھیں۔ یوسف نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہا۔ "زبیدہ! رام ناتھ! اور روپ وتی کو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں ان کے متعلق پریشان ہوں۔ اگر مجھے تمہارے متعلّق ایک دن

پہلے اطلاع مل جاتی تو میں ان کے ساتھ آتا۔ اب مجھے ڈر ہے کہ وہ کاٹھیاواڑ کی حدود سے گزرتے ہوئے گرفتار نہ کیے گئے ہوں۔ اگر وہ میری غیر حاضری میں یہاں پہنچ جائیں تو ان کا خیال رکھنا۔ رام ناتھ میرا محسن ہے۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔ ممکن ہے وہ کامنی کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ کامنی بہت مظلوم ہے۔ اُسے یہ احساس نہ ہونے دینا کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں بھیّا! میں بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی ہوں۔"

یوسف نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا، میں اب جاتا ہوں۔"

"بھیّا!" زبیدہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

"نہیں پوچھو!"

"آپ کو معلوم ہے کہ اب نرملا کہاں ہے؟"

"میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ سومنات سے کہاں

گئے ہیں لیکن تمہیں اس کا خیال کیوں آیا؟"

"بھیّا! مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ وہ آپ کی طرف سے بہتر سلوک کی حقدار تھی۔ گاؤں کی عورتوں نے مجھے بتایا ہے کہ میرے روپوش ہونے کے بعد وہ مندر میں جاکر میرے لیے دعائیں مانگا کرتی تھی۔ جے کرشن نے اس کے مجبور کرنے پر میرا سراغ لگانے والوں کے لیے انعام مقرر کیا تھا۔ اس نے آپ کی جان بچانے کی بھی کوشش کی تھی۔ نوکرانیوں نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے آنسو اس وقت تک نہیں رکے جب تک اسے یہ خبر نہیں مل گئی تھی کہ آپ جان بچاکر نکل گئے ہیں۔ پھر جب اس نے یہ محل چھوڑا تھا تو وہ رو رہی تھی۔ بھائی جان جب وہ یہاں تھی تو کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خیال آیا تھا کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "اس وقت میں یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ جے کرشن کی بیٹی ہے۔"

"اور اب؟"

"اب اس کے متعلّق سوچنے سے کیا فائدہ۔ ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔" یوسف یہ کہہ کر اٹھا اور سفر کا لباس تبدیل کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

۵

یوسف کو گئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ سہ پہر کے قریب آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ زبیدہ ایک کمرے کے دریچے کے سامنے بیٹھی باہر جھانک رہی تھی۔ اچانک برآمدے میں سے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی تھی اور وہ مُڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ یوسف کمرے میں داخل ہوا اور وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئ۔

"بیٹھ جاؤ زبیدہ۔" یوسف نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

زبیدہ بیٹھ گئ۔ یوسف نے اپنی کمر سے تلوار اتار کر دیوار کے ساتھ کھونٹی پر لٹکا دی اور زبیدہ کے قریب بیٹھ گیا۔ زبیدہ جھکی جھکی نگاہوں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ یوسف

مُسکرایا اور اس کی کائنات مسرّت کے قہقہوں سے لبریز ہو گئی۔

"زبیدہ!" یوسف نے کہا۔ "اگلے چاند کی پانچ تاریخ کو تمہاری برات آرہی ہے۔ مجھے عبدالواحد کے سامنے التجا کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جب میں نے کہا کہ میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں تو اس نے کہا ٹھہرو پہلے میری ایک درخواست سُن کو۔ پھر اس کی باتیں سُننے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی نگاہوں سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ زبیدہ تم ایک داسی نہیں بلکہ رانی کی حیثیت سے اس کے پاس جارہی ہو۔ میرا ارادہ تھا کہ تمہاری شادی بڑی دھوم دھام سے کروں، لیکن عبدالواحد ایسی رسوم کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے ہمراہ برات میں صرف پندرہ بیس آدمی آئیں گے۔ عبدالواحد نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر سال اپنی رخصت کے دن یہاں گزاریں گے۔"

شام تک یہ خبر آس پاس کی بستیوں میں مشہور ہو چکی تھی کہ یوسف کی بہن کی شادی قنوج کے فوجی گورنر سے ہونے والی ہے اور مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں یوسف اور زبیدہ کو مبارک باد دینے آرہی تھیں۔

گیارہ دن بعد زبیدہ اپنے محل کی چھت پر کھڑی نئے مہینے کا چاند دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک صبح وہ دلہن کا لباس پہنے محل کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ گاؤں کی خواتین کے علاوہ قرب و جوار کے نو مسلم اور غیر مسلم سرداروں کی بہو بیٹیاں اس کے گرد جمع تھیں۔ ایک کمسن لڑکی بھاگتی ہوئی اندرونی صحن میں داخل ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”برات آ گئی۔“ آن کی آن میں چند لڑکیاں بھاگ کر بالا خانے کی چھت پر چڑھ گئیں اور باقی عورتیں مکان سے باہر کھلے صحن میں جمع ہو کر برات کا انتظار کرنے لگیں۔ محل کی ڈیوڑھی سے باہر عوام کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ باقی دروازے کے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے اترے اور علاقے کے معزّزین انہیں پھولوں کے ہار پہنانے لگے۔ براتیوں کی تعداد پندرہ تھی۔ ان میں سے آٹھ فوج کے افسر اور باقی قنوج کے با اثر سردار تھے۔ جب یہ لوگ صحن میں داخل ہوئے تو عورتوں نے ملک کی رسم کے مطابق ایک راگ شروع کر دیا۔

برات مہمان خانے کے سامنے ایک وسیع شامیانے کے نیچے بیٹھ گئی۔

عبدالواحد اپنے لباس سے ایک ترک معلوم ہوتا تھا۔ شامیانے کے ارد گرد جمع ہونے والوں کی نگاہیں اس کے چہرے پھر مرکوز تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جب نکاح کی رسم ادا ہو چکی تھی تو پڑوس کے ایک راجپوت سردار کی لڑکی زبیدہ کے کان میں کہہ رہی تھی۔ ”بھگوان کی قسم تمہارا پتی تو دیوتا معلوم ہوتا ہے۔“

اگلی صبح کہار زبیدہ کی ڈولی اُٹھا کر باہر نکلے تو یوسف کی آنکھ سے بے اختیار آنسو اُمڈ پڑے۔

دروازے سے باہر عبدالواحد اور اس کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے بعد یوسف محل کے اندر داخل ہوا تو اسے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز اداس نظر آنے لگی۔ وہ کسی سے بات کے بغیر بالائی منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”میری بہن۔ میری شکنتلا۔ میری زبیدہ۔“ وہ ایک بچے کی طرح سسکیاں لے رہا تھا۔۔۔۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" اس نے کہا۔

خادمہ نے آواز دی۔ "مہاراج! میں ہوں؟"

"کیا بات ہے؟" خادمہ نے جواب دیا۔ "مہاراج! ایک عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے؟"

"کون ہے وہ؟"

کسی نے نحیف آواز میں کہا۔ "جی میں روپ وتی ہوں۔"

"روپ وتی۔" یوسف نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ خادمہ کے ساتھ ایک نحیف اور لاغر عورت کھڑی تھی۔ یوسف چند ثانیے پریشان سا ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "رام ناتھ کہاں ہے؟"

روپ وتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ میں مندھیر سے ایک اور آدمی کے ساتھ یہاں پہنچی ہوں۔ بیماری کے باعث مجھے راستے میں کئی جگہ ٹھہرنا پڑا۔ اب تک انہیں یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

مجھے ڈر ہے کہ وہ گرفتار نہ ہو گئے ہوں۔"

یوسف نے کہا۔"آیئے! اندر بیٹھ کر اطمینان سے بات کیجیے۔"

روپ وتی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

یوسف نے سوال کیا۔"آپ ابھی یہاں آئی ہیں؟"

"نہیں، میں کل آپ کے گاؤں پہنچ گئی تھی لیکن آپ اپنی بہن کی شادی میں مصروف تھے اس لیے میں نے آپ کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم گاؤں کے ایک کسان کے گھر ٹھہر گئے تھے۔"

"آپ کے ساتھ کون ہے؟"

"میرے ساتھ جے کرشن کا ایک نوکر ہے۔"

"کون سا جے کرشن؟"

"نرملا کا باپ۔ اگر وہ میری مدد نہ کرتا تو اب تک دوبارہ سومنات پہنچ چکی ہوتی۔""مجھے تمام حالات اطمینان سے سنایئے۔"یوسف یہ کہہ کر ایک

کرسی پر بیٹھ گیا۔

یوسف دیر تک سر جھکائے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”ان حالات میں رام ناتھ کو آپ سے کئی دن پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔ لیکن آپ گھبرائیں نہیں۔ میں خود مندھیر جاکر اس کا پتہ کروں گا۔ جے کرشن کا نوکر کہاں ہے؟“

روپ وتی نے جواب دیا۔ ”میں اسے دروازے کے باہر چھوڑ آئی ہوں۔“

یوسف نے کہا۔ ”مجھے اگلے ہفتے اپنی بہن کو لینے قنوج جانا تھا۔ اب میں اسے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مندھیر جا رہا ہوں۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ میں تھوڑی دیر میں ان سے مل کر واپس آجاؤں گا اور کل سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ جے کرشن کے نوکر کا نام کیا ہے؟“

”گوبند رام!“ روپ وتی نے جواب دیا۔

”میں اسے مہمان خانے میں بھیج دیتا ہوں۔ آپ یہیں آرام کریں۔

نوکرانی آپ کے لیے کھانا لے آئے گی۔"یوسف یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

دوپہر کے قریب یوسف واپس آ گیا اور اس نے روپ وتی سے کہا۔ "میری بہن اگلے ہفتے واپس آ جائے گی۔ اگر عبدالواحد کو فرصت ہوئی تو وہ بھی اس کے ساتھ چند دن یہاں رہے گا۔ آپ کے علاج کے لیے کسی اچھے طبیب کی ضرورت ہے۔ میں نے عبدالواحد سے کہہ دیا ہے اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ قنوج پہنچتے ہی ایک تجربہ کار طبیب علاج کے لیے بھیج دیں گے۔ میں علی الصبح گوبند رام کو ساتھ لے کر مندھیر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ وہاں مجھے اس کی ضرورت پڑے گی۔"

دشمن کے گھر میں

شام کے وقت نرملا پائیں باغ میں گھوم رہی تھی کہ اچانک گوبند رام اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ خوف اور اضطراب کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ گوبند رام نے ہاتھ باندھ کر پرنام کرتے ہوئے کہا۔ ”میں روپ وتی کر وہاں چھوڑ آیا ہوں۔“

نرملا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تم واپس کب آئے؟“

”میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ سردار گھر پر نہیں تھے اس سے میں خود ہی آپ کو اطلاع دینے آ گیا ہوں۔۔۔۔ میں نے رام ناتھ کے متعلق بہت

بُری خبر سنی ہے۔ اب اسے بچانے کی کوئی صورت نہیں؟"

"نہیں، اب اس کی مدد کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ اور تم بہت دیر میں واپس آئے ہو۔ میں روپ وتی کے متعلق بہت پریشان تھی۔"

"اس کی بیماری کے باعث ہمیں راستے ہی کئی دن رکنا پڑا۔"

نرملا نے پوچھا۔ "رنبیر اپنے گھر میں تھا؟"

گوبند رام نے جواب دیا۔ "ہاں! اور اب وہ میرے ساتھ آئے ہیں۔" ایک ثانیہ کے لیے نرملا کی رگوں کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "رنبیر تمہارے ساتھ آیا ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

"میں انہیں دھرم شالہ میں چھوڑ آیا ہوں۔"

"وہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

"رام ناتھ کا پتہ کرنے۔"

”تمہیں اس کی بہن کے بارے ہی کچھ معلوم ہوا ہے؟“

”جی ہاں! جس دن ہم وہاں پہنچے تھے اسی دن اس کی بہن کی برات آئی تھی۔ اس کی شادی قنوج کے مسلمان حاکم سے ہوئی ہے۔“

”مسلمان سے؟“

”جی ہاں۔ رنبیر خود بھی مسلمان ہو چکا ہے۔“

”تم نے یہ بات شہر میں کسی اور سے تو نہیں کی؟“

”جی نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں میں یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔“

”مجھ سے وعدہ کرو کہ تم پِتا جی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کرو گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”رنبیر کو معلوم ہے کہ تم میرے پاس آئے ہو؟“

”ہاں، انہوں نے خود مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

نرملا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”تم انہیں میری طرف سے کہو کہ اگر آپ ابھی تک ہمیں قابلِ نفرت نہیں سمجھتے تو پِتا جی کے گھر کا دروازہ آپ کے لیے کھلا ہے۔ آپ کو دھرم شالہ میں رکنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ میری دعوت قبول کر لیں تو انہیں وہاں لے آؤ۔۔۔ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گی۔ گھر میں نوکر اگر ان کے متعلق پوچھے تو اسے کہہ دینا کہ انہیں گوالیار سے میرے ماموں نے کسی ضروری کام کے لیے پِتا جی کے پاس بھیجا ہے۔“

گوبند رام نے کہا۔ ”لیکن اگر ٹھاکر جی نے پوچھ لیا کہ آپ اس وقت گھر کیوں جا رہی ہیں تو؟“

”وہ سومنات گئے ہوئے ہیں لیکن اگر وہ یہاں ہوتے بھی تو پِتا جی کے گھر جانے کے لیے مجھے ان سے پُوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔“

گوبند رام کو رخصت کرنے کے بعد نرملا نے محل کا رُخ کیا۔ وہ اپنے دل میں بیک وقت مسرّت، خوف اور اضطراب محسوس کر رہی تھی۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پالکی میں بیٹھی اپنے باپ کے گھر کا

رُخ کر رہی تھی۔

۲

نرملا ایک کمرے کے دروازے میں کھڑی صحن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پیارے لال تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ ”آپ نے مجھے بلایا ہے؟“

وہ بولی۔ ”ہاں، میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ پِتا جی ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟“

”جی مجھے تو وہ یہ کہہ کر گئے تھے کہ وہ شام تک واپس آ جائیں گے لیکن ممکن ہے کہ وہ دوسرے گاؤں کی فصل دیکھنے کے لیے چلے گئے ہوں اور آج رات وہیں ٹھہر جائیں۔“

”تم ابھی گھوڑے پر سوار ہو کر جاؤ اور میری طرف سے یہ پیغام دو کہ ایک مہمان آیا ہے اس لیے آپ ابھی گھر آ جائیں۔“

”مہمان کہاں ہیں؟“

”اب تم وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی جاؤ، مہمان تھوڑی دیر تک یہاں پہنچ جائے گا۔“

پیارے لال نے کہا۔ ”آپ کو گوبند رام کے متعلّق معلوم ہو چکا ہے؟“

نرملا نے جواب دیا۔ ”ہاں لیکن اب باتوں کا وقت نہیں۔ تم فوراً پِتا جی کو لے کر یہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔“

پیارے لال کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن نرملا کے تیور دیکھ کر خاموشی سے اصطبل کی طرف چل دیا۔ نرملا کچھ دیر برآمدے میں ٹہلتی رہی، پھر کمرے کے اندر جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ رنبیر کے متعلّق ہر لحظہ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

یوسف اور گوبند رام جے کرشن کے مکان میں داخل ہوئے۔ گوبند رام نے یوسف کے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک خادمہ کھڑی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر یوسف سے سوال کیا۔ ”آپ گوالیار سے آئے ہیں۔“

یوسف اس سوال کا جواب سوچ رہا تھا کہ گوبند رام بول اٹھا۔ ”ہاں! انہیں اندر لے جاؤ۔“

”آیئے!“

یوسف نوکرانی کے پیچھے ہو لیا۔ وسیع صحن سے گزرنے کے بعد وہ ایک برآمدے میں داخل ہوئے اور خادمہ نے ایک روشن کمرے کے دروازے کے سامنے رُکتے ہوئے کہا۔ ”آپ اندر تشریف رکھیں، میں نرملا دیوی کو بلاتی ہوں۔“

یوسف جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہر لحظہ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنے دائیں ہاتھ دوسرا دروازہ کھلنے کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا اور اچانک کھڑا ہو گیا۔ نرملا دروازے میں کھڑی تھی۔ یوسف نے نگاہیں جھکا لیں لیکن ایک تصویر بدستور اس کے دماغ کی سطح پر گھوم رہی تھی۔ ”تشریف رکھیے۔“ نرملا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

یوسف دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

نرملانے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ ”پِتاجی آج فصل دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ مجھے اُمّید ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔“

یوسف نے کہا۔ ”آپ کو علم ہے میں کس لیے آیا ہوں؟

”نرملانے یوسف کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں! مجھے معلوم ہے۔ لیکن اب رام ناتھ کو بچانا کسی کے بس کی بات نہیں رہی۔ وہ سومنات کے پروہت کی قید میں ہے۔“

”آپ کو یقین ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے؟“

”ہاں۔ وہ اس کو قتل نہیں کریں گے۔ وہ اسے ہر روز موت سے زیادہ بھیانک سزائیں دینے کے لیے زندہ رکھیں گے۔ وہ اس سے یہ پوچھتے ہوں گے کہ روپ وتی کہاں ہے۔ اسے مندر سے نکالنے والے کون تھے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ آپ کا دوست ہے اور آپ کو اس کی وجہ سے بہت صدمہ ہوگا لیکن کاش میں اس کی مدد کر سکتی۔“

یوسف نے کہا۔ ”آپ نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس کے لیے میں آپ اور آپ کے پِتا جی کا احسان مند ہوں۔“

”آپ کے منہ سے الفاظ میرے لیے بہت بڑا انعام ہیں۔ میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔“

”کہیے!“

”میرے ساتھ یہ وعدہ کیجیے کہ آپ سومنات میں رام ناتھ کا پیچھا نہیں کریں گے۔“

یوسف نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ اس وقت میں وہاں جا کر کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کسی دن مجھے اس بات کی اُمّید ہو گئی کہ میں اپنی جان پر کھیل کر اپنے دوست کی جان بچا سکتا ہوں تو میں وہاں ضرور جاؤں گا۔“

”میں بھی یہی کہنا چاہتی ہوں کہ اس وقت اگر آپ وہاں جانے کا خطرہ مول بھی لیں تو بھی اپنے دوست کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“

”میرا فوراً وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں لیکن وہ دن بہت جلد آرہا ہے جب سومنات کی دیواریں میرا راستہ نہیں روک سکیں گی۔“

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر نرملا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے لیے کھانا منگواتی ہوں۔“

”نہیں، کھانا میں نے شام ہوتے ہی کھالیا تھا۔“

”تو میں دودھ لاتی ہوں۔“

”نہیں، ابھی، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

نرملا مایوس سی ہو کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے کہا۔ ”مجھے آپ کی بہن کا سُن کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں اس کی شادی پر ایک تحفہ بھیجنا چاہتی ہوں۔“

یوسف مسکرایا۔ ”آپ کا تحفہ اسے مل چکا ہے۔“

”کون سا تحفہ؟“

”وہ کنگن جو آپ وہاں چھوڑ آئی تھیں۔“

”وہ میرے نہ تھے۔“نرملا کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

یوسف نے کہا۔ ”آپ کے پِتا بھی ابھی تک نہیں آئے۔ میں جانے سے پہلے اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔“

نرملا نے جواب دیا۔ ”میں نے انہیں بُلانے کے لیے نوکر بھیج دیا ہے۔ لیکن آج آپ نہیں جاسکتے۔“

”یہ آپ کا حکم ہے؟“

”نہیں یہ التجا ہے۔ اگرچہ مجھے اب آپ سے التجا کرنے کا بھی حق نہیں رہا۔“

یوسف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اچانک اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک کھڈ کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ اس کا ضمیر کہہ رہا تھا۔ ”یوسف سنبھل جاؤ۔ تم ماضی کو واپس نہیں لا سکتے۔ تمہارے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار کھڑی ہے۔ تمہارے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔“ اس نے کرب کی

حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔

نرملا شاید اس کے چہرے سے اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”رنبیر! رنبیر میری طرف دیکھو۔“

یوسف کا سارا جسم کپکپا اُٹھا۔ اس نے گردن اُٹھا کر نرملا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یوسف نے دوبارہ آنکھیں نیچی کرتے ہوئے کرب انگیز آواز میں کہا۔ ”نہیں نہیں۔ مجھے آپ کی طرف دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ زندگی میں ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جُدا ہو چکے ہیں۔ میرا نام رنبیر نہیں یوسف ہے۔“

”مجھے معلوم ہے آپ مسلمان ہو چکے ہیں لیکن میں ہر راستے میں آپ کا پیچھا کروں گی۔“

یوسف کی مدافعانہ قوّتیں پوری شدّت سے بیدار ہو چکی تھیں۔ اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش نہ کریں کہ میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔“

نرملا نے کہا۔ ”میں آپ کو جانے سے نہیں روک سکتی لیکن میں آپ کو ہمیشہ پکارتی رہوں گی۔“ یوسف نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ ”لیکن نرملا اب تمہاری شادی ہو چکی ہے۔“

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا مذاق نہ اُڑاؤ رنبیر۔ میرے بلیدان کو شادی نہ کہو۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔“

یوسف کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔ نرملا چلاّئی۔ ”ٹھہرو رنبیر۔ مجھ سے روٹھ کر نہ جاؤ۔ میں پگلی ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔“

یوسف رُک گیا لیکن اس میں نرملا کی طرف دوبارہ آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمّت نہ تھی۔

خادمہ ہانپتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔ ”نرملا دیوی، سردار جی مہاراج آئے ہیں۔“

نرملا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”انہیں یہاں لے آؤ۔“

خادمہ نے مُڑ کر دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”وہ آ رہے ہیں۔“

یوسف تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔ جے کرشن کمرے میں داخل ہوا۔ نرملا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ۔۔۔۔۔؟“ جے کرشن نے یہ کہہ کر اپنی نگاہیں یوسف کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”میں رنبیر ہوں۔“

جے کرشن چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ رنبیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے۔۔۔۔۔ مجھے یہ اُمّید نہ تھی کہ آپ کسی دن میرے گھر ایک مہمان کی حیثیت سے آئیں گے۔“

یوسف نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کچھ دیر دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

”تشریف رکھیے۔“ جے کرشن نے کہا۔

یوسف کرسی پر بیٹھ گیا۔

جے کرشن اس کے قریب بیٹھ کر نرملا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”بیٹھ جاؤ بیٹی! تم نے انہیں کھانا کھلایا ہے یا نہیں۔“

”نہیں پِتاجی! یہ ہمارے گھر کا کھانا نہیں کھائیں گے۔“

یوسف نے کہا۔ ”میں نے یہاں پہنچنے سے پہلے کھانا کھایا تھا لیکن آپ کا گلِہ دور کرنے کے لیے میں دودھ کے چند گھونٹ پینے کو تیار ہوں۔“

”میں ابھی لاتی ہوں۔“ نرملا یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

جے کرشن اور یوسف کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر جے کرشن نے کہا۔ ”وہ لڑکی آپ کے پاس پہنچ گئی ہے؟“

یوسف جواب دیا۔ ”ہاں! میں اس کے لیے آپ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور میری بہن بھی گھر پہنچ گئی ہے۔“

”کب؟“

وہ گوالیار پر مسلمانوں کے حملے کے فوراً بعد گھر پہنچ گئی تھی۔ مجھے سومنات میں ذرا دیر سے اطلاع ملی۔"

"وہ کہاں تھی؟"

"وہ گوالیار کے ایک غریب کسان کی پناہ میں تھی۔"

جے کرشن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "آپ کو شاید میری بات پر یقین نہ آئے لیکن بھگوان جانتا ہے میں ہر روز آپ کی بہن کے لیے دُعائیں مانگا کرتا تھا۔ میری بیٹی کے ساتھ جو مروّت آپ نے کی تھی وہ ایک پتھر کو بھی موم کر دینے کے لیے کافی تھی۔ آج میری تمنّا کو جو سکون نصیب ہوا ہے اس کا اندازہ شاید آپ نہ لگا سکیں۔"

نرملا چاندی کے کٹورے میں دودھ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ یوسف نے اس کے ہاتھ سے کٹورا لے لیا اور دودھ پینے کے بعد واپس دیتے ہوئے کہا۔ "اب تو آپ کو مجھ سے گلہ نہیں رہا۔"

"نہیں!" نرملا نے اپنے مغموم چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش

کرتے ہوئے جواب دیا۔ خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور نرملا کے ہاتھ سے خالی کٹورا لے کر باہر چلی گئی۔ نرملا اپنے باپ کے اشارے سے اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

یوسف نے کہا۔ ”میں رام ناتھ کا پتا لگانے آیا ہوں۔“

جے کرشن بولا۔ ”مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میں نے اسے خبردار کرنے کی کوشش کی لیکن میرے نوکر کی ذرا سی غفلت نے تمام کام بگاڑ دیا۔ اب وہ پروہت کی قید میں ہے۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتا۔ پروہت کے سامنے اس ملک کے کسی بڑے سے بڑے راجہ کو بھی دم مارنے کی جرأت نہیں۔ رام ناتھ کو اب صرف کوئی غیب کی طاقت ہی بچا سکتی ہے۔“

یوسف نے کہا۔ ”سومنات کے آہنی دروازوں کو توڑنے والی قوّت ظہور میں آچکی ہے۔ جس تلوار کو محمود غزنوی نے بے نیام کیا ہے وہ اس ملک میں سسکتی کراہتی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کی پکار کا جواب ہے۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”آپ کو یقین ہے کہ وہ سومنات تک پہنچے گا۔“

”مجھے یقین ہے۔“

”اور آپ کو ان قوّتوں کا بھی اندازہ ہے جو اس کا راستہ روکنے کے لیے متحد اور منظّم ہو رہی ہیں؟“

”ہاں!“

اور اس کے باوجود آپ یہ سمجھتے ہیں کہ محمود سومنات کو فتح کرلے گا؟“

”ہاں، مجھے یقین ہے کہ اس کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ قدرت نے جس مقصد کی تکمیل کے لیے محمود غزنوی کو منتخب کیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ وہ ایک آندھی کی طرح آئے گا اور سومنات کے دروازے پر پہرہ دینے والی افواج اس کے ایسے تنکوں کا انبار ثابت ہوں گی۔“

اپنی بیٹی کی زبانی روپ وتی کے حالات سُننے کے بعد سومنات کے پروہت جے کرشن کی عقیدت نفرت میں تبدیل ہوچکی تھی، لیکن اس کے باوجود ابھی تک سومنات کے مندر اور اس کی مورتی سے اس کی عقیدت میں

کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے گفتگو کا رُخ بدلنے کی نیّت سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“

”نہیں، اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔“

”آپ اس وقت کہاں جائیں گے؟“

”میں اب واپس جانا چاہتا ہوں۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں آپ کو روک نہیں سکتا۔ پروہت کے جاسوس رام ناتھ کے دوستوں اور ساتھیوں کی تلاش میں ہیں۔ خاص کر اس شہر میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔“

یوسف نے کہا۔ ”جانے سے پہلے میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔“

”کہیے!“ ”قنوج کے راجہ نے آپ کی جائداد کا ایک حصّہ چھین کر میرے پِتا کو دے دیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی جو جائداد ہمارے قبضے میں ہے، آپ کو واپس لوٹا دی جائے۔ میری بہن بھی اس فیصلے میں شریک

ہے۔"

جے کرشن نے حیرت زدہ ہو کر نرملا اور یوسف کی طرف دیکھا اور کہا۔
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کا محل اور آپ کی زمین آپ کو واپس دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

جے کرشن نے مغموم لہجے میں کہا۔ "زبیر! میں پہلے ہی شرم اور ندامت کے بوجھ تلے پسا جا رہا ہوں، بھگوان کے لیے مجھے اور زیادہ شرمسار نہ کرو۔"

یوسف نے پریشان سا ہو کر کہا۔ "اگر آپ کو میری بات سے صدمہ ہوا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں، لیکن آپ کو میرے خلوص پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"مجھے آپ کے خلوص پر شبہ نہیں، لیکن اس محل اور زمین کا ذکر میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

یوسف نے کہا۔ ”ہمیں ماضی کو بھول جانا چاہیے۔ آپ کی جائداد میرے پاس امانت ہے۔ آپ جب چاہیں اسے واپس لے سکتے ہیں۔“

”لیکن وہ جائداد مجھ سے آپ کے پِتا جی نے نہیں بلکہ قنوج کے راجہ نے چھینی تھی۔ اب اس پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا اس پر کوئی حق ہے تو میں آپ کے لیے اس سے دستبردار ہوتا ہوں۔“

”نہیں! میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیں۔ اگر آپ کسی دن اپنے وطن آنے کا فیصلہ کریں تو اپنی جائداد کے متعلق آپ کو میرا وعدہ یاد دلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔“ یوسف یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

جے کرشن نے کہا۔ ”تھوڑی دیر بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔“ یوسف بیٹھ گیا۔ جے کرشن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ تم ایک دن مجھے قتل کرنے کا ارادہ لے کر آئے تھے اور آج تم مجھے قنوج آنے کی دعوت دے رہے

ہو۔ میں اس تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "میں جس اندھیری رات میں بھٹک رہا تھا وہ گزر چکی ہے اور اب میں آپ کو صبح کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے میرے باپ کا قاتل نہیں بلکہ وہ انسان ہے جس نے ایک بے کس لڑکی کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔"

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں اپنے لیے کوئی زبردست خطرہ محسوس نہ کرتا تو شاید میں روپ وتی کی مدد کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔"

"سومنات کے دیوتا کی ناراضی مول لینے سے زیادہ خطرناک بات اور کیا ہو سکتی تھی؟"

"میں نے سومنات کے خلاف بغاوت نہیں کی۔ میرا مقصد روپ وتی کو پروہت کے ظلم سے بچانا تھا۔"

"وہ دن دور نہیں جب آپ سومنات کے مندر کو اس کے پروہت سے

کہیں زیادہ قابلِ نفرت سمجھیں گے۔ میں نے نندنہ کے قید خانے میں جس آفتاب کی روشنی دیکھی تھی وہ یہاں بھی نمودار ہونے والا ہے۔ میں روشنی دیکھنے کے بعد بھی کچھ عرصہ اپنے توہمات کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہا۔ آپ بھی شاید یہی کریں لیکن وہ دن دور نہیں جب میرا اور آپ کا راستہ ایک ہو گا۔ میری طرح آپ کو اس وقت تک سکون نصیب نہیں ہو گا جب تک کہ آپ اَن گنت دیوتاؤں سے منہ موڑ کر اس خُدا کی عظمت اور تقدیس کے سامنے سر نہیں جھکا دیں گے جو زمین اور آسمان کا خالق ہے۔ جس کی بادشاہت میں کوئی شریک نہیں۔ وہ بُت جن کی آڑ میں صدیوں سے ایک انسان نے دوسرے انسان کا شکار کھیلا ہے ایک ایک کر کے ٹوٹ جائیں گے۔ انسانیت کا بول بالا ہو گا۔ چھوت اور اچھوت ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں گے۔ انسان اپنے رنگ اور خون سے نہیں بلکہ اعمال سے پہچانا جائے گا۔"

جے کرشن نے کہا۔ "یعنی تم مسلمان ہو چکے ہو؟"

"ہاں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی کے

سامنے آنکھیں بند نہیں کریں گے۔ اب مجھے اجازت دیجیے اور یہ یاد رکھیے کہ میں آپ کو کسی شرط کے بغیر قنوج آنے کی دعوت دے چکا ہوں۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”ٹھہریے! میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا آپ کو خوشی حاصل ہو گی۔ دنیا میں ہر شخص اپنے گرد ایسے آدمی جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے جنہیں وہ اپنے خیال کے مطابق بہتر کہتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے دل میں مجھے اسلام کا پرچار کرنے کا خیال کیسے پیدا ہوا اور آپ نے اپنے باپ کے قاتل کے بارے میں یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ کسی بلند مقصد کے لیے آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کی آپ میرا جرم معاف کر چکے ہیں، لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ مجھ سے آپ کی نفرت دوستی میں تبدیل ہو چکی ہے؟“

”آپ کو اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے خود ایک ایسے آدمی نے اسلام کی طرف مائل کیا تھا جسے میں اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ نندنہ کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد میں نے ایک پہاڑی کو اپنا آخری مورچہ بنا لیا

تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ اس پہاڑی کا محاصرہ کر لیا۔ میرے لیے جان بچا کر بھاگ نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میرا آخری فیصلہ یہ تھا کہ میں ہتھیار ڈالے کے بجائے دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمی موت کے گھاٹ اُتارنے کی کوشش کروں گا لیکن وہ اپنے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑ کر اکیلا آگے بڑھا۔ اس کی زبان میں جادو تھا اور اس کی باتوں میں آ کر میرے کئی ساتھیوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں میرے لیے زہر میں بجھے ہوئے نشتر تھے۔ اس کی مسکراہٹ میرے لیے ایک گالی تھی۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ وہ میرے تیر کے سامنے آ چکا تھا اور ایک لمحہ کے لیے میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنے مستقبل سے بے پروا ہو کر اسے موت کے گھاٹ اُتار دوں، لیکن اس نے کوئی ایسی بات کہی جس سے زندہ رہنے کی خواہش مجھ پر غالب آ گئی۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ دنیا میں میرا بہترین دوست ہے۔ جنگ میں اگر ہم ایک دوسرے کا سامنا کرتے تو شاید وہ میرا یا میں اس کا قاتل ہوتا۔ لیکن آج میں اسے اپنا بھائی کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔ اسے مجھ سے اس وقت بھی نفرت نہ تھی جب میں تیر

کمان اس کی طرف سیدھی کر چکا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”اور آج آپ یہی خواہش میرے متعلق لے کر آئے ہیں۔“

”ہاں! لیکن میں آپ کو اس وقت تک اسلام قبول کرنے کے لیے نہیں کہوں گا جب تک کہ آپ کا دل اس کی صداقت کا قائل نہیں ہوتا۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”اس وقت کوئی بات میری مجھ میں نہیں آتی۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ سردار موہن چند کا بیٹا مجھ سے انتقام لے چکا ہے۔ اب باقی تمام عمر میری آتما کو چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ رنبیر تم نے مجھے قتل نہیں کیا، لیکن میری دنیا کو ویران ضرور کر دیا ہے۔ اب مجھے دولت اور زمین کی تمنّا نہیں۔ اب مجھے حکومت کے خواہش نہیں۔ تم نے میری تمام دلچسپیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔“

یوسف نے کُرسی سے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بہت جلد اس دنیا میں

آپ کا سواگت کروں گا جو آپ کی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع، رنگین اور پُر بہار ہے۔ جہاں آرزوئیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ ظلم اور استبداد کے قلعے جو مظلوم اور بے بس انسانوں کی ہڈیوں پر تعمیر ہوئے ہیں، صرف ایک جھٹکے کے منتظر ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دینے والوں کا ساتھ نہ دیں۔"

جے کرشن نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کاش یہ سب باتیں میری سمجھ میں آسکتیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اب کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

یوسف نے نرملا کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اٹھی اور اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "پِتا جی! میں ان کی بہن کے لیے ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں۔" پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

۳

جے کرشن اور یوسف خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

نرملا دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے چاندی کی ایک ڈبیہ یوسف کو پیش کی۔ یوسف نے ڈبیہ کھول کر ایک خوبصورت انگوٹھی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری بہن آپ کا تحفہ دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔“

نرملا کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن جذبات کے ہیجان میں اس کی قوّتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ چند لمحات کے لیے اس کی نگاہیں جن میں ہزاروں التجائیں تھیں، یوسف کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یوسف نے جے کرشن کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”چلیے۔“ وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ نرملا بے جس و حرکت کھڑی بر آمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ سن رہی تھی اور اس کی نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہو گئے۔

جے کرشن، یوسف کے ساتھ کھلے صحن میں داخل ہوا تو چاند نمودار ہو چکا تھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے چند نوکر چارپائیوں پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جے کرشن نے گوبند رام کو آواز دی اور وہ بھاگتا ہوا آیا۔ جے کرشن نے کہا۔ ”یہ واپس جارہے ہیں۔ ان کے لیے میرا مشکی گھوڑا تیار کر

دو اور دیکھو پیارے لال کہاں ہے؟"

"مہاراج! وہ اپنی کوٹھڑی کی چھت پر سو رہا ہے۔"

"اسے تم یہاں بھیج دو اور تم ایک کی بجائے دو گھوڑے تیار کرو۔"

گوبند رام چلا گیا۔ یوسف نے جے کرشن سے پوچھا۔ "دو گھوڑے کِس لیے؟"

جے کرشن نے جواب دیا۔ "میں ایک نوکر آپ کے ہمراہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس کا گاؤں آپ کے گاؤں کے قریب ہے۔ جب میں وہاں سے نکلا تھا تو وہ میرے ساتھ آ گیا تھا۔ اب اُسے اپنے رشتہ داروں کی یاد ستاتی ہے۔ اس نے آپ کے خوف سے وہاں جانے کی جرأت نہیں کی۔ اب آپ اُسے تسلّی دے کر اپنے ساتھ لے جائیں اور اسے اپنے پاس نوکر رکھ دیں۔ وہ تھوڑا سا بیوقوف ہے لیکن وفادار ہے۔ اب اس کا یہاں رہنا ویسے بھی ٹھیک نہیں۔ میں نے اسے رام ناتھ کو خبر دار کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ مجھے ڈر ہے اس نے حماقت میں آ کر کسی کو بتا دیا کہ میں نے رام ناتھ کو

بچانے کی کوشش کی تھی تو ہماری شامت آجائے گی۔ لیجیے وہ آرہا ہے۔"

پیارے لال آنکھیں ملتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ جے کرشن نے کہا۔

"پیارے لال! تم اپنے گھر جانا چاہتے ہو؟"

"مہاراج! آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنے گھر جانے کے لیے تیّار ہو جاؤں؟"

"ہاں! اب تمہیں وہاں جانے میں کوئی خطرہ نہیں۔ سردار رنبیر خود تمہارے ساتھ ہوں گے۔"

"سردار رنبیر!"

"ہاں! سردار رنبیر تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ تم انہیں نہیں پہچانتے؟"

پیارے لال جواب دینے کی بجائے بدحواس سا ہو کر یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔

یوسف نے کہا۔ "اب تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں

تمہاری حفاظت کا ذمّہ لے چکا ہوں۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”جاؤ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں نے گوبند رام کو تمہارے لیے گھوڑے پر زین ڈالنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ لیکن یہاں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کون ہیں۔“

”مہاراج! آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ آج تک میں نے رام ناتھ کی متعلّق بھی میں کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن آپ بُرا نہ مانیں تو صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ وہی ہیں؟“

”ہاں! یہ وہی ہیں۔“

”مہاراج! میرا مطلب ہے کہ یہ سردار موہن چند کے بیٹے ہیں؟“

”ہاں! تمہیں یقین نہیں آتا تو جا کر نرملا سے پوچھ لو۔ لیکن باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔“

”مہاراج! مجھے معاف کیجیے، مجھے ان کے یہاں آنے کی اُمّید نہ تھی۔ میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔“

پیارے لال یہ کہہ کر اپنی کوٹھڑی کی طرف بھاگا۔ وہاں سے ایک لکڑی کا چھوٹا سا صندوق نکال کر باہر چاند کی روشنی میں لے آیا اور اسے کھول کر ایک چھوٹی سی تھیلی جس میں نقدی تھی اور کپڑوں کے دو نفیس جوڑے نکالے اور ایک گھڑی میں باندھ لیے۔ پھر اس کے دل میں کوئی خیال آیا اور گٹھڑی بغل میں چبا کر نرملا کی طرف گیا۔ نرملا سے چند باتیں پوچھنے کے بعد اس کے تمام خدشات دور ہو گئے اور وہ تیزی سے اصطبل کی طرف بھاگ گیا۔ گوبند رام دو گھوڑے لیے آ رہا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے ایک گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ ”گوبند رام! میں بہت دور جا رہا ہوں۔ میری کوٹھڑی میں جتنا سامان ہے وہ سب تمہارا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد جے کرشن ڈیوڑھی سے باہر یوسف اور پیارے لال کو الوداع کہہ رہا تھا۔

ملتان سے آگے

کالنجر کی آخری مہم سے واپسی کے بعد قریباً اڑھائی سال سلطان محمود کی افواج جنوب کی رزمگاہوں کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔ اس عرصہ میں سومنات ہندستان کا سب سے بڑا دفاعی حصار بن چکا تھا۔ ملک کے سینکڑوں راجے اور مہاراجے اپنے مضبوط ترین قلعوں کو غیر محفوظ سمجھ کر رسومات کی چار دیواری میں پناہ لے رہے تھے۔ مختلف مندروں کے پجاری اپنی دولت اور سونے چاندی کی مورتیوں کو وہاں منتقل کر رہے تھے۔ سومنات کے پجاری ہندو سماج کے سورماؤں کا خون گرمانے کے لے ملک کے طول و عرض میں چکّر لگا رہے تھے۔ وہ عوام کو سومنات کی

عظمت، قوّت اور ہیبت کے افسانے سنا کر ایک متحدہ محاذ پر جمع ہونے کی ترغیب دیتے۔ آئے دن مختلف سمتوں سے رضاکاروں کی ٹولیاں سومنات پہنچ رہی تھیں۔ "سومنات چلو۔" کی پکار ہندوستان کا قومی نعرہ بن چکی تھی۔ اڑھائی سال کی تیّاریوں کے بعد سومنات کے محافظ یہ سوچ رہے تھے کہ شاید محمود واپس نہ آئے اور ہمیں اپنی قوّت کا مظاہرہ کرنے کے لیے غزنی کا رُخ کرنا پڑے۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب ہندوستان کے شمال میں پانچ دریاؤں کی سرزمین غازیانِ اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپ سے دہل رہی تھی۔ سلطان محمود نے ۲۲ شعبان ۴۱۶ھ کو غزنی سے کوچ کیا اور ماہِ رمضان کے پندرہویں روز ملتان پہنچ کر شہر سے باہر ایک کھلے میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کی باقاعدہ فوج تیس ہزار آزمودہ کار سواروں پر مشتمل تھی لیکن راستے میں ہر منزل پر رضاکاروں کی ٹولیاں اس کے ساتھ شامل ہوتی گئیں۔ ملتان اور سومنات کے درمیان وہ صحرا حائل تھا جس کی بھیانک وسعتوں میں پاؤں رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ راستے میں

کئی کئی منازل تک سپاہیوں اور ان کے گھوڑوں کے لیے خوراک اور پانی ملنے کی امید نہ تھی۔ سلطان نے ہر سپاہی کی رسد اور پانی اٹھانے کے لیے دو دو اونٹ مہیّا کیے۔ اس کے علاوہ بیس ہزار اونٹ صرف پانی لادنے کے لیے وقف کر دیے۔

ماہِ رمضان کے اختتام تک ریگستان کے سفر کی تیّاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ عید کی نماز کے بعد سلطان محمود منبر پر کھڑا ہو کر اپنی فوج کے سپاہیوں اور رضا کاروں کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔

"میرے رفیق! تم سن چکے ہو کہ ہم کل یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں۔ ہماری منزل دور اور راستہ کٹھن ہے۔ سومنات کی جنگ میرے نزدیک ہندوستان کی سرزمین میں کفر اور اسلام کا آخری معرکہ ہے۔ اس جنگ میں ہماری فتح کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے راستے کھل جائیں گے اور ہماری شکست کے ساتھ ان لوگوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے جو اس ملک میں انسانیت کا بول بالا چاہتے ہیں۔ تم وہ خوش نصیب ہو جنہیں قدرت نے باطل کا آخری حصار توڑنے کے لیے

منتخب کیا ہے۔ شہرت اور ناموری کے شوق میں ہم کئی ممالک میں گھوڑے دوڑا چکے ہیں لیکن آج میں جس مقصد کے لیے تمہیں تلوار اُٹھانے کی دعوت دے رہا ہوں وہ میری ذات سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اگر تم میں سے کوئی ایسا ہے جو صرف میری خوشنودی کے لیے جنگ میں حصّہ لینا چاہتا ہے تو اسے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ مجھے صرف ان جانبازوں کی ضرورت ہے جو شہادت کی تمنّا رکھتے ہیں۔ سومنات ان تاریکیوں کی آخری جائے پناہ ہے جن کے تعاقب میں ہم گنگا اور جمنا کی وادیوں میں جا چکے ہیں۔ سومنات کی دیواروں کے سامنے تمہارا مقابلہ ان لوگوں سے ہو گا جو پتھر کی مورتیوں کو خدا کا شریک سمجھتے ہیں۔ ان کی تعداد تمہاری تعداد سے زیادہ اور ان کے وسائل تمہارے وسائل سے زیادہ ہوں گے۔ لیکن یاد رکھو! جن مجاہدوں کے خون سے تمہارے ماضی کی تاریخ کے روشن ترین صفحات لکھے گئے ہیں ان کی تعداد کفّار کے مقابلے میں ہمیشہ کم تھی۔ ایک ہزار یا ایک لاکھ بھیڑوں کی ممیاہٹ ایک شیر کی گرج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سومنات کے پجاریوں کو اپنے لشکر کی تعداد پر ناز ہے۔ انہیں اپنے بتوں کی اعانت پر بھروسہ ہے لیکن اگر تم صدق دل سے اس

بات پر ایمان رکھتے ہو کہ فتح و شکست تمہارے خدا کے ہاتھ میں ہے تو میں تمہیں فتح کی بشارت دیتا ہوں۔ اگر تم خدا کی خشنودی کے لیے آگے بڑھنا چاہتے ہو تو کوئی صحرا، کوی پہاڑ اور کوئی سمندر تمہارا راستہ نہیں روک سکتا۔ اگر تم خدا کے دین کا بول بالا چاہتے ہو تو دنیا کی تمام عظمتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی۔"

اگلی صبح اہلِ ملتان اس عظیم الشّان قافلے کو گرد کے بادلوں میں روپوش ہوتا دیکھ رہے تھے۔ جس کی منزلِ مقصود سومنات تھی۔ دریائے ستلج عبور کرنے کے بعد یہ لشکر اس وسیع صحرا میں داخل ہوا جہاں افق پر نیلگوں آسمان کا کنارا ریت کے ٹیلوں سے ملا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس ریگستان میں کہیں کہیں تھوہر اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سوا سبزہ کا نام ونشان نہ تھا۔ موسمِ سرما کے آغاز کے باعث صحرا کی ہوا میں ایک خوشگوار تبدیلی آچکی تھی۔ دن بھر کی تھکی ماندہ فوج شام کے وقت پڑاؤ ڈالتی تو صحرا کی فضا اونٹوں کی بلبلاہٹ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے گونج اٹھتی۔ رات کے وقت سپاہی ٹھنڈی ریت پر لیٹ جاتے۔ پچھلے پہر پڑاؤ کے ہر

گوشے سے نقّاروں کی صدائیں انہیں گہری نیند سے بیدار کرتیں۔ پھر مؤذّن کی اذان سنائی دیتی اور وہ نماز کے لیے جمع ہو جاتے۔ سورج کی ابتدائی کرنیں اس قافلے کو اگلی منزل کا رُخ کرتے ہوئے دیکھتیں۔

رسد اور پانی کی تقسیم مکمل مساوات کے اصول پر عمل کیا تھا۔ سلطان اور بڑے بڑے جرنیلوں کو بھی اتنا ہی راشن ملتا تھا جتنا ایک عام سپاہی کے لیے مقرر تھا۔

راستے میں سلطان نے لودرواہ کے مشہور قلعے پر حملہ کیا۔ اہل قلعہ نے کچھ دیر ڈٹ مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں کی یلغار کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ سلطان کے سپاہی پتھروں اور تیروں کی بارش سے بے پروا ہو کر سیڑھیوں اور کمندوں کی مدد سے قلعے کی فصیل پر چڑھ گئے اور قلعے کے محافظوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

اس کے بعد قریباً ایک ماہ کے طویل اور صبر آزما سفر کے بعد سلطان کی فوج انہل واڑہ کے سامنے کھڑی تھی۔

۲

انہل واڑہ کے مہاراجہ بھیم دیو کی خود اعتمادی بلا وجہ نہ تھی۔ اس کا لشکر قریباً ایک لاکھ سواروں، دو سو ہاتھیوں اور نوّے ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اس نے سومنات کے پروہت کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ دشمن کی فوج شمال کے صحرا کو عبور کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ چنانچہ سلطان محمود کو سومنات تک پہنچنے کے لیے مشرق کی طرف سے ایک طویل چکر کاٹنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں اگر اس نے سومنات پہنچنے سے پہلے انہل واڑہ کا رُخ کیا تم ہم شمال مشرقی سرحد پر اسے روکیں گے اور وہ ہم سے ٹکّر لیے بغیر براہِ راست سومنات کی طرف بڑھ گیا تو ہم عقب سے حملہ کر کے اس کی فوج کو تتر بتّر کر دیں گے۔ لیکن صحرا کی طرف سے سلطان کی پیش قدمی نے انہل واڑہ کے در و دیوار پر ایک لرزہ طاری کر دیا۔ راجہ بھیم دیو نے تیس ہزار سپاہی دشمن کی پیش قدمی روکنے کے لیے روانہ کر دیے اور باقی فوج کو جو مشرقی سرحد پر متعیّن تھی اپنی راجدھانی کی حفاظت کے لیے جمع ہونے کا حکم دیا۔

ایک صبح راجہ بھیم دیو اپنے تخت پر رونق افروز تھا۔ سلطنت کے اکابر اور ہمسایہ ریاستوں کے باجگزار حکمران اس کے دربار میں حسبِ مراتب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

مہاراجہ نے کچھ دیر خاموشی سے حاضرینِ دربار کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ ”ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہمارے ساتھی ہمارا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ لیکن ہماری فوج کی تعداد اب بھی دشمن سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں اس بات کی ہرگز امید تھی کہ دشمن ریگستان کو عبور کرنے کی جرأت کرے گا لیکن اب ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے تیس ہزار سپاہی شمال کے سرحد پر ہی دشمن کا راستہ روک لیں گے۔ لیکن اگر انہیں دشمن کے دباؤ سے پیچھے ہٹنا پڑا تو سومنات کی جنگ انہل واڑہ کی دیواروں کے سامنے لڑی جائے گی اور ہم دُشمن کو یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ انہل واڑہ کے سورما، قنوج اور گوالیار کے سورماؤں سے کہیں مختلف ہیں۔“

ایک باجگزار راجہ نے اٹھ کر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! اگر

اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔"

"کہیے؟" بھیم دیو نے جواب دیا۔

"مہاراج! ہمارے وہ ساتھی یہاں جمع ہونے کی بجائے سومنات چلے گئے ہیں، میں انہیں بزدلی کا طعنہ نہیں دیتا۔ ہمارے ملک کے کئی نجومی یہ بتا چکے ہیں کہ دشمن سومنات ضرور پہنچے گا۔ آپ کے دربار میں جو راجے اور سردار موجود ہیں ان میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ ملک کے باقی راجاؤں کی افواج کی طرح ہمارے لشکر کو بھی سومنات میں ہی ہونا چاہیے تھا۔ سومنات کی دیواروں سے ہم زیادہ خود اعتمادی اور زیادہ جوش و خروش سے لڑ سکتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر شمالی سرحد پر ہماری فوج کو شکست ہوئی تو انہل واڑہ میں بد دِلی پھیل جائے گی اور ممکن ہے پھر ہمارے کئی اور ساتھی یہاں لڑنے کی بجائے سومنات چلے جائیں۔"

راجہ بھیم دیو نے جوش میں آ کر کہا۔ "اگر تم میں سے کوئی ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہتا ہے تو ہم اس کا راستہ نہیں روکیں گے۔ ہم آخری وقت تک اپنے اس عہد پر قائم رہیں گے کہ محمود کا لشکر ہماری لاشیں روندے بغیر

سومنات کا رُخ نہیں کر سکتا۔ ہم مندھیر کی فوج کو بھی پہنچنے کا حکم دے چکے ہیں۔"

ایک عمر رسیدہ سردار کچھ کہنے کے لیے اٹھا لیکن اچانک سامنے کے دروازے سے انہل واڑہ کے لشکر کا سپہ سالار نمودار ہوا، اور مہاراجہ اور اس کے درباری سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سپہ سالار نے مسند کے قریب پہنچ کر فرشی سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بھیم دیو نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "سینا پتی جی! آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"ان داتا میں۔۔۔۔۔"

"کہیے خاموش کیوں ہو گئے؟"

"اَن داتا! مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ مجھے دشمن کا راستہ روکنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔"

مہاراجہ بھیم دیو نے کہا۔ "تمہارا چہرہ بہت کچھ بتا رہا ہے۔ تم صاف کیوں

نہیں کہتے کہ تمہیں شکست ہوئی ہے۔“

”مہاراج! دشمن کا حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ ہماری فوج کو سمجھنے کا موقع نہ ملا۔ آن کی آن میں اس کے ہر اول دستے ہماری فوج کے دونوں بازوؤں کو چیرتے ہوئے عقب میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد باقی لشکر ہم پر ٹوٹ پڑا۔“

مہاراجہ نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر تم بھاگ نکلے۔ اب ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم کتنی فوج بچا کر لائے ہو۔“

”اَن داتا! ہمارے آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے ہیں۔“

”اور دشمن کا نقصان ہمارے نقصان سے زیادہ ہو گا۔“

”ہاں مہاراج!“

”مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گے۔ شکست کھانے کے بعد ہر سیناپتی یہی کہا کرتا ہے۔ اب ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اطلاع دینے کے لیے تم نے خود یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی؟ کیا باقی تیس ہزار سپاہیوں میں سے

کوئی بھی تمہارا ایلچی بننے کے قابل نہ تھا؟“

”اَن داتا! چند باتیں ایسی ہیں جن کے لیے میرا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ ہمارے اکثر سپاہی یہ خیال کرتے ہیں کہ دشمن کو صرف سومنات کے میدان میں شکست دی جا سکتی ہے۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ واپس آتے ہی تمام لشکر میں بد دلی پھیلا دیں گے۔“

”ہمارے لشکر میں ایسے لوگوں کی تعداد پہلے ہی کم نہیں۔ ہمارے بعض ساتھی تمہاری اطّلاع کا انتظار کرنے سے پہلے ہی سومنات پہنچ چکے ہیں۔“

سیناپتی نے کہا۔ ”مہاراج! مجھے یقین ہے انہل واڑہ میں ہمارا لشکر دشمن کے دانت کھٹّے کر سکتا ہے، لیکن کاش ہم اپنے سپاہیوں کا یہ وہم دور کر سکتے کہ سلطان محمود کو سومنات کے سوا ہر میدان میں فتح ہو گی۔“

”لیکن تم اس وہم کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔“

”میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ دشمن کی قوّت کے متعلّق میرے اندازے غلط تھے۔ وہ ایک سیلاب ہے اور دیوتاؤں کی مدد کے بغیر کوئی

طاقت اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔“

مہاراجہ نے حاضرینِ دربار کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”اب ہمارا سیناپتی بھی ہمیں یہ مشورہ دے رہا ہے کہ ہم اپنی رعایا کو اس کے حال پر چھوڑ کر سومنات بھاگ جائیں۔ لیکن یاد رکھو جو سپاہی ایک بار دشمن کو پیٹھ دکھاتا ہے وہ دوبارہ سینہ تان کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔“

ایک باجگزار راجہ نے اٹھ کر کہا۔ ”مہاراج! لڑائی میں پینترا بدلنے اور بھاگنے میں بہت فرق ہے۔“

مہاراجہ نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے تم جیسے ساتھیوں کی ضرورت نہیں، تم جا سکتے ہو۔ دشمن کے مقابلے کے لیے میری اپنی فوج کافی ہے۔“

راجہ کچھ اور کہے بغیر باہر نکل گیا۔

مہاراجہ بھیم دیو چلّایا۔ ”تم میں سے کوئی اور بھی ہے جو اس کا ساتھ دینا چاہیے؟“

باجگزار ریاستوں کے دو اور مشرقی سرحد کے پانچ سردار اُٹھ کر باہر نکل گئے۔ دربار میں تھوڑی دیر کے لیے سنّاٹا چھا گیا۔

بھیم دیو نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اگر ان لوگوں کے پاس سومنات جانے کا بہانہ نہ ہوتا تو انہیں زندہ زمین میں گاڑ دیتے۔ ہم بزدلوں اور بہادروں کو ایک مورچے میں جمع نہیں کرنا چاہتے۔ سیناپتی جی! آپ بھی ان لوگوں کے ساتھ جاسکتے ہیں۔“

سیناپتی نے کہا۔ ”اَن داتا! آپ کو صحیح حالات سے آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔ اس کے بعد آپ کا جو فیصلہ ہو اس پر عمل کرنا میرا دھرم ہے۔“

اب تم سیتاپتی کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف ایک سپاہی کی حیثیت سے ہمارا ساتھ دے سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر مہاراجہ حاضرینِ دربار کے طرف متوجّہ ہوا۔ ”ہمارا آخری فیصلہ یہی ہے کہ ہم اسی جگہ لڑیں گے۔ اگر تم میں سے کسی کو ہمارے اس فیصلے سے اتفاق ہو تو اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ ابھی سے ہمارا ساتھ چھوڑ دے۔“

ایک سردار نے اٹھ کر کہا۔ ”اَن داتا! ہمارا مرنا اور جینا آپ کے ساتھ ہے۔“

مہاراجہ نے کہا۔ ”ہم ایک بار پھر پوچھتے ہیں کیا تم سب ہمارے ساتھ ہو؟“

”جی مہاراج!“ حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا۔

اس کے بعد کچھ دیر لڑائی کی مختلف تجاویز پر بحث ہوتی رہی پھر دربار برخاست ہو گیا۔

۳

رات کے تیسرے پہر بھیم دیو گہری نیند سے بیدار ہو کر اپنے نئے سیناپتی کی زبانی یہ خبر سُن رہا تھا کہ باقاعدہ فوج کے پندرہ ہزار سپاہی معزول شدہ سیناپتی کی رہنمائی میں سومنات کی طرف روانہ ہو چکے ہیں اور باقی فوج میں بھی عام بغاوت کے آثار پائے جاتے ہیں۔

مہاراجہ نے غصّے سے کانپتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم نے انہیں روکنے کی

کوشش کیوں نہ کی؟“

نئے سیناپتی نے جواب دیا۔ ”مہاراج! میں نے فوج کو اُن کے گرد گھیرا ڈالنے کا حکم دیا تھا لیکن کسی نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ وہ سب یہی کہتے ہیں کہ سومنات کی رکھشا کے لیے جانے والوں کا راستہ روکنا پاپ ہے۔ میں ان کا یہ وہم دور نہیں کر سکتا کہ سومنات کے سوا ہمیں کسی اور میدان میں کامیابی نہیں ہو گی۔ فوج کے افسر کھلم کھلا یہ کہہ رہے ہیں کہ مہاراجہ کو انہل واڑہ میں جنگ کرنے کا فیصلہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ صبح تک فوج کے کئی اور دستے ہمارا ساتھ نہ چھوڑ جائیں۔ دشمن آٹھ پہر کے اندر اندر یہاں پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں فوراً اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیے کہ آخری وقت ہمارے ساتھ کتنی فوج رہ جائے گی۔ اس وقت فوج کے علاوہ شہر کے لوگوں کو بھی تسلّی کی بہت ضرورت ہے۔ وہ اپنے گھروں سے بھاگ رہے ہیں۔“

بھیم دیو نے کہا۔ ”تم اسی وقت چھاؤنی خالی کر دو اور فوج کو شہر پناہ کے اندر جمع کر کے تمام دروازے بند کرا دو۔ کاش میں ایسے بزدلوں کو زنجیروں

میں جکڑ کر دشمن کے آگے ڈال سکتا۔“

سیناپتی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔”کیامہاراج کا آخری فیصلہ یہی ہے کہ ہم انہل واڑہ میں ڈٹے رہیں۔“

”اس وقت ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ تم جاؤ۔“

سیناپتی کمرے سے باہر نکل گیا اور مہاراجہ نڈھال سا ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ساتھ والے کمرے سے مہارانی نمودار ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔”سیناپتی کیا کہتا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ آپ آرام کریں۔“

”لیکن آپ بہت پریشان ہیں۔“ مہارانی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

مہاراجہ کچھ کہنے کو تھا کہ باہر دروازے کے قریب کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی۔”اَن داتا!“

راجہ کے کان اس آواز سے مانوس تھے۔ اس نے کہا۔ ”اندر آ جاؤ۔ کیا بات ہے؟“

محل کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”اَن داتا! شہر کے لوگ محل کے دروازے پر جمع ہو رہے ہیں اور شہر کے برہمنوں کا ایک وفد اس وقت آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔“

مہاراجہ جلدی سے باہر نکلا تو اُسے برآمدے سے تھوڑی دور سینا پتی اور قلعے کے چند فوجی افسر دکھائی دیے۔ سینا پتی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”مہاراج حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ شہر کے لوگ محل کے دروازے پر جمع ہو رہے ہیں اور ہماری فوج کے کئی دستے کی ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ مجھے یہ حالات دیکھ کر دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔“

بھیم دیو نے سراسیمگی کی حالت میں سوال کیا۔ ”وہ کیا چاہتے ہیں؟“

”مہاراج! وہ صرف سومنات چلو کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ لیکن مجھ یقین ہے

کہ آپ کے چند الفاظ انہیں مطمئن کر دیں گے۔“

بھیم دیو نے کہا۔ ”چلو!“

تھوڑی دیر بعد راجہ نے محل کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر لوگوں کے ہجوم کو مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز سومنات چلو کے پُرجوش نعروں میں دب کر رہ گئی۔

اگلی رات جب سلطان محمود کی فوج انہل واڑہ سے صرف ایک منزل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی، مہاراجہ بھیم دیو کنٹھ کوٹ کا رُخ کر رہا تھا۔ ہاتھیوں کے علاوہ بیس ہزار سوار اُس کے ہمراہ تھے۔ اس کے تیس ہزار سپاہی سومنات کے دیوتا کے چرنوں میں جان دینے کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور باقی مغرب کے ساحلی علاقوں میں پناہ لے رہے تھے۔

۴

ٹھاکر رگھوناتھ کے محل سے باہر ایک کھلے میدان میں مندھیر اور اس کے قرب و جوار کے سردار اپنی اپنی فوج کے ساتھ جمع ہو رہے تھے۔ نرملا

محل کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھی تھی، ایک خادمہ نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ''آپ کے پِتا جی آئے ہیں۔'' نرملا نے کہا۔ ''انہیں یہاں لے آؤ۔''

تھوڑی دیر بعد جے کرشن کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ''نرملا تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟''

نرملا نے جواب دیا۔ ''پِتا جی! میں نے ابھی تک مندھیر چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کیا۔''

''بیٹی! اب سوچنے کا وقت نہیں۔ مسلمانوں کی فوج انہل واڑہ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ انہل واڑہ کے متعلق میں نے جو تازہ خبر سنی ہے اس سے میرا اندازہ ہے کہ سلطان محمود کو یہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔''

''انہل واڑہ کے متعلق آپ نے کیا سنا ہے؟''

جے کرشن نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھاکر نے تمہیں نہیں بتایا؟''

''نہیں۔ وہ مجھے صرف سفر کی تیاری کا حکم دے گئے ہیں۔ انہل واڑہ کے

متعلّق انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔"

جے کرشن نے کہا۔ "مجھے علم ہوا ہے کہ سلطان محمود کی پیش قدمی روکنے کے لیے مہاراجہ نے جو فوج شمالی سرحد کی طرف روانہ کی تھی اسے شکست ہوئی ہے اور راجہ کے ساتھیوں میں سے چند راجے اور سردار اپنے اپنے لشکر کے ساتھ سومنات روانہ ہو گئے ہیں۔ گزشتہ رات یہ افواج ہمارے شہر کے قریب سے گزری تھیں۔ اب معلوم نہیں سلطان کا لشکر کب یہاں پہنچ جائے۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"نرملا نے کہا۔ "پِتا جی! میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔"

جے کرشن نے کہا۔ "دیکھو بیٹی! نادان نہ بنو۔ تمہیں مسلمانوں کے متعلق اس قدر مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ جب آندھی آتی ہے تو جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی پھل دار درخت بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ جب وہ آئیں گے تو رنبیر جیسے لوگ تمہیں پناہ دینے کے لیے موجود نہیں ہوں گے۔ جب تک یہ طوفان گزر نہیں جاتا ہمیں مندھیر سے باہر رہنا چاہیے۔ ٹھاکر نے اپنا خزانہ بھی میرے سپرد کر دیا ہے۔ تمہاری وجہ سے مجھے میدانِ

جنگ سے دور رہنے کا بہانہ مل جائے گا۔ لیکن تم نے یہاں ٹھہرنے پر ضد کی تو مجھے ٹھاکر کے ساتھ جانا پڑے گا۔"

ٹھاکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ جلدی کیجیے۔"

"ہم تیار ہیں۔" جے کرشن نے کرسی سے اُٹھ کر جواب دیا۔

ٹھاکر نے نرملا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "نرملا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں کنٹھ کوٹ پہنچنے سے پہلے یہ خبر مل جائے گی کہ ہم نے دشمن کے لشکر کا منہ پھیر دیا ہے۔"

نرملا نے کہا۔ "لیکن میں نے سنا ہے کہ انہل واڑہ کی فوج نے ابھی سے بھاگنا شروع کر دیا ہے۔"

ٹھاکر نے برہم ہو کر جواب دیا۔ "چند بزدل راجوں اور سرداروں کے چلے جانے سے انہل واڑہ کی طاقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب تم جلدی کرو، میں جانے سے پہلے تمہیں رخصت کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک ساعت کے بعد نرملا اور جے کرشن عورتوں اور بچوں کے ایک قافلے کے ساتھ کنتھ کوٹ کا رُخ کر رہے تھے۔ نرملا اپنی دونوکرانیوں کے ساتھ ایک ہاتھی کے ہودج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پانچ ہاتھیوں پر دوسرے سرداروں کے بال بچّے سوار تھے اور دو ہاتھیوں پر ٹھاکر رگھو ناتھ کا خزانہ لدا ہوا تھا۔ باقی عورتیں بچّے اور چند بوڑھے گھوڑے اور بیل گاڑیوں پر سوار تھے۔ قریباً ڈیڑھ دو سو سپاہی ان کی حفاظت پر متعین تھے۔ جے کرشن اس قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔

۵

نرملا کو روانہ کرنے کے بعد ٹھاکر رگھو ناتھ نے بیس ہزار سواروں اور چالیس ہاتھیوں کے ساتھ انہل واڑہ کا رُخ کیا۔ لیکن وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اسے شمال کے افق پر ایک لشکر دکھائی دیا۔ ٹھاکر نے اپنی فوج کو رُکنے کا حکم دیا اور ایک تجربہ کار افسر چند سواروں کے ساتھ آگے بھیج دیا۔ افسر نے واپس آکر اطلاع دی کہ وہ فوج انہل واڑہ سے آرہی ہے۔ سیناپتی ٹھاکر داس خود اس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

”وہ کہاں جارہے ہیں؟“ ٹھاکر نے بدحواس ہوکر سوال کیا۔

”مہاراج!وہ سومنات جارہے ہیں۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر مہاراج کا یہی ارادہ تھا تو انہوں نے ہمیں انہل واڑہ میں جمع ہونے کا حکم کیوں دیا اور ٹھاکر داس تو اب سیناپتی بھی نہیں رہا۔“

افسر نے کہا۔ ”مہاراج! میں ان سے مل کر آیا ہوں۔ وہ میرے تمام سوالات کے جواب میں صرف یہ کہتے ہیں کر تم ٹھاکر جی کو میرے پاس بھیج دو۔۔۔۔ دیکھیے مہاراج! انہوں نے راستہ بھی تبدیل کر دیا ہے۔ شاید وہ ہم سے کترا کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔“

”تم میرے واپس آنے تک فوج کو یہیں روکو!“ ٹھاکر نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

ایک ساعت کے بعد ٹھاکر رگھوناتھ واپس آکر فوج کے سرداروں اور افسروں کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا اور انہل واڑہ سے آنے والا

لشکر آگے جا چکا تھا۔۔۔ انہل واڑہ کے اکابر اور فوج کے افسروں سے دیر تک بحث کرنے کے بعد ٹھاکر نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں اگلے شہر میں پڑاؤ ڈال کر انہل واڑہ کے تازہ حالات معلوم کر لینے چاہئیں۔ چنانچہ غروبِ آفتاب کے قریب اس فوج نے شمال مغرب کی طرف کوئی تین کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے شہر کے باہر پڑاؤ ڈال دیا اور چند سردار سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمراہ انہل واڑہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

اگلی صبح ٹھاکر اپنے قاصدوں کی زبانی یہ خبر سن رہا تھا کہ مہاراجہ بھیم دیو کنتھ کوٹ کی طرف بھاگ گیا ہے اور سلطان کے ہراول دستوں نے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر انہل واڑہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا ہے۔

ٹھاکر نے فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ تیسرے پہر فوج مندھیر سے کوئی چھ سات کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں میں اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں کو پانی پلا رہی تھی کہ ایک سپاہی شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں چلّایا۔ ”مہاراج! مہاراج! ایک اور فوج آ رہی ہے۔“

ٹھاکر اور اس کے ساتھیوں نے مُڑ کر دیکھا تو افق پر سواروں کی ایک دھندلی سی جھلک دکھائی دی۔ ٹھاکر نے کہا۔ ”یہ دشمن کی فوج نہیں ہو سکتی۔ وہ اتنی جلدی یہاں نہیں پہنچ سکتا۔“

ایک عمر رسیدہ سردار نے کہا۔ ”مہاراج! ہو سکتا ہے کہ دشمن نے اپنے ہراول دستے پہلے روانہ کر دیے ہوں۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

ٹھاکر نے گرجتی ہوئی کی آواز میں جواب دیا۔ ”اگر وہ دشمن کے سپاہ ہیں تو ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ میں بھاگنے والوں کا ساتھ نہیں دوں گا۔ بہادر ہمیشہ سینے پر تیر کھاتے ہیں۔“

مندھیر کے سردار تذبذب، پریشانی اور خوف کی حالت میں ٹھاکر رگھوناتھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور ایک ہاتھی پر سوار ہو کر چلّایا۔ ”یاد رکھو! آج سومنات کا دیوتا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ ہم کھلے میدان مین دشمن کا مقابلہ کریں گے۔“

تھوڑی دیر میں مندھیر کی فوج گاؤں سے باہر ایک کھلے میدان میں سومنات کی جے کے نعرے لگا رہی تھی۔ سامنے سے آنے والی فوج کے دستے کوئی نصف میل کے نشانے پر رُک گئے۔ ان کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ مندھیر کے سپاہیوں کی سراسیمگی ایک غایت درجہ کی خود اعتمادی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ رگھو ناتھ کے حکم سے فوج کا ایک افسر گھوڑا بھگاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اطلاع دی کہ وہ سلطان کی فوج کے سپاہی ہیں۔

رگھو ناتھ نے انتظار کیے بغیر فوج کو آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مندھیر کی فوج کے قلب میں ہاتھیوں کا دستہ اور دائیں بائیں اور پیچھے سواروں کی صفیں گرد کے بادل اُڑاتی ہوئی آگے بڑھیں لیکن سلطان کی فوج کے یہ دستے انہل واڑہ سے یلغار کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ اطمینان سے اپنی جگہ کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر بعد مندھیر کے اگلی صفوں کے سوار دشمن کو دونوں پہلوؤں سے گھر کر ہاتھیوں کی زد میں لانے کی غرض سے ایک نصف دائرے کی

صورت میں پھیل گئے اور ہاتھوں کی قطار ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے آگے آ گئی۔ اچانک مسلمانوں کے دستوں میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ ترکمان شہسواروں کے ایک دستے نے مندھیر کی فوج کے بائیں بازو پر حملہ کیا اور اس کے پیچھے فوج کے باقی تمام دستے دشمن کی صف کو چیرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ آن کی آن میں رگھوناتھ کے ہاتھیوں کے سامنے گرد کے بادلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ قبل اس کے کہ مندھیر کی فوج اپنی بدحواسی پر قابو پاتی مسلمانوں کے دستے پلٹ کر دوبارہ حملہ کر چکے تھے اور بائیں بازو کے سوا باقی افراتفری کے عالم میں ہاتھیوں کی صف کی طرف سمٹ رہے تھے۔

عرب اور افغان سواروں کے چند دستوں نے عقب سے چکّر کاٹ کر حملہ کیا اور ہاتھیوں کی صف اور بائیں بازو کے سواروں کے درمیان شگاف ڈال دیا۔

تھوڑی دیر بعد مندھیر کی فوج میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ سوار کسی نظم کے ماتحت لڑنے کی بجائے کئی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔

مسلمانوں کے دستے ایک طرف سے حملہ کرتے اور انہیں تتّر بتّر کرتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے۔ مندھیر کے کئی سوار افراتفری میں اپنے ہاتھیوں کی زد میں آکر ہلاک ہو چکے تھے۔ رگھوناتھ اپنے بڑھاپے کے باوجود جرأت اور ہمّت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے چند بار ہاتھیوں کا رُخ پھیر کر دشمن پر حملہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کے تیز رفتار گھوڑے ہر بار اس کی زد سے بچ کر اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ ایک ساعت کے بعد جب مندھیر کے بعض سردار اپنے اپنے دستوں کے ساتھ میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو وہ اپنے ہاتھی کے ہودج میں کھڑا دونوں ہاتھ بلند کر کے انہیں دھرم کی غیرت کا واسطہ دے رہا تھا۔۔ اچانک دشمن کے کسی سپاہی کا تیر اس کے سینے میں لگا اور وہ تیورا کر ہودج میں گر پڑا۔ یہ دیکھ کر ہاتھیوں کے دستے کے ایک افسر نے اپنے سپاہیوں کو پسپائی کا حکم دیا۔

مندھیر کی بیشتر فوج پہلے ہی میدان سے رفوچکّر ہو چکی تھی۔ ہاتھیوں کے میدان سے نکلنے کی دیر تھی کہ رہی سہی فوج بھی بھاگ نکلی۔ مسلمانوں

نے کوئی تین کوس تک بھاگتے ہوئے لشکر کا پیچھا کیا اور سیکڑوں سپاہی موت کے گھاٹ اُتار دیے۔ بالآخر ان کے سالار نے انہیں رُکنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم آگے نہیں جا سکتے۔ ہمارے گھوڑے جواب دے چکے ہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم آس پاس کی کسی بستی میں قیام کریں گے۔“ پھر اس نے ایک نوجوان افسر کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”تم نماز پڑھتے ہی انہل واڑہ جاؤ اور سلطانِ معظّم اطلاع دو کہ انہل واڑہ سے مندھیر تک راستہ صاف ہو چکا ہے اور ہم کل صبح مندھیر کی چار دیواری سے باہر کمک کا انتظار کریں گے۔

۶

مندھیر کی بستی جہاں مندر کے علاوہ بڑے بڑے سرداروں کے محلّات تھے، قدیم شہر کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سے باہر تھی۔ علی الصبح سلطان کی فوج کے طوفانی دستوں نے شہر سے باہر کمک کا انتظار کرنے کی بجائے شہر کے گرد چکر لگایا اور پھر مشرق کی طرف سے اندر داخل ہو گئے۔ مندر کے سپاہی اور عوام شہر کو خالی چھوڑ کر مندر کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

جب حملہ آوروں نے مندر کا رُخ کیا تو انہیں قدم قدم پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے پے در پے حملے کیے لیکن مندر کے دروازے تک پہنچے میں کامیابی نہ ہوئی۔ مندر کے اندر ہزاروں دروازے کے محافظ کا ایک گروہ پیچھے ہٹتا تو دوسرا گروہ اس کی جگہ لے لیتا۔

اہل مندھیر جس ہوش و خروش سے مندر کے دروازے پر لڑ رہے تھے اگر اسی جوش و خروش سے آگے بڑھ کر جوابی حملہ کرتے تو ان کے لیے مٹھی بھر حملہ آوروں کو شہر سے باہر دھکیل دینا مشکل نہ تھا۔ لیکن شہر کے برہمن انہیں یہ بتا چکے کہ تھے اگر انہوں نے مندر چھوڑ کر کوئی نیا محاذ بنایا تو ان پر دیوتاؤں کا عتاب نازل ہو گا۔

دوپہر سے قبل مندر کے دروازے پر لاشوں کا انبار لگ گیا اور اہلِ مندھیر نے مندر کا دروازہ بند کر لیا لیکن حملہ آوروں کا ایک دستہ ایک جگہ سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ مندر کے محافظوں نے اس دستے کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی لیکن تھوڑی دیر میں چند اور دستے دیوار پھاند کر اندر آ گئے اور انہوں نے مندر کے محافظوں کو ایک طرف

دھکیل کر باقی فوج کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اہلِ مندھیر نے چاروں اطراف سے سمٹ کر ایک جان توڑ حملہ کیا۔ لیکن عین اس وقت جب مندر میں داخل ہونے والے مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ چکے تھے سلطان کی فوج کے دس ہزار مزید سپاہی آ پہنچے اور اہلِ مندھیر کی ہمّت جواب دے گئی۔ وہ سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ کوئی دیوار پھاند کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی تالاب میں کود رہا تھا۔ مندر کے پجاری جو اب اپنی شکست یقینی سمجھتے تھے جنوب کا دروازہ کھلوا کر پرانے شہر کی طرف نکل گئے۔

تیسرے پہر سلطان محمود اپنی بیشتر افواج کو راستے میں ایک منزل کے فاصلے پر یلغار کرتا ہوا مندھیر پہنچا تو مندر کے علاوہ شہر پر بھی مسلمانوں کے پرچم لہرا رہے تھے اور تالاب کے کنارے مندر میں نصب کیے ہوئے ایک ہزار بتوں کے ٹکڑے انسان کے تراشے ہوئے خداؤں کی بے ثباتی کا اعلان کر رہے تھے۔

مندھیر کے مندر کی دولت اس خزانے سے کہیں زیادہ تھی جو انہل واڑہ

میں سلطان محمود کے ہاتھ آیا تھا۔

ستّی

ٹھاکر کے زخمی ہونے کا علم فوج کے چند افسروں اور ان سپاہیوں کے سوا اور کسی کو نہ تھا جو آخری وقت تک اس کے ساتھ تھے۔ رات کے وقت اسے محل میں پہنچانے کے بعد فوج کے افسرِ اعلیٰ نے شہر کے چند معزّزین اور مندر کے پروہت کو صورتِ حالات سے باخبر کیا تو وہ ٹھاکر کو دیکھنے کے لیے آئے۔ ٹھاکر کی حالت نازک تھی۔ پروہت نے شہر کے اکابر سے کہا۔ "ٹھاکر کے زخمی ہونے کی خبر سن کر شہر کے عوام میں بد دلی پھیل جائے گی، اس لیے ہمیں یہ مشہور کر دینا چاہیے کہ ٹھاکر فوج کہ شکست کے بعد مندھیر کی حفاظت کے لیے راجہ بھیم دیو سے ملنے کنٹھ کوٹ گئے

ہیں اور بہت جلد واپس آ جائیں گے۔"

اتفاق سے انہل واڑہ کا شاہی طبیب سندھی مندھیر میں موجود تھا۔ ٹھاکر کے نوکر اسے ٹھاکر کی مرہم پٹّی کے لیے لے آئے۔ اگلے دن سلطان کے ہراول دستے مندھیر پہنچ گئے تو ٹھاکر کی فوج کے افسر نے محل کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے ٹھاکر کو ایک نوکر کے گھر پہنچا دیا اور ایک سوار کو جے کرشن کی طرف یہ پیغام دے کر روانہ کر دیا کہ ٹھاکر زخمی ہو گئے ہیں، اس لیے آپ راستے میں رُک جائیں اور دوسری اطلاع کا انتظار کریں۔ مندھیر فتح کرنے کے بعد سلطان نے رگھوناتھ کے محل میں قیام کیا لیکن اسے معلوم نہ ہو سکا کہ اس محل کا مالک پاس ہی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑا کراہ رہا ہے۔ تیسرے روز سلطان نے اپنے لشکر کے ساتھ کوچ کیا۔ اس کے بعد ٹھاکر کو دوبارہ محل میں لایا گیا۔ منوراج کے علاج کے باوجود اس کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ محل میں پہنچتے ہی اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے تیمار داروں کو دیکھا اور نحیف آواز میں پوچھا۔

"نرملا نہیں آئی؟"

منوراج نے جواب دیا۔ "وہ آپ کے زخمی ہونے کی اطلاع ملتے ہی راستے میں رُک گئے تھے۔ آج صبح دشمن کے یہاں سے کوچ کرتے ہی ان کی طرف ایک سوار بھیج دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کل صبح تک یہاں پہنچ جائیں گے۔"

لیکن ٹھاکر رگھوناتھ زیادہ دیر ان کی راہ نہ دیکھ سکا۔ اگلے دن طلوعِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد نرملا اپنے باپ کے ہمراہ واپس پہنچی تو اس کا شوہر صرف چند ثانیے قبل آخری بار اس کا نام لینے کے بعد دم توڑ چکا تھا۔

۲

نرملا ٹھاکر کی لاش کے پاس بیٹھی تھی اور شہر کی عمر رسیدہ عورتیں اسے ایک ہندو بیوی کا آخری فرض پورا کرنے کی تیاری کا مشورہ دے رہی تھیں۔ مندھیر کے عوام جو مسلمانوں کے کوچ کے بعد کسی حد تک اپنے ہوش و حواس پر قابو پا چکے تھے۔ ٹھاکر کے محل سے باہر جمع ہو رہے تھے۔ ٹھاکر کی موت ان کے نزدیک قوم کے ایک بہت بڑے ہیرو کی موت تھی۔ جے کرشن نرملا کو شہر کی خواتین کے ہجوم میں چھوڑ کر مہمان

خانے میں داخل ہوا تو وہاں ٹھاکر کے رشتہ دار، شہر کے امرا اور برہمن موجود تھے۔ یہ لوگ ٹھاکر کی موت پر افسوس کر رہے تھے۔ اتنے میں شہر کا پروہت جو مندھیر کی فتح کے بعد کہیں غائب ہو گیا تھا، مندر کے چند پجاریوں کے ہمراہ وہاں آ پہنچا۔ اس نے جے کرشن اور ٹھاکر کے رشتہ داروں سے رسمی ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد کہا۔ ”مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ٹھاکر رگھوناتھ جی اپنی موت سے پہلے ہمارے دھرم کے دشمنوں کا انجام نہیں دیکھ سکے۔ دیوتاؤں نے مسلمانوں کو تباہی کے راستے کی طرف بلایا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ جو لوگ لڑنے کے قابل ہیں ان کا یہ فرض ہے کہ فوراً سومنات روانہ ہو جائیں۔ اب دشمن دوبارہ یہاں نہیں آئے گا۔ اس سے انتقام لینے کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم اس کا پیچھا کریں۔ راجہ بھیم دیو نے ہمارے دیوتاؤں کو ناراض کیا ہے۔ اب اس کے لیے ہمارے سماج میں کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ اگر وہ بزدلی کا ثبوت نہ دیتا تو ہم اس تباہی کا سامنا نہ کرتے۔“

ایک برہمن نے آگے بڑھ کر پروہت کے کان میں کچھ کہا اور اس نے جے کرشن کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”سردار جے کرشن ہماری رائے یہ ہے کہ ٹھاکر جی کی آخری رسم پوری کرنے میں دیر نہ کی جائے۔ میں یہاں سے فارغ ہو کر فوراً سومنات پہنچنا چاہتا ہوں۔ آپ اندر جا کر نرملا دیوی کو تیار کریں۔“

جے کرشن کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ نرملا کو کس مقصد کے لیے تیار ہونے کی ضرورت ہے۔ اس نے انتہائی بے بسی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹھاکر جی کے تمام رشتہ داروں کے یہاں پہنچ جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ کل تک مہاراجہ بھیم دیو بھی یہاں پہنچ جائے گا۔“

پروہت نے جواب دیا۔ ”بھیم دیو انہل واڑہ سے بھاگنے کے بعد ہمارا راجہ نہیں رہا۔ اب وہ ٹھاکر رگھو ناتھ کے رشتہ دار کی حیثیت سے بھی ہماری کسی رسم میں شریک نہیں ہو سکتا۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”ہمیں کم از کم ان کے باقی رشتہ داروں کا انتظار کرنا

چاہیے۔" "جو لوگ بھیم دیو کے ساتھ کنٹھ کوٹ بھاگ گئے ہیں وہ اب ٹھاکر کی ارتھی کو ہاتھ لگانے کا حق نہیں رکھتے۔ ٹھاکر جی کے رشتہ دار وہ ہیں جو آخری دم تک ان کے ساتھ تھے۔ آپ باہر نکل کر دیکھیں شہر کے تمام بچّے اور بوڑھے محل کے دروازے پر جمع ہو رہے ہیں۔ ان میں سیکڑوں ایسے ہیں جن کی خواہش ہے کہ وہ دشمن کا پیچھا کرنے سے پہلے ٹھاکر جی کی آخری رسم پوری کرتے جائیں۔"

جے کرشن نے کرب انگیز آواز میں کہا۔ "لیکن ٹھاکر جی کی یہ خواہش نہ تھی کہ نرملا کو ان کے ساتھ ستی کیا جائے۔ وہ اس رسم کو قابلِ نفرت سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے اپنے لیے خطرہ محسوس کیا تو نرملا کو باہر بھیج دیا تھا۔"

حاضرین کی نگاہیں جے کرشن کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ ٹھاکر کے ایک رشتہ دار نے کہا۔ "یہ غلط ہے۔ ٹھاکر جی موت سے پہلے اپنی بیوی کو گھر میں دیکھنا چاہتے تھے۔"

پروہت نے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ قنوج کے ایک راجپوت سردار کو

اپنی بیٹی کا ستی ہونا پسند نہیں اور وہ بھی ٹھاکر رگھو ناتھ جیسے شوہر کے ساتھ۔"

ٹھاکر کے ماموں زاد بھائی ارجن دیو نے قدرے جوش میں آ کر کہا۔ "مہاراج! قنوج کے راجپوتوں کا خون سفید ہو چکا ہے لیکن ہمیں اس بات کے لیے سردار جے کرشن کا مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔"

شہر کے چند اور اکابر نے اس بحث میں حصہ لیا اور جے کرشن کو محسوس ہونے لگا کہ اس کا احتجاج یا التجائیں بے سود ہیں۔ اب نرملا کو بچانے کی صرف تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر کہیں بھاگ جائے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اچانک اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ کیوں بگڑتے ہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں اس رسم کے خلاف ہوں۔ میں نے صرف ٹھاکر جی کی رائے ظاہر کی تھی۔ ٹھاکر رگھو ناتھ کی بیوی کے لیے ستی ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور میری بیٹی کی رگوں میں بھی ایک راجپوت کا خون ہے۔ اگر میں اسے منع کر دوں تو بھی وہ ٹھاکر جی کی چتا میں کود جائے گی۔"

حاضرین نے اطمینان کا سانس لیا اور پروہت نے کہا۔ ”مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔ میرے خیال میں اب دیر نہیں کرنی چاہیے اور ہمیں سورج غروب ہونے سے پہلے فارغ ہو جانا چاہیے۔“

”ہماری طرف سے دیر نہیں ہو گی مہاراج!“ ٹھاکر کے ایک رشتہ دار نے کہا۔

پروہت نے جے کرشن کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”ٹھاکر جی نے جو خزانہ آپ کے سپرد کیا تھا، وہ کہاں ہے؟“

جے کرشن نے جواب دیا۔ ”مہاراج! میں نے وہ خزانہ یہاں واپس لانے کی بجائے سپاہیوں کے ایک دستے کی حفاظت میں کنتھ کوٹ بھیج دیا تھا۔ لیکن نرملا کے تمام زیورات اس کے پاس ہیں۔ میرے پاس بھی کچھ سونا چاندی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ اس موقع پر دان کر دیا جائے۔ نرملا کی خواہش ہے کہ ٹھاکر جی کی تمام جائیداد مندر کو دے دی جائے۔“

برہمنوں کے چہرے مسرت سے چمک اُٹھے لیکن ٹھاکر کے رشتہ دار خون

کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ پروہت نے کہا۔ ”بہت اچھا سردار جے کرشن جی۔ اب آپ تیاری کریں۔“

جے کرشن اٹھ کر چل دیا۔

۳

تھوڑی دیر بعد نرملا کی ایک خادمہ نے اس کے کان میں کہا۔ ”آپ کے پِتا جی دوسرے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ نرملا نے اٹھ کر خادمہ کے ساتھ چل دی۔ جے کرشن محل کے دوسرے سرے پر ایک کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ نرملا اس کے قریب پہنچ کر ایک ثانیہ کے لیے رُکی اور پھر بے اختیار سسکیاں لیتی ہوئی اپنے باپ سے لپٹ گئی۔

جے کرشن نے خادم سے کہا۔ ”اب تم جلدی سے اپنے پرانے کپڑوں کا ایک جوڑا لے آؤ۔ لیکن کسی کو معلوم نہ ہو۔“

خادمہ چلی گئی اور جے کرشن نرملا کا بازو پکڑ کر اسے کمرے میں لے آیا۔

”نرملا! کاش تم میرے مشورے پر عمل کرتیں اور ہم یہاں نہ آتے۔“

”لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ مر جائے گا اور میں اس کے ساتھ ستی ہو جاؤں گی۔۔۔پِتا جی! مجھے موت کا خوف نہیں، لیکن ٹھاکر کی چِتا میں کُود کر جاں دینا میری برداشت سے باہر ہے۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”نرملا! اب تمہاری جان بچانے کی ایک ہی صورت ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ تمہاری خادمہ نے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے، ابھی وہ تمہارے لیے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا لے کر آ جائے گی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد تم محل کے پچھلے دروازے سے اپنے گھر پہنچ جاؤ۔ میں نے گوبند رام کو گھوڑے تیار کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ تم فوراً دروازہ کی طرف بھاگ جاؤ۔ مسلمانوں کی فوج اس طرف گئی ہے، اس لیے اگر یہاں سے کسی نے تمہارا پیچھا کیا تو وہ اس طرف جانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے حالات سننے کے بعد مسلمان فوراً تمہیں اپنی پناہ میں لے لیں گے۔ میں تمہیں بھاگنے کا موقع دینے کے لیے کچھ دیر یہیں رہوں گا۔ پھر شاید پہلی منزل ہی میں تمہارے ساتھ آملوں۔“

نرملا نے کہا۔ ”نہیں نہیں! پِتا جی یہ نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو یہاں چھوڑ کر۔۔۔“

جے کرشن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں جب تک محل میں رہوں گا۔ تمہارے بارے میں کسی کو تشویش نہیں ہو گی۔ میں دیکھ آیا ہوں محل کا پچھلا دروازہ کھُلا ہے اور آج وہاں کوئی پہرہ بھی نہیں ہے۔ اس گہما گہمی میں تمہاری طرف کوئی توجہ نہیں دے گا۔ سینکڑوں عورتیں محل میں گھوم رہی ہیں۔ تمہیں صرف یہ احتیاط کرنی ہے کہ کوئی غور سے تمہارا چہرہ نہ دیکھے۔“

”لیکن پِتا جی۔۔۔۔“

جے کرشن نے عاجز سا ہو کر کہا۔ ”بھگوان کے لیے اب بحث نہ کرو۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے بغیر میری زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ میں تم سے پہلے چِتا میں کود جاؤں گا۔ لیکن میرا کہا ماننے سے میری اور اپنی جان بچا سکو گی۔ بھاگنے کی کوشش خطرناک ضرور ہے لیکن چِتا میں چلنے سے زیادہ خطرناک نہیں۔ اس میں تو بچ نکلنے کی امید ہے لیکن چِتا کے شعلوں سے کون بچا

ہے۔ نرملا میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم زندہ رہو گی۔۔۔ بھگوان جس نے رام ناتھ جیسے لوگوں کی پکار سن کر مسلمانوں کو سومنات کا راستہ دکھایا ہے تمہاری مدد ضرور کرے گا۔ ہمّت سے کام لو بیٹی۔"

خادمہ اپنی بغل میں کپڑوں کی ایک گٹھڑی دبائے کمرے میں داخل ہوئی۔ نرملا نے کپڑے اس کے ہاتھ سے لیے اور کہنے لگی۔ "پِتا جی! کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کو کوئی خطرہ نہیں؟"

جے کرشن نے تلملا کر جواب دیا۔ "مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ بھگوان کے لیے جلدی کرو۔"

نرملا عقب کے کمرے میں چلی گئی اور جے کرشن نے خادمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم نے مجھ سے آج جو نیکی کی ہے اس کا صلہ شاید میں عمر بھر نہ دے سکوں۔ اب تمہیں نرملا کو محل کے پچھلے دروازے سے باہر نکالنا ہے۔"

خادمہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "نرملا کے لیے

میں اپنی جان تک قربان کر سکتی ہوں۔"

جے کرشن نے کہا۔ "نرملا کو دروازے سے باہر نکال کر مجھے اطلاع ضرور دینا۔ اس کے بعد تم اسی کمرے میں جاؤ جہاں ٹھاکر کی لاش پڑی ہوئی ہے وہاں جو عورتیں جمع ہیں ان کو نرملا کے بارے میں تشویش ہو گی۔ تم انہیں باتوں میں لگائے رکھو۔"

نرملا لباس تبدیل کرنے کے بعد عقب کے کمرے سے نمودار ہوئی اور جے کرشن نے اسے کوئی اور بات کرنے کا موقع دینے کی بجائے برآمدے کی طرف دھکیل دیا۔ خادمہ اس کے ہمراہ چل پڑی اور جے کرشن نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگالی۔

۴

نرملا کو روانہ کرنے کے بعد جے کرشن انتہائی اضطراب کی حالت میں دروازے سے کان لگائے کھڑا تھا۔ جب بھی برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ وہ آہستہ سے

دروازہ کھول کر برآمدے میں جھانکتا لیکن نرملا کی خادمہ کی بجائے کسی اور کو دیکھ کر دوبارہ دروازہ بند کر دیتا۔ اس کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ خادمہ ابھی تک کیوں نہیں آئی؟ کیا ہو سکتا ہے کہ دروازے پر نرملا کو کسی نے پہچان لیا ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خادمہ مجھے اطلاع دینا ضروری نہ سمجھ کر سیدھی ٹھاکر کے کمرے میں چلی گئی ہو؟ اس کے پاس ان سوالات کا کوئی تسلّی بخش جواب نہ تھا۔ کمرے کے اندر ایک ایک لمحہ اسے مہینوں سے زیادہ طویل معلوم ہوتا تھا اور اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اتنے میں برآمدے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور وہ پھر ایک بار دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔ ”دروازہ کھولیے۔“

جے کرشن کا دل بیٹھ گیا اور اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کون ہے؟“

باہر سے کسی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”دروازہ کھولیے!“ یہ ٹھاکر رگھوناتھ کے ماموں زاد بھائی سردار ارجن دیو کی آواز تھی۔

جے کرشن نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟“

”آپ ذرا باہر آیئے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ نرملا دیوی کو آپ نے کہاں بھیجا ہے۔“

جے کرشن چند لمحے مبہوت کھڑا رہا پھر اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ برآمدے میں سردار ارجن دیو کے علاوہ محل کے پانچ نوکر اور شہر کے دو برہمن کھڑے تھے۔ ان کے چہرے گواہی دے رہے تھے کہ نرملا محل سے بھاگ نکلنے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ جے کرشن نے ارجن دیو کا ہاتھ پکڑ لیا اور سراپا التجا بن کر کہا۔ ”سردار ارجن دیو مجھ پر رحم کرو۔ نرملا میری اکلوتی بیٹی ہے۔ میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

ارجن دیو نے کہا۔ ”تو وہ آپ کی مرضی سے بھاگنا چاہتی تھی۔“

”ہاں! وہ کہاں ہے؟“

”ارجن دیو نے جواب دیا۔ ”اس کا جواب تمہیں شہر کی پنچائیت کے سامنے دیا جائے گا۔ چلو چلو نیچے۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”بھگوان کے لیے مجھے بتاؤ، وہ کہاں ہے؟“

”وہ نیچے ہے اور جب تک ستی کی رسم پوری نہیں ہو جاتی پروہت جی مہاراج اس کی حفاظت کریں گے۔“

جے کرشن نے بے اختیار اس کے پاؤں پر گرتے ہوئے کہا۔ ”ارجن دیو! اُس کی جان بچاؤ اور اس کے عوض مجھے ٹھاکر کی چِتا میں ڈال دو۔“

ارجن دیو نے کہا۔ ”مجھے ایک راجپوت کے منہ سے ایسی باتیں سن کر شرم محسوس ہوتی ہے۔ جے کرشن ہوش میں آؤ دنیا کیا کہے گی۔“

جے کرشن نے کہا۔ ”میں اپنی بیٹی کی جان بچانا چاہتا ہوں۔ مجھے دنیا کی پروا نہیں۔ ارجن دیو میری مدد کرو۔ میں اسے لے کر قنوج چلا جاؤں گا۔ تم جائداد لے سکتے ہو لیکن نرملا کو چھوڑ دو۔“

ارجن دیو نے جواب دیا۔ ”راجپوت اپنی غیرت کا سودا نہیں کرتے۔ تمہیں یہ باتیں اس دن سوچنی چاہیے تھیں جب تم نے ٹھاکر سے اپنی بیٹی کی شادی رچائی تھی۔“

جے کرشن اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے ارجن دیو کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے چلّایا۔ ”تم نرملا کو اس کی مرضی کے خلاف ٹھاکر کی چِتا میں نہیں ڈال سکتے۔ یہ پاپ ہے۔ میں ایسا پاپ نہیں ہونے دوں گا۔“

”تم پاگل ہوگئے ہو۔“ ارجن دیو نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

جے کرشن بھاگتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں ٹھاکر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ”نرملا! نرملا!“ اس نے بلند آواز میں کہا۔ عورتیں گھبرا کر اِدھر اُدھر ہٹ گئیں۔ نرملا کو وہاں نہ پا کر جے کرشن سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ نیچے ایک وسیع دالان سے باہر شہر کے لوگ جمع تھے۔ جے کرشن انہیں اِدھر اُدھر ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ مندھیر کا پروہت چند برہمنوں اور شہر کے معزّزین کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا اور نرملا انتہائی بے کسی کی حالت میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”نرملا! نرملا!“ جے کشن چلّایا اور وہ ”پِتا جی! پِتا جی!“ کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

”نرملا میری بیٹی۔ میری زندگی! میں تمہیں ستی نہیں ہونے دوں گا۔ یہ لوگ میری غلطی کی سزا تمہیں نہیں دے سکتے۔ تم ان سے کہہ دو کہ تم نے اپنی مرضی کے خلاف ٹھاکر سے شادی کی تھی۔“

اور نرملا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جے کرشن پروہت کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم لوگ میری بیٹی کو اس لیے ستی کرنا چاہتے ہو کہ اس کا زیور تمہارے ہاتھ آئے گا۔ لیکن تم اسے چتا میں ڈالے بغیر بھی سب کچھ لے سکتے ہو۔ میں اپنی جائداد بھی تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔ نرملا نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ بھگوان کے لیے اسے چھوڑ دو۔“

سردار ارجن دیو نے کہا۔ ”یہ پاگل ہو گیا ہے۔ اسے لے جاؤ۔“

چند نوکروں نے آگے بڑھ کر جے کرشن کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ٹھاکر کے ایک اور رشتہ دار نے نرملا کو کھینچ کر اس سے علیحدہ کیا اور نوکر جے کرشن کو باہر لے گئے۔ وہ چلّا رہا تھا۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم ظالم ہو، بھیڑیے ہو۔ لیکن یاد رکھنا مسلمان پھر یہاں آئیں گے اور تم سے نرملا کی موت کا بدلہ لیں گے۔“

۵

پروہت اور شہر کے چند معززین کی رائے تھی کہ جے کرشن کو قید خانے میں بھیج دیا جائے۔ لیکن ارجن دیو نے اس رائے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں شک نہیں کہ جے کرشن کا دماغ خراب ہو گیا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ٹھاکر جی کا خسر ہے۔ جب تک ستّی کی رسم پوری نہیں ہوتی ہم اسے محل کے کسی کونے میں بند رکھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو دن میں اس کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ہمیں ٹھاکر کی ارتھی اُٹھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

شہر کے اکابر نے ارجن دیو کی تجویز سے اتفاق کیا اور جے کرشن کو محل کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ محل کے ایک اور کمرے میں نرملا کو قیمتی لباس اور زیورات سے آراستہ کیا جا رہا تھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت اسے سمجھا رہی تھی۔ ”بیٹی ہمّت سے کام لو۔ تمہیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ تم ٹھاکر رگھوناتھ جیسے دیش بھگت کے ساتھ ستّی ہو رہی ہو۔ مندھیر کی عورتیں تمہاری قسمت پر رشک کیا کریں گی۔ اپنے شوہر کی

لاج رکھو۔۔۔" اور نرملا سکتے کے عالم میں یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بھیانک خلا کے سوا کچھ نہ تھا۔

محل کی تیسری منزل پر جے کرشن اپنے کمرے کا روزہ توڑنے کی ناکام کوشش کے بعد دیواروں سے ٹکریں مار رہا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی صحن کی طرف کھلتی تھی لیکن کھڑکی کے راستے زندہ باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ جے کرشن کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بلند آواز میں چلّایا۔ "بھگوان کے لیے مجھے باہر نکلنے دو۔ میں آخری وقت اپنی بیٹی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔"

لیکن اس کی چیخ و پکار ہجوم کے شور میں گُم ہو کر رہ گئی۔ دوپہر کے وقت ناقوس کی صداؤں کے ساتھ محل سے ٹھاکر رگھوناتھ کی ارتھی اُٹھائی گئی۔ آگے آگے برہمنوں کی ایک ٹولی بھجن گا رہی تھی۔ پیچھے نرملا ایک دلہن کی طرح نئے لباس اور قیمتی زیورات سے آراستہ ایک کھلی پالکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"نرملا! نرملا!" جے کرشن پوری قوّت سے چلّایا۔ لیکن نرملا کے کانوں تک

اس کی آواز نہ پہنچ سکی۔ پھر چند مردوں اور عورتوں کی چیخوں کے درمیان صحن میں کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اور آن کی آن میں صحن کے اندر اور باہر ایک کہرام مچ گیا۔ نرملا کا باپ کھڑکی سے کود کر جان دے چکا تھا۔

جلوس رُک گیا۔ نرملا پالکی سے اتر کر بھاگتی ہوئی آئی اور جے کرشن کی لاش سے لپٹ کر ہچکیاں لینے لگی۔ پھر وہ شہر کے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر چلاّئی۔ ”بھگوان کے لیے میرے پِتا کی ارتھی بھی ہمارے ساتھ ہی لے چلو۔“ تیسرے پہر ٹھاکر رگھو ناتھ کے ساتھ جے کرشن کی ارتھی بھی شمشان کا رُخ کر رہی تھی۔

٦

نرملا کی درخواست پر جے کرشن کی چِتا کو پہلے آگ لگا دی گئی۔ جب شعلے بلند ہوئے تو نرملا نے بھاگ کر چِتا میں کودنے کی کوشش کی۔ ارجن دیو کے لیے اس کی یہ حرکت غیر متوقع نہ تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ نرملا چلاّئی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں ٹھاکر کی بجائے

اپنے پِتا کی چتا میں ستی ہونا چاہتی ہوں۔" لیکن لوگوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ٹھاکر کی لاش کے قریب چِتا میں بٹھا دیا۔

ٹھاکر کے نوکروں اور رشتہ داروں نے خشک لکڑیوں کے انبار گھی کے مٹکے انڈیل دیے۔ اس کے بعد وہ عود، عنبر اور دوسری خوشبودار چیزیں لا کر چِتا پر ڈھیر کرنے لگے۔ چند برہمن مشعلیں لیے کھڑے تھے اور مندھیر کا پروہت سنسکرت میں کچھ اشلوک پڑھ رہا تھا۔

نرملا کی نگاہیں اپنے باپ کی چِتا پر مرکوز تھیں اور وہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ "پِتا جی! آپ کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ تھوڑی دیر بعد آگ کے شعلے مجھے بھی اپنی آغوش میں لیں گے۔ اگر آپ زندہ ہوتے تو میری چیخیں برداشت نہ کر سکتے۔ آپ کہتے تھے کہ میں زندہ رہوں گی اور اس وقت میں موت سے کس قدر ڈرتی تھی لیکن اب مجھے موت کا خوف نہیں رہا۔ اب میری زندگی کی کسی کو ضرورت نہیں۔ اب میری چیخیں سُن کر کسی کو دُکھ نہیں ہو گا۔"

پھر اسے رنبیر کا خیال آیا اور موت کا چہرہ بھیانک دکھائی دینے لگا۔ وہ رنبیر

کی ایک خیالی تصویر سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔ ”کاش! تم اس وقت یہاں ہوتے اور جب آگ کے شعلے میرے قریب پہنچ جاتے تو میں بلند آواز سے تمہارا نام پکارتی۔ میں کہتی، قنوج چھوڑنے کے بعد میری زندگی میں کوئی ایسا لمحہ نہ تھا جب میں تمہاری یاد سے غافل رہی۔ میں ہر وقت یہی سوچا کرتی تھی کہ کسی دن تم آؤ گے۔ تم آئے لیکن تمہاری نگاہیں میرے دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکیں۔ میں ہمیشہ تمہاری تھی لیکن تم نے ہمیشہ مجھے غیر سمجھا۔ رنبیر! رنبیر کہاں ہو؟“

پروہت کے ساتھ برہمنوں کی ٹولی بھجن گانے گئی۔ ان کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ پروہت کے اشارے سے ایک نوجوان مشعل اُٹھائے چِتا کی طرف بڑھا۔ نرملا نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ہجوم میں سے کوئی بلند آواز میں چلّایا۔ ”فوج آگئی! فوج آگئی!“ آن کی آن میں تمام لوگ سراسیمگی کی حالت میں مشرق کی طرف سے سرپٹ سواروں کا ایک لشکر آتا دیکھ رہے تھے۔ کسی نے بدحواسی کی حالت مشعل پھینک دی اور چِتا کے کنارے آگ سلگ اُٹھی۔ سواروں کا رُخ شہر کی طرف تھا

لیکن لوگوں کے غیر معمولی ہجوم نے ان کی توجّہ شمشان بھرمی کی طرف مبذول کر دی۔ تھوڑی دیر میں چند سوار باقی فوج سے کٹ کر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے شمشان بھومی کے قریب پہنچ گئے۔

۷

لوگوں میں افراتفری مچ گئی لیکن پروہت نے بلند آواز میں کہا۔ ”بے وقوفو! یہ تو ہمارے ملک کے سپاہی ہیں۔ تم بھاگ کیوں رہے ہو؟ چِتا کو اچھی طرح آگ لگا دو۔“ چند اور آدمیوں نے اپنی اپنی مشعلیں ہوا میں پھینکیں لیکن ہجوم کی توجّہ چِتا کی بجائے آنے والے سپاہیوں کی طرف تھی۔ جب سواروں کا دستہ چِتا کے قریب پہنچا تو آگ کے شعلے نرملا کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لوگ بھاگتے اور چیختے چِلّاتے اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ ایک نوجوان گھوڑے سے چھلانگ لگا کر بھاگتا ہوا چِتا کی طرف بڑھا۔ نرملا کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر چِتا سے باہر لے آیا۔ نرملا بے ہوش تھی۔ نوجوان نے اسے زمین پر لٹا دیا اور اپنا خنجر نکال کر اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی رسّیاں کاٹ دیں۔ اتنی دیر میں باقی سوار گھوڑوں سے اُتر کر

نرملا کے گرد جمع ہو گئے۔ نوجوان نے ایک سپاہی سے پانی مانگا اور اس نے گھوڑے کی زین سے اپنی چھاگل اتار کر پیش کر دی۔

نوجوان نے "نرملا! نرملا!" کہتے ہوئے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ نرملا نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں اور اس کی نگاہیں نوجوان کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یہ یوسف تھا۔ نرملا کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے ایک نحیف سی آواز نکلی۔ "زبیر! تم آ گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ موت کے بعد ہم ایک دوسرے سے ضرور ملیں گے۔"

"تم زندہ ہو نرملا۔" یوسف نے اپنے ہاتھ سے اُس کی گردن کو سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نرملا چند ثانیے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بے اختیار یوسف کے ساتھ لپٹ گئی اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "وہ۔۔۔۔۔۔ وہ مجھے ٹھاکر کے ساتھ ستّی کر رہے تھے۔ اب تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے۔ اب میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکوں گی۔ ادھر دیکھو، وہ میرے پِتا کی چِتا ہے۔ دنیا میں اب میرا کوئی نہیں۔"

یوسف نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا نرملا۔“

”میں ایک بیوہ ہوں۔“ نرملا یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یوسف نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”اس ملک کے نئے رواج میں بیوہ کو قابلِ نفرت نہیں سمجھا جائے گا۔“

”کیا میں سچ مچ زندہ ہوں رنبیر؟ اور یہ بھی ایک خواب نہیں کہ تم یہاں ہو؟“

”یہ خواب نہیں نرملا۔ اٹھو، ہمارے ساتھ چلو۔“ ”کہاں؟“

”آج ہم تمہارے شہر میں قیام کریں گے۔“

نرملا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اتنی دیر میں باقی فوج جو دو ہزار سواروں پر مشتمل تھی وہاں آ پہنچی۔ اس فوج کا سپہ سالار عبدالواحد تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر آگے بڑھا تو یوسف نے کہا۔ ”یہ نرملا ہے۔ اسے ستّی کیا جا رہا تھا۔“

عبدالواحد نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ ہم وقت پر پہنچ گئے۔“

نرملا نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ چند گھڑی پہلے پہنچ جاتے تو شاید میرے پِتا کی جان بھی بچ جاتی۔“

عبدالواحد کے چند اور سوالات کے جواب میں نرملا نے جے کرشن کی موت کا واقعہ بیان کر دیا۔ نرملا سے اظہار افسوس کرنے کے بعد عبدالواحد یوسف کی طرف متوجّہ ہوا۔ ”ہم آج رات مندھیر میں قیام کریں گے اور علی الصبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ سلطان راستے میں ہمارا انتظار نہیں کریں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم سومنات کی جنگ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔“

شہر کے لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو چکے تھے لیکن مندر کا پروہت چند سرداروں اور برہمنوں کے ساتھ تھوڑی دور کھڑا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور عبدالواحد کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم کون ہو؟“ عبدالواحد نے سوال کیا۔

”مہاراج! میں۔۔۔ میں اس شہر کا پروہت ہوں۔“

”جاؤ شہر کے لوگوں سے کہو کہ اُن کی جان اور مال کو کوئی خطرہ نہیں۔“

”مہاراج! آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“ پروہت دوبارہ اپنے ساتھیوں سے جاملا۔

۸

رات کے وقت نرملا محل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک خادمہ نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ”وہ اوپر آرہے ہیں۔“

نرملا نے کہا۔ ”انہیں یہیں لے آؤ۔“

خادمہ واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد نرملا کو برآمدے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ اضطراری حالت میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ نرملا نے کہا۔ ”آیئے!“

یوسف کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”میں اپنے سالار سے مشورہ کر چکا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ سفر کی تکلیف برداشت کر سکیں تو تیار ہو جائیں۔ ہم پچھلے پہر یہاں سے کوچ کریں گے۔“

نرملا نے یوسف کی طرف دیکھا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

یوسف نے کہا۔ ”نرملا۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

”تشریف رکھیے۔“ نرملا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”نہیں اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“ یوسف یہ کہہ کر دروازے کی طرف مڑا۔ لیکن نرملا نے کہا۔ ”ذرا ٹھہریے میں آپ سے شکنتلا اور روپ وتی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔“

یوسف نے جواب دیا۔ ”شکنتلا بہت خوش ہے اور روپ وتی کی صحت بھی پہلے سے بہت بہتر ہے۔ لیکن اس کے درد کا ہمارے پاس کوئی علاج نہ تھا۔

وہ ہمارے ساتھ آنے پر مصر تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ تم اتنے لمبے سفر کے قابل نہیں ہو۔ خدا کرے رام ناتھ زندہ ہو ورنہ وہ پاگل ہو جائے گی۔"

نرملا نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں گوبند رام کو اپنے ساتھ لے چلوں۔"

"گوبند رام مجھے ابھی راستے میں ملا تھا اور میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ وہ علی الصبح تیار ہو جائے اور دیکھیے میں نے آپ کی حفاظت کے لیے اس محل پر اپنے آدمیوں کا پہرا بٹھا دیا ہے۔"

نرملا نے جواب دیا۔ "چِتا سے زندہ نکلنے کے بعد مجھے موت کا ڈر نہیں رہا۔ کیا میرے لیے اپنے اس مالک کی حفاظت کافی نہیں جس نے آپ کو میری مدد کے لیے بھیجا تھا۔"

یوسف نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ "ہماری رفتار بہت تیز ہو گی اس لیے آپ کو بھی ہمارے ساتھ گھوڑے پر سفر کرنا پڑے گا۔"

نرملا نے جواب دیا۔ ”آپ میری فکر نہ کریں۔ میں آپ کے ساتھ پیدل چلنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ اب میرے لیے اس محل میں ایک دن ٹھہرنا بھی ممکن نہیں۔“

”بہت اچھا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔“ یوسف یہ کہہ کر نرملا کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے باہر گیا۔

اگلی صبح قنوج کے نو مسلم رضاکاروں کا لشکر جنوب کا رُخ کر رہا تھا۔ نرملا ایک گھوڑے پر سوار تھی۔ اسے یہ فکر نہ تھی کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ اس کے لیے صرف یہی کافی تھا کہ یوسف اس کے ساتھ ہے۔

۹

سومنات کے قید خانے میں رام ناتھ کے لیے ہر لمحہ موت سے زیادہ بھیانک تھا۔ بھوک، پیاس اور مار پیٹ کی ناقابلِ برداشت اذیتوں کے باوجود وہ پروہت کے آدمیوں کو اس سوال کا تسلّی بخش جواب نہ دے سکا کہ روپ وتی کہاں ہے۔

ابتدا میں وہ یہی سمجھتا تھا کہ روپ وتی پروہت کے ہاتھ میں ہے چنانچہ جب اسے اذیتیں دی جائیں تو وہ چلّا اٹھتا۔ ”تم میری جان لے سکتے ہو لیکن اس طرح پروہت کے گناہوں پر پردہ نہیں ڈال سکو گے۔ روپ وتی اگر زندہ ہے تو وہ پروہت کے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ مر چکی ہے تو اسے پروہت نے قتل کیا ہے۔“ لیکن چند ہفتوں کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ شاید پروہت کو بھی روپ وتی کے متعلق کوئی علم نہ ہو، اور وہ مندھیر میں اس کی آمد کی خبر ملتے ہی روپوش ہو گئی ہو۔

ایک رات پروہت اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ ”رام ناتھ! تمہاری ضِد بے معنی ہے۔ اگر روپ وتی کو زمین نہیں نگل گئی تو ہم ایک نہ ایک دن اسے ضرور تلاش کر لیں گے۔ ویسے بھی ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں، اس ملک کا کوئی آدمی ہمارے خلاف اس کے الزامات نہیں سُنے گا۔ لیکن تم ہمیں روپ وتی کا پتہ دے کر اپنی جان بچا سکتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم روپ وتی پر کوئی سختی نہیں کریں گے۔“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو میرے پاس تمہارے سوال کا کوئی

جواب نہیں۔ میں روپ وتی کو گھر چھوڑ کر گیا تھا اور اس کے بعد جب میں واپس آ رہا تھا تو تمہارے آدمیوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اب میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟"

پروہت نے قدرے تامّل کے بعد کہا۔ "مجھے معلوم ہو چکا ہے کی روپ وتی کو تم نے دوبارہ نہیں دیکھا لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ روپ وتی گھر سے غائب کیسے ہو گئی؟" رام ناتھ نے کرب انگیز لہجے میں جواب دیا۔ "کاش مجھے اس بات کا علم ہوتا۔"

پروہت نے کہا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیتا ہوں کہ روپ وتی تمہارے علم کے بغیر کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ لیکن تمہیں اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ وہ مندر سے کیسے غائب ہو گئی۔ اگر تم روپ وتی کو مندر سے اغوا کرنے والے آدمیوں کا پتہ دے سکو تو میں تمہاری جان بچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

رام ناتھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "تم ان پہریداروں کی موجودگی میں اس سوال کا جواب سننا پسند نہیں کرو گے۔"

پروہت نے پہریداروں کی طرف اشارہ کیا اور وہ کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ رام ناتھ نے کہا۔ ”تم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ جو پجاری کامنی کو سمندر میں پھینکنے گئے تھے وہ واپس کیوں نہیں آئے؟“

چند ثانیے پروہت کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم ان کے متعلق جانتے ہو؟“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”میں ان کے متعلق یہ جانتا ہوں کہ ان میں سے بعض کامنی کے ساتھ مل گئے تھے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کو سمندر میں پھینک دیا تھا۔“

پروہت چلّایا۔ ”تم جھوٹ کہتے ہو۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم ایسی کہانیاں سنا کر مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”یہ جھوٹ نہیں پجاریوں نے کشتی کو چند کوس دور لے جا کر آگ لگا دی تھی اور اس کے بعد وہ صبح تک دریا کے کنارے جنگل میں چھپے رہے۔ کامنی کو روپ وتی سے ہمدردی تھی اور اسے میرے اور

روپ وتی کے تعلقات کا بھی علم تھا تھا۔ اگلے دن وہ ایک دیہاتی عورت کا بھیس بدل کر مندر میں داخل ہوئی اور اس نے مجھے تمام حالات سے خبر دار کیا۔ میں نے باقی دن اُسے کمرے میں چھپائے رکھا۔ پھر رات کے وقت جب نئی دیوی کا جشن منایا جا رہا تھا تو کامنی نے تمہارے محل تک میری رہنمائی کی۔ وہ مندر کے تمام خفیہ راستوں سے واقف تھی۔ اس لیے ہم کسی دقّت کا سامنا کیے بغیر تمہارے محل میں پہنچ گئے۔ جب تم روپ وتی کو لے کر وہاں پہنچے تو ہم ایک کوٹھڑی میں چھپ کر تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا تمہیں بتانے کی صورت نہیں سمجھتا۔ تمہارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ تمہارے وہ پجاری جنہوں نے کامنی کی جان بچائی تھی تمہارے محل کے قریب ماہی گیروں کی ایک کشتی پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ روپ وتی کے چند زیور ان ماہی گیروں کو خوش کرنے کے لیے کافی تھے۔ ہم دو دن کشتی پر سفر کرتے رہے اور پھر ہمیں مالا بار کا ایک جہاز مل گیا جو سندھ جا رہا تھا اور اس پر سوار ہو گئے۔ راستے میں روپ وتی بیمار ہو گئی اور مجھے اس کے ساتھ جہاز سے اترنا پڑا۔ میں نے چند دن سفر کرنے کے بعد مندھیر میں پناہ لی۔“

یہ کہانی رام ناتھ کے کئی دن کے غور و فکر کا نتیجہ تھی، لیکن پروہت پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔ ”کامنی اور پجاری کہاں ہیں؟“

رام ناتھ نے جواب دیا۔ ”ہم نے انہیں جہاز پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سندھ پہنچ گئے ہوں گے۔ کامنی کہتی تھی کہ میں محمود غزنوی کے پاس جاؤں گی۔“

پروہت نے پوچھا۔ ”کامنی اور پجاریوں کو یہ معلوم تھا کہ تم مندھیر جا رہے ہو؟“

”ہاں! میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ انہل واڑہ کا مہاراجہ میرا دوست ہے اور مجھے وہاں کوئی خطرہ نہیں۔“ ”تمہارا خیال ہے کہ میرے پجاری بھی مسلمانوں کے پاس چلے گئے ہیں؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاز پر ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مجھے یہ ضرور محسوس ہوا تھا کہ وہ اپنے گزشتہ گناہوں پر نادم

ہیں۔ وہ سومنات اور سومنات کے پروہت سے نفرت کرتے ہیں۔“

”جہاز کا کپتان کون تھا؟“

”وہ ایک مسلمان تھا لیکن مجھے اس کا نام معلوم نہیں۔“

پروہت نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔ ”تم جھوٹ بولنے میں بہت ہوشیار ہو لیکن مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میرے پجاری میرے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ سومنات کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہو رہی ہے اور جب تک مجھے یہ علم نہیں ہوتا کہ اس سازش میں حصّہ لینے والے کون کون ہیں، تم میری قید میں رہو گے۔“

مجھے اب تمہاری قید کا خوف نہیں رہا۔ لیکن میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ روپ وتی کہاں ہے اور تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟“

پروہت نے جواب دیا۔ "اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ اس علاقے میں ہمارے دشمن کے جاسوس کون ہیں؟"

"میں کسی جاسوس کو نہیں جانتا۔"

"تم بہت کچھ جانتے ہو اور شاید اپنے نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد تم ہمیں بتانے کے لیے بھی تیّار ہو جاؤ گے۔" پروہت نے یہ کہتے ہوئے پہریداروں کو آواز دی اور خود کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

اسی شام رام ناتھ کو قید خانے کی ایک زمین دوز کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رام ناتھ کے لیے زندگی ایک نہ ختم ہونے والی رات تھی۔۔۔ ہر روز پہریدار آتے اور اس کے لیے کھانا اور پانی رکھ کر چلے جاتے لیکن کسی کو اس سے ہمکلام ہونے کی اجازت نہ تھی۔ دو ماہ بعد ایک دن پہریدار اسے پروہت کے سامنے لے گئے۔ یہ ملاقات بہت مختصر تھی، پروہت نے اسے سمجھایا کہ اگر تم دشمن کے جاسوسوں کا پتہ دینے پر آمادہ ہو جاؤ تو ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔ لیکن رام

ناتھ کا پہلا اور آخری جواب یہی تھا کہ میں کسی جاسوس کو نہیں جانتا۔ اس کے بعد کئی اور مہینے گزر گئے اور رام ناتھ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اسے قید کرنے والے اس کو بھول گئے ہیں۔

اس صبر آزما تنہائی میں روپ وتی کی یاد اس کا آخری سہارا تھی اور یہ یاد اسے مایوسیوں کی آندھیوں میں اُمّید کے چراغ جلانے پر آمادہ کرتی ہیں۔ اسے اس آفتاب کا انتظار تھا جو سومنات کی تاریک فضاؤں کو ایک نئ صبح کا پیغام دینے والا تھا۔ وہ تصوّر میں سومنات کے دروازے پر اس رجلِ عظیم کا خیر مقدم کیا کرتا تھا جس سے رُہت کے کنارے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

آخری معرکہ

جب سلطان محمود کا لشکر دلوارہ کے قریب پہنچا تو اچانک کُہر کے بادل نمودار ہوئے اور فضا میں تاریکی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں تاریکی اس قدر زیادہ ہو گئی کہ لوگ دوپہر کے وقت بھی رات کے پچھلے پہر کا سماں دیکھ رہے تھے۔ سپاہیوں کے لیے چند قدم آگے دیکھنا مشکل تھا لیکن سلطان نے رُکنا گوارا نہ کیا۔

دلوارہ کے برہمن عوام کو سمجھا رہے تھے کہ یہ رسومات کے دیوتاؤں کی کرامت ہے۔ تاریکی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ سومنات کے

دشمنوں کا ہر قدم انہیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔

شہر کے اکابرین اعلان کر رہے تھے کہ ہمیں دشمن کا مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مکمل تباہی کا سامنا کرنے کے لیے اس کا سومنات پہنچنا ضروری ہے۔ چنانچہ جب سلطان کا لشکر شہر میں داخل ہوا تو اہلِ شہر نے کسی مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔

دلوارہ میں عبداللہ اور اس کے چند ساتھی سلطان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان لوگوں سے سومنات کے تازہ حالات معلوم کرنے کے بعد سلطان نے جرنیلوں کا اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں عبداللہ کے ساتھیوں میں سے ایک عرب نوجوان بھی شریک ہوا جو سلطان کے ساتھیوں کے لیے اجنبی تھا۔ سلطان نے اس نوجوان کو اپنے دائیں ہاتھ بٹھاتے ہوئے اپنے جرنیلوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہ ہمارے نئے ساتھی ہیں اور ان کا نام سلمان ہے۔ تم انہیں سومنات کی جنگ میں اہم ترین محاذ پر دیکھو گے۔“

جب اجلاس کی کاروائی شروع ہوئی تو حاضرین کو معلوم ہوا کہ سلطان کی

نگاہوں میں اس اجنبی کی قدر و منزلت بلا وجہ نہ تھی۔ سومنات کے قلعے کی مضبوطی اور اس کی فوجی قوّت کے متعلّق اس کی معلومات حیرت انگیز حد تک مکمل تھیں۔ اجلاس کے اختتام پر سلطان کے جہاں دیدہ افسر اُٹھ اُٹھ کر اپنے نئے رفیق کے ساتھ مصافحہ کر رہے تھے۔

اگلے روز دو ہزار نو مسلم رضاکاروں کی فوج جو عبدالواحد کی قیادت میں قنوج سے آئی تھی، سلطان کے لشکر سے آملی اور تیسرے دن سلطان نے دلوارہ سے کوچ کیا۔

۲

۶ جنوری ۱۰۲۶ء کو جمعرات کا دن تھا اور سلطان محمود کا لشکر اپنے سامنے سومنات کے مندر کے سنہری کلس دیکھ رہا تھا۔ سلطان نے رسد بردار دستوں کو پیچھے چھوڑ کر پیش قدمی کی۔ ہندو اپنی ساری طاقت قلعے کے اندر جمع کر چکے تھے۔ شہر اور مضافات کی بستیاں قریباً خالی ہو چکی ہوتی تھیں اور سلطان کے ہراول دستوں نے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر ان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان قلعے کی طرف بڑھا اور دوپہر کے

قریب اس کی فوج قلعے سے تھوڑی دور کی ایک عجیب منظر دیکھ رہی تھی۔

سومنات کے اَن گنت محافظ فصیل پر کھڑے غیر معمولی جوش و خروش سے حملہ آوروں کو للکار رہے تھے۔ کوئی اُن کا منہ چڑا رہا تھا اور کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا تھا کہ اب تم بچ کر نہیں جاسکتے۔ سومنات کا دیوتا تم سے اس ملک کے تمام دیوتاؤں کی توہین کا بدلہ لے گا فصیل کی طرح قلعے کی اندرونی عمارت کی چھتوں پر بھی انسانوں کے ہجوم کھڑے تھے اور قلعے کے وسیع احاطے میں بھی تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اَن گنت انسانوں کی چیخ و پکار ایک آتش فشاں کی آغوش میں ابلتے اور کھولتے ہوئے لاوے کی گڑ گڑاہٹ سے زیادہ مہیب تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس ملک کی تمام آبادی سمٹ کر سومنات کی چار دیواری میں سماگئی ہے۔

سلطان نے اپنے محفوظ دستوں کو حکم دیا کہ باقی لشکر کے گھوڑے پیچھے لے جائیں۔ اس کے بعد اس نے نہایت اطمینان سے ظہر کی نماز ادا کی۔ بارگاہِ الٰہی سے فتح و نصرت کی دُعا مانگی اور پھر اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا:

”مجاہدو! ہندوستان کی سرزمین میں کفر اور اسلام کا آخری معرکہ ہے۔ ہم نے سومنات کے ظلمت کدہ میں خدا کی توحید کا پرچم لہرانے کا عہد کیا ہے اور اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ فتح یا شہادت۔ خدا کے بندوں کی سب بڑی ڈھال ان کا ایمان ہے اور اگر تمہارا ایمان متزلزل نہ ہوا تو ہم اس امتحان سے سرخرو نکلیں گے۔ آؤ ہم عہد کریں کہ کل ہم جمعہ کی نماز سومنات کے قلعے میں ادا کریں گے۔“

فضا اللہ اکبر کر نعروں سے گونج اٹھی۔ سلطان نے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کی صفوں میں چکّر لگایا اور سالاروں کو ہدایات دینے کے بعد حملے کا حکم دیا۔ آن کی آن میں مسلمانوں کی فوج اٹھتی ہوئی لہر کی طرح فصیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اللہ اکبر کے نعروں کے جواب میں قلعے کر کی طرف سے ”مہا دیو کی جے“ کے نعرے بُلند ہونے لگے اور فصیل کے محافظوں نے اندھا دھند تیروں کی بارش شروع کر دی۔ حملہ آور بھی تیروں کا جواب تیروں سے دے رہے تھے۔ لیکن فصیل کے محافظ اپنے مورچوں میں ان کی نسبت زیادہ محفوظ تھے۔ افغان اور ترک سپاہیوں کے

چند دستے اپنی ڈھالوں پر دشمن کے تیر روکتے ہوئے فصیل کے نیچے پہنچ گئے اور انہوں نے کمندوں اور سیڑھیوں کی مدد سے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن دشمن نے انہیں فصیل پر پاؤں جمانے کا موقع نہ دیا۔ سلطان محمود دشمن کی تعداد سے باخبر تھا۔ لیکن ان کا یہ جوش و خروش اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔

شام تک مسلمانوں کو متعدد حملوں کے باوجود فصیل کے کسی بھی حصّے پر قدم جمانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ رات کے وقت سلطان نے اپنے لشکر کو قلعے سے دور پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ قلعے میں ناقوس اور گھنٹیوں کی صداؤں کے ساتھ ''سومنات کی جے'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور مسلمانوں کے پڑاؤ میں عشاء کی نماز کی اذان سنائی دے رہی تھی۔

۳

اگلی صبح کا آفتاب سومنات کی دیواروں تلے ایک گھمسان کی جنگ دیکھ رہا تھا۔ سلطان تیروں کی بارش میں کھڑا تھا اور اس کے جانباز جرأت اور ہمّت کے مظاہرے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر

رہے تھے۔ فصیل کے محافظ حملہ آوروں پر تیروں اور پتھروں کے علاوہ کھولتا ہوا تیل ڈال رہے تھے۔ کمندیں ٹوٹ رہی تھیں، سیڑھیاں جل رہی تھیں اور فصیل کے نیچے لاشوں کے انبار لگ رہے تھے۔ لیکن حملہ آوروں کے جوش و خروش میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ مشرق کی طرف سے چند دستوں نے اس شدّت سے تیر برسائے کہ فصیل کے محافظ تھوڑی دیر کے لیے مورچوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ چند جانباز بھاگتے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھنا شروع کر دیا۔ تیر اندازوں نے فصیل کے محافظوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا اور آن کی آن میں پندرہ بیس سپاہیوں نے دشمن کر اِدھر اُدھر ہٹا کر فصیل پر پاؤں جما لیے۔ فصیل کے محافظوں نے جوابی حملہ کیا اور مسلمان ان کے دباؤ سے سمٹنے لگے لیکن اتنی دیر میں کئی اور سر فروش اوپر آ گئے۔ انہوں نے ہندوؤں کو ایک بار پھر دائیں اور بائیں طرف دھکیل دیا۔

تھوڑی دیر میں مسلمان فصیل کے ایک برج سے نیچے اُترنے والی سیڑھی پر قبضہ کرنے کو شش کر رہے تھے اور قلعے کے اندر ہندوؤں کا ایک

سیلاب اوپر چڑھ رہا تھا۔ مسلمانوں نے ایک زور دار حملہ کیا اور چند جانباز زینے پر دشمن کی لاشیں روندتے ہوئے صحن میں اتر آئے۔ صحن میں اُن کے دائیں بائیں اور سامنے انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اس سمندر کی موجیں انہیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے آگے بڑھیں لیکن زینے کے راستے مسلمان اس پہاڑی ندی کی سی تندی اور تیزی سے آرہے تھے جس کے تمام بند ٹوٹ چکے ہوں۔

تھوڑی دیر میں سینکڑوں مسلمان صحن میں پہنچ گئے اور دشمن کی صفوں پر بے تحاشہ تیر برسانے شروع کیے۔ اِدھر فصیل پر چڑھنے والوں کی تعداد میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ اتنے میں سلطان محمود بھی فصیل کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے عقابی نگاہ سے صورتِحال کا جائزہ لیا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ باہر سے چند سیڑھیاں کھینچ کر صحن کی طرف لگا دیں۔ ہندو یہ دیکھ کر آگے بڑھے لیکن تیروں کی بارش میں ان کی پیش نہ گئی۔ ایک ساعت کے بعد سلطان کے آٹھ ہزار جانباز قلعے کے اندر داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں ترکمانوں کے چند دستے قلعے کی شمالی دیوار کے کچھ حصّے پر قبضہ کر چکے

تھے۔

سلطان نے ایک شدید حملہ کیا اور دشمن کی صفیں روندتا ہوا مشرقی دروازے کے قریب جا پہنچا۔ دروازے کی حفاظت کے لیے ہندوؤں کی صفیں دیواروں کی طرح کھڑی تھیں لیکن مسلمانوں کی خار شگاف تلواروں کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ تھوڑی دیر میں لاشوں کے انبار لگ گئے اور مسلمانوں نے دروازہ کھول دیا۔

باہر سے اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے اور سلطان کی فوج اندر داخل ہونے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوؤں نے آگے بڑھ کر شدید حملہ کیا اور مشرقی دروازے کے سامنے ایک بار پھر گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔ کبھی مسلمان دشمن کی صفیں روندتے ہوئے چند قدم آگے نکل جاتے اور کبھی قلعے کے محافظوں کے زوردار حملے انہیں دروازے کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیتے۔ اس عرصے میں سلطان کے دوسرے سپاہی شمالی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کے دو طرفہ حملے سے ہندوؤں کی صفوں میں افراتفری پھیل گئی۔ تھوڑی دیر بعد شمال اور

مشرق کے دروازوں سے قلعے میں داخل ہونے والے دستے آپس میں مل گئے اور ہندو ان کے پے در پے حملوں کے باعث مندر کی طرف سمٹنے لگے۔ قلعے کو مندر کے احاطے سے جدا کرنے والی خندق کے سامنے ہندوؤں کے چند دستے مسلمانوں کے سامنے ڈٹ گئے اور ان کی باقی فوج لکڑی کے پُلوں سے گزر کر مندر میں داخل ہونے لگی۔ ایک ساعت کے بعد ہندوؤں کے چند دستے حملہ آوروں کو خندق کے پُلوں سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور باقی فوج مندر کے احاطہ میں جمع ہو چکی تھی۔ ہندو فوج کے سالار کے حکم سے تینوں پُل اُٹھا دیے گئے۔ مسلمانوں کو خندق کے آس پاس ہندوؤں کے رہے سہے دستوں کا صفایا کرنے میں دیر نہ لگی۔ لیکن ان کے لیے خندق عبور کر کے مندر میں داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔

قلعے کے وسیع صحن میں ہندوؤں کے منتشر دستے عمارتوں میں پناہ لے چکے تھے۔ اور نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ ہم ان عمارتوں پر قبضہ کرنے سے پہلے نماز جمعہ ادا کریں گے۔ مؤذن نے شمالی دروازے کے

بُرج پر کھڑے ہو کر اذان دی اور مسلمان صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی نماز کا نظارہ عجیب تھا۔ قلعے کی عمارات سے ہندوؤں کے دستے تیر برسا رہے تھے لیکن مسلمان انتہائی ضبط و سکون سے بارگاہِ الٰہی میں سر بسجود تھے۔ نماز کے بعد سلطان نے اپنے جانبازوں کی طرف نگاہ دوڑائی جن کی پیشانیوں پر فتح و نصرت کی بشارت لکھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میر تشکّر کے آنسو چھلک رہے تھے۔

سلطان نے شہیدوں اور زخمیوں کو قلعے سے باہر لے جانے کے لیے اپنے چند دستے متعین کر دیے اور باقی دستوں کو قلعے کی عمارت پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ دن کے تیسرے پہر مسلمان قلعے کی کئی عمارات پر قبضہ کر چکے تھے لیکن اس جنگ کا فیصلہ کُن مرحلہ ابھی باقی تھا۔ خندق کے پار مندر کے احاطہ میں ہندو سپاہی اور ان کے سردار اپنے مقدس دیوتا کی حفاظت کے لیے آخری دم تک لڑنے کا عہد کرتے تھے۔

اچانک مندر میں ناقوس اور گھنٹیوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ خندق پر لکڑی کے پُل دوبارہ ڈال دیے گئے اور ہندوؤں کا سیلاب ایک بار پھر قلعے

کے صحن کی طرف پھُوٹ نکلا۔ یہ حملہ جس قدر اچانک تھا اسی قدر شدید تھا۔ تھوڑی دیر ہندو قلعے کے ایک چار تہائی حصّے پر قبضہ جما چکے تھے۔ مسلمانوں نے جوابی حملہ کیا اور ہندوؤں کو ایک بار پھر خندق کی طرف سمٹنے پر مجبور کر دیا، لیکن ان کی جدوجہد ایک دریا کی طغیانی کے آگے بند باندھنے کے مترادف تھی۔ خندق کے پُلوں پر ہندوؤں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور مسلمان محسوس کر رہے تھے کہ سومنات کی مٹّی ایک نئی فوج کو جنم دے رہی ہے۔

غروبِ آفتاب کے وقت مسلمان مشرق اور شمال کے دروازوں کی طرف سمٹ رہے تھے۔ شام کی تاریکی پھیلنے لگی تو سلطان نے فوج کو پسپائی کا حکم دیا اور مسلمان ایک منظّم طریقے سے لڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔

۴

مجلسِ شوریٰ کا اجلاس برخاست کرنے کے بعد سلطان اپنے خیمے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تردّد اور پریشانی کے آثار تھے۔ فوج کا ایک افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ ”عالی

جاہ! سلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔“

”بلاؤ اسے۔“

افسر دوبارہ سلام کر کے خیمے سے باہر نکل گیا۔۔۔چند ثانیے بعد سلمان خیمے میں داخل ہوا۔ سلطان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور کہا۔ ”مجھے تمہارا انتظار تھا۔ کہو کیا خبر لائے ہو؟“

سلمان نے جواب دیا۔ ”دشمن کے بارہ نئے جہاز جن کے متعلّق میں نے آپ کو کل اطلاع دی تھی، سومنات کے قریب لنگر انداز ہو چکے ہیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد میں اپنے جہاز کو ان جہازوں کے ساتھ ہی دشمن کے بیڑے کے عقب میں لے آیا تھا۔ ابھی تک دشمن ہمارے متعلّق بے خبر ہے۔ اگر اسے صبح تک ہمارا پتہ نہ چل گیا تو میں اس کے کئی جہاز تباہ کر سکوں گا۔ سپاہیوں کے علاوہ ان جہازوں کے بیشتر ملّاح بھی سومنات کے مندر میں جمع ہو چکے ہیں اور میرے لیے چند جہازوں پر قبضہ کر لینا بھی مشکل نہیں، میں اس وقت حملہ کروں گا جب جنگ آخری مرحلہ میں پہنچ

چکی ہو گی۔ سمندر کے کنارے دشمن کی سینکڑوں کشتیاں کھڑی ہیں۔ ہماری آخری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دشمن کی ان کشتیوں سے فائدہ نہ اٹھاسکے۔"

سلطان نے جواب دیا۔ "میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ میرے سواروں کے محفوظ دستے ساحل کے ساتھ ساتھ دشمن کی کشتیوں کا پیچھا کریں گے۔ بھُوک اور پیاس دُشمن کو بہت جلد سمندر سے نکلنے پر مجبور کر دے گی۔"

سلمان نے کہا۔ "دشمن ساحل سے مایوس ہو کر شاید آس پاس کے ٹاپوؤں پر پناہ لینے کی کوشش کرے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ان ٹاپوؤں پر فوج اُتارنے کے لیے میں آپ کو چند جہاز مہیّا کر سکوں گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے، مجھے اپنے جہاز پر پہنچنے کے لیے ایک طویل چکّر کاٹنا پڑے گا۔"

سلطان نے کہا۔ "میں تمہاری کامیابی کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ کل انشا اللہ سومنات کے مندر میں ہماری ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔"

خیمے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک سپاہی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ سلمان نے گھوڑے پر سوار ہو کر ایڑ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سمندر کے کنارے پہنچ گیا اور گھوڑے سے اُتر کر ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔ کشتی بیڑے کی طرف روانہ ہو گئی۔

۵

اگلے روز دوپہر سے قبل مسلمان ایک بار پھر قلعے پر قبضہ کر چکے تھے اور مندر کے احاطہ کو قلعے سے جدا کرنے والی خندق کے قریب گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ خندق کے کنارے ہندوؤں کی صفیں دیواروں کی طرح کھڑی تھیں۔ مسلمانوں کے پے در پے حملوں کے باعث وہ بھاری نقصان اُٹھا رہے تھے، لیکن ان نقصانات کو پورا کرنے کے لیے اُن کے پاس آدمیوں کی کمی نہ تھی۔ مندر سے ہر آن اُن کے تازہ دم دستے نمودار ہوتے اور پُل عبور کرنے کے بعد اپنی صفوں کے خلا کو پُر کر دیتے۔

سلطان نے اپنے لشکر کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا، اور ہندو اسے فتح سمجھ کر مسرّت کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کھلے صحن میں پہنچ کو

مسلمانوں نے جوابی حملہ کیا اور ان کی صفیں کئی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر ہندوؤں پر ٹوٹ پڑیں۔ اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے ہندوؤں کے لشکر کو بھی کئی حصّوں میں تقسیم ہونا پڑا۔ اچانک بائیں بازو سے مسلمانوں کے چند دستے دشمن کر پیچھے دھکیلتے ہوئے خندق کے ایک پُل کے قریب جا نکلے۔ ہندو بدحواس ہو کر خندق کی طرف بھاگ نکلے۔ لیکن مسلمانوں نے انہیں دوبارہ منظّم ہونے کا موقع نہ دیا۔ انتہائی انتشار کی حالت میں ہندوؤں کی آخری کوشش یہ تھی کہ دشمن کو خندق کے پُلوں سے دُور رکھا جائے، لیکن سلطان کے بائیں بازو کے دستوں نے ایک پُل پر قبضہ کر لیا اور ہندو باقی دوپُلوں کے راستے مندر کی طرف بھاگنے لگے۔

ایک ساعت کے بعد خندق کے تینوں پُل مسلمانوں کے قبضے میں تھے اور ان کے کئی دستے خندق کے دوسرے کنارے پہنچ چکے تھے۔ باقی فوج قلعے کے صحن میں دشمن کی رہی سہی ٹولیوں کا صفایا کرنے میں مصروف تھی۔ مندر میں کفر و اسلام کی جنگ اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوؤں کی ٹولیاں سومنات کی مورتی کے سامنے گڑگڑا کر دُعائیں

مانگتیں اور پھر ایک نئے جوش و خروش سے مسلمانوں پر حملہ کر دیتیں۔ بیرونی عمارتوں کی گزر گاہوں اور بر آمدوں میں لاشوں کے انبار لگانے کے بعد مسلمان اُس کشادہ صحن میں داخل ہوئے جو اونچی حیثیت کے پجاریوں اور داسیوں کے محلّات سے گھِرا ہوا تھا۔ یہاں ہزاروں ہندو سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیّار کھڑے تھے۔ مسلمانوں نے پے در پے حملوں کے بعد انہیں ایک طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ہندوؤں کے تازہ دم دستے ارد گرد کی عمارات کی بالائی منزلوں سے اتر کر صحن میں اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے جمع ہو رہے تھے لیکن مسلمان بتدریج صحن پر قبضہ کر رہے تھے۔ نصف ساعت کے بعد صحن میں ہزاروں آدمی ڈھیر ہو گئے اور ہندو ارد گرد کی عمارات میں پناہ لینے لگے۔

٦

دن کے تیسرے پہر مسلمان مندر کے اِرد گرد کئی عمارات پر قبضہ کر چکے تھے اور ہندو مندر کے وسط میں اس وسیع کمرے کو بچانے کی فکر میں تھے جہاں سومنات کا بُت نصب تھا۔ اس کمرے کے تین اطراف بہت کشادہ

کمرے سپاہیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے ان کمروں پر قبضہ کرنے کے لیے چند حملے کیے۔ لیکن ہندوؤں نے انہیں پاؤں جمانے کا موقع نہ دیا۔ یہ کمرے سیڑھیوں کے ذریعے زمین دوز کوٹھڑی سے ملے ہوئے تھے۔ ہندو سپاہی ان کوٹھڑیوں سے نمودار ہوتے اور اپنے قتل یا زخمی ہونے والے ساتھیوں کی جگہ ڈٹ جاتے۔ پے در پے حملوں کے بعد مسلمانوں نے ایک کمرے پر قبضہ کر لیا لیکن اس سے قبل وہ آہنی دروازہ جو اس کمرے کو وسطی کمرے سے ملاتا تھا بند ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے چند سپاہی تلواریں سونت کر زمین دوز کوٹھڑیوں کی طرف اترنے والے زینے پر کھڑے ہو گئے اور باقی آہنی دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ دروازہ چند دھکوں کے بعد ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی وسطی کمرے سے ہندوؤں کا ایک نیا حملہ ہوا۔ فریقین ایک تنگ محاذ پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ کبھی ہندو مسلمانوں کو دھکیل کر کمرے سے باہر نکال دیتے اور کبھی مسلمان وسطی کمرے کے دروازے تک پہنچ جاتے۔ اس ہاتھا پائی میں مسلمان تلواروں کی جگہ خنجر استعمال کر رہے تھے۔ مندر کا پروہت سومنات کی مورتی کے سامنے کھڑا ہو کر چلّا رہا تھا:

"بہادرو! ہمّت سے کام لو، دشمن کی تباہی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ہمارا دیوتا مسلمانوں کو بھسم کرنے سے پہلے تمہاری غیرت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ آج کے دن اپنے سینوں پر وار کھانے والے بہادر سیدھے سورگ میں جائیں گے۔"

اور ہندو آخری وقت کسی معجزے کی اُمّید پر جان کی بازی لگا رہے تھے۔ لیکن ایک شدید حملے کے بعد چند سپاہی وسطی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہندو انہیں پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے دوسری طرف سے ایک اور کمرے پر قبضہ کر کے وسطی کمرے کی طرف کھلنے والا دوسرا دروازہ بھی توڑ دیا اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے سومنات کے محافظوں پر ٹوٹ پڑے۔

اب ہندوؤں کے لاتعداد سپاہی زمین دوز پناہ گاہوں اور مکانوں کی چھتوں سے نمودار ہو کر وسطی کمرے کے اس وسیع دروازے کے سامنے جمع ہو رہے تھے جو سمندر کی طرف کھلتا تھا۔ تھوڑی دیر میں سمندر کے کنارے کے ساتھ ساتھ طویل چبوترے پر تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سومنات کی

مورتی کے گرد گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی اور سمندر کے کنارے جمع ہونے والے ہندو اندر داخل ہونے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلطان محمود وسطی کمرے پر یلغار کرنے والے مجاہدوں کے ساتھ تھا۔ اس نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "سمندر کی طرف بڑھو۔ فتح قریب ہے۔" آن کی آن میں لشکر کے سالار اپنے اپنے دستوں کو سلطان کا حکم پہنچا چکے تھے اور تھوڑی دیر بعد مسلمانوں کے دستے شمال اور جنوب کی سمتوں سے چکر کاٹ کر چبوترے پر حملہ کر رہے تھے۔ ادھر وسطی کمرے میں لڑنے والے مجاہدین نے ایک زور دار حملہ کیا اور ہندوؤں کو مارتے، روندتے اور دھکیلتے ہوئے چبوترے کی طرف لے گئے۔ ہندوؤں نے جوابی حملہ کر کے دوبارہ اپنے دیوتا کے چرنوں تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن مسلمان ان کے سامنے آہنی دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ سمندر کے کنارے اس وسیع چبوترے پر سومنات کی جنگ کا آخری دور شروع ہو چکا تھا۔ مندر کے وسطی کمرے پر قبضہ ہو جانے کے باعث ہندوؤں کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے اور ان کی چیخیں اپنے دیوتاؤں کی بے بسی کا اعتراف کر رہی تھیں۔

سمندر میں سینکڑوں کشتیاں کھڑی تھیں اور ہندو مسلمانوں کے حملوں سے مغلوب ہو کر افراتفری کی حالت میں سمندر کے کنارے پہنچ کر کشتیوں میں سوار ہونے لگے۔ ساحل سے کچھ دور سومنات کی جنگ میں حصّہ لینے والے راجوں اور مہاراجوں کے جہاز دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک ایک جہاز میں آگ کے شعلے دیکھا کر کشتیوں کے ملّاحوں نے چیخ و پکار شروع کر دی اور ہندوؤں کی رہی سہی فوج میں سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ چیختے چِلاّتے اور بھاگتے ہوئے کشتیوں پر سوار ہونے لگے۔ ہزاروں سپاہی جنہیں کشتیوں میں جگہ نہ ملی سمندر میں چھلانگیں لگارہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کشتیوں پر سوار ہو کر فرار ہونے والے ہندو ایک نئی پریشانی کا سامنا کرنے لگے۔ کوئی نامعلوم دشمن تین اور جہازوں میں آگ لگا چکا تھا اور پانچ جہاز جن پر اُن کے راجاؤں کے جھنڈوں کی بجائے مسلمانوں کے ہلالی پرچم لہرارہے تھے، ساحل سے دور جارہے تھے۔ جلتے ہوئے جہازوں کے عقب سے ایک اور جہاز جس پر ہلالی پرچم لہرارہا تھا نمودار ہوا اور اپنے دائیں بائیں چند اور جہازوں پہ آتشیں گولے پھینکتا ہوا

ایک طرف نکل گیا۔ آن کی آن میں دو اور جہازوں کے بادبانوں میں آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ اتنی دیر میں بہت سی کشتیاں جہازوں کے قریب پہنچ چکی تھیں اور باقی ساحل کے ساتھ ساتھ شمال اور جنوب کا رُخ کر رہی تھیں۔

مندر کی رہی سہی فوج بھاگنے کے راستے مسدود دیکھ کر ہتھیار ڈال چکی تھی۔ راجے، سردار اور پجاری سلطان محمود کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ مندر کے طول و عرض میں ہندوؤں کی پچاس ہزار لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ پروہت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سلطان کے سپاہیوں نے اس کے محل کی تلاشی لی تو وہاں سے سینکڑوں داسیاں برآمد ہوئیں۔ ایک داسی کی زبانی معلوم ہوا کہ پروہت مندر کی دیوی کو اپنے ساتھ لے کر محل کے ایک کونے کے کمرے میں روپوش ہو گیا تھا۔ اس کے کمرے کی تلاشی لی گئی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ جب سپاہی کمرے سے باہر آنے لگے تو انہیں کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ ایک سپاہی نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ کان لگا دیے اور پھر اچانک اپنے

ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”اس دیوار کے پیچھے کوئی کراہ رہا ہے۔ اچھی طرح دیکھو شاید اس جگہ کوئی چور دروازہ ہو۔“

پھر اس نے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ زنجیر کھینچو!“ دوسرے سپاہی نے چھت سے لٹکی ہوئی زنجیر کھینچی تو دیوار میں آہستہ آہستہ ایک شگاف نمودار ہونے گا۔ چور دروازہ کھُل گیا اور سپاہی جلدی سے عقب کی تنگ کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ سومنات کے پروہت کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی اور قریب ہی مندر کی دیوی جس کے سینے میں خنجر پیوست تھا اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ اس نے نحیف آواز میں کہا۔ ”اب مجھ کسی کا خوف نہیں۔ میں نے پروہت کو قتل کر دیا ہے۔ اس کی یہی سزا تھی۔ کاش میں اسے اسی رات قتل کر دیتی اور یہ مندر تباہی سے بچ جاتا۔ تمہارا بادشاہ کہاں ہے۔ وہ بہت دیر سے آیا۔ اسے بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔۔“ ایک ہندی نو مسلم نے اپنے ساتھیوں کو اس کے الفاظ کا مطلب سمجھایا۔ انہوں نے اسے اُٹھا کر باہر نکالا اور کھلے صحن میں لِٹا دیا۔ ایک سپاہی فوجی طبیب کو بُلانے کے لیے بھاگا لیکن مندر

کی دیوی طبیب کے پہنچنے سے پہلے اپنا سفر حیات پورا کر چکی تھی۔

۷

رام ناتھ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا۔ سومنات کی جنگ کے دوران میں اس کا کرب انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ پہلے دن وہ اپنی کوٹھڑی سے کان لگا کر مندر کے محافظوں کی چیخ و پکار سُنتا رہا۔ جب دروازے سے باہر کسی پہرے دار کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی تو وہ چلّا اُٹھتا۔ ''بھگوان کے لیے مجھے بتاؤ باہر کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ کیا مسلمانوں کی فوج آ گئی ہے۔ کیا انہوں نے مندر پر حملہ کر دیا ہے۔''لیکن کوئی اس کی چیخ و پکار کی طرف توجّہ نہ دیتا۔ اگلے دن سومنات کی جے کے نعروں کے جواب میں اللہ اکبر کی صدائیں اس کے دل میں مسرت کی حدیں بیدار کر رہی تھیں۔ پھر جب رات کے وقت مندر کے محافظ مسرت کے نعرے بلند کر رہے تھے تو اس کی امیدوں کے چراغ بُجھ چکے تھے۔

جب مندر میں فیصلہ کن معرکہ شروع ہوا تو رام ناتھ کے دل میں زندگی کے نئے ولولے کروٹیں لینے لگے۔ جنگ کے اختتام پر ناقوس اور گھنٹیوں

کی صداؤں کے ساتھ سومنات کے پجاریوں کے پر جوش نعرے بھی خاموش ہوگئے تو اس کے لیے جنگ کے نتیجے کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا لیکن اس کے بعد ہر لحظہ بڑھتا ہوا سکوت اس کے لیے صبر آزما تھا۔ "کیا مسلمان فتح کے بعد واپس جارہے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ اس تاریک کوٹھڑی میں ایک مظلوم انسان اُن کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اگر وہ مجھے یہیں چھوڑ کر چلے گے تو کیا ہو گا؟" دیر تک ان سوالات کا جواب سوچنے کے بعد وہ گلا پھاڑ کر چلّانے لگا۔ "مسلمانو! مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں نے مدّتوں تمہارا انتظار کیا ہے۔ میں نے رو رو کر تمہاری فتح کی دُعائیں مانگی ہیں۔"

لیکن آس پاس اس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر اپنی کوٹھڑی کے دروازے کو دھکے دینے کے بعد وہ منہ کے بل فرش پر بیٹھ گیا اور گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے لگا۔ "مسلمانوں کے خدا! میں تیری صداقت پر ایمان لاتا ہوں۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میری مدد کر۔ تو میرا آخری سہارا ہے۔ اس تاریک کوٹھڑی میں میرا دم گھٹا جارہا ہے۔ میں اپنی موت سے پہلے

صرف ایک بار تیرے سورج کی چمک، تیرے چاند کی روشنی، تیرے ستاروں کی جگمگاہٹ اور تیرے پھولوں کی مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کھلی فضاؤں میں سانس لینا چاہتا ہوں۔ میں دریاؤں کے کناروں پہاڑوں کی چوٹیوں پر تیری عظمت کے گیت گانا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کے خُدا، میرے خدا، اور ساری دنیا کے خدا میری مدد کر۔"

دُعا ختم کرنے کے بعد رام ناتھ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اچانک باہر اسے چند آدمیوں کے پاؤں کی آہٹ سنا دی۔ پھر کوئی یہ کہہ رہا تھا۔ "مہاراج! رام ناتھ اس کوٹھڑی میں ہے۔"

کسی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "بہت اچھا! دروازہ کھول دو۔ جلدی کرو!"

پھر رام ناتھ کو دروازے کا تالا کھلنے کی آہٹ اور بھاری زنجیر کی کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے بعد کسی نے دھکّا دے کر دروازے کے دونوں کواڑ کھول دیے۔ رام ناتھ کے سامنے قید خانے کے دو محافظ اور سلطان کی فوج کے چند مشعل بردار سپاہیوں کے درمیان یوسف اور عبدالواحد کھڑے تھے۔ رام ناتھ "رنبیر! رنبیر!" کہتا ہوا کوٹھڑی سے نکلا

اور بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”رنبیر! رنبیر! تم آ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ قدرت میری مدد کرے گی۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ، روپ وتی کہاں ہے؟“

یوسف نے کہا۔ ”روپ وتی ہمارے گھر میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

ایک لمحے کے لیے رام ناتھ مسرّت کے ساتویں آسمان پر تھا۔ اس نے عبد الواحد کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں یہ سچ ہے۔“ عبد الواحد نے اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

”تو میں اس قید سے آزاد ہونے سے پہلے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔“

عبد الواحد نے اپنے سپاہیوں اور قید خانے کے محافظوں کو حکم دیا کہ تم اس قید خانے کی تمام کوٹھڑیوں کی تلاشی لے کر قیدیوں کو رہا کر دو۔

۸

عصر کی نماز کے بعد سلطان خود اس کشادہ کمرے میں داخل ہوا جہاں سومنات کا بڑا بُت نصب تھا۔ اس بُت کے ارد گرد کئی چھوٹی چھوٹی مورتیاں نصب تھیں۔ سلطان کے حکم سے ان تمام مورتیوں کو توڑ دیا گیا لیکن جب بڑے بُت کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گِر پڑے۔ اور انہوں نے گڑگڑا کر التجا کی کہ اگر آپ اس مورتی کو چھوڑ دیں تو اس کے وزن کے برابر سونا دینے کے لیے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا اور اس نے جواب دیا۔ ”میں بُت فروش نہیں، بُت شکن کہلانا چاہتا ہوں۔“

سلطان نے دونوں ہاتھوں سے ایک بھاری گُرز اُٹھایا۔ فضائیں میں سومنات کے پجاریوں کی چیخیں بلند ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی پتھّر کے چند ٹکڑے[6] اِدھر اُدھر گِر گئے۔ سپاہیوں نے سلطان کی تقلید کی اور پے

---

[6] بعض روایات کے مطابق یہ بُت اندر سے کھوکھلا تھا اور جب اسے توڑا گیا تو اس میں سے بیش قیمت ہیرے اور جواہرات بر آمد ہوئے۔ یہ دولت اس دولت سے کہیں زیادہ تھی جو ہندو اس بُت کے عوض پیش کرنا چاہتے تھے۔

در پے ضربوں سے بُت کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس کے بعد سلطان کے حکم سے بُت کے گرد ایندھن کا ڈھیر لگا کر آگ لگا دی گئی۔[7]

مندر سے جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اس کی مالیت دو کروڑ دینار کے برابر تھی۔[8] اس کے بعد سلطان محمود اپنے پڑاؤ کا رُخ کر رہا تھا۔

---

[7] یہ بُت چونے کے پتھّر کا بنا ہوا تھا اور آگ میں جلنے سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بعض روایات کے مطابق سلطان نے اس بُت کے چند ٹکڑے یادگار کے طور پر غزنی بھیج دیے۔

[8] بعض روایات کے مطابق یہ دولت صرف سلطان کے حصّے میں آئی تھی اور یہ اصل مالِ غنیمت کا نواں حصّہ تھی۔

جنگ کے بعد

رات کے وقت جب مسلمان پڑاؤ کے قریب شُہدا کی لاشیں دفن کر رہے تھے، رام ناتھ اور نرملا ایک خیمے میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ رام ناتھ کو اپنی سرگزشت سنانے کے بعد نرملا نے اسے بتایا کہ میں بھی مسلمان ہو چکی ہوں اور یوسف نے میرے لیے نرملا کی بجائے سعیدہ کا نام پسند کیا ہے۔

رام ناتھ نے کہا۔ ”میں اپنے قید خانے کا دروازہ کھلنے سے پہلے مسلمان ہو چکا تھا۔ میں نے پہلی بار نماز اس انسان کے پیچھے ادا کی ہے جس نے اس

ملک میں کفر کا سب سے بڑا قلعہ مسمار کیا ہے لیکن ابھی تک مجھے اپنا نیا نام دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

نرملا نے کہا۔ "بھیّا! مجھے بہت سے مسلمانوں کے نام معلوم ہیں۔ تم اُن میں سے کوئی نام پسند کر لو۔"

"اچھا بتاؤ۔"

نرملا نے کئی نام بتا دیے۔ رام نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے تو عثمان پسند ہے۔"

نرملا نے کہا۔ "بھیّا میں نے ابھی تک آپ کو ایک خوشخبری نہیں سنائی" "وہ کیا؟"

"یوسف نے مجھے بتایا تھا کہ روپ وتی مسلمان ہو گئی ہے۔ اس کا نام بھی بہت اچھا ہے لیکن مجھے یاد نہیں آرہا۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر رام ناتھ نے کہا۔ "بہت دیر ہو گئی وہ ابھی تک نہیں آئے۔"

نرملا نے کہا۔ ”آپ کو نیند آرہی ہے؟ ان کا خیمہ دائیں ہاتھ ہے۔ باہر ان کا نوکر کھڑا ہوگا آپ وہاں جا کر لیٹ جائیں۔“

رام ناتھ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آج مدّت کے بعد نیند آرہی ہے۔“

تھوڑی دیر میں رام ناتھ، یوسف کے خیمے میں نیم خوابی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ اُسے یوسف کی آواز سنائی دی۔ ”رام ناتھ سو گئے؟“

”میں ابھی لیٹا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا سو جاؤ“ یوسف یہ کہہ کر خیمے کے دوسرے کونے میں لیٹ گیا۔

رام ناتھ نے قدرے توقّف سے کہا۔ ”زبیر۔۔۔ معاف کیجیے، آپ کا نیا نام ابھی تک میری زبان پر نہیں چڑھا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ روپ وتی کا نیا نام کیا ہے؟“

”کیا تمہیں نرملا نے بتا دیا ہے کہ روپ وتی مسلمان ہو چکی ہے؟“

”ہاں، لیکن انہیں اس کا نام یاد نہیں۔“

”روپ وتی کا نیا نام طاہرہ ہے۔“

”طاہرہ، طاہرہ“ رام ناتھ اپنے دل میں یہ نام کئی بار دہرانے کے بعد سو گیا۔ اگلی صبح رام ناتھ گہری نیند سے بیدار ہوا تو یوسف، عبدالواحد اور سعیدہ اس کے قریب کھڑے تھے۔ رام ناتھ نے اُٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ ”صبح ہوگئی!“ یوسف نے جواب دیا۔ ”اب تو دوپہر ہونے والی ہے۔ تم بہت گہری نیند دو رہے تھے۔“

”مجھے مدّت کے بعد ایسی نیند نصیب ہوئی ہے۔“

یوسف نے کہا۔ ”اسی لیے میں نے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اب تو سورج بہت اوپر آچکا ہے۔ جلدی سفر کی تیاری کرو۔ تمہارے ساتھی انتظار کر رہے ہیں۔“

رام ناتھ نے کہا۔ ”ہم آج ہی جا رہے ہیں؟“

”تم آج ہی جا رہے ہو اور سعیدہ بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔ ہم یہاں سے کنٹھ کوٹ تک سلطان کے ہمراہ جائیں گے۔“

رام ناتھ حیرانی اور مسرّت کے ملے جلے جذبات سے یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔

عبدالواحد نے کہا۔ ”ہمارے ڈیڑھ ہزار سپاہی تمہارے ساتھ جا رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد رام ناتھ ان کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا تو مدّت تک دھوپ نہ دیکھنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ فوج کے سپاہی کوچ کے لیے تیّار کھڑے تھے۔ رام ناتھ اور سعیدہ (نرملا) گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔

۲

سومنات کا مندر لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ متعفّن فضا میں گِدھوں اور چیلوں کے غول منڈلا رہے تھے۔ سلطان نے قلعے سے چند میل ہٹ کر دریا کے کنارے پڑاؤ ڈال لیا۔ لشکر کے سینکڑوں سپاہی سومنات کی جنگ میں زخمی ہو چکے تھے۔ اور انہیں چند دن آرام کی ضرورت تھی۔ سلطان

نے یہاں قریباً دو ہفتے قیام کیا۔ اس عرصے میں مبلّغین کی کوششوں سے قرب و جوار کے ہزاروں ہندو مسلمان ہو گئے تھے۔ پندرہویں روز سلطان محمود نے وہاں سے کُوچ کیا۔

سومنات کی تباہی کی خبر سے کاٹھیاواڑ کی ہمسایہ ریاستوں میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ وہ راجے اور سردار جو سلطان کی برق رفتاری کے باعث سومنات کی جنگ میں حصّہ لینے سے محروم رہے تھے، آبُو کے راجہ پریم چند کے جھنڈے تلے جمع ہو کر کچھ دور ایراولی کی پہاڑیوں کے درمیان سلطان کا راستہ روکنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سلطان کے سامنے اہم ترین مسئلہ ان سیکڑوں زخمیوں کی حفاظت تھا جو ابھی تک جنگ میں حصّہ لینے کے قابل نہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ دوبارہ اس مہیب صحرا کو عبور کرنا غیر ضروری سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا رُخ زیادہ تر مغرب کے ساحل کی طرف رکھا۔

ایک دن سلطان کا لشکر ایک ایسے مقام پر جا نکلا جہاں کوسوں تک پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان آبو کے راجہ کے لشکر کی نقل و حرکت سے

سے باخبر تھا۔ اس علاقے میں گھِر جانے کے بعد دشمن کے حملے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا۔ سلطان کے پیچھے ساری فوج گھٹنے گھٹنے پانی میں کود پڑی۔ نشیب کے اس علاقے کی وسعت سلطان کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ سپاہیوں کے گھوڑے کبھی گھٹنوں اور کبھی گردنوں تک پانی میں ڈوب رہے تھے۔ کبھی وہ اپنے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹاپو دیکھتے تھے تو سمجھتے کہ کنارا قریب آرہا ہے لیکن تھوری دور سطحِ زمین پر چلنے کے بعد انہیں حدِّ نگاہ تک پھر پانی ہی پانی نظر آنے لگتا۔

جن مجاہدوں نے سومنات کی طرف یلغار کرتے ہوئے ایک بھیانک ریگستان کے سراب دیکھے تھے، وہ اب سمندر میں گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ یہ ان جوانمردوں کا ایک نیا امتحان تھا جو سرزمینِ ہند میں ایک نئی صبح کا پیام لے کر آئے تھے۔ ان کے عزائم بلند اور ان کے حوصلے ناقابلِ شکست تھے۔

دو دن صبر آزما مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد سلطان کا لشکر خشکی پر پہنچ

گیا۔ اَن گِنت مصائب کے باوجود لشکر کے علاوہ بار برداری کے دو لاکھ اونٹوں اور گھوڑوں کا بحفاظت پار پہنچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ اس کے بعد سلطان کنتھ کوٹ کا رُخ کیا۔ راجہ بھیم دیو سلطان کی آمد کی خبر سنتے ہی بھاگ گیا اور سلطان نے کسی مزاحمت کے بغیر کنتھ کوٹ پر قبضہ کرلیا۔ کنتھ کوٹ میں سلطان نے دو دن قیام کیا۔ تیسرے روز صبح کی نماز کے بعد عبدالواحد اور اس کے ساتھی سلطان کے لشکر کو الوداع کہنے کے لیے کھڑے تھے۔

رُخصت ہوتے وقت سلطان نے یکے بعد دیگرے عبدالواحد، یوسف اور دوسرے نو مسلم سرداروں سے کہا۔ ”میں اپنا عہد پورا کر چکا ہوں۔ اس ملک میں ظلم و استبداد کا سب سے بڑا قلعہ مسمار ہو چکا ہے لیکن تمہارے حصّے کا بہت سا کام باقی ہے۔

عبدالواحد! یوسف! میں تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں میری واپسی پر مغموم نہیں ہونا چاہیے۔ شاہراہِ حیات پر میری آخری منزل قریب آچکی ہے۔ ممکن ہے ہم ایک دوسرے کو دوبارہ زندگی میں

نہ دیکھ سکیں۔ لیکن وہ عظیم مقصد جس کی تکمیل کے لیے قدرت نے ہمیں منتخب کیا ہے، ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اللہ کی راہ میں وہ لوگ یقیناً مجھ سے آگے تھے جو سومنات کی دیواروں تلے شہید ہوئے اور تم جیسے نوجوان اس درخت کا پھل ہیں جسے گمنام مجاہدوں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ انہوں نے ظلم و ستم اور کفر و الحاد کی عمارت کو گرایا ہے لیکن اس کے جگہ ایک نئی عمارت تعمیر کرنا تمہارا کام ہے۔

میں اس یقین کے ساتھ واپس جا رہا ہوں کہ تم وہ چراغ کبھی نہیں بجھنے دو گے جو شہیدوں نے اپنے خون سے جلائے ہیں۔ تم حق و صداقت کا وہ پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہونے دو گے، جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں نے بلند کیا ہے۔ خدا حافظ۔"

سلطان گھوڑے[۹] پر سوار ہو گیا اور لشکر روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد

---

[۹] کچھ کا علاقہ عبور کرتے ہوئے سلطان کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض روایات کے مطابق سومنات کا ایک پجاری جس نے مسلمانوں سے انتقام لینے کا حلف اٹھایا تھا، سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سلطان کو راستہ بتانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ سلطان کا لشکر اس شخص کی رہنمائی میں ایک ایسے بیابان

عبد الواحد اور اس کے ساتھی اس قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے جس کا امیر گزشتہ تیس برس سے شاہ راہِ حیات پر اپنی فتوحات کے پرچم

میں پہنچا جہاں پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ سلطان نے اس سے باز پُرس کی تو معلوم ہوا کہ وہ سومنات کا پجاری ہے اور قصداً مسلمانوں کو غلط راستے پر لے آیا ہے جس پر سلطان کے حکم سے شخص کی گردن اڑادی گئی۔ سلطان کو چند دن اس کٹھن راستے پر سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر وہ اپنی فوج کو تباہی سے بچا کر سندھ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ راستے میں سلطان نے منصورہ پر حملہ کیا۔ منصورہ کے قرمطی حاکم نے شہر سے فرار ہو کر کھجوروں کے ایک جنگل میں پناہ لی۔ سلطان کی فوج نے جنگل کا محاصرہ کر لیا اور اس کے کئی ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد سلطان نے دریائے سندھ کے کنارے سفر جاری رکھا۔ اس علاقے میں جاٹوں کے جنگجو قبائل نے سلطان کے لشکر کو کافی نقصان پہنچایا۔ یہ لوگ اچانک کنارے کی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے جنگل سے نمودار ہوتے اور رسد بردار دستوں پر حملہ کر کے بھاگ جاتے۔ بالآخر سلطان ایک طویل اور صبر آزما سفر کے بعد ۲ اپریل ۱۰۲۶ء کو غزنی پہنچ گیا۔

اگلے سال مارچ کے مہینے میں سلطان نے ان جاٹوں کو سزا دینے کے لیے ملتان کا رُخ کیا۔ ملتان کے قریب دریا کے کنارے پڑاؤ ڈال کر اس نے چودہ سو ایسی کشتیوں کا بیڑا تیار کرایا جن کے دائیں بائیں اور اگلے سرے پر لوہے کی لمبی میخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہر کشتی میں بیس بیس سپاہی تیر کمانوں، ڈھالوں اور آتشیں گولوں سے مسلح موجود تھے۔

جاٹ چار ہزار کشتیوں پر سوار ہو کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے آئے لیکن سلطان نے عبرتناک شکست دی۔ جاٹوں نے دریا سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی تو دونوں کناروں پر ترکمان سواروں کے دستے اور ہاتھیوں پر بیٹھے ہوئے تیر انداز اُن کی تاک میں تھے۔ جنگ کے بعد جاٹوں کی ہزاروں لاشیں دریا میں بہہ رہی تھیں اور ہزاروں کناروں پر بکھری تھیں۔ اس جنگ کے بعد سلطان کو پھر کبھی ہندستان آنا نصیب نہ ہوا۔

لہرا چکا تھا۔

۳

طاہرہ (روپ وتی) محل کے ایک کمرے میں عصر کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگ رہی تھی کہ اسے بر آمدے سے زبیدہ کی آواز سنائی دی۔

"طاہرہ! طاہرہ!"

"کیا ہے بہن؟" طاہرہ نے دُعا ختم کرنے کے بعد دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"طاہرہ! وہ آ گئے ہیں۔" زبیدہ نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

ایک ثانیہ کے لیے زندگی کی تمام دھڑکنیں سمٹ کر طاہرہ کی آنکھوں میں آ گئیں۔ زبیدہ مڑ کر بر آمدے کی طرف دیکھتے ہوئے کسی سے مخاطب ہوئی۔ "آیئے آپ رُک کیوں گئے۔"

طاہرہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی، لیکن اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ عثمان (رام ناتھ) دروازے کے سامنے نمودار ہوا۔ چند ثانیے وہ

ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔ ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

زبیدہ ایک طرف ہٹ گئی۔ عثمان کمرے میں داخل ہوا۔ ”میری روپا! میری طاہرہ! میری زندگی۔“ اس نے فرطِ انبساط سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

طاہرہ پیچھے ہٹی اور اچانک قبلہ رو ہو کر سجدے میں گر پڑی۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی اور عثمان بے حس و حرکت اس کے قریب کھڑا تھا۔ جب وہ اُٹھی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”رام ناتھ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔“
”مجھے معلوم ہے۔ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔“

”بھائی یوسف کہاں ہیں؟“

”وہ چند دن کے بعد آئیں گے۔ تمہاری ایک سہیلی میرے ساتھ آئی ہے۔“

”وہ کون؟“

”سعیدہ!“

”سعیدہ کون ہے؟“

”سعیدہ نرملا دیوی کا نام ہے۔“

”نرملا! میری بہن، میری محسن، کہاں ہے وہ؟“ طاہرہ یہ کہتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھی۔ برابر کے کمرے سے زبیدہ نے آواز دی۔ ”طاہرہ! نرملا یہاں ہے۔“ وہ جلدی سے کمرے میں داخل ہوئی اور بے اختیار آگے بڑھ کر نرملا سے لپٹ گئی۔

۴

سومنات کی جنگ کو تین ماہ گزر گئے۔ اس عرصہ میں سعیدہ کی یوسف سے اور طاہرہ کی عثمان کے ساتھ شادی ہو چکی تھی۔ یوسف کی بہن زبیدہ اپنے شوہر عبدالواحد کے ہمراہ قنوج جا چکی تھی۔

ایک دن یوسف کو عبدالواحد کا یہ پیغام ملا کہ تم فوراً قنوج پہنچو۔ ایلچی سے دریافت کرنے پر یوسف کو معلوم ہوا کہ عبدالواحد نے کئی سرداروں اور با اثر لوگوں کو بھی قنوج آنے کی دعوت دی ہے۔ یوسف اور عثمان اسی وقت قاصد کے ہمراہ روانہ ہوگئے اور تیسرے روز دوپہر کے قریب قنوج پہنچ گئے۔

جب وہ عبدالواحد کی قیام گاہ پر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنے دفتر میں ہے۔ عثمان کو مہمان خانے میں ٹھہرا کر اپنی بہن سے ملا اور تھوڑی دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد عثمان کو لے کر عبدالواحد کے دفتر پہنچا۔ عبدالواحد نے اُن کی آمد کی اطلاع ملتے ہی انہیں دفتر میں بلا لیا۔ یوسف اور عثمان مصافحہ کے بعد اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عبدالواحد نے ان سے دریافت کیا۔ ”آپ گھر سے ہو کر آئے ہیں؟“

”جی ہاں! زبیدہ نے مجھے نہایت پریشان کُن خبر سنائی ہے۔ کیا آپ سچ مچ قنوج چھوڑنے کا ارادہ کر چکے ہیں؟“

”ہاں!“ عبدالواحد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن کیوں۔ کیا سلطانِ معظّم یہاں آپ کی کارگزاری سے مطمئن نہیں؟"

عبدالواحد نے جواب دیا۔ "میں نے خود ہی سلطان سے یہ درخواست کی تھی کہ مجھے اب رُخصت دی جائے۔ میں اپنے وطن جانا چاہتا ہوں۔ وہاں میری زیادہ ضرورت ہے۔ میں نے اپنی باقی زندگی اسلام کی تبلیغ کے لیے وقف کر دی ہے۔ یہ زمین اب خدا کے دین کے لیے ہموار ہو چکی ہے۔ یہاں میرے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ درویش خصلت انسان آگئے ہیں جن کے سینے ایمان کے نور سے منوّر ہیں۔ اب دِلوں کی تسخیر کا کام باقی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ان لوگوں کی نگاہیں تلواروں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوں گی۔ لیکن نگر کوٹ کے دور افتادہ گوشوں میں بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اسلام کی تبلیغ کو اپنا مقصدِ حیات بنا چکے ہیں۔ اس شہر میں خدا کی توحید اور انسانی مساوات کا نور بلند کرنا چاہتا ہوں جہاں کالی دیوی کے سامنے انسانوں کا بلیدان دیا جاتا تھا۔ میں اس ندی کے کنارے اذانیں دینا چاہتا ہوں جہاں مجھے آشا کی چیخیں سنائی دی

تھیں۔۔۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہاں ہزاروں انسان میرا انتظار کر رہے ہیں۔“

یوسف نے کہا۔ ”لیکن آپ کی جگہ کون لے گا؟“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو مجھ سے بہتر کام کر سکتے ہیں اور سلطان نے ان میں سے ایک کو قنوج کا نیا حاکم مقرر کر دیا ہے۔ میں اس سے مطمئن ہوں اور مجھے یقین ہے کہ قنوج کے نو مسلم اور غیر مسلم عوام بھی اس کا خیر مقدم کریں گے۔“

”وہ کون ہے؟“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”میں پرسوں ایک عام اجلاس میں اس کے نام کا اعلان کروں گا۔“

یوسف نے کہا۔ ”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟“

”بہت اچھّا۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں، لیکن پہلے وعدہ کیجیے کہ آپ اس کی

تائید کریں گے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ جس فیصلہ کی آپ تائید کریں گے میں دل و جان سے اس کی حمایت کروں گا۔"

عبدالواحد نے مسکراتے ہوئے یوسف کے چہرے ہر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں اور کہا۔ "قنوج کا نیا حاکم اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہے اور اس کا نام یوسف ہے۔"

یوسف اضطراری حالت میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "نہیں نہیں، میں اس قابل نہیں۔"

عبدالواحد نے میز پر سے ایک مراسلہ اُٹھایا اور اُٹھ کر یوسف کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سلطان کا حکم نامہ ہے۔ میں نے ان کے استفسار پر ایک ایسے آدمی کا نام پیش کیا تھا جو میری نگاہ میں بہترین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ بیٹھ جاؤ یوسف۔"

یوسف بیٹھ گیا۔ عبدالواحد کے اصرار پر اس نے کانپتے ہاتھوں سے

مراسلہ کھولا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ مراسلہ پڑھنے کے بعد اس نے عبدالواحد کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”آپ نے میرے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ ڈال دیا ہے۔“

عبدالواحد نے جواب دیا۔ ”آپ کے کندھے ایک پہاڑ کا بوجھ اُٹھا سکتے ہیں۔“

۵

تیسرے دن قنوج کے سردار، شہر کے عوام اور ہمسایہ ریاستوں کے سفیر قلعے کے وسیع صحن میں جمع تھے اور عبدالواحد ان کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔

”دوستو اور بھائیو! میں نے آپ کو یہ خبر سنانے کے لیے یہاں جمع ہونے کی دعوت دی ہے کہ میں اپنے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا ہوں۔ میں نے سلطانِ معظّم سے درخواست کی تھی کہ اپنے وطن جانا چاہتا ہوں اور انھوں نے میری یہ درخواست منظور کر لی ہے۔ جانے سے پہلے آپ کے

لیے میرا آخری پیغام یہ ہے کہ اب ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو چکا ہے۔ شمال سے جو گھٹا اٹھی تھی وہ برس چکی ہے۔ اب اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔ سلطان محمود کو قدرت نے جس مقصد کے لیے منتخب کیا تھا وہ پورا ہو چکا ہے۔ وہ نظام جس نے انسانوں کے درمیان نفرت اور حقارت کی دیواریں کھڑی کی تھیں اور جس نے ایک انسان کو چھوت اور دوسرے کو اچھوت بنایا تھا، شکست کھا چکا ہے۔ وہ تہذیب جس نے اس ملک کے اونچی ذات کے انسانوں کو نیچ ذات انسانوں کی ہڈیوں پر عشرت کدے تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی، ایک ایسی تہذیب سے مار کھا چکی ہے جس کا مقصد انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کی حد بندیاں توڑنا ہے۔ محمود غزنوی اسی ملک میں ایک نئی صبح کا آفتاب بن کر آیا تھا۔ وہ ان کروڑوں انسانوں کی پکار کا جواب تھا جو ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہے تھے۔ اب اُن بتوں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے جو انسانوں کو بھیڑوں اور بھیڑیوں کے ٹولیوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اب اس ملک میں تہذیب کے سیلاب کو کوئی نہیں روک سکتا جس کی روشنی میں انسان اپنے خون سے نہیں بلکہ اپنے اعمال سے پہچانا جائے گا۔

اس ملک کے باشندو! میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ وہ انسان جو دوسرے انسانوں کے خون پر پلتے ہیں، تمہیں اس تہذیب کے خلاف اکسائیں گے۔ وہ کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اس ملک کے بے بس اور نادار انسانوں کو ان کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل ہو۔ وہ تمہیں ان بتوں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کریں گے جو انہیں برتری عطا کرتے ہیں۔ لیکن یاد رکھّو! انسانوں کے بنائے ہوئے بُت انسانوں کے ہاتھوں ٹوٹتے رہیں گے۔ وہ کسی نئے سومنات کے لیے قلعہ تعمیر کریں تو قدرت کسی اور محمود کو بھیج دے گی۔

قنوج کے سرداروں اور ہمسایہ ریاستوں کے حکمرانوں نے ہمارے ساتھ یہ معاہدہ کیا ہے کہ وہ اسلام کی تبلیغ کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ میں اس یقین کے ساتھ یہاں سے واپس جارہا ہوں کہ اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ ورنہ شمال سے ایک طوفان اُٹھے گا جو پہلے کی نسبت زیادہ شدید ہوگا۔ اپنے نومسلم بھائیوں سے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہاری زندگی کا مقصد جس قدر بلند ہے اسی قدر تمہاری

ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ اس ملک میں اسلام کی روشنی پھیلانے کے لیے ان تھک کوششوں اور بے لوث قربانیوں کی ضرورت ہے۔ تمہاری ملّت کے شہیدوں نے اس ملک کی زمین کو اپنے خون سے سیراب کیا ہے، اب ایک نئی پود کو پروان چڑھنا تمہارا کام ہے۔

اختتام پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے قنوج کے حاکم کی حیثیت میں حتیٰ الامکان اسلام کے ضابطۂ اخلاق کا پابند رہنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دانستہ طور پر کسی مسلم کے ساتھ بے جا رعایت یا کسی غیر مسلم سے بلا وجہ زیادتی نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود اگر مجھ سے کسی کو کوئی دکھ پہنچا ہو تو صدقِ دل سے معذرت کا طلبگار ہوں۔ اب میں اپنا آخری فرض ادا کرتا ہوں آپ میرے جانشین کا نام سُننے کے لیے بے قرار ہوں گے۔ سلطانِ معظّم نے میری درخواست پر یوسف کو تمہارا نیا حاکم مقرر کیا ہے۔ آپ میں سے اکثر اسے رنبیر کے نام سے جانتے ہوں گے۔ ذاتی طور پر میں اسے اس عہدے کے لیے موزوں ترین آدمی سمجھتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ وہ آپ کا بہترین دوست اور مخلص خادم ثابت ہو اور مجھے قیامت

کے دن خدا کے سامنے شر مسار نہ ہونا پڑے۔ اب میں آپ کے نئے حاکم سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی مسند پر تشریف لائیں۔“

یوسف اُٹھ کر مسند کے قریب گیا اور کچھ دیر ہجوم کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھائیو! میں صرف آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ پوری نیک نیتی سے اپنا فرض ادا کروں گا۔ میں اس ملک میں عدل و انصاف کا جھنڈا سر نگوں نہیں ہونے دوں گا۔ وہ لوگ جو انسانیت کا بول بالا چاہتے ہیں، انہیں مجھ سے مایوسی نہیں ہو گی اور جو لوگ انسانیت کے دشمن ہیں اُن کے خلاف مجھے آپ سب سے آگے دیکھیں گے۔ مجھے ہر اس شخص کے تعاون کی ضرورت ہے جو قنوج کو امن کا گھر بنانا چاہتا ہے۔ اس وقت میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔“

۶

اگلے روز شہر سے باہر ہزاروں لوگ عبدالواحد کو الوداع کہنے کے لیے کھڑے تھے، پچاس ہزار سوار جو نگر کوٹ کے باشندے تھے عبدالواحد کے ہمراہ جانے کے لیے تیار تھے۔ زبیدہ بھی اپنے شوہر کے قریب

گھوڑے پر سوار تھی اور یوسف اس کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ ”بھیّا!“ زبیدہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے بھول تو نہیں جائیں گے۔“

یوسف کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے جواب دیا۔ ”پگلی کہیں کی۔ میں تجھے کیسے بھُول سکتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”میں جانے سے پہلے بھابھی سے نہ مل سکی، آپ وعدہ کریں کہ ان کے ساتھ آپ نگر کوٹ ضرور آئیں گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں، ہم سال میں کم از کم ایک بار ضرور تمہارے پاس آیا کریں گے۔“

پھر زبیدہ نے عثمان کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”آپ اور بہن طاہرہ نہیں آئیں گے ہمارے گھر؟“

عثمان نے جواب دیا۔ ”بہن ضرور آئیں گے۔ ہم بہت جلد گوالیار جا رہے ہیں اور وہاں سے آپ کر ملنے نگر کوٹ آئیں گے۔“

”آپ گوالیار کیوں جا رہے ہیں؟ بھیّا کے پاس نہیں رہیں گے؟“

”نہیں، اب میں بھی اپنے وطن جانا چاہتا ہوں وہاں میری زندگی کا مقصد بھی اسلام کی تبلیغ ہو گا۔“

عبدالواحد نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں اجازت دیجیے۔“

یوسف اور عثمان نے یکّے بعد دیگرے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور عبدالواحد نے قافلے کو کوچ کا حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد یوسف اور عثمان ایک ٹیلے پر کھڑے اس قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ یوسف آہستہ آہستہ یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ ”خدا حافظ، میرے بھائی، میرے رفیق، میرے محسن اور میرے رہبر خدا حافظ!“

اختتام

ایبٹ آباد

۲ مارچ سنہ ۱۹۵۳ء